

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرثیہ نگارانِ امروہہ

عظیم امروہوی

مصنف — عظیم امروہوی
ناشرین — عاصم نقوش۔ مہران عظیم
سنِ اشاعت — ۱۹۸۳ء
تعداد — دو ہزار
طابع — مہران پریس۔ کراچی
ہمارا ڈیزائنر — نعیم اختر
کتابت — کفیل امروہوی۔ امان امروہوی
قیمت — پچاس روپے

ملنے کے پتے

الاتحاد ھال۔ ۵۰۔ بی۔ ۵۷۔ سوکوارٹرز کورنگی۔ کراچی ۳۱
مرکز سادات امروھہ۔ بلاک ۱۳۔ فیڈرل "بی" ایریا۔ کراچی
بزم رئیس۔ دربار شاہ ولایت امروہہ
نظارہ بک ڈپو۔ لکھنؤ

منجانب

الاتحاد کمیٹی رجسٹرڈ

۵۰۔ بی۔ ۵۷۔ سوکوارٹرز۔ کورنگی۔ کراچی۔ ۳۱
فون نمبر: ۳۱۰۶۵۵-۳۱۰۷۱۳

مہران پریس
[illegible] چوک۔ آؤ[illegible] روڈ۔ کراچی
فون: [illegible]۸۵[illegible]

انتساب

برادرم نقوش نقوی کے نام

کہ

جن کی زندگی حسینیت اور اردو ادب
کی خدمت کے لیے وقف ہے............

عظیم امروہوی

...(النصف اول)

...سین

امروہہ در حقیقت ایوانِ شاعری ہے
مولد ہے مصحفیؔ کا محشرؔ ذرا سنبھل کے

محشرؔ لکھنوی

[illegible] چوک
فون [illegible] : د

ترتیب

چودھویں صدی ھجری (نصف آخر)

فقر[illegible] کے باعث ضائع

پیش گفت

شاعری سے اس دن سے دل مانوس ہے جس دن سے ہوش سنبھالا ہے۔ لیکن تحقیق کی خارزار وادی سے گزرنے کی کبھی ہمت بھی نہیں کی تھی۔ اپنے وطن امروہہ سے والہانہ عشق ہونے کے سبب جب جب الطفی مراثی کا بھی ہے کی ... ایک حصہ ... نگارشات نظر سے گزرتی تھیں تو ایک سوال ذہن میں اُبھرتا تھا۔ ... ہیں۔ اس طرح کے شخصی مراثی امروہہ میں خدمات کب تک وقت کی گرد کے نیچے ... اور ... شخصی مراثی کہے ہیں اس میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے ... اور اردو دنیا ... کو نہیں سمجھتا

... پروفیسر زیبی مرحوم۔ ... امروہوی مرحوم۔ مولانا ...

... سال

... ضیا رضا وغیرہ۔

... عبادت ...

... انھوں نے بھی مرثیے ... احباب کی

... ایمان ... امروہوی۔ عشرت

... نے

... نے دیا ہے

... کے باعث ...

لگاؤ رہا ہے اس لیے پہلا قدم "مرثیہ نگارانِ امروہہ" کے سلسلہ میں اٹھایا گیا۔ اس ارادے کو عزیز دوست ڈاکٹر بلال نقوی نے بھی تقویت بخشی۔

مرثیہ نگار شعرا کی فہرست ترتیب دینے میں یہ خیال رکھا گیا کہ صرف ان شعرا کا ذکر ہو جن کا آبائی وطن امروہہ ہے۔ چاہے وہ شعرا بعد میں کہیں بھی ہجرت کر گئے ہوں۔ وہ شعرا جن کا وطنی تعلق امروہہ سے نہیں تھا لیکن امروہہ میں پیدا ہوئے تھے ان کا اس میں ذکر نہیں ہے اور نہ ہی ان کا ذکر ہے جن کے بزرگ امروہہ سے ہجرت کر گئے تھے۔ جن شعرا کی مرثیہ نگاری کے بارے میں پورا یقین نہیں تھا ان کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔

شعرا کی ترتیب ان کے عہد کے مطابق ہے اور عہد کا تعین ان کی ولادت کی مدد سے کیا گیا ہے۔ اس طرح اس میں نہ صرف مرحوم شعرا کا ذکر ہے بلکہ عصرِ حاضر کے شعرا بھی شامل ہیں۔ مرحوم شعرا کے ذکر میں خاص طور سے ان کے اسلاف کا مختصر ذکر اس لیے کیا ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے اجداد کی تاریخ سے تھوڑی واقف ہو سکے اس کا مقصد "پدرم سلطان بود" نہ ہو کر قصص الاولین موعظۃ الآخرین ... تاکہ ان کی حیات اور کارناموں سے فائدہ اٹھایا جاسکے اور اس کی روشنی سے ا... مستقبل کو تابناک بنانے میں مدد ملے۔ ... ساتھ ہی ساتھ اخلاف کا ذکر اس لیے کیا گ...

... سلسلہ جو اہاسکے اور ...

شعرا کی ...

... ہے ...

آ ...

جہاں تک نسل ...

بنیاد بنا گ...

...سن رضا خاں ______

...سید دلاور حسین ______

مولوی سید قاسم رضا ______

شعرا کی مرثیہ نگاری کے علاوہ دیگر اصناف سے ان کے تعلق کا ذکر بھی مختصراً اس لیے شامل کیا گیا ہے تا کہ شاعر سے اچھی طرح متعارف ہوا جا سکے۔ نمونۂ کلام پیش کرنے میں کافی احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی ہے لیکن ممکن ہے بہت سے مقامات پر کلام میں غلطیاں نظر آئیں مگر اس کے لیے شاعر کو ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہوگا۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کلام کی نقول اترتے اترتے یہ خرابی پیدا ہوتی ہو یا قدیم اور بوسیدہ کاغذات پڑھنے اور سمجھنے میں مجھ سے ہی غلطی ہوتی ہو۔

اس طرح شعر ... ران کی شاعری کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے یہ ایک تذکرہ ... اور تنقید نہیں۔ جس کی نہ صفحات میں گنجائش تھی اور نہ بہ زیادہ تر شعرا کا کلام منظرِ عام پر آنے سے پہلے یہ کام مناسب تھا۔ یہ صرف اتنا کام ہے کہ تاریخ کے کچھ صفحات کی گرد ہٹائی گئی ہے جو ادبی سرمایہ دفن ہو چکا تھا اسے نکالا گیا ہے۔ جو کلام کرم خوردگی اور نمی کے سبب دم توڑ رہا تھا اسے بچایا گیا ہے اور جو جواہر خاک میں ملے ہوئے تھے انہیں خاک چھان کر نکالا گیا ہے ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں کچھ مرحوم شعرا کا کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکے تب ہی ان پر نقد و تبصرہ مناسب ہوگا۔

اردو مرثیے میں ایک حصہ شخصی مراثی کا بھی ہے یعنی وہ مراثی جو رسولؐ اور اہلِ بیتؑ کے علاوہ کسی کے ذکر میں ہیں۔ اس طرح کے شخصی مراثی امروہہ میں بھی کافی تعداد میں کہے گئے ہیں لیکن جن شعرا نے صرف شخصی مراثی کہے ہیں اس میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے شعرا میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں پروفیسر زیدی مرحوم۔ ... ت امروہوی مرحوم۔ مولانا سید ظفر حسن عاشی۔ مولانا سید محمد عبادت کلیم ... ضا رضا وغیرہ۔

یہ بات بھی وہ ... انوں نے بھی مرثیے کی جانب توجہ کی ہے۔ جن ... نقبل ... ۔ ایمان ... عشرت امروہوی۔ سراج ... عقو ...

بد قسمتی ہے کہ پرانے ا ... کے باعث خان ... نے دیا ہے

اہلِ امروہہ کی خدمات تھیں وہ بھی دنیا کے سامنے آجاتیں۔

اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے اسلامی حکومت کے زمانے میں جنم لیا اور مغلیہ زمانے میں پھولی پھلی یہ سرزمین امروہہ کی خوش نصیبی ہے کہ شمالی ہند کا اردو کا سب سے پہلا شاعر سید اسمٰعیل امروہوی امروہہ میں پیدا ہوا۔ اور اسی کی آغوش میں اس نے پرورش پائی۔

میر سعادت علی سعادت امروہوی جن کی صحبت نے میر محمد تقی میرؔ کو ناخدائے سخن بن جانے کے راستے پر ڈال دیا وہ بھی سرزمینِ امروہہ کے ہی لائق فرزند تھے۔ استادالاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے مولد ہونے کا شرف بھی امروہہ ہی کو حاصل ہے۔ ان بزرگوں کے علاوہ کتنے ہی صاحبانِ فن کتنے ہی ادیب اور کتنے ہی شعرائے نامدار امروہہ نے پیدا کیے جنہوں نے امروہہ کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ ادبی دنیا غزل میں استاد مومن حسین صفیؔ اور ملک الکلام لائق حسین قوی کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔ دیگر اصنافِ سخن مع مرثیے کے استاد شمیم امروہوی کے مرہونِ منت ہیں اور رہیں گے امروہہ نے جہاں غزل گو اور مثنوی نگار اساتذہ پیدا کیے وہیں مرثیہ نگاروں کو بھی جنم دیا اور امروہہ کے مرثیہ نگاروں نے دہلی اور لکھنؤ اساتذہ کے زانو سے زانو ملا کر اس صنف کی ایسی خدمت کی جو ہر طرح ناقابلِ فراموش ہے۔

امروہہ کے مرثیہ نگاروں میں استاد شمیم امروہوی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو برِّ عظیم ہندوپاک کے مرثیہ نگاروں میں انیسؔ و دبیرؔ کی ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے اسلوب میں واضح فرق ہے میرے خیال میں دونوں مرثیہ نگاروں کا مقابلہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے ان دونوں کے اسالیب دو کشتیوں [illegible] مثل ہیں جو کبھی کبھی تو برابر سفر کرتی ہیں اور کہیں ان کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ [illegible] کی کشتی کے ناخدا۔ دبیرؔ اپنی کشتی کے بعد کے آنے والوں میں کسی نے اسلوب انیسؔ کو اختیار [illegible] دبیرؔ لیکن کوئی اس مقام کو نہ پہنچ سکا۔ شمیم مرحوم نے ابتداً اسلوب دبیرؔ کی [illegible] بعد اسلوب انیسؔ میں بھی طبع آزمائی کی جو شخص ان کے کلام کا بغور مطالعہ [illegible] مجبور ہے کہ جہاں انہوں نے اسلوب دبیرؔ کی پیروی کی ہے وہاں اس کا حق ادا

کر دیا ہے اور جہاں اسلوب انیس کی پیروی کی ہے وہاں بھی ایسے گل کھلائے ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ شمیم کو یہ خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ اسالیب انیس و دبیر کا سنگم اور ان اسالیب کے بہترین آئینہ دار ہیں جو ان کی عظمت و رفعت کا مظہر ہے۔ آج شمیم کے جانشین مولوی قائم رضا نسیم اپنے جد کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور زمانے اور ماحول کے مطابق جدید مرثیہ نگاری میں ادب کی بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں اور بے شک برِ عظیم کے مرثیہ نگاروں میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

عظیم امروہوی قوم و ملک کے ہونہار نوجوان ہیں جو عرصے سے شاعری کر رہے ہیں جس میں مدح محمدؐ و آلِ محمدؐ پر کافی حصہ ہے اور اردو مرثیے پر ان کی خاص توجہ ہے۔ اب تک ماشاء اللہ تقریباً ۱۴ مراثی کہہ چکے ہیں جو امروہہ اور بیرونِ امروہہ کی مجالس میں کافی مقبول ہوتے ہیں۔ قابلِ تحسین ہیں وہ گذشتہ ۵۔ ۷ سال سے مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ مرثیے پر تحقیق بھی کر رہے تھے اس عرصے میں انہوں نے مرثیہ نگارانِ امروہہ سے متعلق بے حد تحقیق و تلاش کی جس کے نتیجے میں شعرائے امروہہ سے متعلق پہلی تاریخ منظرِ عام پر آ سکی مجھے یقین ہے کہ یہ اہلِ علم میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اردو مرثیے کی تاریخ میں بھی اضافے کا سبب بنے گی۔

عظیم امروہوی نے امروہہ کے مرثیہ نگاروں کے کلام کو بڑی کاوشوں سے جمع کیا ہے اور بہت سے مُردوں کو زندہ کر دیا ان کی یہ کاوش اہلِ امروہہ کے لئے خاص طور سے وجہِ افتخار ہے۔ زیرِ نظر تصنیف میں امروہہ کے تقریباً ۸۰۔ ۸۵ مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے کلام کے کچھ اچھے نمونے دیے گئے ہیں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تقریباً ۵۰ ایسے مرثیہ نگاروں کا کلام پیش کیا ہے جنہیں دنیا بھول چکی تھی مجھے بڑی مسرت ہے کہ انہوں نے یہ عظیم کام انجام دیا اور اس بات کی بھی خوشی ہے کہ نقوشِ تقوی نے طباعت اور اشاعت کا بار اپنے کاندھوں پر لیا اور خداوندِ عالم ان دونوں حضرات کو بہترین جزا عطا فرمائے اور اربابِ دانش کی نگاہ میں اس تصنیف کو شرفِ قبولیت حاصل ہو۔ آمین۔

پاکیزہ مقصد

لکھی تو نے حیاتِ مرثیہ گویانِ امروہہ مزیّن علم و دانش سے ہے ہر عنوانِ امروہہ
بہ ذاتِ شرفِ دیں شاہِ ولایت جانِ امروہہ نہ کیوں ہوں معترف اس۔ ... امر

عبارت ہے تری جلدِ مجلد اس عبارت سے
بقائے نام نیک و بخشش روزِ قیامت سے

فنا کا رکھ دیا سر ریگ قلم ... نے قلم کرکے جو رکھ ... کو طلعدم کرکے
کیا احسان حالِ رفتگاں بے شک رقم کرکے دکھا دیں ہم سب کی صورتیں یکجا ...

... یہ
اگر کردار ماضی کا کسی کے حال دیتے ہیں
مسیحائے زماں مُردوں میں جان بھی ڈال دیتے ہیں

عجب پاکیزہ مقصد ہے ترا یہ مرثیہ گوئی بھلا اس کی بلندی کو سمجھ سکتا ہے کیا کوئی
مصیبت وہ کہ جس پر آسماں رویا زمیں روئی کسی نے آبرو پائی، کسی نے

بڑا میدان مارا، سر وہ میداں کر لیا تو نے
کہ ذوقِ مرثیہ گوئی کو زندہ کر دیا تو نے

ستارہ مرثیہ گویانِ امروہہ کی قسمت کا　　خدا کی شان اک مدت کا ڈوبا پھر چمک اٹھا
جو تھے گم نام کب سے، ہو گئے پھر انجمن آرا　　تری کوشش سے ذکرِ کربلا تازہ ہوا گویا

حقیقت میں تری تحقیق ایسا کارنامہ ہے
کہ جو فخرِ ادب، فخرِ زباں، فخرِ زمانہ ہے

نقیؔ حیرت ہے تیرے تبصرے کی جامعیت پر　　زبان و شوکتِ الفاظ پر، مضمون کی ندرت پر
فصاحت پر بلاغت پر سخن سنجی کی قدرت پر　　مسدس ہے یہی حاوی مجلد کی ضخامت پر

مجلد معجزہ ہے تو نے ذکرِ معجزہ لکھا
"عظیم الشان" ہے تاریخ ایسا تبصرہ لکھا

۱۴۰۲ھ

سید شجاع الحسن نقیؔ

نوٹ: ... سے دو سال قبل اس وقت نکالی گئی تھی جبکہ ...ب زیرِ ترتیب تھی۔

قطعۂ تاریخ

شاعرِ آلِ محمد حضرت نسیم امروہوی

مرحبا کیا خوب ہے تحقیق و تاریخِ ادب
یہ ترے ذہنِ رسا کا کارنامہ ہے عظیم
لکھ دو اک مصرع میں سالِ طبع و موضوعِ کتاب
یہ مکمل "مرثیہ گویانِ امروہہ" نسیم

سنہ ۱۴۰۴ھ

مرثیہ از آدمؑ تا ایں دم

مرثیہ کا لفظ عربی کے رثا سے مشتق ہے جس کے معنی رونے کے ہیں اس لیئے مرثیہ اس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کے صفاتِ حسنہ بیان کر کے اظہارِ حزن و ملال کرتے ہیں۔ حالی نے بھی کچھ اسی طرح مرثیہ کی تعریف بیان کی ہے کہ

"مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر جی کڑھانا اور اس کے محامد اور محاسن بیان کر کے اس کا نام دنیا میں زندہ کرنا۔" (مقدمۂ شعر و شاعری صفحہ ۱۶۳) تقریباً یہی تعریف دوسرے نقادوں نے بھی کی ہے جب مرثیہ وہ نظم ہے جس میں کسی کی موت پر اظہارِ رنج و غم کیا جائے اور کسی عزیز یا دوست کی موت پر انسان کو احساسِ رنج والم ہونا فطرتِ انسانی میں شامل ہے اور رنج و غم کے احساس کی شدت ہی اشک و آہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو مرثیہ عینِ فطرتِ انسانی ہوا اس لیئے انسانی آنسوؤں کی اس منظوم شکل کا نام ہی مرثیہ ہو گا۔ لہٰذا یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ جتنی قدیم نسلِ انسانی کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم تاریخ مرثیہ بھی ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل ساقِ عرش کا واقعہ بھی ہے۔ بہر حال بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

"مرثیہ کو دنیا کی قدیم ترین اور نسلِ انسانی کی مشترک صنفِ کلام قرار دینا شاید غلط نہ

ہو گا۔" (دبستانِ دبیر صفحہ ۱۶۷)

حضرتِ ہابیل کی موت پر ابوالبشر حضرتِ آدمؑ کی آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسو شاید وہ پہلا خاموش مرثیہ ہے جو خود فطرت نے ایک درد رسیدہ باپ کے صحیفۂ عارض پر لکھا

مرثیہ کی قدامت کا ایک بہت بڑا ثبوت توریت میں مختلف انبیاءؑ کے نوحوں کی موجودگی بھی ہے۔ شبلی نعمانی نے بھی مرثیہ کی قدامت کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ

"عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی۔" (موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۱)

قدیم عربی ادب اور تاریخ کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ زمانہ جب میں بھی کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس نے مرثیہ نہ کہا ہو۔ کسی نے بھائی کا مرثیہ کہا تو کسی نے بیٹے کا۔ کسی نے باپ کا مرثیہ کہا تو کسی نے دوست کا۔ عدی بن ربیعہ جابر بن سفیان، علقی بن مالک، خنساؔ، متمم بن نویرہ، دعبل، فرزدق، کمیت اسد بن معدان، امام شافعی، علی محمد بن منصور، محمود بن حسین الشہیدی، ابو منہ، رجعو محی الدین بن طریح النجفی، علامہ شہاب الدین عبد القادر اور عبد الباقی العمری اپنے اپنے دور کے مشہور و ممتاز مرثیہ نگار ہوتے ہیں۔ عہدِ رسولِ مقبولؐ میں شہدائے بدر و اُحد کے بھی مرثیے لکھے گئے۔ بعد وفات رسولؐ آں حضرت کی پھوپی حضرت صفیہ نے بہت سے مرثیے لکھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حسان بن ثابت نے بھی مرثیے کہے ان کے مرثیوں کے اشعار طبری نے لکھے ہیں (مجاہد اعظم صفحہ ۲۵۵ مصنف مولوی سید شاکر حسین) متمم بن نویرہ نے اپنے بھائی کی موت پر جو دردناک مرثیہ کہا وہ بہت مشہور ہوا۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے جب متمم بن نویرہ سے یہ مرثیہ سنا تو بہت متاثر ہوئے اور اپنے بھائی کی موت پر بھی مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔ متمم نے مرثیہ لکھا اور حضرت عمرؓ کو جا کر سنایا۔ آپ نے سُن کر کہا کہ اس مرثیے میں وہ درد و کرب نہیں ہے جو ہمارے بھائی کے مرثیہ میں ہے۔ متمم نے

بجا وہ مرثیہ میں نے اپنے بھائی کا لکھا تھا اور یہ آپ کے بھائی کا ہے۔

اس طرح فارسی ادب میں بھی مرثیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے سلجوقی عہد میں مرثیہ اور ...شہدائے کربلا کے حالات اکی کتابیں لکھی گئیں۔ فردوسی نے سہراب کا مرثیہ اس کی ماں کی زبانی لکھا۔ فرخی نے سلطان محمود کا مرثیہ لکھا۔ یہ دونوں مرثیہ مثنوی کی شکل میں ہیں۔ اس کے علاوہ ابوالمفاخر رازی۔ نورالائمہ خوارزمی۔ حکیم سنائی غزنوی۔ خواجہ عطار نیشاپوری۔ آذری اسفرائنی۔ ابن حسام (پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ...تیموری عہد کا سب سے بڑا مرثیہ نگار بتایا ہے) حاجی محمد جان قدسی اور مقبل نے بھی کافی مرثیے لکھے ہیں شیخ سعدی اور امیر خسرو کا بھی ایک ایک مرثیہ بہت مقبول ہے۔ محتشم کاشی نے اہلِ بیت رسولؐ کا بھی مرثیہ لکھا۔

...کہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے ادب میں مرثیہ کی ایک تاریخی حیثیت ...ور شاعری جس کی دیگر اصنافِ سخن کا سرچشمہ فارسی شاعری کو کہا جاسکتا ہے اردو ...ثیہ کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اس کی بنیادیں اپنی ذاتی ہیں اس کی جڑیں اس کی اپنی سرزمین میں ہیں۔ اور یہ خصوصیت صرف اردو مرثیہ ہی کو حاصل ہے۔

اردو شاعری کی طرح مرثیہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی ہے ریاست گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں نے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا ہے۔ محمد قطب شاہ۔ قلی قطب شاہ۔ غواصی۔ وجیہی۔ فائز۔ لطیف۔ ہاشم علی۔ درگاہ قلی۔ نوری، شاہی۔ مرزا۔ شعور۔ بیچارہ۔ کاظم۔ ابن نشاطی۔ جنیدی۔ ہاشمی۔ نصرتی وغیرہ اردو کے ابتدائی مرثیہ نگاروں میں سے ہیں۔ ولی دکنی نے بھی ایک مرثیہ بشکل مثنوی لکھا۔ اور واقعاتِ کربلا نظم کیے۔

ابتدائی دور کے چند شعرا کے مراثی کے نمونے مندرجہ ذیل ہیں ۔

سلطان محمد قطب شاہ

یارب بجب نشانی سلطان کربلا ... یارب بہ شاہِ بے سروسامانِ کربلا

یارب بہ اضطرابِ دلِ شاہِ اولیا — از درد و اضطرابِ عزیزانِ کربلا

ہاشم علی سے

آج پُرخوں کفن ترا اصغر — آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گُل بدن ترا اصغر — حیف یو بالپن ترا اصغر

ابوالقاسم مرزا سے

کہوں دکھ درد اصغر کا اور نورِ چشمِ سرور کا — شہِ غازی کے جوہر کا کروزاری مسلماناں
عزیزاں دل ہوا پُرخوں یو سن احوالِ تم کوں — گئے معصوم شہادت کوں کروزاری مسلماناں

درگاہ قلی سے

ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو — صحرائے دل فگار کا داماں لہو لہو
ہے دشت وکوہ و جنگل ویراں لہو لہو — وہ رزم گاہِ شاہِ شہیداں لہو لہو

ولی سے

کروں میں مجلسِ اول میں تحریر — وفاتِ سید عالم کی تقریر
کروں میں مجلسِ دوئیم پُرنم — وفاتِ فاطمہؑ کر کر مرتم

غواصی

جلتا ہے سوزِ جوتی دنیا کھڑی ہے روتی — کال تے ہوا یو کوئی مہمانِ کربلا کا
غواصیاں معطر عالم کو سب کیا ہے — گویا یہ مرثیہ ہے ریحانِ کربلا کا

کاظم سے

ترا پنے دلبراں کی خبر لو علیؑ ولی — بے تاج سروراں کی خبر لو علیؑ ولی
تیروں اور پسراں کی خبر لو علیؑ ولی — ظلم وستم گراں کی خبر لو علیؑ ولی

شمالی ہند میں سب سے پہلے مرثیہ نگار اسمٰعیل امروہوی ہوئے۔ اسمٰعیل نے ۱۱۰۵ھ میں وفات نامہ بی بی فاطمہؑ کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ جس میں حالاتِ

زندگی اور وفات کی تفصیلات بیان کیں۔ مولوی عبدالحق نے بھی اسمٰعیل امروہوی کو شمالی ہند کا سب سے قدیم مثنوی نگار قرار دیا ہے۔ اس مثنوی کو ہم مرثیہ اس لیئے کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں مرثیہ نے باقاعدہ کوئی ہیئت اختیار نہیں کی تھی۔ عربی اور فارسی کے شعرا نے بھی مثنوی کی شکل میں مرثیے لکھے ہیں۔ اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں کہ "شروع شروع میں مرثیہ غزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظم ہوتا تھا اس لیئے کہ سوز خوانی اور لحن کے طرز میں پڑھنے کے لیئے یہ فارم نہایت موزوں تھے"۔ (اردو مرثیہ صفحہ ۱۸) سفارش حسین رضوی لکھتے ہیں کہ "میر اور سودا کے زمانے تک نظم کی ہر شکل میں مرثیہ کہا گیا" (اردو مرثیہ۔ تاریخ مرثیہ صفحہ ۱۹۳) پاکستانی شاعر اور محقق ہلال نقوی نے بھی اسمٰعیل کی اس مثنوی کو مرثیہ قرار دیا ہے۔ اسمٰعیل کے مرثیے کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں ؎

دونو روتے یک بارگی جو پکار　　　بیٹوں نے تبھی سن جو کھائی پچھار

چلا خون جاری ہو چشماں بھتار　　　دونو روتے بھائی آنکھوں زار زار

اسمٰعیل کے بعد شمالی ہند میں مرثیہ کے بہت سے شعرا پیدا ہوتے مثلاً حیدر، رسؔا، مسکینؔ، گدؔا، سکندؔر، محبؔ، احسانؔ، نفضلیؔ، افسردؔہ، سعادتؔ، محزوںؔ، سوؔدا، میرؔ، مصحفیؔ، قائمؔ چاندپوری وغیرہ ان میں سے کچھ نے تو خاص طور سے مرثیہ لکھا۔ اسی زمانے میں میر ضاحکؔ بھی ہوتے (ان کا کلام بہت کم ملتا ہے) اسی دور میں مرثیہ میں مسدس کی شکل کا بھی آغاز ہوا اور ادبی حیثیت بھی شروع ہوتی۔ سکندر کا ایک مرثیہ بہت مقبول ہوا جو آج بھی جگہ جگہ پڑھا جاتا ہے ؎

اک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول　　　ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول

ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و ملول　　　جس محلے میں کہ رہتے تھے حسین ابن علی

خط لیے کہتی تھی پردے سے لگی زار و قطار

ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

دیگر شعرا کا نمونۂ کلام اس طرح ہے ؎

حیدری

شام سے جب کربلا میں آئے زین العابدین اور سر بابا کا اپنے لائے زین العابدین
دیکھ کر لوتھوں کو یہ کہہ کر بائے زین العابدین گر پڑے ماٹی پہ اور چلائے زین العابدین

کیا کروں کس سے کہوں غم تو مجھ کو کھا گیا
ہائے میں جیتا رہا بابا کا چہلم آ گیا

احسان

آج صغرا یوں مدینے بیچ روتی ہو کے بین سونے گھر میں کس طرح آوے مجھے آرام چین
ام سلمیٰ سے کبھی کہتی ہے یوں با شور و شین کب سفر سے پھر کے آوے گا مرا بابا حسین

اکبر و عباس منہ پھر بھی مجھے دکھلاویں گے
میرے پردیسی کہو نانی کسی دن آویں گے

افسردہ

بانو کہتی ہیں کہ میں گو دکھلاوں کس کو لال زخمی ہے پڑا چھاتی لگاوں کس کو
جھوٹے جھوٹے یہ شلوکے میں پنہاوں کس کو جھولنے والا یہ سدھارا میں جھلاؤں کس کو

اتنی سی عمر میں جا تیر کی پیکاں کھائی
تیری اے لال منڈھی بیل نہ چڑھنے پائی

اس دور کے شعرا میں مرثیہ کو ادبی شکل دینے میں سودا کی خدمات سب سے زیادہ ہیں سودا نے چو مصرع اور مسدس دونوں طرح سے مرثیے لکھے ہیں۔ اس بند سے سودا کی مرثیہ نگاری کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی یاں تلک پہونچی ہے ملعون تری جلادی

کون فرزندِ علیؑ پہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اس کے تو نہیں ڈرتا ہے

میر تقی میر کے مرثیے کا نمونہ ہے

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے   مصیبت ہے، ماتم ہے، غم ہے، تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے   حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے

اسی دور کے آخر میں اردو مثنوی کے بادشاہ میر حسن بھی ہوئے میر حسن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے تو چار دانگِ عالم میں شہرت حاصل ہے لیکن ان کی مرثیہ نگاری سے واقفیت کم لوگوں کو ہے۔ ان کے مراثی میں بھی مثنوی کا سا بیانیہ انداز ہے۔

جب سکینہ نے سنا گھر میں کہ وہ سر گیا   یعنی جنت کو پیاسہ سبطِ پیغمبر گیا
سنتے ہی یہ ماجرا ہوش اس کا تو بکھر گیا   رو رو کر بولی اماں بابا مرا کیدھر گیا

میر و سودا کے دور کے سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں کہتے ہیں "میر و سودا کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ سے ادبی تقاضے شروع ہو گئے"۔ (اردو مرثیہ کا ارتقا)

مرثیہ کا اگلا دور دلگیر، ضمیر، خلیق اور فصیح کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت مستقل قائم ہوئی اور اب تک جو مرثیہ پر یہ اعتراض تھا کہ مرثیہ صرف رونے رلانے کی خالص مذہبی چیز کا نام ہے یہ اعتراض زائل ہونا شروع ہوا اور ادبی حیثیت کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں ضمیر کی خدمات زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ پروفیسر ممتاز احمد نقوی نے اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ

"میر ضمیر نے اپنی جدتِ طبع سے دنیائے مرثیہ میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا اس نے ہزاروں موزوں اور ندرت پسند طبائع کو اپنی طرف کھینچ لیا اور رفتہ رفتہ مرثیہ نے اصولِ نظم، تازگیٔ خیالات اور وسعتِ ادا کے لحاظ سے اتنی ترقی کی کہ اگر دنیا کی تمام جدید قدیم زبانوں کے نئے اور پرانے مرثیے ایک پلّے میں رکھ دیئے جائیں اور دوسرے میں

اردو مرثیے تو صرف کمیت (مقدار) کے اعتبار سے نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اردو مرثیہ کا ہی پلہ جھکا رہے گا۔" (ساز حریت صفحہ ۴۰۹)

ضمیرؔ کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

سو اس کلام سے مطلب ہے یہ خدا ہے گواہ ۔۔۔ جناب فاطمہؑ کے گھر میں ہے تمہیں پالا
خصوص زینبؑ و کلثومؑ سے بھی ہو آگاہ ۔۔۔ ہیں دونوں بیبیاں شہزادیاں عزیز اللہ

وہ سب تو ایک طرف پر امام اچھے ہیں
کہو حسین علیہ السلام اچھے ہیں

اس دور میں ضمیرؔ کی مرثیے کے سلسلے میں خدمات یقیناً قابل قدر ہیں لیکن دوسری طرف میر خلیقؔ نے بھی زبان کی سلاست اور نکھار کی جو مرثیے کے ذریعے کوشش کی ہے اس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا میر انیسؔ نے خود فخر یہ کہا ہے کہ ؎

مصرعہ ۔ حتا کہ یہ خلیقؔ کی ہے سربسر زباں

تلوار کی تعریف میں خلیقؔ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

موجیں زدہ حباب ہیں سر اس کے سامنے ۔۔۔ شق ہیں بہادروں کے جگر اس کے سامنے
رکھتی ہے کیا بساط سپر اس کے سامنے ۔۔۔ تنکے ہیں جبرئیل کے پر اس کے سامنے

ماریں کمر کا ہاتھ اگر پاؤں گاڑ کے
دو ٹکڑے ہے آسیا کی طرح کوہ پہاڑ کے

چھنو لال دلگیرؔ کا معرکتہ الآرا مرثیہ "قید سے چھوٹ کے جب سید سجاد آئے" بے حد مقبول ہوا۔

فصیحؔ نے زیادہ تر طویل بحروں میں مرثیے لکھے۔

مرثیہ کے اس انقلاب سے اب مرثیہ صرف مذہبی چیز نہیں رہا بلکہ ادبی حیثیت بھی ہو گئی۔ ضمیرؔ اور خلیقؔ کے بعد اردو مرثیہ کا جو دور آیا وہ مرثیہ کی تاریخ کا سب سے

زیادہ شان دار اور تابناک دور ہے یعنی دورِ انیس و دبیر۔ حالاں کہ ان سے پہلے نظیر غالب اور ذوق جیسے شاعروں نے بھی ادھر توجہ کی تھی۔ غالب نے تو اپنے بیٹے کا ہی مرثیہ ناتمام چھوڑ دیا۔ البتہ ذوق کے کئی مرثیے راقم نے حاصل کیے ہیں جن پر تحقیق جاری ہے۔ مطلعے اس طرح ہیں ؎

؎ جب اربعینِ سبطِ پیمبرؑ قریں ہوا

؎ جب قید سکینہ ہوئی زندانِ ستم میں

؎ جب تیر کھا کے حلق پہ اصغر گذر گئے

؎ ہر بشر کے لیے ہے شادی و غم دنیا میں

؎ جب اہلِ بیت واردِ بزمِ لعیں ہوئے

؎ آفت میں جب مسیح گرفتار ہو گئے

؎ جہاں میں صاحبِ اولاد جو بشر ہوگا

؎ شام میں عترتِ شبیرؑ کھلے سر آئی

؎ جب فوجِ اشقیا میں علم دار گھر گیا

ذوق کے شاگرد بہادر شاہ ظفر نے بھی کافی مرثیے کہے۔

بہر حال دورِ انیس و دبیر نے مرثیہ کو وہ عظمت بخشی کہ دنیا کے ادب سے نظر ملانے کے قابل بنا دیا۔ بقول امداد امام اثرؔ۔

"اگر میر انیس صاحب کو شعرائے اردو کے زمرے سے نکال لیجئے تو اردو کی شاعری فارسی کی شاعری سے بہت پیچھے پڑ جاتی ہے۔" (کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۳)

ایک اور موقع پر امداد امام انیس کی شاعرانہ عظمت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں "رزمی شاعری میں میر انیس، ہومر، ورجل، ملٹن اور فردوسی پر غالب ہیں۔ اور اگر ان کا جواب کوئی شاعر ہے تو بالمکی ہے یا بیاس ہے۔" (کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۱۰)

انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی سے نمونۂ کلام کا انتخاب کرنا بہت دشوار ہے اور غالباً اردو کے ہر سخن فہم کے ذہن میں ان خدایانِ سخن کا نمونۂ کلام محفوظ ہوگا۔

انیسؔ و دبیرؔ کی عظمت کا اعتراف دورِ حاضر کے منفرد نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی ایک جگہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"انیسؔ و دبیرؔ کے بعد پھر مرثیہ گو شعرا کو عروج نہیں ہوا اور انیسؔ و دبیرؔ وہ لوگ ہیں جو مرثیہ ہی نہیں جو کچھ کہتے خدائے سخن کہلاتے۔" (مکتوب رشید احمد صدیقی بنام نسیم امروہوی مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۲ء)

انیسؔ و دبیرؔ کے دور میں واقعی مرثیے نے ارتقا کی وہ تمام منازل طے کرلیں کہ جس سے ادب کا نہ صرف ایک اہم جز بن گیا بلکہ اردو کے سرمایے میں وہ گراں قدر اضافے کیے اور وہ خدمات انجام دیں کہ جس کا اعتراف ہر صاحبِ فہم کو کرنا پڑ گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں کہ

"تمہارے مراثی کی یہ خدمت ناقابلِ انکار ہے کہ انہیں کے سہارے سارا علم بدیع اردو ادب میں منتقل ہوا۔" (دبستانِ دبیرؔ صفحہ ۴۹)

مرثیہ کی اہمیت اور افادیت سے انکار اس لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ وہ واحد صنفِ شاعری ہے جس کے دامن میں سب کچھ موجود ہے۔ غزل کی رنگینی اور سحرکاری بھی ہے۔ قصیدے کی شان وشکوہ اور بلند آہنگی بھی۔ نظم کا تسلسل اور روانی بھی ہے۔ اور مثنوی کی واقعہ نگاری اور لطافت بھی اور اس کے علاوہ بزم کے جلوے۔ رزم کا جلال۔ انقلاب کے شرارے۔ جہد و عمل کے مرقعے۔ اخلاق کی تعلیم۔ فلسفہ کا درس۔ جرأت وہمت کا سبق۔ تاریخ کی تصویریں۔ شجاعت وجاں نثاری کی تمثیلیں۔ جہاد کا عزم۔ مذہب کا تقدس اور رثائیت کا سرچشمہ بھی ہے۔ غرض کہ منظر نگاری۔ جذبات نگاری۔ کردار نگاری۔ واقعہ نگاری اور رزم نگاری سب کچھ مرثیے میں موجود ہے۔

اسی لیے مرثیہ کو صرف رزمیہ ۔ ڈرامہ ۔ المیہ ۔ خمریات ۔ فلسفہ یا تاریخ سمجھ لینا غلط ہے۔ اور جن نقادانِ فن نے ایسا سوچا ہے وہ مرثیے کے سلسلے میں رائے قائم کرنے ہیں گم راہ ہوتے ہیں ۔ دراصل مرثیہ سب کچھ ضرور ہے لیکن سب سے پہلے وہ مرثیہ ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے اجزا مانی جا سکتی ہیں ۔ اور کسی بھی زبان کی کوئی بھی صنفِ شاعری مرثیہ سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتی مماثلت ضرور ہے ۔

مرثیہ کی اہمیت کا اظہار ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "اردو شاعری کو صرف مرثیہ کی بدولت وسعت و جامعیت اور گہرائی و گیرائی نصیب ہوئی جذبات و احساسات کی جتنی فطری اور صحیح عکاسی مرثیوں میں ملتی ہے دوسری اصنافِ سخن اس سے عاری ہیں اردو میں اخلاقی شاعری مرثیوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔"
(تعارف مرثیہ صفحہ ۵۶)

پاکستانی شاعر ساحر لکھنوی نے اس بات کا اعتراف اس طرح کیا ہے ؎

اس میں غزل کا حُسن، قصیدے کی دلکشی — مدحت کی آن بان، عقیدت کی چاشنی
حمدِ خدا کا لطف بھی نعتِ رسولؐ بھی — پھیلاؤ میں ہے نظم، تسلسل ہے مثنوی
غم بھی ہے بزم و رزم بھی ہے ہجو بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے زمزمہ بھی ہے (مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک صفحہ ۹)

مرثیہ کے سلسلے میں ایک غور طلب بات ڈاکٹر فضل امام نے کہی ہے کہ " اگر انیس و دبیر کے مراثی نہ ہوتے تو جدید نظم کو سنورنے اور نکھرنے میں ابھی معلوم نہیں کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ۔" (شاعرِ آخر الزماں جوش ملیح آبادی صفحہ ۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ مرثیے نے نہ صرف زندگی کی عکاسی کی خدمت انجام دی ہے۔ بلکہ زندگی کے تقدس کی بھی کوشش کی ہے۔ لیکن کامیابی کے ساتھ مرثیہ کہنا بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگار شعرا کم ہوتے ہیں اور کامیاب مرثیہ نگار اور

بھی کم ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ مرثیہ نگاروں کی کمی کی یہ بھی ہے کہ مرثیہ نگار کے لیئے بہت سے علوم پر قدرت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔

انیس و دبیر کے دور میں اور اس کے بعد بھی بہت سے شعراء نے مرثیے کی بڑی خدمت کی ہے۔ کچھ نے تو اپنی پوری زندگی کی تمام تر صلاحیتیں مرثیہ نگاری کے لیئے وقف کر دی تھیں۔ ادبی مقام دلانے میں انیس و دبیر کے علاوہ تعشق، عشق، انس، مونس، اوج، شمیم، برجیس، مطیر، شاد، صفی، رضی، کوثر، تمکین، وحید، رشید، عروج، نفیس، سلیس، رئیس، عارف، جلیس، فائق، قدیم، قلق، بحر، اسیر، عرش، حافظ، معجز، صبر، صابر، عاشق، محسن، سراج، فارغ، ضیا، فراست، کامل، محب، محبوب، مودب، شاعر، آرزو، صفدر، خورشید، رضا، طیش اور عالم وغیرہ کا بھی ہاتھ ہے۔

اس کے علاوہ انیس و دبیر کے دور سے قبل اور بعد بھی بہت سے دوسرے شعراء نے مرثیے کہے لیکن چونکہ دیگر اصنافِ سخن سے وہ پوری طرح وابستہ تھے اس لیئے وہ مرثیہ نگار کی حیثیت سے متعارف نہ ہو سکے۔ مثلاً ذکی دہلوی، ملک الشعراء مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی، امانت اور منشی امیر مینائی وغیرہ۔ منشی امیر مینائی نے اس حضرت کی ولادت سے وفات تک کے حالات نظم کیئے ہیں اس مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

جب تک رہے جہاں میں شفقت کیا کیئے ۔۔۔ باندھا شکم پہ سنگ ریاضت کیا کیئے
بے وارثوں کے کام میں محنت کیا کیئے ۔۔۔ محتاجوں کی ضعیفوں کی خدمت کیا کیئے
بیمار آپ نے جسے پایا چلے گئے!
مسکیں، غریب جس نے بلایا چلے گئے

اس طرح مرثیہ کی ادبی حیثیت تو ظاہر ہو گئی اور صاحبانِ علم و فن نے اس کا اعتراف کر لیا لیکن یہ اعتراض پھر بھی باقی رہ گیا کہ مرثیہ صرف ایک مخصوص فرقے کی مذہبی چیز ہے۔ دیگر اقوام سے اس کا تعلق نہیں ہے عوام اور عوامی زندگی سے دور کی چیز

ہے لیکن بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ برِصغیر میں جوشؔ ملیح آبادی، نسیم امروہوی، جمیلؔ مظہری، نجم آفندی اور آلِ رضا کی آوازیں گونج اٹھیں اور مرثیے کو عوام کی زندگی کا ترجمان۔ عوام کے کردار کی اصلاح کا ذریعہ اور عوام کے مسائل کا حل بنا کر پیش کیا گیا۔ امام حسینؑ کی ذات کے محدود تصور کو ختم کر کے ہمہ گیری اور عوام سے تعلق پیدا کیا گیا۔ اور تزکیۂ نفس کے لیے ان کی سیرت کے اعلیٰ نمونے پیش کیے گئے۔ شمشیر نے، بہار آمد، رجز، تلوار اور گھوڑے وغیرہ کے ذکر اور ترتیب کا جو اضافہ کیا گیا تھا اس سے منہ موڑ کر قلم اٹھایا۔

جوشؔ ملیح آبادی نے پیشین گوئی کی کہ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو!
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

نسیم امروہوی نے آواز بلند کی کہ؎

حسینؑ پیکرِ انسانیت کی جاں تو ہے   زمینِ صبر و تحمل کا آسماں تو ہے
نہ صرف دینِ محمدؐ کی عزّ و شاں تو ہے   رہِ حیات میں سالارِ کارواں تو ہے
جہاں کو خوابِ فنا سے جگا دیا تو نے
بقا کے واسطے مرنا سکھا دیا تو نے

جمیلؔ مظہری کہہ اٹھے کہ

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ وارثِ میراثِ خلیل   خالقِ جذبۂ قربانی و روحِ تعمیل
جس کی سیرت ہوئی اک فطرتِ کبریٰ کی دلیل   جس سے دیکھی نہ گئی نوعِ بشر کی تذلیل
جس نے انسان کو پستی سے ابھارا وہ حسینؑ
جس کے تیور تھے مشیت کا اشارا وہ حسینؑ

آلِ رضا رضاؔ پکار اٹھے کہ؎

آواز دی ہے فاطمہؑ کے نورِ عین کو
انسانیت پکار رہی ہے حسینؑ کو!

نجم آفندی نے ارادہ ظاہر کیا کہ

اہلِ زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر
ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہے اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کا بشر
مردانِ حق پرست کا جب ہو اگر
عباسِ نام ور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

اب امام حسینؑ کو انسانیت کا پیکر۔ صبر و تحمّل کا آسمان۔ زندگی کے کارواں کا سالار۔ خوابِ غفلت سے جگانے والا۔ نوعِ بشر کو تذلیل سے بچانے والا اور انسان کو پستی سے ابھارنے والا۔ ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ مرثیہ کی دنیا میں یہ ایسا انقلاب تھا کہ جس سے مرثیہ نے ایک بالکل نئی شکل اختیار کی مرثیہ کے موضوعات کو وسعت ملی۔ مرثیہ کے قاری کا حلقہ بڑھا۔ اور مرثیہ ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ عوام کے لیے ایک کارآمد چیز بن گیا۔ حالاں کہ بہت سے قدامت پسند اور روایت پرستوں نے طرح طرح سے اس جدید مرثیہ پر تنقید کی۔ کسی نے کہا یہ مرثیہ کلاسیکی نہیں ہے۔ کسی نے کہا اس میں ذکرِ مصائب کم ہے۔ کسی نے صرف ایک نظم یا مسدّس قرار دیا۔ اور کسی نے تلوار، گھوڑے، ساقی نامے اور بہار کا ذکر نہ دیکھ کر اس کو مرثیہ کی صنف سے ہی بالکل خارج کر دیا۔ حالاں کہ یہ اعتراضات بالکل اسی طرح ہیں کہ جیسے آج بھی کوئی غزل کے معنی صرف عورت سے بات چیت سمجھتا رہے۔ دراصل دوسری اصنافِ سخن کی طرح مرثیہ میں بھی یہ تبدیلیاں فطری تھیں۔ بقول پروفیسر احتشام حسین

"ہر صنفِ شاعری کی طرح مرثیہ بھی تغیرات کی رو سے گزرتا رہا ہے ایسا ہونا فطری بھی تھا۔" (امانتِ سخن صفحہ ۷)

مرثیے کے ارتقا کے سلسلے میں ایک اور عالم علّامہ ذیشان حیدر جوادی نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے کہ

تی دور میں مرثیہ کو زندہ رکھنا ہے تو دیگر اصنافِ سخن کی طرح اسے برقی رفتاری دینا پڑے گی اور اس کے مزاج میں برقی لہروں کو دوڑانا پڑے گا۔" (امانتِ سخن صفحہ ۵۵) بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد مرثیے میں تغیر پذیر امکانات پیدا ہوئے جس نے جدید اثرات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی۔ نیا ذہن نئے تصورات لے کر ابھرا اور نئے اور پرانے تصورات نے مرثیے کو ایک نئی شکل دی جسے ہم جدید مرثیے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس نئی شکل کے پیدا ہونے میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا بھی ہاتھ رہا۔

قدیم مرثیے کی عظمت اور اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن جدید مرثیے کی ضرورت سے انکار بھی غیر ممکن ہے۔ بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد مرثیے کی یہ کروٹ جس سے جدید مرثیے نے جنم لیا اس جدید مرثیے اور قدیم مرثیے میں کیا فرق ہے اس سلسلے میں بہت سے ذہنوں میں کوئی واضح تصور نہیں حالاں کہ بنیادی فرق نہ ہونے کے باوجود بھی دونوں کے مزاج۔ انداز۔ لہجہ۔ زبان اور مضامین کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔

قدیم وجدید مرثیہ میں سب سے بڑا اور نمایاں فرق یہ ہے کہ قدیم مرثیے کا مقصد شہادت کا بیان تھا۔ لیکن جدید مرثیہ مقصدِ شہادت بیان کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے کہ آخر یہ واقعہ اور یہ المیہ کیوں رونما ہوا۔ کس عظیم مقصد کے تحت یہ عظیم قربانی پیش کی گئی۔ اور اس قربانی نے انسانیت کے کیا کیا درس دیئے۔ قدیم مرثیہ نگار امام حسینؑ کو اس حیثیت سے زیادہ پیش کرتا تھا کہ ؎

ع باغِ جناں کا نخلِ تمنا حسینؑ ہے

ع اعجازِ انبیا کا خزانہ حسینؑ ہے

ع دریائے مغفرت کا سفینہ حسینؑ ہے

لیکن جدید مرثیہ نگار امام حسینؑ کو اس حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے کہتا ہے کہ ؎

ع قاطعِ نخلِ امارت ہیں حسینؑ ابنِ علیؑ

ع شہیدِ معرکہ جہد و ارتقا ہے حسین

دوسرا ابڑا فرق قدیم و جدید مرثیہ میں یہ بھی ہے کہ قدیم مرثیہ کا مقصد حزن و ملال اور گریہ وزاری تھا۔ مرثیہ نگار رلانے کے لیئے مرثیہ لکھتے تھے لیکن جدید مرثیہ صرف رلانے کے لیئے نہیں لکھا جا رہا بلکہ اس کا مقصد (اور کچھ شعرا کی رائے میں اہم مقصد) جگانا ہے۔ بیدار کرنا ہے۔ چونکانا ہے اور اگر جوشؔ کے مراثی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جدید مرثیہ جھنجوڑنے کے لیئے بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

کس طرح جانا ہے تجھ کو سوچ اے مردِ خدا اک طرف زہرِ فنا ہے اک طرف ہے بقا
یا پہن لے تاج کردارِ شہیدِ کربلا یا محیطِ کشورِ باطل میں جا کے ڈوب جا
یا عنانِ ذہنِ عالم جانبِ حق موڑ دے
یا حسینؑ ابنِ علیؑ کا نام لینا چھوڑ دے

اسی طرح موضوع کے اعتبار سے بھی جدید مرثیہ قدیم مرثیے سے بہت مختلف ہے۔ قدیم مرثیے میں شاعرانہ تعلیاں، تلوار اور گھوڑے کا حال، ساقی نامہ، بہار کا ذکر، صبح و شام کا منظر اور کردار نگاری وغیرہ ہوتی تھی۔ لیکن جدید مرثیے کا موضوع عالمی مسائل بنے ہوئے ہیں۔ اس کی روح میں آفاقیت ہے۔ اس کا زاویہ نظر بدل گیا ہے وہ کہہ رہا ہے کہ

ہم انقلابیوں کی نظر ہے حسینؑ پر
اور یہ نظر بطرزِ دگر ہے حسینؑ پر

اور جب نظر بطرزِ دگر ہے تو وہ کردار پیش کر کے کردار سازی بھی چاہتا ہے اور کہتا ہے

رعبِ سلطانی کو ٹھکرا دو تو لو نامِ حسینؑ لوٹتے رن میں نہ گھبراؤ تو لو نامِ حسینؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو نامِ حسینؑ موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ تو لو نامِ حسینؑ
حلق سے تیغوں کے منہ موڑو تو لو نامِ حسینؑ
برگ سے فولاد کو توڑو تو لو نامِ حسینؑ

جدید مرثیہ نگار نے امام حسینؑ کو قدیم مرثیہ نگار کی طرح صرف امام ہی کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ ایک عظیم انسان کی شکل میں پیش کیا ہے امام ... کی بحیثیت امام بھی عظمت برقرار رکھتے ہوئے انسانِ کامل بنا کر جدید مرثیہ نگار نے پیش کیا ہے۔

شبیرؑ زندگی کی رہِ معتبر کا نام   شبیرؑ ہے وقار و کمالِ بشر کا نام
شبیرؑ ذہن و قلب کی ہے روشنی کا نام   شبیرؑ ہر غریب سے ہے دوستی کا نام

قدیم مرثیہ کا چوں کہ حلقہ محدود تھا اس لئے اس میں طرزِ تخاطب بھی محدود تھا۔ جدید مرثیہ کا حلقہ لا محدود ہونے سے طرزِ تخاطب بھی بدل گیا اور لا محدود ہو گیا۔ اب صرف اہلِ عزا، مومنو یا مسلمانوں کو مخاطب نہیں کیا جاتا جس طرح قدیم مرثیہ نگار کہتے تھے۔

ع اے اہلِ عزا پھر الم و غم کے دن آئے

ع اے مومنو! حسینؑ سے مقتل قریب ہے

ع اے مومنو! اولاد کا مرنا بھی غضب ہے

اس کے بجائے آج کا مرثیہ نگار کہتا ہے ؎

ع اسلام دینِ عظمتِ انساں ہے دوستو!

ہاں وہ بشر ہے وارثِ تطہیر دوستو!
ہاں اس جری کا نام ہے شبیرؑ دوستو!

مرثیے کی بنیادی چیز اور اس کی روح رثائیت ہے۔ قدیم مرثیہ میں صرف ایک غریب الوطن، ایک بے کس و بے مددگار اور ایک بھوکے اور پیاسے کا ذکر کر کے اس کی مظلومی پر رُلایا جاتا تھا۔ لیکن جدید مرثیہ نگار ایک بہادر، ایک مجاہد، ایک شجاع اور ایک سپاہی کی شہادت پر رُلاتا ہے اور رُلا کر صبر کی تلقین نہیں کرتا بلکہ جوش و خروش پیدا کر کے مردِ میدان اور شورِ ما بناتا ہے حق پر جان دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ مثلاً؎

لیکن آنسو وہ جو برسائیں شرارِ زندگی   جس سے ٹپکے گوہرِ عزّ و وقارِ زندگی

جس کے قبضے میں ہو تیغ آبدارِ زندگی جن کی رنگینی میں کروٹ لے بہارِ زندگی

ہاں وہ آنسو جن میں غلطاں ہو خروشِ خونِ حق
جن کے گرنے کی صدا میں ہو شہادت کا سبق

یا امام حسینؑ کو صرف ایک مظلوم سمجھ کر مظلومی پر آنسو بہانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جدید مرثیہ نگار کہتا ہے ؎

بپا جو کرتے ہو تم مجلسیں عزا کیلئے اشاعتِ غمِ مظلومِ کربلا کے لیے
یہ صرف بہرِ بکا ہیں نہ واہ واہ کیلئے یہ مدرسہ بھی تو ہیں دینِ مصطفیٰؐ کیلئے
نہیں یہ بزمِ ہدایت کا باب ہے گویا
حسینؑ علم و عمل کی کتاب ہے گویا

اردو شاعری کی دیگر اصناف میں کبھی دور از کار تشبیہات اور مبالغہ شاعرانہ حسن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج قدریں بدل گئی ہیں معیار بدل گیا ہے اس لیے کل کا حسن آج عیب قرار دے دیا گیا ہے اور جدید مرثیہ میں مبالغہ آرائی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ آج گرمی کی شدت اس طرح بیان نہیں کی جاتی کہ

ع ماہی جو سیخِ موج پر آئی کباب تھی

آج حقیقت پسندی کا رجحان بڑھ گیا ہے عصرِ حاضر کے جدید مرثیہ نگار ڈاکٹر وحید اختر موسم کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں ؎

ہے قافلۂ تشنگی شوقِ سفر میں منزل کا نشاں بھی نہیں اس راہگزر میں
تا حدِ نظر ریگِ بیاباں ہے نظر میں سایہ ہے نہ پانی رہِ پُر پیچ و خطر میں
گردوں ہے شرر بار زمیں آگ کا دریا
پھیلا ہوا ہے دور و قریب آگ کا دریا

قدیم و جدید مرثیہ میں ایک سب سے بڑا فرق ماحول نے پیدا کر دیا ہے۔ وہ مرثیہ

جو دورِ آمریت میں لکھا گیا ہو۔ یا جاگیرداری نظام میں تخلیق ہوا ہو۔ ظاہر ہے اس میں ایک قسم کی ذہنی آزادی کی کمی ہو گی اس لیے اس میں ایک گھٹن اور حبس کی کیفیت کے اثرات آجانے ناممکن نہیں ہیں لیکن وہ مرثیہ جو جمہوری نظام کے ماحول میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر کہا جائے گا تو شاعر کی سانسیں بھی اس سے متاثر ہوں گی، قلب کی کیفیت بھی بدلے گی لہجہ بھی اثر انداز ہوگا زبان بھی بدلے گی۔ اس لیے اس میں جرأتِ اظہار اور بے باکی زیادہ ہو گی ظاہر ہے کہ یہ بات ؎

؏ رعبِ سلطانی کو ٹھکرا دو تو نامِ حسینؑ

اس دور میں نہیں کہی جاسکتی تھی جب انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ کہہ رہے تھے۔ آج کا شاعر ہلال نقوی ہی یہ کہہ سکتا ہے ؎

رہبر بنی ہے کور نگاہی جہان میں
اہلِ ہوس ہیں ظلِ الٰہی جہان میں

یا جوشؔ ملیح آبادی ہی یہ بے باکی اختیار کر سکتے تھے ؎

جب حکومت تھر تھرانے میں دھلنے لگے | جب غرورِ اقتدار اقدار پر آنے لگے
خسروی آئین پر جب آگ برسانے لگے | جب حقوقِ نوعِ انسانی پہ آنچ آنے لگے

ان میں درآ باز وئے خیبر شکن سے کام لے
ان مواقع پر حسینی بانکپن سے کام لے

قدیم و جدید مرثیے میں ایک بڑا فرق اندازِ بیان کا بھی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم مرثیہ نگار زیادہ تر بیانیہ انداز یا مکالمے کا انداز مرثیے میں اختیار کرتے تھے

؏ اے مومنو یہ فصلِ غمِ شیرِ خدا ہے
؏ جب چلے یثرب سے سبطِ مصطفٰےؐ سوئے عراق
؏ چہلم جو کربلا میں بہتّر کا ہو چکا

ع قید سے چھوٹ کے جب سیدِ سجاد آئے

لیکن جدید مرثیہ نگار ہم سے صرف اس طرح مخاطب نہیں ہوتا بلکہ مبصرانہ انداز بھی اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

ع عزت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی

ع راہِ عمل میں نور بداماں ہے زندگی

ع اسلام دینِ عظمتِ انساں ہے دوستو

ع تمام خلق کا خدمت گزار ہے باقی

جدید مرثیہ نگار صرف تبصرے تک ہی نہیں جاتا وہ اس سے اور آگے بڑھ کر تنقید کی وادی میں بھی قدم رکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ؎

علم و عمل کا شیشۂ دل چور چور ہے
اونچا جہالتوں کا سرِ پُر غرور ہے
لڑو فروع پہ ناحق نہ مصطفےٰ کے لیے
اصولِ دیں کی حفاظت کرو خدا کیلئے
غضب ہے کم رہِ علم و عمل سے بھاگتے ہو
حسین کا تو سپاہی وہ ہے جو آگے ہو

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جدید مرثیہ تاریخ کے ساتھ ساتھ تبصرہ اور تنقید بھی ہے لیکن قدیم مرثیہ تاریخ زیادہ ہے۔ تبصرہ کم اور تنقید بالکل نہیں۔

ایک فرق قدیم و جدید مرثیے میں یہ بھی ہے کہ قدیم مرثیہ نگار اپنے ماحول کی عکاسی کرنے اور خصوصاً سیاسی و سماجی حالات پیش کرنے میں ہچکچاتا تھا اور یہ اس کے ماحول کی مجبوری تھی۔ اس لیے قدیم مرثیے میں ہمیں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کی تصویریں بہت کم ملیں گی۔ ادب کے سلسلے میں یہ نظریہ کہ ہر ادب اپنے عہد کا

آئینہ دار ہونا چاہیئے یہ جدید مرثیہ پر زیادہ پورا اُترتا ہے۔ اس میں معاشرے کی عکاسی کافی کی گئی ہے۔ مثلاً سے

اگر پسر کی ہے شادی بفضلِ ربّانی — ضیافتوں میں یہ کرتے ہیں اپنی قربانی
خوشی کے جوش میں ہوتی ہے ایسی جانی — کہ جس کے بعد نہ کلنے کو مل سکے پانی

تباہ ہو گئے بھی برباد گھن عمل نہ گئے۔
اگرچہ جل گئی رسّی مگر وہ بل نہ گئے

ان تمام باتوں کے علاوہ قدیم وجدید مرثیے میں ایک فرق طوالت واختصار کا بھی ہے قدیم زمانے میں لوگوں کو وقت کی کمی نہیں تھی نہ مرثیہ نگار کو اور نہ مرثیے کے سامعین کو اس لیے مرثیہ ۱۰۰، ۱۵۰ بندوں سے ہزار ہزار بندوں پر مشتمل ہوتا تھا آج اس سائنسی اور مشینی دور میں ہر ایک کے پاس وقت کی کمی ہے انسان کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں اس لیے جدید مرثیہ نگار عام طور پر ۵۰ بندوں سے زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ بندوں پر اپنے مرثیے کو ختم کر دیتا ہے جوش ملیح آبادی کا کوئی بھی مرثیہ ۱۵۰ بندوں سے زیادہ کا نہیں ہے نسیم امروہوی کے چند مرثیوں کے علاوہ تقریباً ۲۰۰ مراثی میں سے کوئی بھی ۱۰۰ بندوں سے تجاوز نہیں کر سکا ہے جمیل مظہری، نجم آفندی، آلِ رضا رضاؔ، زائر سیتا پوری، باقر امانت خانی، شمیم کرہانی، ڈاکٹر وحید اختر، علی سردار جعفری، ڈاکٹر پیام اعظمی، ڈاکٹر صفدر حسین، سردار نقوی، یاور اعظمی، فیض احمد فیض، شوکت تھانوی، ڈاکٹر یاور عباس، رئیس امروہوی، امیر امام، مہدی نظمی، فیض بھرت پوری، ہلال نقوی، خمار فاروقی، انعام امروہوی، ناشر نقوی، حسین مہدی رضوی، صادقین نقوی، اصغر علی ماہلی، تبسم ابن تسیم، سروش مچھلی شہری، محمود حسن قیصر، امجد فاضلی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، قاسم شبیر نصیر آبادی، معجز سنبھلی، حسین اعظمی، وحید الحسن ہاشمی، علی مہدی بلرام پوری، کالی داس گپتا رضا، اظہر جعفری اور راقم الحروف وغیرہ کے جدید مراثی ۵۰ سے ۱۵۰ بندوں پر مشتمل ہیں۔

مرثیے کے لیے جو ہیئت قدما نے مقرر کی تھی وہ مناسب ترین تھی اس لیے دورِ جدید کے مرثیہ نگاروں نے مسدس کی ہیئت کو اپنائے رکھا اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوشش نہیں کی البتہ صرف جمیل مظہری نے ہیئت کے سلسلے میں ایک تجربہ ضرور کیا ہے وہ یہ کہ مسدس کے بند کے تیسرے مصرعے کو سادہ کر دیا یعنی قافیے کی پابندی نہیں رکھی۔ ان کے اس تجربے کے سلسلے میں نقادوں کی رائے میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں تک کامیاب ہیں بہر حال اس سلسلے میں غالباً ابھی کسی شاعر نے ان کی تقلید نہیں کی ہے۔ شاید ان کا یہ تجربہ آگے چل کر کوئی دہرائے۔ دوسرا تجربہ صادقین نقوی نے بھی رباعی کی بحر میں مرثیہ لکھ کر کیا ہے۔

اردو شاعری میں جب آزاد شاعری عالمِ وجود میں آئی اور آزاد نظم اور آزاد غزل کے نام سے تجربے شروع ہوئے تو کچھ مرثیہ نگاروں نے آزاد مرثیے لکھنے پر بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن یہ کوشش آگے نہ بڑھ سکی جوش ملیح آبادی نے یہ کہہ کر اس طرف توجہ نہیں کی کہ

"یہ کوشش ان لوگوں کی ہے جو پابندی کے ساتھ کہنے کی طاقت نہیں رکھتے اور دماغ کے کاہل ہیں۔" (جدید مرثیہ کے تین معمار صفحہ ۲۷)

جس طرح اردو ادب کے وہ مرثیے جن کا موضوع کربلائیات ہے ان میں تبدیلیاں آئیں اور تغیر و انقلاب سے دوچار ہوتے ان کا لہجہ، آہنگ، زبان، مضمون، انداز، طرز، ادا، اسلوبِ بیان وغیرہ وغیرہ جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوا اور جدید مرثیے نے جنم لیا۔ تقریباً اسی طرح اردو کے شخصی مرثیوں نے بھی ایک کروٹ لی حالاں کہ شخصی مرثیوں میں اس حد تک یہ تبدیلی رُونما نہیں ہوئی جتنی کربلا کے موضوع پر لکھے جانے والے مرثیوں میں ہوئی اردو میں شخصی مرثیوں کی اہمیت کا اقرار سب سے پہلے حالی نے مرزا غالب کا مرثیہ لکھ کر کرایا تھا۔ چکبست نے جو گوکھلے کا مرثیہ لکھا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ لیکن ان کا مزاج روایتی اور قدیم ہے۔

مولانا نصیر الملت کا مرثیہ نسیم امروہوی نے لکھ کر شخصی مرثیہ میں تبدیلی پیدا

کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد نسیم امروہوی نے ہی آقائے محسن الحکیم کا مرثیہ لکھ کر اس کوشش کو اور آگے بڑھایا اور مرثیے کے چہرے میں علمائے اسلام کی تاریخ بیان کرکے اردو کے شعری سرمایہ میں ایک اضافہ کیا ہے۔ نسیم امروہوی کا علامہ رشید ترابی کے حال کا مرثیہ بھی اس سلسلہ کا ایک اہم نمونہ ہے۔ نسیم امروہوی نے جوش ملیح آبادی کی وفات پر بھی ایک شاندار مرثیہ کہا۔ لیکن ادھر گذشتہ چند سالوں میں جو شخصی مرثیے لکھے گئے ہیں ان میں اسلوب اور لہجے کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ہیئت کے اعتبار سے بھی نیا موڑ آیا ہے مثلاً جاں نثار اختر کے شخصی مرثیے۔ یا مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا آزاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ فخرالدین علی احمد کے انتقال پر نظموں کے نام سے جو مرثیے لکھے گئے ان میں سے بھی کچھ قابلِ توجہ ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ دنیا کی قدیم زبانوں مصری، عبرانی، یونانی سنسکرت اور قدیم چینی میں بھی مرثیے کے آثار ملتے ہیں۔ انگریزی میں جان لونگ نے بھی ایک مرثیہ کربلا کے موضوع پر لکھا ہے جس میں تقریباً چارسو اشعار ہیں چند اشعار کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے

"وہ حسینؑ دین دار، خدا پرست، فروتن، خلیق اور بے مثل بہادر تھا وہ سلطنت اور حکومت کے واسطے نہیں لڑا بلکہ خدا پرستی کے جوش میں یزید سے اس لیئے بے زار تھا کہ وہ اسلام اور دینِ محمدیؐ کے خلاف تھا۔"

انگریزی زبان ہی میں ہمارے ہندوستان کی بیسویں صدی کی مشہور سیاسی رہنما اور شاعرہ سروجنی نائیڈو نے بھی واقعات کربلا کے موضوع پر مرثیہ لکھا جو بہت مقبول ہوا اور اس کا منظوم ترجمہ بھی اردو کے کئی شاعروں نے کیا۔ عصر حاضر میں بھی آلِ محمد جیسے نوجوان انگریزی میں مرثیہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں بھاشا یا ہندی بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

جیسا ہم ہندی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ بہت سے مسلمان بھی ہندی کے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں۔ جس میں امیر خسرو، ملا داؤد، ملک محمد جائسی، رحیم، رس کھان، رس لین، مبارک، رحمت، رحمن، عالم شیخ، سکندر وغیرہ ہیں ان میں سے کچھ شعراء نے کربلا کے موضوع پر ہندی میں مرثیے لکھے ہیں۔

سکندر کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

بن کربل میں بانو دکھیا نینا نیر بہاوت ہے ۔۔۔ ابن علیؑ کی لودھ کے اوپر بے کل ہو ہو جاوت ہے

چھاتی پیٹت آنسو بہاوت رو رو بہو ستاوت ہے ۔۔۔ زہرا جی کی بہو پیاری بن ساتیں دکھ پاوت ہے

یا حیدر تم ساقیٔ کوثر جلو اپنا پیک پلاؤ

تس کے مارے ہو تمہاری ترسا ہی پیاسا بچاؤ

ہندی کے صرف قدیم شعراء نے ہی مرثیے نہیں لکھے بلکہ بیسویں صدی کے آغاز سے دور حاضر تک ہندی میں مرثیے لکھے گئے ہیں مثلاً آل احمد نعیم امروہوی کے ہندی مرثیے ۱۰ بند ملاحظہ ہو ۔

کربل دیس کے بانکے سپیا میں تہر بلہاری

ابن علیؑ کے پیارے بھیا میں تہر بلہاری

پیارے نبیؐ کے پیارے علیؑ کے پیارے بھیا ابن علی کے

سائیں گھر کے سیس نویا میں تہر بلہاری

خیبر کا در جس نے ڈھایو بیر علم میں دیو گرا دو

ان کے نام کے تم ہی رکھیا میں تہر بلہاری

نواب رضا علی خاں رضا والی رام پور نے بھی ہندی میں مرثیہ نگاری کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ۔

بالی سکینہ کہتی تھی بھیا کدھر گیو

بھیا کدھر گیو ہے بابا کدھر گیو

بچھان پہ کس کی سوؤں گی راتوں کو چھپ کے

اے نانا جان تمرا بھیا کدھر گیو

کانن لہو بھرا ہے کوئی دیکھتا نہیں

چپ چپ کا پیار ماتا کی ممتا کدھر گیو

ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بنگالی زبان کو بھی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور اب وہ پورے ایک ملک کی زبان ہے۔ بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر السلام نے بھی بنگالی میں کربلا پر ایک آزاد مرثیہ کہا ہے جس کا اردو میں ترجمہ نواب جعفر علی خاں اثر نے کیا ہے۔

ان زبانوں کے علاوہ ہمیں جن زبانوں میں کربلا کے موضوع پر مرثیے ملتے ہیں ان میں فرانسیسی زبان بھی ہے۔ فرانسیسی کا مشہور شاعر الیکزنیدر گنل جو فرانس کے چیدہ و مایہ ناز شعرا میں سے تھا اور جس کو فرنچ اکیڈمی سے شاعری کا سب سے اعلیٰ اعزاز بھی ملا تھا۔ اس نے تقریباً ڈھائی ہزار مصرعوں پر مشتمل ایک مرثیہ کہا ہے اس مرثیے کی خصوصیت ہے کہ یہ ایک معصوم بچے کی زبان سے حضرت علی اصغرؑ کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ سید مسرور حسین رضوی امروہوی نے کیا ہے۔ مرثیے کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں ؎

علی اصغر شیر خواروں کے درخشندہ ستارے

تیری چمک نورانیت بخشتی ہے ستاروں کو

جو جگمگاتے ہیں

آسمانی ستونوں کی بلندیوں پر

تیرے حسن کو حلقے میں لیتے ہے

اے ظلم وستم کے شکار

تیری بلند پایہ مادر شہر بانو جن کے جدِ تاریخ کے نامی خسرو نوشیرواں

دوسری طرف حسینؑ تیرے گرامی پدر

نواسے اور بے مثال یادگار. حضرت پیغمبر صلعم کی

جس کو خدائے پاک نے. جو سب سے برتر دانا اور حکیم ہے

الہام سے مشرف فرمایا

کس خون میں ہو سکتی ہے وہ نورانیت جو تیرے لہو میں تاباں ہے؟

تیرے زخم نے تجھ کو پہونچا دیا

تاریخ کی بلند ترین چوٹی پر

تیری فتح کا سورج افقِ آسمان پر

ناآشنا ہے

غروب سے۔"

بہر حال یہ مرثیہ کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر تھی اور مرثیہ کے ارتقا کا وہ سفر تھا جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر جدید مرثیہ کی منزل تک پہنچتا ہے ورنہ یہ موضوع تو ایک الگ ضخیم کتاب کی مناسبت رکھتا ہے۔

آخر میں برِ صغیر کے چند ممتاز جدید مرثیہ نگاروں کا جدید مرثیہ کے سلسلے میں نقطۂ نظر پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر وحید اختر کہتے ہیں کہ

"میں جدید مرثیے کو انیسؔ اور ان کی تقلید میں لکھے جانے والے تمام مراثی سے نقطۂ انحراف کی بنا پر الگ کرتا ہوں۔ انیسؔ و دبیرؔ کی عظمت مسلّم لیکن آج کا شعری محاورہ اور زبان دوسرے طرزِ اظہار کے متقاضی ہیں۔" (مرثیہ عظیم صفحہ ۱۵)

سید آلِ رضا رضاؔ سے جب لاہور کے ایک پروفیسر نے جدید مرثیے کے سلسلہ میں سوال

کیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل چار مصرعوں میں اس کا جواب دیا ہے

فکر انگیز ہوا کرتا ہے اکثر یہ خیال ۔ درس آموز ہے کتنی یہ عزائی تنظیم

مرثیہ کا یہ تقاضہ ہے کہ مجروح نہ ہو ۔ شعریت اور حقیقت کی رثائی تنظیم

بیسویں صدی کے شاعروں میں سب سے زیادہ تعداد میں مرثیہ لکھنے والے شاعر جناب نسیم امروہوی سے جب جدید مرثیے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ

"جدید مرثیہ وہ ہے جس میں شعوری طور پر اخلاق و ہمت کے مختلف پہلو اس انداز سے بیان کیئے جائیں جو سامع کے دل میں تاسی کا ولولہ پیدا کریں اس کے علاوہ فلسفہ اور سائنس نے ذہنوں میں تجسس، تحقیق اور منطقی فکر و نظر کی جو صلاحیت پیدا کی ہے اس کی تسکین کا موجب ہو اور لیجے سے یہ محسوس ہو کہ یہ مرثیہ ہے نظم نہیں۔" (جدید مرثیہ کے تین معمار صفحہ ۳۳)

اور یہی سوال جب ہلال نقوی نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی سے کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ

"جو مرثیہ تاسی حسینؑ پر ابھارے وہ جدید ہے اور وہ مرثیہ جو تاسی حسینؑ پر نہ ابھارے چاہے اس کو جدید عہد میں لکھا جائے لیکن وہ قدیم مرثیہ ہی کہلایا جائے گا۔" (جدید مرثیہ کے تین معمار صفحہ ۳۳)

آخر میں صرف یہی عرض کرنا ہے کہ قدیم مرثیہ کی اہمیت و عظمت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ لیکن مرثیہ کا جدید عہد کے قارئین و سامعین اور ناظرین سے جذباتی اور فکری ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور ابھی بھی مرثیہ کی افادیت پوشیدہ ہے آج کی بات کل نہیں کہی جاسکتی تھی۔ اس لیئے مان لینا چاہیئے کہ مرثیہ میں انیس و دبیر کے بعد بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور کل کی بات آج کہنا کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے اُگلے ہوئے نوالے کھانے یا لکیر کے فقیر ہونے کے مترادف ہے اس لیئے مرثیہ کے کینوس کو بڑھانا اور جدید مرثیہ کی ضرورت کا احساس کر لینا بھی ضروری ہے۔ انیس و دبیر کی شاعرانہ عظمت سے انکار تو ادب کے مسلک میں کفر ہے۔

دبستانِ امروہہ

امروہہ ہندوستان کے صوبہ اُتّر پردیش کی ایک قدیم ترین بستی ہے۔ مراد آباد سرکاری گزیٹیر کے مطابق امروہہ کی بنیاد چار سو چہتّر سال قبل مسیح یعنی ڈھائی ہزار سال پہلے پڑی تھی۔ مشہور مسلمان مورخ مسعودی ۹۱۵ء میں ہندوستان آیا۔ اسلامی عہد میں سپہ سالار مسعود غازی نے امروہہ اور سنبھل کے قلعے فتح کیے۔ جب سلطان التمش تخت نشین ہوا تو اس نے امروہہ اور بدایوں میں الگ الگ حاکم مقرر کیے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دور میں امروہہ پر دہلی کی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔

۱۳۴۰ء میں مشہور سیاح ابن بطوطہ امروہہ پہنچا جس کا ذکر اس نے اپنے سفرنامے میں ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"ثم وصلنا الی امروھا وھی بلدۃ صغیرۃ حسنۃ فخرج عمالہا اللقائی جاء قاضیہا الشریف امیر علی و شیخ زاویتہا و اضافا لی معا ضیافۃ حسنۃ"

(پھر ہم امروہہ پہنچے یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے اس کے اہل کار میری ملاقات کو آئے اور اس شہر کے قاضی شریف امیر علی اور شیخِ خانقاہ نے میری بہترین ضیافت کی)

(سفرنامہ ابنِ بطوطہ صفحہ ۲۲۹)

مندرجہ بالا تاریخی حقائق امروہہ کے قدیم اور تاریخی بستی ہونے کے سلسلے میں پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن کسی بھی بستی کا صرف قدیم ہونا ہی اس کی اہمیت کے لیئے کافی نہیں ہے جب تک وہاں پیدا ہونے والے اور رہنے والے کچھ تاریخی حیثیت اور کارناموں کے مالک نہ ہوں یا وہاں کی کوئی جغرافیائی حیثیت نہ ہو۔ امروہہ کی ایک مشہور تاریخ "تواریخ واسطیہ" مصنف سید رحیم بخش نے اس شہر کے بارے میں اس طرح لکھا ہے

"مقام امروہہ عرصۂ دراز سے آباد ہے کہ اس شہر کا شروع آبادی مفصلاً تحقیق نہیں ہوا۔ جملہ اقوام ہندو مسلمان اس شہر میں آباد تھے مگر دل پذیر بے نظیر رونق آمیز نہ تھا۔ جب کہ میران سید علی بزرگ مع اپنے فرزند ارجمند جناب مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت قدس سرہٗ العزیز با جماعت کثیر امروہہ میں تشریف فرما کر سکونت پذیر ہوتے اس روز سے یہ مقام مسکنِ سادات والا صفات مثل گلستانِ سرسبز و شاداب دم بدم رشک دہِ باغِ ارم اعقاب آنحضرت ممدوح سے ہوا جس میں محلات۔ چمن چمن۔ گلدستہ گلدستہ۔ روش بہ روش۔ کوچہ و بازار۔ باغ دبہار و چاہ و شیریں بے شمار و سرایات طرز بہ طرز آباد ہوتے اور اولاد امجاد آنحضرت نامی منزلت گرامی مقدرت ہوئی کہ ہر ایک شخص اعلے مراتب والا مناسب۔ با رفعت و اجلال۔ صاحبِ اقبال ہر طرح سے لائق و فائق و شہرہ آفاق۔ شکیل و جمیل۔ عقیل و جلیل۔ عالم و خاضل۔ عامل کامل۔ عابد و زاہد۔ سخی و جواد۔ حق بین و حق پرست۔ شجاع و دلیر یعنی ہمہ صفت موصوف ہوتے۔" (صفحہ ۶۔۷)

دورِ حاضر کی مشہور ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر نے اپنی کتاب "کارِ جہاں دراز ہے" میں امروہہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"سارا قصبہ امروہہ ایک وسیع جھیل پر منعکس ہے موسم بہار کی شفاف دھوپ میں قصبے کی قدیم مساجد و مقابر اور دو منزلہ مکانات کے گنبد۔ مینارے اور کنگورے نیل گوں

سطحِ آب پر مغل اسکول کے کسی خوش رنگ، رنگ لینڈ اسکیپ کے مانند جھلکتے ہیں۔ جاڑوں کے کہرے اور گرما کے گرد و غبار میں جھیل کے اس پار سے شہر کا یہی منظر وکٹورین انڈیا کا ایک مٹیالا لیتھوگراف معلوم ہوتا ہے۔ جو کسی شاندار سرکٹ ہاؤس کے برآمدے میں آویزاں ہو۔"

سرزمین امروہہ کو حقیقتاً کئی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر یہ ایک طرف بڑے بڑے اولیائے کرام کا مسکن ہے تو دوسری طرف اعلیٰ منصب داروں و اطبا کا معدن بھی ہے۔ اگر یہ ایک طرف حریت پسندوں اور جنگِ آزادی کے مجاہدوں کا وطن ہے تو دوسری طرف ساداتِ عظام کا گہوارہ بھی۔ اسی لئے مختصر ہونے کے باوجود امروہہ ہر دور میں باعظمت اور بارونق رہا ہے۔ افق کاظمی نے کہا ہے کہ؎

اگرچہ ایک شہر مختصر ہے شہرِ امروہہ
بہت آباد و خوش منظر مگر ہے شہرِ امروہہ
یہ معدن عالموں کا ہے یہ مخزن ہے حکیموں کا
مقامِ اولیائے نام ور ہے شہرِ امروہہ
لیے نامی گرامی خانداں سادات کے اتنے
بجا ہے گر کہوں سیّد نگر ہے شہرِ امروہہ
سعادت، مصحفی، عارف، عطاؔ، احسنؔ، صفی، ساکت
وہ شاعر ہیں کہ جن سے نام ور ہے شہرِ امروہہ

دراصل اس شہر کو سب سے بڑی اہمیت اس کی سادات کے سبب حاصل ہے۔ اس کی شہرت و عظمت کا باعث بھی امروہہ کی سادات ہی ہے۔ صاحب "تاریخ فرشتہ" نے ذکرِ علاالدین خلجی الملقب سکندر ثانی میں اس شہر کا نام "ولایتِ امروہہ" تحریر کیا ہے اس کا بھی اصل سبب یہی ہے کہ یہاں کی سادات کی اکثریت کے مورثِ اعلا

سید حسین شرف الدین شاہ ولایتؒ ہوتے ہیں جن کی درگاہ آج بھی درگاہِ شاہ ولایت کے نام سے مشہورِ خاص و عام ہے۔ جن سے ہر قوم و مذہب کے ماننے والے عقیدت رکھتے ہیں۔ شاہ ولایتؒ کا سلسلۂ نسب گیارہ پشتوں کے بعد امام علی نقیؑ سے ملتا ہے۔

سیادت کے اعتبار سے ہندوستان کی تمام سادات میں سادات امروہہ ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں "آئینۂ اکبری" میں بھی ذکر ہے کہ امروہہ کے سید ہندوستان کے مشہور خاندانوں میں سے ہیں۔ اکبر اعظم کے وقت میں امروہہ کے سید بارہہ کے سیدوں سے جو مظفر نگر میں ہیں درجہ دوم پر شمار کئے جاتے تھے۔ مگر حسب و نسب میں درجہ اول پر۔ یعنی صرف محاربات میں سادات بارہہ درجۂ اوّل پر تھے۔

ویسے تو امروہہ میں دیگر اقوام مسلم اور ہندو برادریوں کی بھی ہر ذات پائی جاتی ہے لیکن امروہہ کی نہ صرف علمی اور ادبی بلکہ ہر قسم کی تاریخ بغیر ذکرِ ساداتِ امروہہ نامکمل ہے۔ بلکہ اس میں بڑا حصہ بھی سادات ہی کا ہے۔ جب ہم مسلمان حکمرانوں کے دور کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس چھوٹی سی بستی میں عہدِ اکبری میں ۲۸۴ منصب دار ساداتِ امروہہ سے تھے۔ پھر سید محمد میر عدل اور ان کی اولاد تو بڑے اعلےٰ مناصب (چیف جسٹس اور گورنر وغیرہ) پر فائز رہی "اقبال نامہ جہانگیری" و نیز اکثر کتب تواریخِ شاہی میں سادات کی بہادری، دلاوری اور جان بازی کا ذکر ہے۔ ساداتِ امروہہ کی ہی وجہ سے یہ سرزمین علم و ادب اور شعر و سخن کا بھی مرکز رہی ہے۔ بقول حضرت رئیسؔ امروہوی "جہاں تک شعرائے امروہہ کا تعلق ہے تو بلا شبہ دو ہزار صفحے کی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی جا سکتی ہے۔" (مجلّہ شاہ ولایت ڈے ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۱ مطبوعہ پاکستان)

علامہ شبلیؔ "شعر العجم" میں قومی بے رحمی اور ملی تغافل کے دور کرنے کے اسباب میں فرماتے ہیں کہ "کسی قوم میں ترقی کی صحیح روح پھونکنا ہو تو اسلاف کے مہتم بالشان کارناموں کا تذکرہ اور ان کے موجودہ یاس انگیز طرزِ عمل کا اعادہ بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔

"تاریخِ فرشتہ" "تاریخ اصغری" "نخبتہ التواریخ" "تواریخ واسطیہ" "تاریخ سادات امروہہ" "تحقیق الانساب" "تذکرۃ الکرام" "شجراتِ سادات امروہہ" "آئینۂ عباسی" "انوار قمر" "تاریخ امروہہ" "تاریخ زیدیہ" "ذکر سادات امروہہ" "سادات امروہہ ایک تعارف" اردو شعرا کے مختلف تذکرے اور مختلف ادبی کتب و رسائل وغیرہ وغیرہ میں جگہ جگہ شعرائے امروہہ کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ فہرست تقریباً ایک ہزار شعرا سے بھی زیادہ کی ہے۔

ظاہر ہے کہ بہت سے شعرا تاریخ کے ذہن سے بھی فراموش ہو گئے ہوں گے۔ شعرا کی اس فہرست میں ۵۰ سے بھی زیادہ وہ شاعر ہیں جن کے لیے تاریخ مرثیہ نگار بھی لکھ رہی ہے۔ اسی طرح ان کے علاوہ کچھ مرثیہ نگار بھی ہوں گے جن کو تاریخ فراموش کر چکی ہو گی۔ کاش کہ ان شعرا کی تاریخ پوری توجہ سے صحیح وقت پر لکھی گئی ہوتی تو آج امروہہ یقیناً مرثیے کے ایک اسکول کی مسلّم حیثیت رکھتا۔ ان مرثیہ نگار شعرا میں تقریباً ۲۵ ایسے بھی ہیں جن کو تاریخ صاحبِ دیوان کہہ رہی ہے۔

دورِ حاضر میں بھی نسیم۔ رئیس۔ کلیم۔ رونق۔ صادقین۔ شہباز۔ اثر۔ قائم۔ قمر دلدار۔ ثاقب۔ تاباں۔ شاہد۔ قیصر۔ جمیل۔ جون۔ زبیر۔ رضا۔ سردار۔ ہلال۔ کوثر۔ جاوید۔ کفیل۔ نظر۔ فہمی۔ عنبر۔ نقوش۔ قسیم۔ خمار۔ جالب۔ سیفی۔ غمگین۔ شمیم۔ حفیظ۔ ندرت۔ ساجد علی۔ ناشر۔ افسر۔ ریحان۔ اسلم۔ یوسف۔ نوشہ۔ فہیم۔ ضیا۔ ندیم اور سراج جیسے شعرائے امروہہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ ادب سرحدوں میں تقسیم نہیں ہوتا ہے اس لیے خاکِ امروہہ سب پر فخر محسوس کرتی ہے۔

امروہہ کے قدیم شعرا سے متعلق مطاہر حسین مومن لکھتے ہیں کہ

"یوں تو امروہہ کی ادب نوازی اور علم پروری قدیم الایام سے شہرۂ آفاق رہی ہے لیکن بقول شخصے زبان اردو کی علمی اور ادبی خدمات کے لحاظ سے اب سے ۳۰۔۳۵ سال پیشتر کا زمانہ ایک عجیب و غریب زمانہ تھا۔ مرکز ادب امروہہ کی فلک آسا زمین پر بہتر سے بہتر

اساتذہ رونق افروز تھے۔ سخن گوئی و ادب نوازی کا بازار گرم تھا۔ عروسِ سخن کی شباب آگینی بزمِ شعر کو پُر رونق اور اپنا شیفتہ بنائے ہوئے تھی چنانچہ ناطق الملک سید الشعراء سید مومن حسین صفی مرحوم۔ عمدۃ الشعراء السید ابوالحسن فرقتی مغفور۔ مولوی ابوالحسن صاحب ساکت۔ نور اللہ مرقدہ انیس ثانی فرزدق ہند مولانا سید جواد حسین صاحب شمیم اعلی اللہ تعالے مقامہ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور ان اساتذہ کے فیضانِ صحبت و ادبی خدمات سے دہلی۔ لکھنؤ۔ بریلی۔ اجمیر۔ رامپور۔ مراد آباد وغیرہ اکثر مقاماتِ ہند بالمساوات مستفید ہورہے تھے" (حیات حاذق صفحہ ۵،۶ مطبوعہ ۱۳۵۲ھ)

مسیح اللہ خاں عطا دیوانِ شبیر حصہ دوم کا دیباچہ لکھتے وقت امروہہ کے ادبی ماحول کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ

"امروہہ کی مردُم خیز سرزمین نے جہاں اور متفرق کسب و ہنر میں کامل و اکمل ہستیاں پیدا کیں وہاں فنِ شاعری میں بھی سیکڑوں شاعر شیریں مقال و ناظم باکمال اور استادِ زماں انسان پیدا کیے" (صفحہ ۳)

آبِ حیات میں محمد حسین آزاد نے مصحفی امروہوی کے باب میں جب مصحفی کی زبان کا ذکر کیا ہے تو اس میں "امروہہ پن" بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد کا مصحفی کے لیے لفظ "امروہہ پن" کا استعمال ہی امروہہ کی انفرادیت کو تسلیم کرنے کا ثبوت ہے۔

دکن کے بعد اردو شاعری کے لیے دہلی اور لکھنؤ دونوں مقامات کی حیثیت اردو ادب میں اسکول کی رہی ہے۔ امروہہ ان دونوں مقامات کے درمیان واقع ہے بقول علامہ شفیق حسن ایلیا۔ دہلی و لکھنؤ کا اوسط ہے۔ معتدل ہے زبانِ امروہہ اردو شاعری کے ایک اسکول کی حیثیت سے تو امروہہ متعارف نہیں ہوا کیوں کہ امروہہ کے زیادہ تر شعرا نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ باہر گزارا لیکن امروہہ اسکول نہ ہونے کے باوجود دونوں اسکولوں کا سرچشمہ رہا ہے۔

خدائے سخن۔ بادشاہِ غزل۔ استاد الاساتذہ دہلی اسکول کے صفِ اول کے شاعر

میر تقی میر نے بھی سعادت امروہوی کے مشورے پر ریختہ کی جانب توجہ کی۔ میر نے اپنے تذکرہ میں بھی سعادت سے اپنے تعلق کا ذکر کیا ہے۔

دوسری طرف مصحفی امروہوی جیسا استاد بھی اسی سرزمین نے پیدا کیا۔ شاعری میں استادی کے اس درجے پر شاید ہی کوئی فائز ہوا ہو۔ لکھنؤ اسکول میں آتش اور دو اہم مرثیہ نگار ضمیر اور خلیق بھی مصحفی کے ہی شاگرد تھے۔ اس طرح امروہہ اسکول نہ ہونے کے باوجود دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں کا سرچشمہ ہے۔ محشر لکھنوی کے استاد اسی امروہہ کے مومن جبین صفی امروہوی تھے۔ نواب کلب علی خاں رامپور کے استاد سید احمد نذر احمد امروہوی تھے۔ نواب باقر علی خاں فہیم جانسٹھ کے استاد فرزدق ہند شمیم امروہوی تھے۔ نواب رضا علی خاں رضا رامپور کے استاد حافظ محمد اسرائیل طوبیٰ امروہوی تھے۔ ابوالحسن فرقتی امروہوی کے شاگرد سعید مرادآبادی اور زار بلند شہری ہوئے۔ دورِ حاضر پر بھی اگر نظر ڈالی جائے تو شاعرِ آلِ محمدؐ حضرت نسیم امروہوی کے فیضِ صحبت سے ہند و پاک میں سیکڑوں فنکار مستفید ہو رہے ہیں۔ آج پاکستان اور ہندوستان میں نسیم امروہوی سے زیادہ کسی کے شاگرد مرثیہ نگار نہیں ہیں یہ تو صرف چند شعرائے امروہہ کے ذریعے دیگر مقامات کے شعرا کا کسب علم و فن کا ذکر تھا۔ ورنہ سعادت و مصحفی سے نسیم تک اور بھی بہت سے ایسے فنکار اس سرزمین نے پیدا کئے جن سے اردو کے بے شمار شعرا نے فیض حاصل کیا۔

دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شعرائے امروہہ کو بادشاہوں۔ نوابوں اور راجاؤں کے دربار میں بھی بڑی عزت حاصل رہی ہے۔ اسمٰعیل امروہوی اورنگ زیب کے عہدِ سلطنت میں دامنِ شاہی سے وابستہ ہو کر دکن میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ نواب واجد علی شاہ کے دربار میں جو عزت و وقار حافظ سید محمد اسمٰعیل حافظ امروہوی کو حاصل تھا وہ بھی کچھ کم قابلِ فخر نہیں ہے نواب موصوف نے حافظ امروہوی کو سید الحفاظ کا خطاب دیا تھا۔ اسی طرح ریاست رامپور میں نوابِ حامد علی خاں کے دربار سے ہی حضرت

شمیم امروہوی کو فرزدق ہند کا خطاب ملا تھا اور نواب موصوف خود امروہہ سے شمیم امروہوی کو اپنے ساتھ رامپور لے گئے تھے اس کے ساتھ ہی بہت سے اساتذہ سے شعرائے امروہہ کی بڑی قربت رہی ہے۔ امیر اللہ صوفی امروہوی استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ عاقل امروہوی اور صادق امروہوی داغ دہلوی کے شاگرد ہوتے۔ میر انیس جیسے شاعر جن کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ اپنے قرابت داروں کے علاوہ کسی کو شاگرد بنانا کم پسند کرتے تھے۔ لیکن سراج الدین احمد سراج امروہوی کو میر انیس سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ملک الشعراء شیخ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی نے اپنا جانشین یعقوب علی معجز امروہوی کو بنایا تھا۔ اس کے علاوہ ذکی کے شاگردوں میں صفی امروہوی اور سرفراز امروہوی بھی ہوتے ہیں۔ امیر مینائی کے شاگرد سید احمد نذر احمد امروہوی تھے۔ نذر الحسن طپش امروہوی کو پہلے ناسخ اور پھر میر عشق کی شاگردی کا موقع ملا۔ حاتم علی مہر کے شاگرد مضطر امروہوی ہوتے۔ اور مولانا صفی لکھنوی کے مخصوص شاگرد طالب امروہوی تھے۔ مرزا دبیر کے شاگرد سید امجد علی اور میر سلیس کے شاگرد سید ماجد حسین تھے۔ میر نفیس کے شاگرد وحید امروہوی تھے۔

مندرجہ بالا حقائق اہلِ امروہہ کی اردو شاعری میں خدمات کے سلسلے میں یقیناً قابلِ غور ہیں۔ لیکن اس کے باوجود امروہہ کی اس حیثیت سے لوگوں کو واقفیت بہت کم رہی۔ آخر ایسا کیوں؟ پہلا سبب تو یہی ہے کہ امروہہ کی ادبی روایات اور شعری خدمات کی کوئی تاریخ مرتب ہو کر منظرِ عام پر نہیں آئی۔ قوموں۔ برادریوں۔ خاندانوں اور منصب داروں کی تاریخیں تو ضرور لکھی گئیں لیکن شعرا کی تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک چھوٹی بستی ہونے کے سبب امروہہ میں نشر و اشاعت اور طباعت کے وسائل بہت محدود تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ امروہہ کی شاعری میں ایک بڑا حصہ مذہبی شاعری کا رہا ہے۔ مثلاً حمد۔ نعت۔ منقبت۔ قصیدہ۔ مناقب۔ مناجات۔ سلام۔ مرثیہ۔ نوحہ۔ اور ماتم وغیرہ۔ اور وہ تمام قدیم شعرا یہ شاعری زیادہ تر حصولِ ثواب کے لیے کرتے تھے۔ نام و نمود اور شہرت

کی کبھی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے کلام کی تشہیر کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ اور یہ جذبہ یہاں تک تھا کہ اپنے کلام میں بہت سے شعرا تخلص کا بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ شہرت مدِنظر نہیں تھی ثواب پیشِ نظر تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ بہت سے شعرا کے مزاج کی اُنا بھی رہی جو زیادہ تر اسلاف کے خون سے ملی تھی۔

یہ امر یقیناً قابلِ غور ہے کہ ایک اتنی مختصر بستی نے اتنے شعرا پیدا کیے اور اس میں کافی تعداد میں مرثیہ نگار بھی ہوتے۔ مرثیہ نگار شعرا کا یہ تناسب اور تعداد ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم امروہہ کو اردو مرثیے کا ایک اسکول اور شمالی ہند میں لکھنؤ کے بعد دوسرا اسکول تسلیم کریں۔

راقم کو اس وقت ایک اہم واقعہ یاد آرہا ہے جو پروفیسر نانا مختار حسین نقوی مرحوم کی زبانی سنا تھا۔

مرزا اوج لکھنوی کی مرثیہ نگاری کے شباب کا زمانہ تھا وہ ہر سال پابندی سے امروہہ مرثیہ پڑھنے آتے تھے۔ امام باڑہ اکبر علی خاں محلہ دانشمندان میں وہ مرثیہ پڑھتے تھے اور امام باڑہ نور الحسن میں فرزدقِ ہند شمیم امروہوی یا برجیس حسن برجیس امروہوی مرثیہ پڑھتے تھے۔ اور ایک قسم کی ادبی معرکہ آرائی رہتی تھی۔ اہلِ امروہہ مرزا اوج کی مجلس میں بھی زیادہ سے تعداد میں شرکت کر کے اپنی وسیع النظری اور علم دوستی کا ثبوت دیتے تھے مرزا اوج کے ساتھ بھی ان کی مجالس سننے کی غرض سے لکھنؤ سے ان کے بہت سے حاشیہ نشین بھی آتے تھے ایک سال مرزا اوج نے ایک قطعہ پڑھا جس کا ایک مصرع تھا ؎

لکھنؤ کچھ اور ہے واں کی زباں کچھ اور ہے

حالاں کہ یہ بات کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں تھی لیکن چونکہ اس میں ایک طنز کا پہلو چھپا ہوا تھا اس پر اہلِ امروہہ نے احتجاج کیا اور جواب بالجواب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عرصے بعد محشر لکھنوی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے سالانہ اجلاسِ منعقدہ امروہہ میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے (یہ اجلاس نجم الملت مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مرحوم کی تحریک

پر منعقد ہوا تھا) تو اس میں ایک نظم پڑھی جس میں امروہہ کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا جس کا مندرجہ ذیل شعر بہت مقبول ہوا ۔

امروہہ درحقیقت ایوانِ شاعری ہے
مولد ہے مصحفی کا محشر ذرا سنبھل کے

محشر لکھنوی کی اس نظم کے بعد وہ غبار جس نے ماحول مکدر کر دیا تھا ختم ہوا اور اس طرح ادبی معرکہ آرائی کا بھی اختتام ہوا

بہرحال اس وقت شعرائے امروہہ کی مرثیہ نگاری موضوعِ بیان ہے۔ ادبی تخلیقات کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات ادبی ماحول کا قائم ہونا ہے۔ اور یہ ماحول مرثیہ نگار شاعر کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ بغیر ماحول کے مذہبی شاعری ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ جب ہم اس حیثیت سے امروہہ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً اردو کے بہت سے نامور شعرا کی امروہہ میں آمد۔ مجالس۔ محافل۔ ادبی نشستیں اور مختلف جلسوں کا انعقاد وغیرہ۔ اردو کے قدیم شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں دہلی سے امروہہ تشریف لائے۔ اور سید اسد اللہ صاحب عرف میر کلو کے مدرسے میں قیام فرمایا۔ (تذکرۃ الکرام صفحہ ۱۶۴)

صاحبِ "تواریخ واسطیہ" نے امروہہ میں انیسویں صدی کے آخر کی مجالس و مرثیہ خوانی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ "ہر طرح کے ذی کمال ذاکر اہل لکھنؤ مثل میر انیس صاحب اور بیٹے پوتے اور بھتیجے ہر سال عشرۂ اربعین میں تشریف لاکر (امروہہ میں) ذاکری کرتے ہیں سوائے مدارات و خاطر داری کے صدہا روپیہ بھی ان کو نذر کیا جاتا ہے۔ تشریف آوری میر انیس صاحب کی اور مجالس اس وقت کی لائق یادگار و قابلِ تعریف ہیں" (تواریخ واسطیہ صفحہ ۲۳۸)

"مرزا مقبل مرثیہ گو ممبر خوان و نیز دیگر صاحبان ساکنانِ لکھنؤ ہر سال مجالس اربعین یہاں آکر ذاکری کرتے ہیں"۔ (تواریخ واسطیہ صفحہ ۲۵۷)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے "دبستانِ دبیر" میں ممتاز مرثیہ نگار طالب (۱۸۶۸ء تا ۱۹۴۴ء)

کے مرثیہ پڑھنے کے سلسلے میں امروہہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

"طالب نے اپنی ذہانت۔ خوش گوئی اور محنت کے سہارے جلد ہی ترقی کر لی اور ممتاز مرثیہ گویوں میں شمار کیے جانے لگے حیدرآباد۔ مرشدآباد۔ امروہہ۔ پٹنہ۔ ہنگلی اور مظفرپور وغیرہ میں انہوں نے مجلسیں پڑھیں۔" (دبستان دبیر صفحہ ۶۷۹)

سید صغیر حسن نے میر انیس اور میر وحید کا ذکر اس طرح کیا ہے

"ذی کمال ذاکرین مثل سید جواد حسین شمیم دانشمند سید برجیس حسن برجیس دانشمند نیز حضرات لکھنؤ سے میر انیس میر وحید اور ان کے بیٹے پوتے زیب ممبر ہوتے تھے" (انوار قم صفحہ ۱)

اس کے علاوہ بہت سے مرثیہ نگار شعرا مختلف ادوار میں امروہہ آتے رہے ہیں مثلاً نواب باقر علی خاں فہیم جانسٹھ۔ راجہ محمد علی خاں محب محمود آباد۔ نواب سرفراز علی خاں سرفراز جانسٹھ۔ علامہ نجم آفندی۔ مہاراج کمار امیر احمد خاں حب محمود آباد۔ حضرت مہذب لکھنوی۔ راجہ قاسم علی خاں شمیم پنڈراول۔ ڈاکٹر پیام اعظمی۔ مہدی نظمی۔ قاشبیر۔ ڈاکٹر وحید اختر۔ خمر فیض آبادی اور معجز سنبھلی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بہت سے مشہور مرثیہ خوان اور نثار لکھنؤ و دیگر مقامات سے مختلف ادوار میں امروہہ آتے رہے ہیں مثلاً میر فدا علی لکھنوی وغیرہ اور یہی امروہہ کا وہ ماحول اور مرثیے کے لیے ساز گار فضا تھی جو شعرائے امروہہ کو مرثیے کی جانب نہ صرف متوجہ کر رہی تھی بلکہ مرثیہ کے لیے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جتنے بھی مرثیہ نگار شعرا پیدا ہوتے تو تعجب نہ ہوتا۔ اسی ماحول کا سبب تھا کہ یہاں کے سامعین کا بھی شعری ذوق اور ادبی مذاق بہت بلند تھا۔ بہت سی ایسی شخصیتیں بھی گزری ہیں جن کی مجالس میں شرکت شعرا کے لیے بھی باعث فخر تھی۔ اس بات کا اظہار بیرون امروہہ کے شعرا نے بھی کیا ہے مہدی حسن احسن لکھنوی نے "واقعات انیس" اور نواب امداد امام اثر نے "کاشف الحقائق" میں بیرسٹر حامد علی خاں امروہوی کی سخن شناسی کے سلسلے میں کافی لکھا ہے اور میر نفیس کا قول بھی نقل کیا ہے

ڈسٹرکٹ بورڈ حامد علی خاں امروہوی کا تشریف رکھنا دادِ کلام کے لیے دو ہزار آدمیوں کے برابر ہے۔"

اردو کے ممتاز مرثیہ نگار ہی صرف امروہہ نہیں آتے رہے بلکہ امروہہ کے مرثیہ نگار شعرا بھی ملک کے مختلف حصوں میں مرثیے پڑھنے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً حیدر آباد۔ کلکتہ۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ اجمیر۔ آگرہ۔ بریلی۔ رامپور۔ دھول پور۔ [illegible] پور۔ بھوپال۔ جے پور۔ مظفر نگر۔ میرٹھ۔ سرسی۔ ساداتِ بارہہ اور سنبھل وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ تین صدیوں میں اس سرزمین پر اردو مرثیے کی جو تعمیر و ترقی ہوئی ہے وہ مرثیے کی تاریخ میں نہایت اہم ہے لیکن یہ اردو مرثیہ کا المیہ ہے کہ اہلِ امروہہ کی مرثیہ نگاری اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی تھی۔

جہاں تک ہندی ادب میں امروہہ کے حصے کا سوال ہے یہ موضوع ایک الگ کتاب کا تقاضہ رکھتا ہے۔ اور یقیناً ان ہندی شعرا میں سے کچھ شعرا کا مرثیے سے بھی تعلق رہا ہوگا۔ کیوں کہ یہاں جناب سید قیصر مبین و جناب زیدی جعفر رضا پروفیسر مسلم یونیورسٹی کی تحقیق کے مطابق سید غلام محمد رسکھان (اولادِ شاہ ولایتؒ محلہ چاہ غوری امروہہ) جیسے ہندی کے شاعر پیدا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

"رسکھان کا نام سید غلام محمد تھا۔ یہ سید دیارِ حسینی کے بیٹے تھے۔ ان کا جنم مراد آباد جن پد کے استھت امروہے نگر کے ایک پرتشٹھت سید پریوار میں ۱۶۳۶ (۱۰۹۹ھ) کے لگ بھگ ہوا تھا۔ ان کی پرارمبھک سکشا امروہہ میں ہوئی۔" (ہندی کے کیتے مسلمان کوی صفحہ ۱۲۹)

امروہہ میں بزرگوں سے سینہ بسینہ بھی یہی روایت جاری ہے کہ سید غلام محمد امروہوی ہندی کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔

میر سیّد اسمٰعیل

شمالی ہند میں جب ہم اردو شاعری کی ابتدا اور آغاز کی جستجو میں نکلتے ہیں اور وقت کی گرد ہٹا کر تاریخ کے صفحات کی چھان بین کرتے ہیں تو اس ورق گردانی میں میر اسمٰعیل کا سراغ ملتا ہے۔ میر اسمٰعیل کا جس دور سے تعلق ہے اس دور میں اردو شعرا کے تذکرے نہیں لکھے گئے۔ اسی وجہ سے جب ہم اردو شعرا کے تذکروں میں میر اسمٰعیل کو تلاش کرتے ہیں تو وہ نہیں ملتے۔ البتہ شیخ چاند نے مرزا محمد رفیع سودا سے متعلق جو مقالہ لکھا ہے اس میں میر اسمٰعیل کا ذکر ملتا ہے لیکن اس مقالے سے ایک طویل مدت کے بعد یعنی جب بیسویں صدی کا نصف گزر جاتا ہے تب کہیں اسمٰعیل کا کچھ کلام سامنے آتا ہے اور بقول سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء انجمن ترقیِ اردو پاکستان کہ

"شمالی ہند میں اس وقت تک جو پرانی اردو کتابیں دستیاب ہوئیں ان میں سب سے پرانی کتاب جو مجھے ملی ہے وہ وفات نامہ بی بی فاطمہؓ ہے اس کے مصنف کوئی اسمٰعیل ہیں جو امروہہ کے رہنے والے ہیں۔"

بقول نائب حسین نقوی کہ "اردو ادب کی جتنی تاریخیں مرتب ہوں گی ان میں اسمٰعیل کی

شخصیت کا شمول ناگزیر ہے۔" (اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحہ ۹۳)

درحقیقت اسمٰعیلؔ کا تعلق جس دور سے ہے اس دور کا جو کچھ ادبی سرمایہ ہے اس پر ہی تاریخِ ادب اردو کی تعمیر ہوئی ہے اور اس کی بنیادی حیثیت ہے اب یہ ہماری اردو شاعری کا المیہ ہے کہ اس دور کا سارا سرمایہ تاریخِ ادب کے سینے میں محفوظ نہ رہ سکا اور جب کلام ہی ضائع ہوگیا تو پھر شعرا کے تفصیلی حالات ملنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہمیں تاریخ سے یہی شکایت ہے کہ شہنشاہوں، حکمرانوں، جاگیرداروں اور منصب داروں کو تو تاریخ نے محفوظ رکھا لیکن فن کاروں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا بلکہ فراموش کر دیا۔ آج اسی وجہ سے اس شاعر کے حالاتِ زندگی نہیں ملتے جس نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی تخم ریزی کی۔

جب ہم میر اسمٰعیل کے اسلاف واخلاف کی تحقیق کرتے ہیں تو چند تواریخ مثلاً تواریخ واسطیہ۔ تاریخِ اصغری۔ تحفۃ التواریخ۔ طبقاتِ اکبری اور سیر المتاخرین سے کچھ مختصر معلومات ہوتی ہے میر اسمٰعیل کے مورثِ اعلیٰ مشہور صوفی بزرگ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت تھے۔ امروہہ ساداتِ کی ایک بڑی اکثریت ان ہی بزرگ کی اولاد میں ہے۔ یہ بڑے صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ سید حسینؒ کے فرزند میر علی بزرگ ہوئے جو فیروز شاہ خلجی کے عہد میں اقضی القضاۃ مملکت ہند ہوئے۔ ابنِ بطوطہ مشہور سیاح جب امروہہ آیا تو وہ آپ ہی کا مہمان رہا۔ اس بات کا ذکر اس نے اپنے سفر نامے میں بھی کیا ہے۔ میر علی بزرگ کے بھائی سید عبدالعزیز ہوتے ان سے فیروز شاہ خلجی کی دختر منسوب تھیں۔ عبدالعزیز کی اولاد میں سید محمد میر عدل ہوئے جو عہدِ اکبری میں میر عدل کے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے اس کے بعد صوبہ سندھ بھکر کی گورنری پر مامور ہوتے۔ ان کی وفات کی تاریخ "سید فاضل" ہے۔ آپ کے تلامذہ میں ملّا عبدالقادر بدایونی مصنف "منتخب التواریخ" بہت مشہور ہوتے۔ سید محمد میر عدل کے فرزند سید ابوالفضل ہوئے جو شہنشاہ اکبر۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ہی قلعہ بکی فتح کیا۔ سید ابوالفضل کے فرزند سید ابراہیم ہوتے یہ بھی اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور

عہدِ شاہ جہانی کی جنگ میں کام آئے اور سید ابراہیم کے ہی فرزند میر اسمٰعیل۔۔۔
کے ننہیال کا سوال ہے وہاں کے بزرگ بھی صاحبِ علم و شجاعت ہوتے۔

میر اسمٰعیل کے اخلاف میں سید غلام علی حقیقی بھتیجے عہدِ شاہ جہانی میں اعلٰے منصب پر فائز تھے جن کے نام سے امروہہ کا محلہ کٹرہ غلام علی ہے جو آپ نے آباد کیا۔ میر اسمٰعیل کے ایک پوتے سید علی اکبر دیوانہ اپنے عہد میں دہلی کے مشاہیر شعرا میں تھے۔ سید غلام علی ثانی حسینی (نبیرہ میر اسمٰعیل) اپنے دور کے نامور استاد شاعر تھے۔ شاہی منصب داروں کی فہرست میں اسمٰعیل کے اسلاف و اخلاف میں ۱۲۸۶ افراد کے نام شامل ہیں۔

میر اسمٰعیل کی اولاد آج بھی امروہہ میں آباد ہے لیکن ان لوگوں کو بھی اسمٰعیل کے حالات کا باقی علم نہیں۔ نائب حسین نقوی (مرحوم) نے بہت کوشش اور محنت کے بعد کچھ تحقیق کی ہے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ "میر اسمٰعیل کی ولادت نشو و نما اور تعلیم وطن میں ہوئی ـــــ سید اسمٰعیل نے متصل باغ بدلی کے ایک اسمٰعیل سرائے اپنی سکونت وغیرہ کے لیے آباد کی تھی عرصہ دراز ہوا کہ وہ انقلابِ زمانہ سے ویران ہو گئی اب اس مقام پر زراعت ہوتی ہے۔ سابق میں اولادِ میر اسمٰعیل موصوف اس سرائے میں آباد تھی ـــــ میر اسمٰعیل کا وجود ۱۰۵۷ھ سے ۱۱۲۳ھ تک مسلم ہے ـــــ وطنی روایت کے مطابق اسمٰعیل عالمگیر کے عہد میں دامنِ شاہی سے وابستہ ہو کر دکن چلے گئے اور کم از کم عالمگیر کے جلوس میں ۱۱۰۷ھ میں ضرور کسی شاہی منصب پر وطن سے دور تھے جس کا ثبوت موصوف کے شراکت نامے سے ملتا ہے۔" (اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحہ ۵۲۔ ۵۹۔ ۱۸)

صاحب تاریخ اصغری اور تواریخ واسطیہ نے بھی اس کے علاوہ میر اسمٰعیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

میر اسمٰعیل کے ہم عصر شعرا میں حاجی محمد نوشہ، مولانا عبدی اور افضل پانی پتی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے بعد کے شعرا میں فاخر دہلوی، جعفر زٹلی اور ولی ہوئے۔ ان میں فاخر

جب دیوان شاعر ہیں۔ فائز سے اسمٰعیل کے عہد کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دیوان فائز میں مسعود حسن رضوی ادیب نے فائز کے دادا ابراہیم خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ عالم گیر اورنگ زیب نے تخت پر بیٹھ کر ان کو ملازمت کا شرف بخشا۔ جب کہ میر اسمٰعیل، جہاں گیر، شاہ جہاں اور عالم گیر اورنگ زیب کے ادوار میں مختلف مناصب پر فائز رہے۔ اس طرح میر اسمٰعیل شمالی ہند کے تمام اولین شعرا کے باہمی اہم رشتوں اور کڑیوں کو ملانے والے شاعر ہیں۔

میر اسمٰعیل کے کلام کے بارے میں محققین اب تک جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ اس طرح ہے کہ اسمٰعیل کی ایک مثنوی جو وفات نامہ بی بی فاطمہؑ کے عنوان سے ہے وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے سہ ماہی اردو "کراچی جولائی ۱۹۵۱ء میں "شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی" کے عنوان سے شائع کی ہے جس میں ۳۱۷ اشعار ہیں۔ اسی مثنوی کے سلسلے میں نائب حسین نقوی کا بیان ہے کہ "وفات نامہ بی بی فاطمہؑ" حاجی مرتضےٰ حسین مرحوم کے کتب خانے امروہہ سے نسیم امروہوی اپنے دادا شمیم صاحب مرحوم کے مراثی اپنے ساتھ لے گئے تھے اسی میں یہ مخطوط شامل تھا جس کی نقل ترقی اردو بورڈ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ حیدر حسین یکتا (شمیم امروہوی کے والد) نے مثنوی کے عنوان میں علاوہ اسمٰعیل کے شجرہ نسب کے مصنف کا سالِ وفات سن تصنیف اور سن نقل بھی لکھا ہے"۔ (اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحہ ۲۷) اس نسخہ امروہہ میں ۳۱۹ اشعار ہیں اور دونوں نسخوں کے کل اشعار ۳۳۰ ہیں۔ اس مثنوی میں پہلے حمد پھر نعت پھر بی بی فاطمہؑ کے تفصیلی حالات اس کے بعد وفات اور بین وغیرہ ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشعار جو مثنوی کی ہیئت میں ہیں یہ مرثیہ بھی ہیں یا نہیں؟ اس بات کے فیصلے سے پہلے ہمیں مرثیے کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جب ہم مرثیے کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور سے سودا اور میر کے دور تک مرثیہ ہر ہیئت میں کہا جاتا رہا ہے اور مثنوی کی ہیئت کے بھی کافی نمونے قدیم مراثی میں ملتے ہیں۔ مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت جب سے ایجاد ہوئی اور مخصوص ہوئی اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اسمٰعیل کا دور تھا۔

لہٰذا اسمٰعیل سے مسدس کی ہیئت میں مرثیے کا تقاضہ ہی غیر اصولی بات ہے۔ شبلی اور حالی سے لے کر عصر حاضر کے محققین تک مثنوی کی ہیئت میں مراثی پر متفق ہیں۔

"_____ اردو میں یہ لکھا تو گیا ہے نظم کی ہر شکل میں مگر آخر میں ٹھہراؤ نظم کی چھ مصرعوں والی شکل پر ہوا جسے مسدس کہتے ہیں۔ مسدس مرثیہ ضمیر کے ہاتھوں میں پہنچ کر اردو کی سب سے زیادہ اونچی اور نا تقلید کی صنفِ سخن بن گیا۔" (سفارش حسین رضوی۔ اردو مرثیہ صفحہ ۱۰)

"مرثیے کی صنفی شناخت خالص طور پر موضوع پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ انیس و دبیر کے مراثی کی وجہ سے مسدس کی ہیئت اس کی پہچان میں داخل ہو گئی لیکن شروع میں اس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں تھی اور یہ صنف ہیئت کے بجائے موضوع ہی پر اپنی شناخت کی اساس رکھتی تھی۔" (شمیم احمد درسِ بلاغت صفحہ ۱۴۰)

"ابتدائی زمانے کے مرثیے غزل، مثنوی اور ترکیب بند وغیرہ کی ہیئتوں میں بھی موجود ہیں۔" (درسِ بلاغت صفحہ ۱۴۱)

"ابتدا میں اردو مرثیے کی کوئی ہیئت مقرر نہیں تھی _____ اس اعتبار سے اشرف کی مثنوی نوسر ہار جس کا سن تصنیف ۹۰۹ھ ہے اردو کا پہلا مرثیہ قرار پائے گی۔" (شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی از ڈاکٹر فضل امام صفحہ ۱۱۹)

بیسویں صدی کے شعرا میں بھی اقبال نے اپنی والدہ کا مرثیہ مثنوی کی ہیئت میں لکھا ہے۔ محمد علی جوہر۔ سیماب اکبر آبادی اور حفیظ جالندھری نے بھی شخصی مرثیوں کے لیے غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ اور مخمس کی ہیئتیں اختیار کی ہیں۔ غرض کہ میر اسمٰعیل کی یہ مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہؑ ہر طرح مرثیہ کے ذیل میں آتی ہے۔ اس کا آغاز اسمٰعیل اس طرح کرتے ہیں کہ

الٰہی توں صاحب ہے سنسار کا ۔۔۔ ہمن کوں ہے امید دیدار کا
ترے حکم پر سارے ہیں گے فدا ۔۔۔ جو کچھ تیں کہا مانیا سب سدا

ہمن عاجزن کا توہیں دست گیر
ترے در اوپر شاہ ہیں گے فقیر

حمد کے بعد اسمٰعیل نعت کے بھی کچھ اشعار کہتے ہیں ؎

کہوں نعت اب میں محمد رسول — دو عالم صدقِ دل سیں کیجو قبول
محمد نبی ہیں گے دُرِ یتیم — ازل سے ابد تک ہوئے مستقیم
پڑھیا نعت جو میں کہا دل کر زود — نبی آل اوپر پاک بولوں درود

حمد اور نعت کے تقریباً بیس اشعار ہیں اس کے بعد اسمٰعیل اس طرح اپنے اصل مقصد کی جانب گریز کرتے ہیں ؎

علی کی کفو ہیں بی بی فاطمہؓ
اونوں سے بجھیا نار جو حاطمہ

اس کے بعد اسمٰعیل بی بی فاطمہؓ کی ولادت کے حالات بیان کرتے ہیں ؎

حمل سیں خدیجہ جو ہیں گی مگر — ہوئی پیدا دختر بہت خوب تر
دھرا نام اون کا بی بی فاطمہؓ — طفیلی انہوں کے ہمہ اور شما
اتھے بست تاریخ آخر جماد — تولد دو شنبہ کی شب راکھیا یاد

ولادت کے بعد بی بی فاطمہؓ کی شادی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

اے دل اب دکھاوں بی بی کی برات — فضل اون کے سیں ہو مومن کی نجات
دیج اب بی بی جو دیکھو توں تمام — جو کچھ دیا اونوں کو رسولِ انام
روپیہ صد و بست ہفت حق کی نبی — مہر بی بی باندھا علیؓ سیں تبھی

شادی کے بعد ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ رسولِ مقبول رحلت فرماتے ہیں

نبی موت جو آئے کر ہو نچپا — بی بی فاطمہؓ غم بہت کھائیا
بی بی روئے بولی جو بابا حضور — جدا ہو تمن سیں پڑی مے جو دور

مجے چھوڑ تم کیوں چلے اے پدر　　رہوں کیوں جدا ہوتے اس جا تجہ

نبی حسن جو بولیا اے فرزند سن　　سبھوں پہلے مجھ پاس پہونچو تمن

وفات رسولؐ کے بعد بی بی فاطمہؓ کی کیا حالت ہوئی؟

شب و روز بی بی کو جال گیا　　پدر کی جدائی منیں رو گیا

ایک وقت وہ بھی آیا کہ بی بی فاطمہؓ کی وفات قریب آگئی اس موقع پر وہ حضرت علیؓ سے مخاطب ہوئیں اور وصیتیں کیں۔

بولی روئے کر اے علیؓ الوداع　　دنی چھوڑ تم سات ہوتے وداع

دو نو بیٹوں سے بیٹیوں سے وداع　　ساری سکھیاں ساتھ ہوتے وداع

ایتا کہہ بولی بی بی آہ مار کر　　سنو یا علیؓ میں کہوں کان دھر

مرے بیٹوں کو خبر تم نا کرو　　دیکھے سات ان کے جو ظاہر کرو

دامن مرا لے کے جو سر کے اوپر　　انوں کے تمن ڈالیو رو رو کر

قبر بیچ تنہا لے کر تم مجھے　　دفن کریو حق بھی اجر دے تجھے

حضرت علیؓ پر یہ سن کر کیا گزری اور دونوں بچوں یعنی حسنینؓ کی کیا کیفیت ہوئی؟

علیؓ او نصیحت سُنی کان سیں　　روتے ہوت بے ہوش ہو جان سے

یہی بات سن ماں سوں دونوں امام　　اپس ڈھانپ کر منہ رو گیا تمام

اس کے بعد ملک الموت کے آنے اور روح مقدس کے پرواز کرنے کا ذکر کیا ہے۔

علیؓ فاطمہؓ کوں جو دیکھا ہے　　مردہ ہوتے لیٹی ہیں اس جائے پے

بولے روئے کر فاطمہؓ نیک بخت　　ہمن کو دیا دکھ موں سخت

وفات کے بعد غسل و کفن۔ جنازے کا جانا اور دفن کا ذکر کیا ہے اس کے بعد حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و امام حسینؓ کے بین اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جدا ہو ہمن سیں چلی تم ایتا ل　　ہمارا دنی بیچ کیا ہوئے حال

وداع ہو قبر سیں علیؑ پھر چلے — لئے گھر موں بیٹوں سیں آ کر ملے

بولے دونوں بھائی اے بابا کہاں — ہماری نہ ماں ہے گی گھر کے مہاں

رو کر بولے اے ماں گئی چھوڑ کر — تنہا کیوں کے رہوے گی اوس جاگے پر

علیؑ روئے کر کہیا فرزند حسن — نہ رہ [illegible] کر دنی بیچ بھی ہم تمن

اس کے بعد حضرت علیؑ کی زبانی دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں ؎

دنی پانچ دن کا ہے سنیا س جان

نہ رہ توں جو غافل یو دل میں پچھان

اس کے بعد اسمٰعیل اپنا اور اپنے وطن کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

نبی پیروی بیچ رہ اسمٰعیل — قیامت کوں بخشے گا ربِّ جلیل

وطن امروہا میرا ہے شہر نام — اسی جائے پر میرا ہے گا قیام

دلی کے گرد بیچ وہ شہر ہے — ندی سوت کی بھی وہاں لہر ہے

آخر میں مرثیے کی تاریخ بیان کرکے مرثیے کا اختتام کرتے ہیں ؎

مہینہ جو رجب مرجب اتھا — یہ تاریخ پچیسویں ماہ تھا

اتھے سالِ ہجری نبی کے علیا — گیارہ سو اور پانچ تھے بوجھ جیا

جو دن چہار شنبہ بوقت ظہر — قصہ پورا کیتا بہوت فکر کر

قصہ پورا کیتا جو سن کان دھر

پڑھو کلمہ خوش ہوئے ہر وقت پر

میر اسمٰعیل کے اس مرثیے کے علاوہ اور کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔ البتہ ایک مثنوی بعنوان "معجزۂ انار" (بادشاہ خیبر بلقیس) تصنیف ۱۱۲۰ھ نائب حسین نقوی (مرحوم) نے وفات نامہ بی بی فاطمہؑ کے ساتھ شائع کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الٰہی تو دانا ہے ہر کاج کا — سر انجام دیتا ہے محتاج کا

ملک ملک کے شاہ اور خاص عام　　　حکم مان کر آئے کرتے سلام

بڑا پہلوان تھا وہ بلقیس شاہ　　　تکبر غرہ وری دھرے سال ماہ

اس کے علاوہ اسمٰعیل کی ایک مثنوی "سوت ندی" کے نام سے بھی بتائی جاتی ہے لیکن وہ نایاب ہے۔ حیدر حسین یکتا نے "یکے از تصنیفات" استعمال کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسمٰعیل نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جو وقت کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔

حیدر حسین یکتا نے اسمٰعیل کے لیے جو القاب و آداب لکھے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسمٰعیل کا شمار امروہہ کے علما اور فضلا میں ہوتا تھا۔

وفات نامہ بی بی فاطمہ جو مذہبی عقائد پر مبنی ہے ان کے عقائد کی پختگی۔ ایمان بالغیب۔ حمد خدائے تعالٰی۔ شفاعت رسولؐ مقبول۔ اصحاب سے خلوص اور ائمہ سے محبت و مودت کا ثبوت ہے۔

یہ مرثیہ شمالی ہند کی ابتدائی زبان کی نمائندگی کرتا ہے اور اس دور کو دیکھتے ہوئے فارسی و عربی کا استعمال۔ الفاظ کے مرکبات اور تراکیب کے استعمال سے اسمٰعیل کی زبان پر دست رس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً وعظ و نصیحت۔ خوب تر۔ مخلوق۔ خاص و عام وغیرہ۔

مرثیے کے محققین نے شمالی ہند کی مرثیہ نگاری کے سلسلے میں جن شعرا اور جن مراثی کا ذکر کیا ہے وہ سب اسمٰعیل کے مرثیے وفات نامہ بی بی فاطمہؑ کے بعد کے ہیں اس لیے یہ مرثیہ شمالی ہند کا پہلا مرثیہ اور میر اسمٰعیل شمالی ہند کے پہلے مرثیہ نگار کی حیثیت سے مرثیہ کی تاریخ میں آئندہ تحقیق تک نمایاں رہیں گے۔

سیّد سعادت علی سعادتؔ

نسلِ شرف الدین شاہ ولایت میں دیوان سید خضر بڑے نام ور گزرے ہیں۔ جو سعادتؔ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ ان کی بھی تمام اولاد شاہی منصب دار تھی۔ صاحبِ "تاریخ اصغری" لکھتے ہیں کہ

"دوسرے بیٹے دیوان سید خضر کے سید غلام علی ہوئے جن کے بیٹے سید میر علی اور پوتے سید سعادت علی ولد سید میر علی مذکور منصب دارانِ شاہی تھے۔" (صفحہ ۹۲)

سرکاری گزیٹیر مراد آباد سعادتؔ کے بارے میں لکھتا ہے کہ

"مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں امروہہ میں بہت مصنّف اور شاعر پیدا ہوتے لیکن قابلِ تحریر شخصیت میر سعادت علی کی تھی جو اٹھارویں صدی میں کمال کو پہنچے"۔ سعادتؔ کی ولادت و عمر سے متعلق قدیم مورخین خاموش نظر آتے ہیں۔ البتہ نسیم امروہوی نے اس سلسلے میں تحقیق اور قیاس سے مدد لی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"میر سعادتؔ سرزمینِ امروہہ پر تقریباً ۱۶۹۸ء میں متولد ہوئے۔ وہ امروہہ جو قدیم الایام سے علما و فضلا اور شعرا کا گہوارہ رہا ہے اور جسے مغربِ اقصےٰ کے مشہور سیاح

ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں دو مقام پر بہ نظرِ استحسان یاد کیا ہے۔ اس سے ایک غیر جانب دار مورخ اس کے سوا اور کیا نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ امروہہ آج سے ساڑھے سات سو برس پہلے بھی اپنے باشندوں کے علم و فضل کی بنا پر اطراف و اکناف دہلی میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ابن بطوطہ امروہے میں یوں ہی سرسری طور پر ہرتے پھرتے نہیں چلے آتے تھے بلکہ انہیں تغلق شاہ کے دربار سے امروہے جانے کی ہدایت کی گئی تھی جس سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ امروہہ اس وقت بھی اربابِ علم و فن کا مرکز تھا اور حکومتِ دہلی اس چھوٹے سے خطۂ ارض کے فضل و کمال اور اس کی انفرادیت پر بڑا اعتماد رکھتی تھی ـــــ سعادت نے اس علمی و ادبی خطۂ ارض میں آنکھ کھولی اور اسی کی آغوشِ عاطفت میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ علوم متداولہ اور فنون حربیہ امروہے کے اہلِ کمال سے سیکھے اور ان میں اتنی شہرت پائی کہ ۱۷۱۹ء کے بعد دہلی میں محمد شاہی دربار کے منصب داروں میں شمولیت کا اعزاز حاصل کر لیا۔" (سعادت امروہوی صفحہ ۳)

سعادت کا تعلق میر تقی میر سے بہت قریبی تھا۔ اس سلسلے میں میر نے بھی دو مقامات پر اظہار کیا ہے۔ سعادت ہی کے مشورے پر میر نے ریختہ میں شاعری شروع کی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحقیق کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ میر تقی میر سعادت کے شاگرد تھے۔ "ذکرِ میر" کے مقدمے میں صفحہ ۷۶ پر انہوں نے ایک عنوان "میر سعادت علی کی شاگردی" قائم کیا ہے۔

میر تقی میر اپنی تصنیف "نکات الشعرا" میں سعادت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

ترجمہ:۔ "میر سعادت علی ساداتِ امروہہ سے تعلق رکھتے تھے سلیم الطبع۔ متواضع اور کم سخن تھے۔ ان میں بڑی حد تک درویشی کا مذاق پایا جاتا تھا اشعار لطافت سے پُر ہیں مجھ سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔" (صفحہ ۷۲) ان تعلقات کی وضاحت "ذکرِ میر" میں میر اس طرح کرتے ہیں

ترجمہ:۔ کچھ دنوں کے بعد سعادت علی سے ملاقات ہوئی یہ امروہے کے سید تھے

ان بزرگ نے یہ مشورہ دیا کہ میں ریختہ (اردو غزل) موزوں کروں ریختہ فارسی شعر کی طرح بادشاہِ ہندوستان کی زبان موسوم بہ اردوئے معلےٰ میں ایک طرز شعر ہے۔ جس کا اس زمانے میں رواج تھا میں نے اپنے نفس پر جبر کرکے اس مشورے پر عمل کیا اور اتنی مشق بہم پہنچائی کہ شہر کے شعرا مجھے مستند سمجھنے لگے۔ میرے اشعار سے تمام شہر گونج اٹھا اور میرا کلام ہر چھوٹے بڑے کے کانوں تک پہنچ گیا۔" (صفحہ ۶۷)

محمود احمد عباسی نے "تذکرۃ الاکرام" عابدی الہ آبادی نے "تحریکِ نئے نوا" اور زبیر گستاخ نے "حدیثِ غم" میں میر کے سعادت سے قریبی تعلق اور شاگردی کا ذکر کیا ہے۔

سعادت کے شاگردوں میں میر کے علاوہ ایک نام اور بھی ملتا ہے اور وہ ہے علی نظر امروہوی کا۔ سید محمد سیادت لکھتے ہیں کہ

"علی نظر نے اپنے قریبی عزیز سید سعادت علی سعادت امروہوی کے فیضِ صحبت سے شعر گوئی کا آغاز کیا یہ وہی سعادت امروہوی ہیں جن کے لئے میر تقی میر نے "ذکرِ میر" میں لکھا ہے کہ مجھے سعادت امروہوی نے اردو غزل گوئی کی طرف متوجہ کیا جس طرح میر کی پنہاں قوتیں سعادت امروہوی کی تحریک و تاثر سے اُبھر کر سامنے آئیں اسی طرح علی نظر امروہوی کا ذوقِ شعر گوئی جو شعور کے نہاں خانوں میں پوشیدہ تھا سعادت امروہوی کے فیضِ صحبت سے اجاگر ہوا۔" (دیوانِ علی نظر صفحہ ۱)

سعادت کی عمر صرف ۳۹ سال ہوئی قائم چاندپوری "مخزنِ نکات" میں لکھتے ہیں کہ

ترجمہ:۔ میر سعادت علی جن کا تخلص سعادت تھا امروہے کے رہنے والے شاہ ولایت (۶۶۳ھ) کی اولاد ہیں اور انسانیت و اخلاق کا مجسمہ تھے غزل میں ایک سے ایک نئی بات تلاش کرکے لاتے تھے۔ اسی وجہ سے اپنے معاصرین میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔

ابھی پورے چالیس برس کے نہ ہوئے تھے کہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر کوچ کر گئے۔

یوں تو تمام تذکرہ نگاروں نے سعادت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن سید فتح علی (تذکرہ ریختہ گویاں)

شیفتہ (گلشن بے خار) حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم (مجموعہ نغز) شیخ غلام ہمدانی مصحفی (تذکرہ ہندی گویاں) علی ابراہیم خاں (تذکرہ گلزارِ ابراہیم) کریم الدین (طبقات شعرائے ہند) شاہ محمد کمال (مجمع الانتخاب) ابوالحسن امیرالدین (مسرّت افزا) میر حسن دہلوی (تذکرہ شعرائے اردو) لالہ سری رام (خم خانۂ جاوید) وغیرہ نے سعادت کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ ان تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعادت صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ غزل کے علاوہ مثنوی، مناقب، سلام وغیرہ بھی کہتے تھے اور ان کا کلام کافی شہرت رکھتا تھا۔

شعرا کے تذکروں کے علاوہ "قاموس المشاہیر" میں نظامی بدایونی نے بھی سعادت کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"سعادت، میر سعادت علی امروہوی کا تخلص ہے اس نے نواب قمرالدین خاں وزیر کے عہد کا ایک قصہ نظم کیا ہے جو "سہیلی سکھیوں" کے نام سے مشہور ہے جس میں ایک عاشق و معشوق کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔" (صفحہ ۲۸۹)

جہاں تک سعادت کی مرثیہ نگاری کا تعلق ہے اس سے تمام معتبر مورخین متفق ہیں۔ اردو مرثیے کی تاریخ کا جب جب ذکر ہوا ہے تو شمالی ہند کی ابتدائی مرثیہ نگاری میں سعادت کا بھی نام آیا ہے۔ لیکن تمام مورخین و محققین ابھی تک سعادت کے مراثی پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

سفارش حسین رضوی نے اپنی کتاب "اردو مرثیہ" میں سعادت کا ذکر کئی مقامات پر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"میر سعادت علی امروہوی ـــــ مختلف تذکرے لکھنے والے اس شاعر کا ذکر کرتے ہیں۔ مصحفی تذکرہ ہندی گویاں میں اور کریم الدین طبقات الشعرا میں اس کے کلام کی تعریف اور اس کی شہرت کا ذکر کرتے ہیں ـــــ شیخ چاند بھی اس کی مرثیہ گوئی کا ذکر کرتا ہے ـــــ اور شاعروں نے بھی مرثیے میں طبع آزمائی کی ہے جن میں ...... سعادت علی سعادت

..... اہم ہیں۔ اس کے مرثیے کا نمونہ نہیں ملتا۔" (صفحہ ۲۱۲)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے "دبستانِ دبیر" کے صفحہ ۱۲۲ پر سعادت امروہوی کا ذکر کیا ہے۔

عصرِ حاضر کے نوجوان محقق ضمیر اختر نے بھی اپنی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" سعادت کی مرثیہ نگاری کا ذکر کیا ہے اور اپنے ایک خط بنام محمد علی خاں امروہوی مورخہ ۲۷/اپریل ۱۹۸۱ء میں مندرجہ ذیل مطلع کا بھی ذکر کیا ہے ؎

ع حسینؑ امام جب آئے بہ دشت کرب و بلا

راقم الحروف نے پورے امروہہ کی خاک چھاننے کے بعد سعادت تخلص سے ۲ مرثیے حاصل کیے ہیں جو مسدس کی ہیئت میں ہیں۔ جن پر ابھی مزید تحقیق جاری ہے۔ مکمل تحقیق اور یقینِ کامل کے بعد ان شاء اللہ ان کو منظرِ عام پر لانے کا ارادہ ہے۔ مطلعے مندرجہ ذیل ہیں ؎

۱ ع جب چلے خیمے سے رن کو پسرانِ زینبؑ — بند ۳۱ تحریر ۱۳۲۵ھ

مقطع کا مصرع اس طرح ہے ؎

بس ہو خاموش سعادت نہ کر اب طولِ کلام

۲ ع جب جنگ میں اکبر نے سناں ظلم کی کھائی — بند ۳۸ تحریر ۱۳۳۰ھ

مقطع کا مصرع اس طرح ہے ؎

بس روک سعادت قلمِ نوحہ رقم کو

مرثیہ نمبر ۱ امروہہ میں تقریباً ۵۔۶ جگہ بستوں میں موجود ہے۔

سعادت کی سواری جس کا ذکر میر حسن نے بھی کیا ہے آج بھی امروہہ میں بہت مقبول ہے۔ محرم میں جلوسِ عزا کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔ اس سواری کو نسیم امروہوی نے اپنی کتاب "سعادت امروہوی" میں شائع کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے ؎

ہوئی یثرب نگر پر جب چڑھائی — علیؑ نے غیظ میں تیوری چڑھائی

بڑھا گھوڑے کی جانب وہ فدائی — فرس کی ٹاپ سے آواز آئی

سواری ہے امیر

سواری ہے نبیؐ کے جانشیں کی

دھرا جب زین ڈل ڈل کی کمر پر
اندھیرا ہو گیا شمس و قمر پر
پڑی لرزش پہاڑوں کے جگر پر
صدا یہ چھا گئی سارے نگر پر

سواری ہے امیرالمومنیں کی

سواری ہے نبیؐ کے جانشیں کی

طبل اوّل سواری کا سنوارا
بجے ترہی دمامہ اور نقارا
نفیری جھانج ناروں ٹھاٹھ سارا
نقیب شاہِ دیں آ کر پکارا!

سواری ہے امیرالمومنیں کی

سواری ہے نبیؐ کے جانشیں کی

نقارا حیدرِ صفدر کا گرجا
ڈرے سُن کر سبھی راجا و پرجا
مخالف کو پکارا بوق، مرجا
گزر اب صعب ہے جاں سے گزرجا

سواری ہے امیرالمومنیں کی

سواری ہے نبیؐ کے جانشیں کی

جھپٹ کر ابنِ ود کا سیس کاٹا
کہ لوہو تیغ کے لوہے نے چاٹا
فرس نے لوتھ کچلی بھر سپاٹا
تو اس نعرے نے کھائی پاٹ پاٹا

سواری ہے امیرالمومنیں کی

سواری ہے نبیؐ کے جانشیں کی

علیؑ کے ہاتھ میں ظالم کا سر ہے
جدھر سینا ہے اب آمد اُدھر ہے
لجامِ اسپ پر دستِ ظفر ہے
سعادت لغزنِ با کرو فر ہے

ہے امیر المومنیں کی

سواری ہے نبیؐ کے جانشیں کی

اس سواری میں مندرجہ بالا بندوں کے علاوہ ۴ بند اور بھی ہیں جو امروہہ میں ۷ر محرم الحرام کو پڑھے جاتے ہیں اس طرح یہ صرف ۱۰ بند ہی تحقیق ہو سکے ہیں۔

مختلف تذکروں کے ذریعے سعادتؔ کی صرف مندرجہ ذیل غزلوں کے اشعار محفوظ رہ سکے ہیں ؎

لکھا چاہے ہے تیرے قد کی تعریف
اس کو کیا تراشہ ہے قلم نے

شیخ کیوں جاتا ہے تو تسبیح کا داں دام لے
وہ صنم کیا رام ہوتا ہے خدا کا نام لے

یہ دانا ہیں دوانے جو مجھے زنجیر کرتے ہیں
ہر اک تیّ اکوتیّ ادم میں جی نکلے ہے یہ تدبیر کرتے ہیں

مت دکھا اس طرح کی آن مجھے
کوئی دم جینے دے جان مجھے

نہیں کچھ ہجر میں پیتے شراب ارغوانی ہم
ارے ساقی ترے مارے نہیں مانگے گے پانی ہم

پپیہے کی طرح داردکے شیشے
زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی

ہوش کھو دیتی ہیں میرا اس کی آنکھیں مے پرست
بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہو جاتا ہوں مست

کس سے پوچھوں دل مرا چوری گیا زلفوں نے رات
ایک جو شانہ ہے سو وہ تیل میں ڈالے ہے ہات

یار سے جو رقیب لڑتے ہیں
یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں

بے محابا زلف کے کوچے میں جائے گا چلا
سر چڑھایا ہے بہت تم نے میاں شانے کے تیئں

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہ ہوتا
ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

مثل آئینہ سادہ رویوں کی
مُنہ ہی دیکھے کی آشنائی ہے

سعادت کے سلسلے میں ایک شعر ایک واقعے کے ساتھ مشہور ہے وہ اس طرح کہ ایک دن محفل میں دُردانہ نامی رقاصہ کا ناچ گانا تھا وہاں سعادت کا نیا جُوتا کوئی چرا کر لے گیا جب سعادت محفل سے چلے اور جوتا نظر نہیں آیا تو ظرافت کے طور پر بے ساختہ ان کی زبان پر ایک شعر آیا ؎

سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوتا
گیا تو جانے دے دُردانہ کے بھر طور کے صدقے

سعادت کو اکثر شعرا نے منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے مثلاً ایک موقع پر اختر شاہ خاں اختر کہتے ہیں کہ ؎

نمودِ تربیتِ میر ریختہ گویاں
زہے سعادتِ معجز نمائے امروہہ

انیس الدین انیس رضوی کہتے ہیں کہ ؎

سعادت آں سخن سنج و سخن فہم و سخن گستر

زلطفش قطرۂ معنی رقیب موجِ جیحوں شد

نسیم امروہوی سعادت کے بارے میں ایک جگہ ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ "جب دکنی ہند کا ادبی جائزہ لے کر ہم شمالی ہند کی طرف پلٹے اور اردو کے بعض قدیم تذکروں نے نئے نئے سراغوں کی نشان دہی کی تو سعادت امروہوی کی لافانی شخصیت کا پتہ چلا جنہیں اردو شاعری کے خدائے علی الاطلاق میر تقی میر کے خضرِ راہ ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ اور فوراً ہی اردو کی دنیائے ادب نے سعادت کو عظمتِ جاودان کی اس بلند مرتبہ کرسی پر جگہ دے دی جو صرف انہیں کے لیے مخصوص تھی۔" (سعادت امروہوی صفحہ ۳،۲)

شاہ عالم محزوںؔ

شاہ عالم محزوںؔ کے اسلاف کے بارے میں تواریخ میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اردو کے قدیم تذکرہ نگاروں نے شاہ عالم نام محزوںؔ تخلص اور مشائخینِ گڑھ مکتیسر لکھا ہے۔ جو امروہہ آیا اور سکونت اختیار کی۔ امروہہ میں مشائخین و عارفین کی کوئی تاریخ مرتب نہیں ہو سکی جس سے محزوںؔ کے بارے میں معلومات ہوتی۔ البتہ صاحب "واسطیہ" نے امروہہ کی درگاہوں اور مقبروں کا ذکر کیا ہے۔ پیر گنج بخش کی درگاہ کا بھی ذکر ہے جو مرادآبادی دروازہ کے قریب واقع ہے۔ یہ پیر جی بھی گڑھ مکتیسر سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ پہلے یہ ہر ہفتہ امروہہ آتے تھے بعد میں امروہہ مستقل قیام کیا اور یہیں وفات ہوئی ان پیر جی کے علاوہ گڑھ مکتیسر سے کسی اور کا تعلق نہیں ہے۔

امروہہ میں پیر گنج بخش کے مرید سید دوست علی کی اولاد میں سینہ بہ سینہ یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ پیر جی کے ہی فرزند پیرزادے شاہ عالم محزوںؔ تھے جن کی قبر امروہہ میں مرادآبادی دروازے کے قریب پیر جی کی درگاہ میں ہے۔

شاہ محمد کمال اپنی کتاب "مجمع الانتخاب" میں لکھتے ہیں کہ "محزوںؔ کا وطن امروہہ تھا۔"

میر قطب الدین اپنے تذکرے میں محزوںؔ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"محزوںؔ تخلص شاہ عالم نام مشائخین گڑھ مکٹیسر سے ہیں ـــــ گو کہ کلام محزوںؔ ہے مگر سامع اس پر مفتوں ہے نگاہِ محبوبہ سخن محزوںؔ کو عاشقِ شیدا کی تاک ہے مدعی بد کردار نا جوا کی آنکھوں میں خاک ہے

اہلِ دنیا تو نہیں دیتے ہیں محزوںؔ کو جواب

کوہکن کو خوابِ شیریں سے جگاؤں تو سہی "

(گلستانِ بے خزاں صفحہ ۲۰۸، ۲۰۹)

جہاں تک محزوںؔ کی مرثیہ نگاری کا ذکر ہے تو مرثیے کی تاریخ میں محزوںؔ کا ذکر کافی ملتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی شمالی ہند کی ابتدائی مرثیہ نگاری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ

"شمالی ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا چلن جلد ہی عام ہو گیا۔ چنانچہ فاصمیؔ۔ یکرنگؔ۔ خلیفہ محمد علیؔ۔ سکندرؔ۔ مرزا مغل ندرتؔ۔ علی قلی ندیمؔ۔ میر ضاحکؔ۔ مرزا رفیع سوداؔ۔ میر تقی میرؔ۔ میر حسنؔ اشرف علی خاں فغاںؔ۔ مہربان خاں رندؔ۔ قائمؔ چاند پوری۔ راسخؔ عظیم آبادی۔ میر آفاقیؔ۔ میر باقر علی باقرؔ۔ مذنبؔ۔ میر ظہور علی ظہورؔ۔ راجہ رام ناتھ ذرہؔ۔ شرف الدین شرفؔ۔ مرزا محمد شریفؔ شریفؔ۔ میر بھیجو گریاںؔ۔ میر محمد علی محبؔ۔ خدا بخش موجؔ۔ شاہ محمد عظیم عظیمؔ۔ محزوںؔ امروہوی۔ سعادت امروہوی۔ حزیںؔ۔ غمگیںؔ۔ نثارؔ۔ نجاتؔ۔ خادمؔ۔ صابرؔ۔ حرمتؔ۔ ملولؔ۔ زائرؔ۔ مسیحؔ اور بعض دوسرے حضرات کے مراثی آج بھی ملتے ہیں۔" (دبستانِ دبیر صفحہ ۱۲۲)

"مراثیِ میرؔ" کے مقدمے میں ڈاکٹر مسیح الزماں نے بھی محزوںؔ کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے

"اس زمانے کے مرثیہ گویوں میں سوداؔ۔ میرؔ۔ مسکینؔ۔ حزیںؔ۔ غمگینؔ۔ محمد تقیؔ۔ نظر علیؔ۔ نعیمؔ۔ علی قلیؔ۔ ندیمؔ۔ گداؔ۔ مہربانؔ۔ عاجزؔ۔ محبؔ۔ محزوںؔ۔ جعفر علی حسرتؔ۔ احدؔ۔ صوفیؔ۔ سکندرؔ وغیرہ مشہور ہیں۔" (صفحہ ۳۲)

سفارش حسین رضوی نے اپنی کتاب "اردو مرثیہ" میں محزوںؔ کے مرثیہ کہنے اور پڑھنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"محزوںؔ عالم شاہ امروہوی۔ امروہہ کے پیرزادوں میں سے تھا مرثیہ کہتا اور پڑھتا بھی تھا بہت سے تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے مصحفی کے قول کے مطابق قرب وجوار میں اس کی کافی شہرت تھی۔ کلام کا نمونہ تک نہیں ملتا۔" (صفحہ ۲۵۰)

ڈاکٹر صفدر حسین صفدر "مراثیٔ نسیم" جلد اول کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ

"جس زمانے میں مصحفی مکتب نشین تھے امروہہ میں پیرزادہ عالم شاہ محزوںؔ بہت مشہور شاعر تھے دوسری اصناف سخن کے علاوہ وہ مدح و منقبت پر بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ ایام عزا میں وہ اکثر مرثیہ و سلام ہی تصنیف کیا کرتے تھے۔ غرض امروہہ پرانے زمانے ہی سے علم وادب کی طرح مدح و منقبت اور مراثی وسلام کا بھی مرکز تھا۔" (صفحہ ۶-۷)

ہر چند راقم نے مراثیٔ محزوںؔ اور اخلاف محزوں کی تلاش کی لیکن افسوس کہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ صرف ایک مرثیہ محزوںؔ تخلص سے حاصل ہوا ہے جس پر تحقیق جاری ہے۔ مطلع و مقطع مندرجہ ذیل ہے ؎

مطلع: نور سے یارو زمین کربلا معمور ہے

کہہ کے یہ غائب ہوئے جس دم امام ابن امام — روتی اولاد اسد اور تھے زمیں دار السلام

جو مصیبت گزری واں سجاد پر تا ملک شام — کیا تمام اس کو لکھے محزوںؔ کہ ہے وہ ناتمام

آرزو ہے مجھ کو حاصل ہو زیارت شاہ کی

دیکھوں تربت جا کے میں سبط رسول اللہ کی

سیّد نجابت علی نجابتؔ

نسل سید حسین شرف الدین میں عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ میں چہار ہستی ذات کے منصب پر دیوان میراں سید خضر ہوئے ہیں۔ دیوان سید خضر کی اولاد میں سید میر علی بھی عہدِ اکبری کے منصب دار اور عالم و فاضل تھے۔ سید میر علی کے لائق فرزند سید سعادت علی سعادتؔ اردو کے نامور شاعر اور شمالی ہند کے قدیم مرثیہ نگار ہوئے۔

سعادت کے ہی لائق فرزند اور حقیقی جانشین سید نجابت علی نجابتؔ ہوئے۔ مولانا نسیم امروہوی کی تحقیق کے مطابق تقریباً ۱۶۹۸ء میں سعادت کی ولادت ہوئی اور ۳۹ سال کی عمر میں ۱۷۳۶ء میں انتقال ہوا۔ اس طرح نجابت کی ولادت تقریباً ۱۷۱۷ء سے ۱۷۲۰ء کے دوران ہوئی ہوگی کیوں کہ نجابتؔ سعادتؔ کے فرزندِ اکبر تھے ان کے چھوٹے بھائی حشمت علی تھے۔ نجابتؔ کی مرثیہ خوانی کا ذکر تو صاحبِ "تواریخ واسطیہ" نے بھی کیا ہے۔ لیکن صاحب "تاریخِ اصغری" کے بیان سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خود شاعر بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ

"دوسرے بیٹے دیوان سید خضر کے سید غلام علی ہوئے جن کے بیٹے سید میر علی اور پوتے سعادت علی ولد سید میر علی مذکور منصب دارانِ شاہی اور پرپوتے سید نجابت علی ولد سید

سعادت علی مذکور مرثیہ خوان بلند آواز تھے۔" (صفحہ ۹۲)

کتاب "تاریخِ اصغری" نجابت کے دور سے تقریباً ۱۵۰ سال بعد کی تصنیف ہے اس لیے اس میں نجابت کی شاعری کا ذکر اور حالاتِ زندگی کا نہ ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کیوں کہ اس میں نجابت کے والد میر سعادت جیسے شاعر کی بھی شاعری کا ذکر نہیں ہے۔

نجابت کو شاعری ان کے والد میر سعادت سے ورثے میں ملی تھی گھر کے ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر میں انہوں نے مراثی بھی کہے۔ امروہہ کے جب قدیم ترین بستوں کی تلاش کی گئی تو راقم الحروف کو نجابت کا ایک مرثیہ سید فیض الحسن مقیم مرحوم محلہ دربارِ کلاں کے بستے سے ملا۔ اس مرثیے میں ۳۲ بند ہیں۔ مرثیہ مسدس کی ہیئت میں ہے۔ اس کی زبان اور بیان سے ہی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس عہد کی تخلیق ہے۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

صغرا سے بہت رکھتا تھا الفت علی اکبر ۔۔۔ کرتا تھا اسے پیار بہ شدت علی اکبر
دیکھ اس کی کسل مند طبیعت علی اکبر ۔۔۔ ہو جاتا تھا بے تاب نہایت علی اکبر

کبرا و سکینہ پہ بھی ہر چند فدا تھا
پر فاطمہ صغرا سے اسے عشق بڑا تھا

اس مرثیے میں جناب صغرا کی حضرت علی اکبر سے مخصوص محبت۔ امام کے قافلے کا کربلا سے روانہ ہونا۔ بیمار صغرا سے رخصت۔ کربلا میں حضرت علی اکبر کی شہادت۔ وہاں قاصدِ صغرا کا پہنچنا۔ نامہ صغرا امام کو دینا۔ شہادت کی خبر سن کر کربلا کو قاصد کی واپسی اور جناب زینبؑ وغیرہ کے بین نظم کئے ہیں۔ جو بالکل سادہ زبان میں بڑے دردناک لہجے میں ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

سب بہنوں میں بس دل سے وہ عاشق تھا اسی کا ۔۔۔ صغرا بھی دل و جان سے تھی اس بھائی کی شیدا
ان دونوں میں تھا انس برابر باہم ایسا ۔۔۔ بھائی بہن اک جان دو قالب تھے وہ گویا

جس طرح سے زینبؑ رخِ سرورؑ پہ فدا تھی

صغرا بھی اسی طرح سے اکبرؑ پہ فدا تھی

امام حسینؑ جب اپنی بیمار بیٹی فاطمہ صغرا سے رخصت ہوتے تو فرمایا ؎

اللہ کو سونپا تجھے اے میری دلِ آرام　　خالق سے دعا کرنا تو دل سے سحر و شام

بچپن کا وفا وعدہ ہو پورا ہو مرا کام　　جس کام کو جاتا ہوں بخیر اس کا ہو انجام

لغزش نہ قدم کو ہو رہِ صبر و رضا میں

صدقے کروں گھر بار تلک راہِ خدا میں

کربلا پہنچ کر یزید کے لشکر سے جنگ اور حضرت علی اکبرؑ کی شہادت اس طرح بیان کی ہے

حضرتؑ کو قضا کرب و بلا میں جو نہی لائی　　در پیش ہوئی لشکرِ اعدا سے لڑائی

مارا گیا شبیرؑ کا عباسؑ سا بھائی　　اکبرؑ نے بھی سینے پہ سناں ظلم کی کھائی

جس وقت گرا گھوڑے سے وہ ماہ زمیں پر

دل تھام کے بس بیٹھ گئے شاہ زمیں پر

کھول آنکھوں کو یوں بولا وہ جنت کا مسافر　　صد شکر کہ سب کنبے کو دیکھا دمِ آخر

اب ہم چلے سب گھر کا خدا حافظ و ناصر　　آئے تھے دمِ نزع یہی کہنے کی خاطر

پردیس سے جانا جو تمہارا ہو وطن کو

پیغام یہ دینا مری بیمار بہن کو

کہنا مری جانب سے کہ اے خواہرِ رنجور　　نزدیک تھی دل سے مگر گو تجھ سے میں تھا دور

تھا وردِ زباں آٹھ پہر تیرا ہی مذکور　　قسمت کی جدائی سے مگر ہو گیا مجبور

پردیس میں فرصت جو اگر موت سے پاتا

لینے کو ترے پاس یہ بھائی ترا آتا

مرثیے کا مقطع مندرجہ ذیل ہے ؎

مرتے ہوئے پھر کی ہے یہ اکبر نے وصیت ماتم میں مرے کیجیو تغیر اپنی نہ حالت
فرماکے یہ قاصد کو کیا شاہ نے رخصت اب منہ کو کلیجہ مرا آتا ہے نجابت

صغرا نے سنائی جو نئی بھائی کی ہوگی
حالت کہو کیا اس گھڑی ماں جائی کی ہوگی

یقیناً نجابت نے کچھ اور بھی مراثی کہے ہوں گے۔ ممکن ہے آنے والے وقت میں سامنے آئیں۔

سیّد غلام علی حسینی

اولاد سید شرف الدین شاہ ولایت میں عہدِ اکبری میں سید محمد میر عدل بڑے نامور اور اعلیٰ منصب دار ہوتے اکثر کتب تواریخ میں آپ کا ذکر ہے۔ سید محمد میر عدل کے فرزند سید ابوالفضل بھی منصب دار تھے جو عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ میں ممتاز تھے انہوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کے ایک پسر سید غلام علی (بانیٔ قلعہ) بھی ہوئے جن کے نام پر امروہہ کا محلہ گڑھہ غلام علی ہے۔ غلام علی کے ایک پسر سید مجتبیٰ علی عرف چاند ہوئے سید مجتبیٰ علی کے پوتے سید منور علی ہوئے۔ سید منور علی کے پسر سید غلام علی حسینی تھے۔ چونکہ ان سے چار واسطوں قبل ان کے جد بھی غلام علی تھے اس لیے یہ غلام علی ثانی کہلاتے۔

سید اصغر حسین لکھتے ہیں کہ

"سید غلام علی ثانی اپنے وقت کے استاد اور نامور شاعر تھے حسینی ان کا تخلص تھا۔ قصہ "قاہیار" اور "چندر بدن" کا بزبان اردو ان سے یادگار ہے۔" (تاریخ اصغری صفحہ ۱۳۱)

صاحب "تواریخ واسطیہ" نے بھی حسینی کو نامور شاعر لکھا ہے۔ جہاں تک حسینی کے ننھیال کا تعلق ہے تو آپ حکیم جلال الدین کے نواسے تھے جن کی تالیفات سے "قرابادین جلالی"

طب کی مشہور کتاب ہے۔

حسینی کے اجداد میں تو میر اسمٰعیل شاعر ہوتے ہیں ان کے بعد خاندان کی اس روایت کو حسینی نے قائم رکھا۔ حسینی کے بھائی سید اکبر علی بھی شاعر تھے اور دیوانہ تخلص کرتے تھے حسینی کے صرف ایک پسر تھے جن سے چار پوتے ہوئے لیکن چاروں لاولد تھے اس لئے حسینی کی نسل آگے نہ بڑھ سکی۔

کتب تواریخ حسینی کی ولادت اور وفات کے سلسلے میں خاموش ہیں۔ لیکن حسینی کی زبان ان کے قلمی مرثیے پر جو سن تحریر ہے اور ایک صدی میں تین نسلوں کے اصول کے تحت یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حسینی کی ولادت بارھویں صدی ہجری کے تیسرے یا آخری ربع میں ہوئی ہوگی۔ اور تیرھویں صدی ہجری کے دوسرے ربع میں وفات ہوئی ہوگی۔

حسینی اپنے وقت کے نامور اور استاد شاعر تھے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد حسینی کے راقم کو دو مرثیے حاصل ہوسکے ہیں ایک مرثیہ تو بے حد مقبول ہے اور برسوں سے ۸ محرم کے جلوس برآمد ہونے سے قبل پڑھا جاتا ہے۔ مرثیے کے رنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۲۰۰ سال قبل کی تصنیف ہے۔ برادرم علی نقوی نے سید امیر حسن صاحب کے بستے سے نقل کر کے راقم کو دیا ہے۔

یہ مرثیہ مربع کی ہیئت میں ہے اور اس میں ۱۹ بند ہیں مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

حسینؑ چلے جب جنگ وجدل کو یارو گھوڑا منگا
بی سکینہ کہے یوں پدر کو بابا رن کو نہ جا
گر تم چلے یاں سے رن کو ظالم لوٹیں گے آہ
چھینیں گے مرے کانوں سے دُر کو بابا رن کو نہ جا

اس پورے مرثیے میں جناب سکینہ کے امام حسینؑ سے بیان نظم کیے گئے ہیں چند بند اور ملاحظہ ہوں ؎

میری ماں پہ مصیبت ہے ٹوٹی خبر اس کی تو لو
اس کی کھیتی قضا نے ہے لوٹی بیٹی بیٹوں کو کھو
سر کھلے ہے نصیبوں کی پھوٹی مہر اس پر تو کرو
اسے چھوڑ کر دینے کو سر کو بابا رن کو نہ جا
بابا تم پہ سکینہ ہو صدقے مانو میرا کہا
ناخدا ہو جہازِ بنجگ کے نہ اسے دو بہا
داغِ غم تمہارا تو مجھ سے نہیں جاتا سہا،
چھوڑ رنج میں خاک بسر کو بابا رن کو نہ جا
شہ نے دیکھ سکینہ کی زاری لیا چھاتی لگا
منہ کو چوم کہا مری پیاری بس ہے بابا کا گیا
ہے یہی حکم خالقِ باری کٹے میرا گلا
کہہ نہ مجھ شاہِ تشنہ جگر کو بابا رن کو نہ جا

اس کے بعد اس طرح مقطع پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے ؎

اے حسینی سکینہ کا رونا ہائے جس نے سنا
دیکھ اس کو آتا ہے رونا تھی یہ ہر دم بُکا
چھینے اعدا نے اس کے جو گوہر کان زخمی ہوا
یہ ہی کہتی رہی وہ تڑپ کر بابا رن کو نہ جا

اس مرثیے کی زبان اور رنگ قطب شاہی عہد کی یاد دلا رہا ہے اس میں بیانیہ انداز ہے دردناک زبان ہے اور پُر تاثیر لہجہ ہے۔
حسینی کا دوسرا مرثیہ سید علی اکبر مرحوم (دکرطہ غلام علی) نے راقم کو عنایت فرمایا ہے جو مسدس کی شکل میں ہے جس میں ۳۸ بند ہیں مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

لکھے ہے راوی کہ اک روز فاطمہ صغرا ۔۔۔ پدر کی یاد میں کرتی تھی آہ واویلا
بحالِ فکر یہ اس کے خیال میں گزرا ۔۔۔ کہ مجھ غریب کو بے شک بھلا گئے بابا
وہ آپ ہوویں گے با اقربا سفر کرتے
جو یاد رکھتے تو احوال سے خبر کرتے
پھر اس ستم زدی نے اپنی ہم سنوں سے کہا ۔۔۔ یہ مجھ غریب کی قسمت میں ہی خدا نے لکھا
کہ چھوٹے سن میں یہ بابا سے اپنے ہوگی جدا ۔۔۔ اور اس کے ہجر میں رویا کرے گی یہ دکھیا
پدر بھی جا کے سفر میں اسے بھلاوے گا
اب آگے دیکھئے اللہ کیا دکھاوے گا

اس طرح یہ مرثیہ جناب صغرا کے مختلف خیالات۔ باپ سے بیٹی کے شکوے۔ بچھڑنے کا غم۔ تنہائی کی تکلیف اور عزیزوں کی یاد سے شروع ہوتا ہے فطری جذبات اور نفسیات شامل ہیں۔ جنہیں بہت سادہ زبان میں ادا کیا گیا ہے۔ آگے چل کر جناب فاطمہ صغرا کی زبانی حسینی کہتے ہیں کہ ؎

کہوں گی بابا جو الفت تمہیں ذرا ہوتی ۔۔۔ تو صغرا کاہے کو ان قدموں سے جدا ہوتی
ہمیشہ ساتھ تمہارے ہر ایک جا ہوتی ۔۔۔ جو رنج آپ کو ہوتا تو میں فدا ہوتی
سو تم نے جا کے وہاں اس قدر بھلایا مجھے
کہ ایک پرچۂ قرطاس بھی نہ آیا مجھے

اس کے بعد جناب صغرا کو ایک قاصد کربلا جانے والا مل جاتا ہے اسے خط دیتی ہیں اور کچھ گفتگو بھی کرتی ہیں۔

کھڑی تھی ڈیوڑھی پہ اک روز وہ بحالِ نزار ۔۔۔ کہ اس طرف کو ہوا وارد ایک ناقہ سوار
کہا یہ صغرا نے اس نامہ بر سے رو رو کر ۔۔۔ جو کربلا میں گزر ہو ترا تو اے غم خوار

یہ خط مرا مرے والد کو جا کے تو دینا

مرے عزیزوں سے تو میری خیریت کہنا

سکینہ نامی بہن ہے مری بہ سنِ صغیر　　بہت ہی پیاری ہے مجھ کو وہ دخترِ شبیرؑ

یہ کہنا اس سے کہ ہوں دھیان میں ترے دلگیر　　ہمیشہ روتی ہوں میں یاد کر تری تصویر

بلائیں لے کے تو اصغر کو گود میں لینا

اور اماں جان کو پھوپھیوں کو بندگی کہنا

جنابِ سکینہ کا خط اور زبانی پیغام لے کر قاصد روانہ ہوا۔

یہ حال سن کے غرض خط کو نامہ بر نے لیا　　کمر کو باندھ کے پھر قصد کربلا کا کیا

غرض کہ مومنو! جس دم وہ کربلا پہنچا　　تو گیا وہ دیکھ کے نوجوں کا اک جم پڑا

اور اک طرف کو کھڑا اک سوار روتا ہے

وہ آپ باقی ہے لشکر تمام سوتا ہے

قاصد نے امام حسینؑ کو خط دیا وہ ہر ہر شہید کے پاس قاصد کو لے گئے اور خط سنایا۔

حضرت علی اکبر کی لاش پر پہنچے اور فرمایا ؎

کہا یہ رو رو کے پھر شہ نے لاشِ اکبر سے　　کہ شکوہ تیری بہن نے بہت لکھا ہے تجھے

خدا کے واسطے ٹک منہ سے کچھ جواب تو دے　　کہ خط یہ دور سے آیا ہے آج تیرے لیے

وہ تیری یاد میں روتی ہے آہ و زاری ہے

تجھے جواب کا دینا بھی منہ سے بھاری ہے

اس کے بعد امام خود میدان میں تشریف لے گئے اور شہادت ہوئی یہ دیکھ کر قاصد واپس ہوا اور مدینے پہنچ کر جناب صغرا سے تمام واقعات بیان کیے تو ان کے دل پر غموں کا پہاڑ گر پڑا۔ یہ تمام واقعات حسینی نے مرثیے میں بڑے دل خراش اور موثر انداز میں بیان کیے ہیں۔ آخر میں اس طرح مقطع پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے ؎

تمام بیبیاں پھر جمع ہو گئیں اُس جا　　اور ایک حلقۂ ماتم انہوں نے باندھ لیا

غمِ حسینؑ میں سینہ زنی کا شور مچا　　بیان کرنے کی آگے نہیں ہے تاب ذرا

حسینی کریہ دعا مرثیہ کہوں میں حسینؑ

تمہارے غم میں یوں ہی مبتلا رہوں یا حسینؑ

یہ مرثیہ ۱۲۳۵ھ یعنی اب سے تقریباً ۱۷۰ سال قبل کی تحریر ہے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

امروہہ کے جس شاعر نے چہار دانگ عالم میں شہرت پائی وہ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ ولد ولی محمد ابن درویش محمد ہے۔ یوں تو اردو شعرا کے تمام تذکروں میں مصحفیؔ کا ذکر موجود ہے لیکن "مجمع الانتخاب"۔ "طبقات الشعرا"۔ "بزم سخن"۔ "نتائج الافکار"۔ "طور کلیم"۔ "نغمۂ عندلیب"۔ "جامع المشاہیر"۔ "خوش معرکۂ زیبا"۔ "گلشن بے خار"۔ "نکات الشعرا"۔ "عقد ثریا" اور "ریاض الفصحا" وغیرہ میں مصحفیؔ کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔

میر قطب الدین باطن لکھتے ہیں کہ "مصحفیؔ تخلص۔ شاعر عزۃ او استاد ذوی الاحترام استاد مسلم الثبوت علم ہمدانی میں غلام ہمدانی نام۔ ابتدا ان کی قصبہ امروہہ مضافات مراد آباد۔ شباب میں تشریف لائے شاہجہان آباد۔ خجستہ بنیاد۔ بعد چندے مشتاق شہر لکھنؤ۔" (گلستان بے خزاں صفحہ ۲۱۶)

صاحب "بزم سخن" لکھتے ہیں کہ "غلام ہمدانی پسر ولی محمد امروہہ ضلع مراد آباد کے قدیم باشندے ایک عرصے تک شاہ جہاں آباد میں رہے آخر میں لکھنؤ جا بسے اور عمر بھر وہیں رہے۔ ہر صنف سخن پر قادر تھے۔" (صفحہ ۱۱۱)

نہیں۔ مہذب لکھنوی جن کا مرثیے سے خاص تعلق ہے انہوں نے بھی "آیاتِ مصحفی" میں مصحفی کی مرثیہ نگاری کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلے میں سفارش حسین رضوی اپنی کتاب "تاریخ مرثیہ۔ اردو مرثیہ" میں اس طرح لکھتے ہیں کہ "مصحفی یعنی شیخ غلام ہمدانی امروہوی۔ شاعری کا چسکا شروع سے تھا اس لیے خود مشاعرے کرتے اور مشاعروں کی شرکت بھی ناغہ نہ ہوتی ـــــ مصحفی نے لکھنؤ کے مذاق سے متاثر ہو کر مرثیے بھی کہے ہیں ان کے ایک مرثیے کا مطلع ہے ؎

ع بولو تو کوئی روحِ پیمبرؐ کے واسطے

ـــــ مصحفی کے مرثیے میں غم انگیز مضمون تو ہیں مگر بیان کا وہ پیرایہ نہیں جس سے سننے والوں کے دل پر چوٹ لگے جذبات امڈیں اور وہ پھوٹ پڑیں لیکن پھر بھی مصحفی کا مرثیہ اپنے ہم عصروں کے مرثیوں سے کسی حیثیت میں کم نہیں"۔ (صفحہ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹)

مصحفی کا مندرجہ بالا مرثیہ محمود آباد ہاؤس لکھنؤ سے حاصل کر کے سید محمد رشید صاحب نے راقم کو عنایت فرمایا ہے۔ یہ مرثیہ مربع کی ہیئت میں ہے۔ اور اس میں ۳۳ بند ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

بولو تو کوئی روحِ پیمبرؐ کے واسطے	تسکینِ دل کرو مری حیدرؑ کے واسطے
سر تھا بنا حسینؑ کا افسر کے واسطے	یا نوکِ نیزہ و دمِ خنجر کے واسطے

مصحفی کا یہ مرثیہ اس دور کے مراثی کے ہی رنگ میں ہے یعنی شروع سے آخر تک بیانیہ انداز صرف مصائبِ شہدائے کربلا یا مدح کا بیان ہے اور ہر بند کا مضمون مختلف ہے۔ مسلسل اور مربوط بند نہیں ہیں اسی طرز پر سودا اور میر کے بھی کچھ مربع مراثی ملتے ہیں۔ مصحفی امام حسین کا تعارف ان کے نانا اور باپ کے ذریعے اس طرح کرتے ہیں ؎

نانا کو جس کے آوے الم نشرح والضحیٰ	بابا کے جس کی شان میں نازل ہوا تھا
حیف اس کا انتخاب کرے کاتبِ قضا	سینہ کا صفحۂ تیغ کے مسطر کے واسطے

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ایک موقع پر مصحفیؔ نے اہلِ حرم کے بیان کی اس طرح منظرکشی کی ہے ۔

روروکہے تھیں زینبؑ و کلثوم ہائے ہائے
بھائی ہمارے سیدِ مظلوم ہائے ہائے

خیمے میں ہر طرف تھی مچی دھوم ہائے ہائے
جب شہربانو پیٹے تھی سرور کے واسطے

امام حسینؑ کی شہادت سے نہ صرف بنی نوعِ انسان بلکہ نظامِ فطرت بھی متاثر ہوا۔ مصحفیؔ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ۔

پہلے تو آب دیدہ ہوئی چشمِ آفتاب
چاہا یہ صبح نے میں اسے اپنا دوں نقاب

پھر آسماں سے مانگ کے لایا کہیں سحاب
چادر کبود لاشۂ بے سر کے واسطے

امامؑ کی شہادت کے بعد ان کے اہلِ حرم پر کیا گزری سفر میں کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں۔ قید خانے میں کتنی تکلیفیں ہوئیں اور ظلم سہے۔ مصحفیؔ قافلۂ اہلِ حرم کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ

جاتا تھا بے کسوں کا جو کوفے کو کارواں
مت پوچھو حالِ عابدِ بیمار و ناتواں

اپنے قدم کو اس کو اٹھانا تھا حد گراں
ہر آبلہ تھا پاؤں کا لشکر کے واسطے

مصحفیؔ نے مرثیے کا مقطع بھی کہا ہے جو مندرجہ ذیل ہے ۔

مضطر ہے مصحفیؔ غمِ دنیا سے دیجئے
یا مرتضیٰ علیؑ مری عمر خضی کو کیجئے

مداحِ اہلِ بیتؑ کا اک کام کیجئے
آزادی اس غلام کو قنبر کے واسطے

اس مرثیے کے علاوہ مصحفیؔ کے باقیات میں اکثر ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے مصحفیؔ کی اہلِ بیتؑ سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ دراصل وہ اولادِ رسولؐ سے خاص عقیدت رکھتے تھے تو اسدِ رسولؐ کا ان کی نظر میں حد درجہ احترام تھا اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنی عمر کا کافی حصہ لکھنؤ جیسے ماحول میں گزارا اور اپنے شعور کے تانے بانے امروہہ جیسے مرکزِ عزائے حسینؑ کے ماحول میں پہلے ہی بُن چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ۔

یہ تعزیہ خانہ ہے حسینؑ ابن علیؑ کا

یاں بات نہ بے جا کسی انساں سے نکل جائے

قریب پہنچے جو رحلت کے دن سمجھ کر بات

کیا نبیؐ نے علیؑ کو وصی بہ خُم غدیر

کہ یعنی بعد مرے ہو یہ جانشیں میرا

کریں متابعت اس کی سبھی صغیر و کبیر

تم مصحفیؔ خستہ کو ہر غم سے چھڑا دو

یا ابنِ علیؑ یہ بھی تو اثنا عشری ہے

جو علیؑ کا حکم نافذ نہ فلک پہ تھا تو پھر کیوں

بگہہ غروب آیا نکل آفتاب اُلٹا

(اوصاف علی صفحہ ۳۴)

درحقیقت مصحفیؔ کی اصل حیثیت ایک غزل گو کی شکل میں ہے اور ان کے مقام و معیار کے بارے میں اب تک اتنا لکھا گیا ہے کہ اہلِ نظر اس سے خوب واقف ہیں۔ البتہ مصحفیؔ بحیثیت مرثیہ نگار کس مقام کے مالک ہیں یہ بات قابلِ غور ہے اور یہ فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب ہم مصحفیؔ کے عہد پر پوری طرح نظر رکھیں اور یہ مدِ نظر رکھیں کہ اس وقت نہ صرف انیسؔ و دبیرؔ پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ضمیرؔ و خلیقؔ اور دلگیرؔ و فصیحؔ کے بھی مراثی نہیں تھے اس وقت مصحفیؔ نے مرثیہ کہا ہے تب ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ کسی بھی طرح اپنے ہم عصر شعراء سے پیچھے نہیں ہیں۔

سیّد جعفر نذر جعفری

نسلِ حسین شرف الدین شاہ ولایت میں سید محمد میر عدل جیسے نام ور عالم و منصبدار ہوتے ہیں۔ میر عدل کے ایک فرزند سید ابوالحسن ہوتے جن کے نام پر امروہہ میں ایک محلہ دربار شاہ ابوالحسن (دشٹھی) آباد ہوا ابوالحسن کی اولاد میں کئی نسل کے بعد سید علی نذر نظر ہوتے جن کے بارے میں سید رحیم بخش لکھتے ہیں کہ

"بحسبِ فرمان سنہ جلوس احمد شاہ بادشاہ بہ رسالہ مرزا علی خان یا نصدیذات کے منصب پر ممتاز تھے و نیز اولاد سید بھیکا موصوف میں اور بھی منصب دار گزرے ہوں گے۔ چوں کہ کاغذاتِ دیرانہ و اسناد شاہی ساداتِ امروہہ کے کثرت سے تلف ہوگئے اور جو باقی ہیں وہ نمونہ از خروارے واندکے بسیارے کا مضمون ظاہر ہے لہٰذا بلا معائنہ کسی تحریر سابقہ کے اور کسی کا نام درج جدول ہذا نہیں ہوا۔" (تواریخ واسطیہ صفحہ ۲۷۵)

سید علی نذر نظر ہی کے لائق فرزند سید جعفر نذر جعفری ہوتے ہیں۔ جعفری کے بارے میں رحیم بخش کا بیان ہے کہ

"یہ زیارات۔ عتبات عالیات سے شرف یاب تھے اور بڑے وضع دار متقی و پرہیز گار

زاہد و ابرار ذی علم و خوش خط و مشہور و نامدار تھے۔ نواب والیِ رام پور ان سے بہت اعزاز و تکریم و خاطر و تواضع سے پیش آتے تھے۔ غرض کہ یہ بڑے بزرگ منش باوقار تھے۔" (صفحہ ۲۷۳-۲۷۴)

جعفری کی ولادت و وفات کے سلسلے میں کتب تواریخ خاموش ہیں۔ لیکن جعفری کے والد سید علی نذر نظر جو خود اپنے وقت کے ممتاز شاعر تھے ان کے سلسلے میں مولوی بشیر حسن لکھتے ہیں کہ

"ولی دکنی کے تلامذہ میں تھے میر سعادت امروہوی کے ہم عصر تھے ان کا انتقال ۱۲۱۰ھ میں ہوا۔"

دوسری جانب جعفری کے فرزند مولوی سید احمد نذر کی سنِ وفات رحیم بخش اپنی تاریخ میں ۱۳۱۰ھ لکھتے ہیں۔ تیسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت جعفری کی چھٹی نسل امروہہ میں موجود ہے ایک صدی میں تین نسلوں کے اصول سے اگر دیکھا جائے تب بھی جعفری کا عہد بارہویں ہجری کا تیسرا ربع یا چوتھا ربع سے تیرہویں ہجری کا دوسرا ربع یا تیسرا ربع ہوگا راقم کو جعفری کا جو مرثیہ حاصل ہوا ہے اس پر سنِ تحریر ۱۲۳۹ھ لکھا ہوا ہے ممکن ہے یہ مرثیہ اس سے بھی قبل کی تصنیف ہو۔

جعفری کا جو مرثیہ راقم نے تلاش کیا ہے اس میں صرف ۲۹ بند ہیں۔ یہ مرثیہ سید محمد اکبر مرحوم (محلہ کٹہرہ غلام علی) نے دیا تھا۔

مرثیہ کا مطلع اس طرح ہے ؎

اصغرؑ جو رن میں موت کے مہمان ہو چکے ۔۔۔ پیکان کھا کے شاہ پہ قربان ہو چکے
بے شیر تین روز کے بے جان ہو چکے ۔۔۔ بانو پکاری لو مرے نادان ہو چکے
گھر فاطمہؑ کے لال کا سنسان کر گئے
اصغرؑ ہماری گود کو ویران کر گئے

آگے چل کر کہتے ہیں کہ

ہے ہے ابھی تو جھولے میں کرتے تھے ماں نثار
ہے ہے کبھی تو غش کبھی ہوتے تھے ہوشیار

ہے ہے ابھی تو تکتے تھے ماں کو بحالِ زار
وہ ننھی ننھی پتلیاں پھرتی تھیں بار بار

ماں بہنوں پر پھوپی پہ نگاہیں تھیں یاس سے
ہے ہے ابھی تو ہچکیاں لیتے تھے پیاس سے

اے نورِ چشم گھر کے اُجالے نثار ماں
ہے ہے ہمارے ہنسلیوں والے نثار ماں

مجھ غم زدہ کی گود کے پالے نثار ماں
ماں کو بھی اپنے پاس بُلالے نثار ماں

ڈھونڈو گے عین خواب میں مادر کے ساتھ کو
واری اکیلے نیند نہ آئے گی رات کو

اس مرثیے میں حضرتِ علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد کے حالات بیان کئے گئے ہیں وہی قدیم رنگ اس دور کا نظر آتا ہے۔ جعفری کہتے ہیں کہ ؎

گھر سے چلے تھے کہہ کے یہ سلطانِ روزگار
ہے ہے مری طرف کو ہمکتے تھے گلِ عذار

آنکھوں سے میرے لال کی حیرت تھی آشکار
وہ ننھے ننھے ہاتھ اُٹھاتے تھے بار بار

واری جو لے چلی تھی اجل تم کو گھیر کے
مادر کو تکتے جاتے تھے مُنہ پھیر پھیر کے

کہتے یہ بات سن کے شہنشاہِ کربلا
جھولے میں رکھ کے لاش کو بانو نے یوں کہا

لو اب نہ بھوک ہے نہ انہیں پیاس ہے گلا
مانگیں گے اب دودھ نہ روئیں گے مہ لقا

دیں وار ان کی پیاس پہ روئیں گے حشر تک
تم سے چھٹے یہ قبر میں سوئیں گے حشر تک

مقطع میں کہتے ہیں کہ ؎

اس بین پر تڑپتی تھیں سیدانیاں تمام
قاصد سے پھر حسینؑ نے رو کر کیا کلام

تو جا کہ اب حسینؑ ہے اور شمر کی حسام
بس جعفری تڑپتے ہیں مجلس میں خاص و عام

ہے بزم غم میں رنج و تعب سامعین کو
باقی نہیں ہے ہوش بھی اب سامعین کو

یہ مرثیہ محلہ کٹرہ غلام علی امروہہ کے ایک اور بستے میں بھی بقلم حیدر بخش حیدرؔ موجود ہے اور سن تحریر ۱۹۰۷ء درج ہوتی ہے اس مرثیے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جعفریؔ کے کلام میں روانی زبان میں صفائی اور انداز میں درد و کرب پایا جاتا ہے۔ جذبات نگاری، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری پر بھی وہ اچھی مہارت رکھتے تھے۔

جعفریؔ کی غزل کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

نوجواں آگے گئے ہم پشت پرخم رہ گئے
شاد و خرم سب گئے ہم چشم پرنم رہ گئے

زندگی پر اپنی ہم کرنے کو ماتم رہ گئے
زیبِ عالم چل بسے ہم ننگِ آدم رہ گئے

جعفریؔ فارسی کے بھی اعلیٰ شاعر تھے۔

سیّد نجیب الدین صفدرؔ

سید محمد شفاعت جنھوں نے امروہہ کا محلہ شفاعت پوتہ آباد کیا اولادِ شاہ ولایتؒ میں بڑے نامور گزرے ہیں۔ محمد شفاعت کی نسل میں سید نجیب الدین صفدرؔ بارہویں صدی ہجری کے بالکل آخر میں ہوئے ہیں اور تیرہویں صدی ہجری کے نصف کے بعد تک حیات رہے۔ صفدر کا ذکر یوں تو تمام مورخین نے کیا ہے لیکن صاحب اصغری نے شجاعت اور تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ۔

"محمد امین کو عہدِ محمد شاہ میں پانصدی ذات کا منصب ملا۔ ان کے پوتے سید نجیب الدین صفدرؔ بن فصیح الدین بڑے دلاور تھے چنانچہ موضع مان پور دیہ معافی اپنے میں ایک شیر بضرب شمشیر مارا تھا اور بہ سبب ورع اور تقوی کے مسجد اشرف المساجد کی امامت ان سے متعلق تھی۔ رسالہ علم القوس ان سے یادگار ہے۔

(صفحہ ۱۱۴-۱۱۵)

صفدرؔ کے دو پسر سید سراج الدین احمد سراجؔ (شاگردِ میر انیس) اور سید غازی الدین

احمد ہوئے۔ دونوں اپنے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ صفدر کے مراثی کی تعداد کا اندازہ تو نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک مرثیہ جو راقم کو حاصل ہو سکا ہے وہ امروہہ کے کئی بستوں میں موجود ہے لیکن سید شانِ حیدر محلہ گذری، سید عتیق حسن چاہ غوری اور سید رضا حیدر مرحوم دربار شاہ ولایت کے خاندانی بستوں سے یہ مرثیہ مع مقطع ملا ہے۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

شاہِ نجف کے باغ میں گلچیں قضا ہے آج
باغِ جہاں کی اور ہی آب و ہوا ہے آج
کشتِ نبیؐ پہ بارشِ ابرِ بلا ہے آج
بے آب غرق کشتیِ آلِ عبا ہے آج
لاشے ہیں گل رخوں کے برابر پڑے ہوئے
شبیرؑ مثلِ سرو ہیں تنہا کھڑے ہوئے

چند بند اور ملاحظہ ہوں۔

جاری ہیں اشک آنکھوں سے اور منھ سے آہ آہ
لب خشک، رنگ زرد نظر سوئے قتل گاہ
لاشِ پسر پہ کرتے ہیں حسرت سے جب نگاہ
کہتے ہیں ان کے مرنے سے ہم ہو گئے تباہ
سقّائے اہلِ بیت کو جب یاد کرتے ہیں
دریا کی سمت دیکھ کے فریاد کرتے ہیں

للہ رحم کھاؤ مری کچھ خطا نہیں
دو دن ہوئے کہ پانی سے لب آشنا نہیں
فریاد کی جو میری سماعت ذرا نہیں
یارو! میں کیا نواسۂ خیر الوریٰ نہیں
محروم آبِ نہر سے میں ہوں یہ قہر ہے
زہرؑا کا میں پسر ہوں یہ زہرؑا کا مہر ہے

جنابِ زینب فرماتی ہیں کہ

اے سرو بوستانِ رسالت کہاں گرے
اے نورِ چشمِ شاہِ ولایت کہاں گرے
اے آفتابِ برجِ امامت کہاں گرے
اے بضعۂ نبیؐ کی بضاعت کہاں گرے

بیکس بہن کو بھائی تمہاری تلاش ہے
جنگل میں لاش ہے کہ ترائی میں لاش ہے

مقطع ملاحظہ ہو۔

صفدر اب آگے تاب نہیں بند کر زباں
گذرا جو اہلبیت پہ کس منہ سے ہو بیاں
کافی ہے حشر تک یہی بس نالہ و فغاں
آلِ نبیؐ کا لٹ گیا جنگل میں کارواں

یوں اہلبیتؑ ختم رسلؐ در بدر پھرے
اونٹوں پہ بیبیاں نیزوں پہ مردوں کے سر پھرے

اس مرثیے کے کُل بند ۳۳ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مرثیہ خواں حضرات نے اپنے اپنے لئے انتخاب کر لیا تھا ورنہ یقیناً اس کے اور بھی بند ہوں گے۔

سیّد یعقوب علی معجز

اولادِ سیّد حسین شرف الدین میں سید غلام اسد اللہ بڑے نامور ہوئے ہیں۔ ان کے ایک فرزند سید سعادت اللہ ہوئے ان کے بارے میں صاحب واسطیہ لکھتے ہیں کہ

"رئیس منش الوالعزم ذی حشم بخت بلند ہوش مند تھے دیوان خانہ رفیع الشان ان کے والد اسد اللہ خاں کا ان کے وجود مغتنم سے پُر رونق اور آباد رہا۔ مرجع انام ایسے تھے کہ تمام شہر کے سرپنچ مقبول رہے۔ کارِ تولیت مسجد و مدرسہ بھی انجام دیتے رہے۔ (صفحہ ۲۵۲۔۲۵۳)

سیدِ غلام اسد اللہ کے پوتے اور سید سعادت اللہ کے نامور فرزند سید یعقوب علی معجز تھے۔

معجز کے بارے میں سید رحیم بخش لکھتے ہیں کہ:-

"یہ بڑے رنگین طبع، خوش باش و خوش وضع، رفیق پرور، پاکیزہ نفس نظم و نثر میں دقیقہ رس تھے، اکثر عمر کو شعر و شاعری مداحی و مرثیہ گوئی میں صرف

کرتے رہے ان کی تصنیفات سے چند دیوان و چند رسالے مثل افسانہ دلکشا و چار چمن وغیرہ اور بہت سے سلام و مرثیے مرتب ہوئے مگر اکثر تصنیفات پریشان ہو گئے چند مرثیے و سلام ان کی باقیات صالحات موجود ہیں۔ شیخ مہدی علی خاں متخلص بہ زکی ملک الشعرا ساکن مرادآباد کے شاگردِ رشید ہیں۔ معجز تخلص تھا بلکہ مہدی علی خاں موصوف نے واسطے اصلاح شاگردوں کے اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور اجازت نامہ مورخہ ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بہ مہر ملک الشعرائی اپنی ان کو عنایت کیا سب شاگردوں پر فائق جانتے تھے۔ ان کے کوئی عقب باقی نہیں رہا۔ (تواریخ واسطیہ صفحہ ۴۶۸-۴۶۹)

صاحب تاریخ اصغری نے معجز کی مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ ایک مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن آج زمانے کے ہاتھوں سب کچھ اسی خاک میں مل چکا ہے۔ نہ کوئی تصنیف ملتی ہے نہ مراثی، صرف نام باقی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ معجز کے کوئی عقب باقی نہیں رہا۔ امروہہ کی تواریخ کے علاوہ تذکرۃ النساخ و شیر میں صفحہ ۴۴۹ پر معجز کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کی لائبریری کراچی میں موجود ہے۔

جہاں تک معجز کی ولادت و وفات کا سوال ہے تواریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا البتہ ان کی زندگی کے چند حوالے ملتے ہیں انھوں نے مولوی سید محمد سیادت کی تاریخ وفات ۱۲۶۰ھ میں کہی۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو وہ جانشین زکی مرادآبادی ہوئے۔ اشرف المساجد کی تاریخ امروہہ کے تمام نامور شعرا نے ۱۳۰۱ھ میں کہی جس میں ؔ کا نام نہیں ہے اس کے معنی ہیں کہ وہ اس سے قبل انتقال کر چکے تھے لہٰذا معجز کا دور تقریباً ۱۲۱۰ھ سے ۱۲۹۰ھ تک کا ہے۔

زکی مرادآبادی کے جانشین ہونے کے سبب زکی کے تمام شاگرد معجز کے بھی شاگرد تھے لیکن صفی امروہوی آپ کے مخصوص شاگرد تھے۔

راقم الحروف نے معجزؔ کے کلام کی جب بہت زیادہ تلاش کی تو صرف چند سلام حاصل ہو سکے۔ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

بن بھائی کے جب سوئے وطن جائے گی زینبؑ
اے مجرئی ہم چشموں میں شرمائے گی زینبؑ

اکبرؑ سے یہ زینبؑ نے کہا رو کے بلائیں
تم رن کو اگر جاؤ گے مر جائے گی زینبؑ

تو ذاکرِ فرزندِ علیؑ اور بتولؑ ہے
معجزؔ تجھے فردوس میں لے جائے گی زینبؑ

اے سلامی قتل جب زہراؑ کا پیارا ہو گیا
حشر کا ساماں جہاں میں آشکارا ہو گیا

ہوں گی آساں ایک دم میں معجزؔ اپنی مشکلیں
مہرباں جس وقت بس آقا ہمارا ہو گیا

کب شہ کا سلامی ہے کوئی ہم سے زیادہ
ہم رکھتے ہیں سر خم فلکِ خم سے زیادہ

اے اہلِ عزا اشک تمہارے جو رواں ہیں
زخمِ تنِ شہ کو ہیں یہ مرہم سے زیادہ

کہتی تھی سکینہؑ کہ اب پانی پیوں گی !
یہ پانی تو ہے میرے لئے سم سے زیادہ

بے آب ہوا خشک گلستانِ امامت
بلبل کے رواں اشک ہیں شبنم سے زیادہ

ہے حضرتِ رحمٰن سے تلمذ ہمیں معجزؔ
کیا اہلِ زباں ہو گا کوئی ہم سے زیادہ

مجرئی ہو در شہ تک جو رسائی میری
شرفِ مرتبۂ جم ہو گدائی میری

نہ پدر ہیں، نہ برادر ہیں، نہ عمو افسوس
قیدِ ظالم سے ہو کس طرح رہائی میری

بس تمنّا ہے یہی دل کی مرے اے معجز
یعنی شبیرؑ کے در تک ہو رسائی میری

اے مجرئی نہیں ہیں نبیؐ و امامؑ دو — ظاہر ہیں گرچہ احمدؐ و حیدرؑ ہیں نام دو
خدمت میں اُن کی بھی ذرا تو بھی سلام دو — ہیں خاصۂ خدا وہ علیہ السلام دو
نور دو چشم فاطمہ و جانِ مرتضیٰؑ — شہزادے ہیں وہ سبطِ رسولِ انامؐ دو
مسموم ایک دوسرا مظلومِ کربلا — یہ ہیں شفیعِ اُمّتِ خیر الانام دو
فرمایا شہ نے اے علی اکبرؑ یہ کیا کیا — اس وقت داغ تم تو نہ اے لالہ فام دو

معجز کی آرزو ہے کہ جنّت میں یا علیؑ
کوثر کا اپنے دستِ مبارک سے جام دو

سلامی جب لٹا یا گود سے بے شیر جھولے میں
تو روئی منھ پہ منھ رکھ بانوئے دلگیر جھولے میں

سے کیونکر زمانہ ہو نہ بانو کی نگاہوں میں
کہ اصغر کی نہ جب ہو چاند سی تصویر جھولے میں

قیامت کی گھڑی تھی خیمۂ شہ میں وہ اے معجز
ہوا جب حالِ اصغر پیاس سے تغیر جھولے میں

معجز نے ایک بہت طویل سلام کہا ہے جس میں تقریباً ۴۵ اشعار ہیں۔ مختلف شہداء کا اس میں ذکر ہے۔ چند اس طرح ہیں۔

کرتا ہوں مجرئی یہ دعا ذو المنن سے میں
یارب ہوں مستفیض درِ پنجتن سے میں

دائمی ہوں یہ خدا اے زمین و زمن سے میں
آنکھیں ملوں ضریحِ حسینؑ و حسنؑ سے میں

رکھتا ہوں شوق بزمِ غمِ پنجتن سے میں
کم جانتا ہوں خُلد کو اس انجمن سے میں
عشقِ حسینؑ رکھتا ہوں دجۂ حسنؑ سے میں
کیونکر نہ اگلوں لعل و زمرد دہن سے میں
فضلِ خدا سے یاں وہ تعلّی ہے ذہن کو
مضمونِ تازہ لاتا ہوں چرخ کہن سے میں
قاسمؑ یہ جی میں کہتے تھے شادی ہوئی ہے رات
مرنے کی آج کیونکہ رضا لوں دلہن سے میں
زخمی گلا ہے طوق سے عابدؑ یہ کہتے تھے
کیونکر چھپاؤں گا اسے اہلِ وطن سے میں
دنداں شکن ہوں کیوں نہ یہ مضموں پئے حسود
رکھتا ہوں واسطہ شہِ خیبر شکن سے میں
مشہور کیوں نہ ہوں عرب معجزؔ بیانیاں
مجھ سے جہاں میں زندہ سخن ہے سخن سے میں

راقم کو معجزؔ کا ایک قطعہ تاریخ بھی حاصل ہو سکا ہے۔ جو صفتِ صوری و معنوی میں ہے۔ ۱۶۔ اشعار ہیں قطعہ فارسی میں ہے اور مولوی سید محمد سیادت ولد مولوی سید محمد عبادت کی وفات پر کہا گیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بعین فکر سنین وفات اے معجزؔ	دمی کہ ہاتف غیبی بگفت در گوشم
ہزار سال دو صد و پنج تاریخش	لوشتم وعدد حرف حرف بشمردم

افسوس ہے کہ وہ شاعر جس کے کئی دیوان ہوں، آج اُس کے صرف یہ چند اوراقِ پریشاں باقی رہ جائیں۔

سیّد حیدر حسین یکتا

امروہہ فیروز شاہ تغلق کے دور سے امام علی نقی علیہ السلام کی اولاد کا مولد و مسکن چلا آرہا ہے۔ سادات نقوی ہر طرح سے پھل پھول رہی تھی کہ شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں سادات کے ایک اور خاندان کا یہاں اضافہ ہوا اور وہ ہے اولادِ امام محمد تقی علیہ السلام۔ اس خانوادۂ علم و ادب کے مورثِ اعلیٰ شہنشاہ بابر کے ہمراہ سبزوار سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کی اولاد پہلے زید پور میں آباد ہوئی، وہاں سے سید محمد اشرف دانشمند سکونت ترک کر کے امروہہ پہنچے اور نقوی سادات میں اس طرح گھل مل گئے کہ نسلی تعلق بھی پیدا ہو گیا۔

سید محمد اشرف کو مورخین نے سید العلماء، زبدۃ الفضلاء، حاجی، زاہد و متقی، شریف و نجیب، فقیہہ، پشتینی رئیس، اور دانشمند لکھا ہے۔ سید محمد اشرف کی نسل میں سید حیدر حسین یکتا ابنِ حاجی سید خادم حسین ہوئے۔ صاحب واسطیہ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

"ان کو استعدادِ علم عربی میں کافی تھی یہ بڑے لائق و ذی علم تھے اور یہ علاقہ"

بجرت پور میں ملازم تھے، بعدہٗ محکمۂ بندوبست ضلع بجنور میں عرصے تک منسلک رہے۔ انھوں نے عالمِ جوانی میں انتقال کیا۔ (صہ ۲۶۱)

سید صغیر حسین کا بیان ہے کہ۔

"مولوی سید حیدر حسین یکتا ابنِ سید خادم حسین سرآمد طلبائے جیدۃ الاستعداد، علم فقہ و اصولِ ادب و معقول و منقول کے ماہر تھے۔ عنفوانِ شباب میں ہی علم مساحت و ہندسہ و ہیئت میں مہارتِ تامہ حاصل کی تھی۔ شاعر کامل و یکتا تھے

(انوارِ قمر صہ ۱۲)

یکتا کی ولادت و وفات کے سلسلے میں تاریخ میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ صرف عالمِ جوانی میں انتقال کا ذکر ملتا ہے۔ راقم نے جب یکتا کے پرپوتے استادِ محترم مولانا نسیم امروہوی قبلہ سے دریافت کیا تو انھوں نے یکتا کی سنِ وفات ۱۸۷۶ء بتائی اور تقریباً ۴۰ سال عمر بتائی اس طرح یکتا کی ولادت تقریباً ۱۸۳۶ء میں ہوئی ہوگی۔ صاحبِ انوارِ قمر نے آپ کو خلیق و سخی اور متواضع بھی لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ان کے مہمان خانے میں ہمیشہ طالبانِ علم اور علمائے کرام مقیم رہتے تھے اور آپ کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے چنانچہ مولوی سید اکبر حسین بجرت صاحب تاریخ زیدیہ نے بھی بلا تردد سن و سال آپ سے کتب درسیہ صرف و نحو پڑھی تھیں آپ نے مرضِ قرحہ مثانہ میں رحلت فرمائی

یکتا کی شادی سے متعلق سید ظہور الحسن فروغ سیتاپوری "شجراتِ طیبات" میں لکھتے ہیں کہ سید حیدر حسین یکتا ابن سید خادم حسین کی شادی دختر سید سلامت علی محلہ قاضی زادہ امروہہ سے ہوئی۔ ایک پسر سید جواد حسین چھوڑ کر انتقال کیا (صہ ۱۱۴)

یکتا کی مرثیہ نگاری کا ذکر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے اپنی کتاب "بزم نگارانِ کربلا" میں ان الفاظ میں کیا ہے کہ "نسیم امروہوی کے پردادا سید حیدر حسین یکتا تھے (نسیم امروہوی کے والد) ان کے متعدد مرثیے امروہہ میں پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً"

مصرع۔ جب آئے بنی فاطمہؑ زندانِ بلا میں

یکتا صاحب کا ایک مکمل مرثیہ۔

مصرع۔ نیرنگیٔ ریاضِ جہاں یادگار ہے" ہے۔

راقم السطور کو مولانا نسیم امروہوی نے بتایا کہ یکتا کے مراثی ان کے پاس موجود ہیں۔ یکتا کا ایک مصرع امروہہ کے بہت سے بزرگوں کو یاد ہے اور بہت مقبول ہے۔ کسی مرثیے کی بیت کا مصرع ہے مصرع۔ دانا بھی بھول جاتے ہیں تسبیح بھوک میں۔

یکتا کا مرثیہ مصرع جب آئے بنی فاطمہ زندانِ بلا میں

۳۰ بندوں پر مشتمل ہے مسدس مرثیہ ہے۔ اس میں ایک کہانی نظم ہوئی ہے جو شاعر کے عقیدے میں حضرت زینبؑ نے قید خانے میں جناب سکینہ کو بہلانے کے لئے سنائی تھی۔ یکتا کے ایک طویل قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کدھر ہے ساقیٔ گل رو پلائے گلنار — کہ مژدۂ و سقاہم سنا رہی ہے بہار
مطہرات میں ہے آفتاب لے مہ رو — پلادے جام کہ عصیاں سے پاک ہوں میخوار
وہ مے جو بزم جہاں میں صفائے قلبِ مسیحؑ — وہ مے کہ جس کے سبب نوحؑ کا ہو بیڑا پار
وہ مے کہ موسیٔ عمراں کو جس سے مدہوشی — وہ مے کہ جس سے جنابِ خلیلؑ بھی سرشار
وہ مے کہ جس کی ازل سے ہے چاہ یوسفؑ کو — وہ مے شبابِ زلیخا کی جو ہے آئینہ دار

تشبیب اور ساقی نامے کے بعد مدح ملاحظہ ہو۔

علیؑ امیر، علیؑ پیشوا، علیؑ سردار — علیؑ امام، علیؑ نفسِ احمدؐ مختار
علیؑ کی ضرب پہ صدقے عبادتِ ثقلین — علیؑ کی نذر کو آئی ہے چرخ سے تلوار
علیؑ رسولؐ کا بازو، علیؑ خدا کا ہاتھ — علیؑ کا قاتل و بسمل کلاھما فی النار
علیؑ شجاع و علیؑ اشجع و علیؑ غازی — علیؑ ہژبر و علیؑ حیدر و علیؑ کرار

سید سراج الدین احمد سراج

سید حسین شاہ ولایت شرف الدین کی اولاد میں میر سید مبارک مقتدر اور معزز بزرگ ہوئے ہیں۔ ان کی نسل میں سید محمد شجاعت اور ان کے بعد سید محمد امین بڑے نام ور ہوئے ہیں۔ سید محمد امین کا منصب پانصدی ذات عہد احمد شاہ بادشاہ میں تھا۔ سید محمد امین کے ایک پوتے سید نجیب الدین ہوئے۔ سید نجیب الدین کے دو فرزند ہوتے سید غازی الدین (وکیل وسفیر ریاست بانس واڑہ) اور سید سراج الدین احمد سراج

صاحب اصغری سراج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"سید سراج الدین احمد جو بعد وفات اپنے پدر بزرگوار کے مسجد اشرف المساجد کے اقامت گو ہیں۔ اول عہد محمد علی شاہ میں کوتوالی لکھنؤ کے محرر رہے اور وہیں شاعری اور مرثیہ گوئی میں سید ببر علی انیس کے شاگرد ہوئے پھر اپنے چھوٹے بھائی سید غازی الدین کے پاس بہ سمت دکن جا کر عمدہ عمدہ عہدوں پر مثل تھانے داری و تحصیل داری ریاست بھوپال کے مامور رہے اور بڑی عزت و آبرو پیدا کی اور خلعت و سارٹیفکیٹ اور پروانجات خوش نودی مزاج وغیرہ حکام سے حاصل کیے۔ نظم و نثر میں مذاق عجیب رکھتے ہیں کئی کتابیں مثل "سراج العاشقین" جس کو صاحب

ڈائرکٹر بہادر نے نہایت پسند کر کے درج رجسٹر فرمایا اور تنبیہہ پواج اور سراج المومنین اور شنبھو پسند وغیرہ ان کی تالیفات سے ہیں۔ سفرنامہ ونادر غریباں بھی لکھی"۔ (تاریخ اصغری صفحہ ۱۵)

مندرجہ بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سراج اقامت گو۔ تھانے دار اور تحصیل دار بھی رہے ہیں۔ لکھنؤ اور بھوپال میں قیام رہا ہے۔ میرانیس کے شاگرد تھے۔ نہ صرف شاعر بلکہ ادیب بھی تھے اور مرثیہ نگار بھی۔ صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" نے بھی یہی سب کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ نہایت ظریف اور خوش طبع بھی لکھا ہے۔ مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ ایک تصنیف سراج العارفین کا بھی ذکر کیا ہے۔

صاحبِ "انوارِ قم" سراج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"۱۸۶۷ء میں میر ولدار علی صاحب لکھنوی ماہرِ تعمیر کے نقشے کے مطابق امروہہ میں ایک عالی شان شاہی عمارت لکھنؤ کے ہم پلہ تیار ہو گئی اور سید سراج الدین احمد ابن سید نجیب الدین صفدر نے بڑی دلیری و بہادری سے مسجد کے بلند و بالا مینار پر چڑھ کر ــــ اذان کہی"۔ (صفحہ ۱۱۵)

سراج کے والد نجیب الدین صفدر بھی شاعر تھے۔ اس طرح سراج کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ سراج کا زیادہ تر قیام امروہہ سے باہر لکھنؤ اور بھوپال رہا اس لیے کلام بھی زیادہ تر امروہہ نہ آسکا۔ سید علی امام نقوی کراچی نے راقم کو سراج کے ایک سلام کے چند اشعار دیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں ان سے ان کے بارے میں اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی تمنا میں میرے مولا تمہارے در پر قیام ہوگا
کبھی تو جاگے گی اپنی قسمت کبھی تو اپنا سلام ہوگا

رہا ہوں لہو و لعب میں مولا کبھی نہ سمجھا یہ اپنے دل میں
کہ میری عمرِ رواں کا اک دن جہاں میں لبریز جام ہوگا

حبیبِ خالق کے زلف و رخ کی لکھی ہے شرح سراج تم نے
تمہارے مضمونِ نو کا چرچا جہاں میں ہر صبح و شام ہوگا

سیّد سراج الدین احمد سراؔج

سید حسین شاہ ولایت شرف الدین کی اولاد میں میر سید مبارک مقتدر اور معزز بزرگ ہوئے ہیں۔ ان کی نسل میں سید محمد شفاعت اور ان کے بعد سید محمد امین بڑے نام ور ہوئے ہیں۔ سید محمد امین کا منصب پانصدی ذات عہد احمد شاہ بادشاہ میں تھا۔ سید محمد امین کے ایک پوتے سید نجیب الدین ہوئے۔ سید نجیب الدین کے دو فرزند ہوئے سید غازی الدین (وکیل وسفیر ریاست بانس واڑہ) اور سید سراج الدین احمد سراؔج

صاحب اصغری سراؔج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"سید سراج الدین احمد جو بعد وفات اپنے پدر بزرگوار کے مسجد اشرف المساجد کے اقامت گو ہیں۔ اول عہدِ محمد علی شاہ میں کوتوالی لکھنؤ کے محرّر رہے اور وہیں شاعری اور مرثیہ گوئی میں سید ببر علی انیس کے شاگرد ہوئے پھر اپنے چھوٹے بھائی سید غازی الدین کے پاس بہ سمت دکن جا کر عمدہ عمدہ عہدوں پر مثل تھانے داری و تحصیل داری ریاست بھوپال کے مامور رہے اور بڑی عزت وآبرو پیدا کی اور خلعت وسارٹیفکیٹ اور پروانجات خوش نودی مزاج وغیرہ حکام سے حاصل کیے۔ نظم ونثر میں مذاق عجیب رکھتے ہیں کئی کتابیں مثل "سراج العاشقین" جس کو چھاپ

ڈائرکٹر بہادر نے نہایت پسند کر کے درج رجسٹر فرمایا اور تنبیہ پوچ اور سراج المومنین اور شنبھو پسند وغیرہ ان کی تالیفات سے ہیں۔ سفرنامہ و زاد غریباں بھی لکھی۔" (تاریخ اصغری صفحہ ۱۵)

مندرجہ بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سراجؔ اقامت گو۔ تھانے دار اور تحصیل دار بھی رہے ہیں۔ لکھنؤ اور بھوپال میں قیام رہا ہے۔ میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔ نہ صرف شاعر بلکہ ادیب بھی تھے اور مرثیہ نگار بھی۔ صاحب "تواریخ واسطیہ" نے بھی یہی سب کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ نہایت ظریف اور خوش طبع بھی لکھا ہے۔ مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ ایک تصنیف سراج العارفین کا بھی ذکر کیا ہے۔

صاحب "انوار قم" سراجؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"۱۸۶۷ء میں میر ولدار علی صاحب لکھنوی ماہر تعمیر کے نقشے کے مطابق امروہہ میں ایک عالی شان شاہی عمارت لکھنؤ کے ہم پلہ تیار ہو گئی اور سید سراج الدین احمد ابن سید نجیب الدین صفدرؔ نے بڑی دلیری و بہادری سے مسجد کے بلند و بالا مینار پر چڑھ کر ____ اذان کہی۔" (صفحہ ۱۱۵)

سراجؔ کے والد نجیب الدین صفدرؔ بھی شاعر تھے۔ اس طرح سراجؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ سراجؔ کا زیادہ تر قیام امروہہ سے باہر لکھنؤ اور بھوپال رہا اس لیے کلام بھی زیادہ تر امروہہ نہ آسکا۔ سید علی امام نقوی کراچی نے راقم کو سراجؔ کے ایک سلام کے چند اشعار دیئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں ان سے ان کے بارے میں اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی تمنا میں میرے مولا تمہارے در پر قیام ہوگا
کبھی تو جاگے گی اپنی قسمت کبھی تو اپنا سلام ہوگا

رہا ہوں ہو لعب میں مولا کبھی نہ سمجھا یہ اپنے دل میں
کہ میری عمر رواں کا اک دن جہاں میں لبریز جام ہوگا

حبیب خالق کے زلف و رخ کی لکھی ہے مدح سراجؔ تم نے
تمہارے مضمون تو کا چرچا جہاں میں ہر صبح و شام ہوگا

سراؔج کے ایک قصیدے کا مطلعِ ثانی بھی ملاحظہ ہو ؎

یہ کس کی آمد آمد ہے جو کُل عالم منور ہے

سراؔج اب کیوں مثالِ شمعِ محفل زیبِ منبر ہے

سید رحمت علی ولد سید حسین علی کی تاریخ وفات بھی سراؔج نے فارسی میں کہی ہے جس سے ۱۲۸۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔

آنکہ مصاحب علی صاحب زہد و تقا | بود عزادار خاص بہر حسینؑ ذکی

بست چو رخت از جہاں گشت شروش از سراؔج | یکہ بسوئے ارم رفت مصاحب علی

یہ تاریخ صاحب "واسطیہ" نے صفحہ ۲۱۶ پر دی ہے۔

سراؔج کی دو تاریخیں اور بھی حاصل ہو سکیں ہیں ایک "تحقیقِ جگر" (دیوان فرقتی) اور دوسری "تہیا الصنائع" (مصنف ابوالحسن فرقتی) کی طبع پر کہی گئی ہیں سراؔج کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت "تحقیقِ جگری" میں دی ہوئی ہے جس سے ان کے مقام و منزلت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"قطعہ تاریخ از نتائج طبع عالی و افکار معالی ناظم زماں ناشر دوراں درۃ التاج سید سراج الدین احمد سراؔج شاگرد جناب قدوۃ الذاکرین عمدۃ الطاہرین اوستاد خفی و جلی سید ببر علی متخلص بہ انیسؔ نور اللہ مرقدہ" (صفحہ ۱۴۶)

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بوالحسن ذی شرف رتبہ بہ شیریں سخنی

در نسب ہست حسینی بحسب ہم حسنی

کردہ دیواں چو مرتب بسخن سنجی و فہم

زیبِ دستار فصاحت شد و از عیب غنی

نام او زیب رقم کردہ تحقیق جگری

بہر عشاق دوا ساخت پئے دل شکنی

جوہر لطف سخن از کلماتش روشن
ہر غزل درِ معانی است چو دُرِّ عدنی
گفت ہاتف بہ سراج از دلِ جاں تاریخش
کایں عقیق جگری شد چو عقیق یمنی

اس سے ۱۲۹۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ "ضیا الصنائع" کی تاریخ کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں یہ بھی فارسی میں ہیں ؎

ضیا الصنائع بدیعی عجیبی
بہ صنعت لطیف و بمعنی غریبی
ہزار آفریں جودت فکرِ تقی را
کہ برگفت ازاں اہلِ معنی نصیبی
ہماں بوالحسن سید ذی متانت
عزیزی، حبیبی، شریفی، نجیبی
سراج آمد از غیب تاریخ روشن
"ضیا الصنائع" لطیفی، عجیبی

اس سے بھی ۱۲۹۷ھ برآمد ہوتے ہیں

سراج کی وفات ۹۰ سال کی عمر میں تقریباً ۱۸۹۵ء میں ہوئی اس طرح ان کی ولادت ۱۸۰۵ء میں ہوئی۔ ۹۰ سال کی عمر میں لکھنؤ اور بھوپال جیسے شہروں میں ظاہر ہے سراج نے کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ لیکن سراج کے ورثہ میں کوئی ایسا نہیں ہوا جو سراج کے کلام کو محفوظ رکھتا۔ اور اس وقت تو ان کا کوئی وارث نہیں بچا۔

سراج کی ایک چہار بیت امروہہ میں بہت مشہور تھی اب بھی کچھ بزرگوں کو اس کے بند یاد ہیں۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

یار کے کوچے تلک اب تو مجھے جانے دے

سنگِ در یار سے سر مجھے ٹکرانے دے

سراج کا ذکر ڈاکٹر تمقام حسین جعفری نے اپنی مشہور کتاب شاگردانِ انیس میں بھی کیا ہے۔

سیّد نذرالحسن طپش

سید نذرالحسن طپش کا تعلق نسلِ سید شرف الدین شاہ ولایت سے ہے۔ ان کے بزرگوں میں سید شجاعت علی بن سید ہزبر علی کے بارے میں سید رحیم بخش کا بیان ہے کہ

"۲ جلوس شاہ عالم بہادر شاہ کے وقت میں ان کا چہار بستی منصب تھا ۶ جلوس محمد شاہ بادشاہ میں مع اصل و اضافہ پانچ صدی ذات یک صد سوار کے منصب پر ترقی پائی اور بموجب فرمان مورخہ ۱۷ ربیع الاول ۲۵ جلوس محمد شاہ خدمت سزاولی سرشتہ موازنہ وجمدامی وغیرہ متعلقہ سرکار سنبھل کی تصحیح و ترسیل بھی ان سے متعلق تھی یہ بڑے نام دار تھے ان کا نصب کردہ ایک باغ انبہ اب تک ان کے نام سے مشہور ہے ان کے اکثر مواضعات جاگیر و زمیں داری و تعلقات قصبہ و شہر بہت تھا۔" (تواریخِ واسطیہ صفحہ ۲۶۶)

سید شجاعت علی کے فرزند سید فضل علی بھی شاہی منصب دار تھے۔ سید فضل علی کے پوتے سید ناصر حسین ہوتے سید ناصر حسین کے ہی لائق فرزند سید نذرالحسن طپش ہوئے طپش کے بارے میں صاحبِ "واسطیہ" لکھتے ہیں کہ

یہ بڑے ناظم و ناشر ذی کمال تھے تخلص ان کا طپش تھا ان کی تصنیفات سے ایک

دیوانِ اردو چند رسالے بر زبانِ اردو و سلام و مرثیہ و فارسی نظم و نثر میں یہ بڑے فصیح کلام نازک خیال باکمال مشہور و معروف تھے۔" (صفحہ ۴۸۹)

بیسویں صدی کے مورخ مولوی سید بشیر حسن نے آپ کے بارے میں کچھ معلومات اس طرح فراہم کی ہیں کہ

"سید نذر الحسن طپش امروہہ کے شعر و ادب میں ایک نمودار شخصیت کے مالک اور استادانہ قابلیت کے حامل تھے عنفوانِ شباب میں اپنے والد کی معیت میں لکھنؤ چلے گئے ناسخ کی شاگردی اختیار کی ناسخ کی وفات کے بعد میر عشق سے تلمذ کیا ۲۵ سال لکھنؤ رہے ان کے شاگرد بھی استاد کہے گئے جونپور کے قریب اکثر اضلاع میں ان کے شاگرد ہیں۔ بہت سی ادبی کتابوں کے مصنف ہیں اردو دیوان بہت سا تلف ہو گیا پھر بھی ردیف وار غنیمت ہے کہ مرتب ہو گیا لیکن افسوس کہ فارسی کا دیوان ضائع ہو گیا۔" (شجرات سادات امروہہ حصہ دوم صفحہ ۵۷)

طپش کا ذکر امروہہ کی تمام تواریخ میں مورخین نے بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ شعرا کے تذکروں میں ان کا ذکر لالہ سری رام کے تذکرے "خم خانۂ جاوید" جلد دوم کے صفحہ ۴۷ پر بھی ملتا ہے۔

مولوی سید صفی مرتضےٰ مرحوم کی تحقیق مطبوعہ "نیا دور" لکھنؤ جنوری ۱۹۵۹ء کے مطابق طپش کی ولادت تخمیناً ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور وفات ۷ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں اس طرح طپش کی عمر تقریباً ۵۶ سال ہوئی۔ جس میں ۲۵ سال لکھنؤ جیسے مقام پر گزارے لیکن مروجہ تعلیم اپنے وطن امروہہ ہی حاصل کی۔ جہاں تک ناسخ اور میر عشق سے تلمذ کا سوال ہے تو اس کے بارے میں نہ صرف مورخین کے بیانات ہیں بلکہ طپش کے دیوان کے بہت سے اشعار بھی اس کے گواہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

اے طپش ہے جو کلام اپنا بلاغت آمیز
داد ہم لیتے جو ناسخ کا زباں داں ہوتا

بہ فیضِ عشق و ناسخ ہو گیا مجھ کو طپش حاصل
کہ تیرے سامنے کھلتا ہے منہ کب ہر سخن گو کا

حسن بندش سوا نہ کیوں ہو طپش
ہم ہیں شاگرد عشق کامل کے

طپش کے ایک شاگرد شیر محمد خاں حشمؔ رئیس دولت پور ضلع بلند شہر بھی ہوتے ہیں انہوں نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے ؎

جناب ناسخ و عشق و طپش کے ہم تو پیرو ہیں
کسی کی بندش مضموں نگہ میں اپنی کیا ٹھہرے

سید اصغر حسین طپش کی تصانیف کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ

"سید منور الحسن زبانِ اردو و فارسی کے شاعر نمودار بڑے شاعر خوش گو ہیں تخلص ان کا طپش ہے ایک انشا "گلزار فیض" اور "زلیخائے نثر" موسوم بہ "اخبار عشق" بزبان فارسی میں اور ایک رسالہ "ریاض" دانش اخلاق میں اور رسالہ "تعلیم النسا" اور "قلزم فصاحت" بزبان اردو علاوہ دیوان کے ان کی تصنیفات ہیں۔" (تاریخ اصغری صفحہ ۱۵۸)

طپش کے اخلاف میں ان ایک پسر ماسٹر سید نجم الحسن انجم ہوئے جو ایک شاعر تھے نواب وقار الملک سے ان کی خاص قربت تھی امروہہ میں انگریزی تعلیم کی ترویج میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انجم کے تین فرزند رئیس حسن، رفیع حسن اور متین حسن محزوںؔ ہوئے مدیر رفیع حسن لاولد رہے۔ رئیس حسن کے دو پسر شان حسن مرحوم اور محمد شوذب ہوئے محمد شوذب بمبئی میں فلمی صنعت سے وابستہ ہیں متین حسن محزوں کی اولاد میں سید ذہین حسن (سکریٹری غالب اکیڈمی نئی دہلی) سید علی سوڈان میں سید ناصر علی کراچی پاکستان میں انجمن سادات امروہہ میں نمایاں خدمات انجام دیتے ہیں چوتھے پسر سید علی ہادی بھی کراچی میں ہیں سید ذہین حسن کے ہونہار فرزند سید شاداب حیدر زیر تعلیم ہیں۔ مورخین نے طپش کو مرثیہ نگار لکھا ہے اور اس بات کی تائید ان کے لکھنؤ میں ۵ سال

قیام سے بھی ہوتی ہے اور میر عشق سے تلمذ سے بھی۔ لیکن طپش کے مراثی یا تو ضائع ہو گئے یا پھر لکھنؤ و قرب و جوارِ لکھنؤ میں کسی ناقدرے کے پاس پوشیدہ ہیں۔ جوانی میں امروہہ سے لکھنؤ جانا اور پھر لکھنؤ میں ۲۵ سال رہنا یہ بتاتا ہے کہ مراثی لکھنؤ کے قیام میں لکھے اور وہیں رہ گئے۔ طپش کے پرپوتے سید ناصر علی (مقیم کراچی) کے پاس راقم نے اپنے دورۂ پاکستان ۱۹۸۳ء کے دوران جب قلمی دیوان دیکھا تو اس میں مراثی نہیں مل سکے کیوں کہ وہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ البتہ طپش کے چند سلام امروہہ میں مختلف مرثیہ خوان حضرات کے بستوں میں محفوظ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کب سمجھتے تھے فرشتے کہ جہاں اور بھی ہے
دیکھا جب سوتے نجف بولے کہ ہاں اور بھی ہے
قتل جب ہو چکے عباسؑ تو بولے اعدا
لشکرِ شاہ میں اک شیرِ جواں اور بھی ہے
لوگ بھولے تھے طپش اپنی زباں دانی پر
یہ نہ سمجھے کہ یہاں اہلِ زباں اور بھی ہے
مجرائی جو داغِ غمِ حیدر نہیں رکھتا
جنت میں وہ رہنے کے لیے گھر نہیں رکھتا
پانی کی تمنا بھی تو اے فرقۂ ناری
تم سے پسرِ ساقیِ کوثر نہیں رکھتا
پھر کس لیے تم مجھ کو ستاتے ہو بتاؤ
کیا تم میں کوئی دینِ پیمبرؐ نہیں رکھتا
دل سے بھی ثنا خواں ہے امامِ ازلی کا
کچھ دل میں طپش خطرۂ محشر نہیں رکھتا

آسماں کی کج ادائی دیکھیے
شہ پہ اعدا کی چڑھائی دیکھیے
کہتی تھی زینبؑ کہ بھائی دیکھیے
آکے میری بے ردائی دیکھیے
ہر گھڑی مولا طپش ہے بے قرار
کب ہو روضے تک رسائی دیکھیے

سلامی کہتی تھی یہ غم کی مبتلا زینبؑ
حسینؑ مر گئے جاتی ہے بے ردا زینبؑ
کہا یہ حضرتِ عابدؑ نے شانِ خالق ہے
کجا یہ بزمِ یزیدِ لعیں کجا زینبؑ
بلائیں بہرِ زیارت اسے حسینؑ شہید
کرو طپش کی یہ بھائی سے التجا زینبؑ

ہمیں جب صدمۂ آلِ پیمبرؐ یاد آتا ہے
سلامی دل کو اک سامانِ محشر یاد آتا ہے
بہا کرتے ہیں آنسو میری آنکھوں سے طپش ہر دم
مجھے گر روضۂ پُر نور سرورؑ یاد آتا ہے

اے سلامی مجھے خاکِ درِ شبیرؑ ملے
اسے پروا نہ ہو اصلا اگر اکسیر ملے
کہا سجادؑ نے خوش ہوں میں اک یہ عجب
طوق گردن کو ملے پاؤں کو زنجیر ملے
عمر سب کٹ گئی شبیرؑ کی مداحی میں
اے طپش کیوں نہ تجھے خلد کی جاگیر ملے

جو دنیا سے شہ کا ثنا خواں اٹھے گا

تو مجرے کو مجرائی رضواں اٹھے گا

طپشؔ رونے گا جو گل فاطمہ کو

وہ محشر میں بے شبہ خنداں اٹھے گا

اُکے شبیرؑ نے میدان میں ہر سُو دیکھا

محب رنی پر نہ کوئی مونس و دلجو دیکھا

قتلِ شبیرؑ کا اس دم ہوا صغرا کو یقیں

خون سے خاک کے شیشے کو جو مملو دیکھا

پھر نہ اس کو رہے نظارہ جنت کی ہوس

اے طپشؔ جس نے مزارِ شہِ خوشخو دیکھا

یہاں ایک سلام کے مقطع میں روضہ سرورؑ کی یاد میں رونے کا ذکر اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ طپشؔ زیارات سے بھی مشرف ہوتے تھے۔

طپشؔ کی غزلیات کا دیوان غیر مطبوعہ ہے ان کے پر پوتے سید ناصر علی اسے طبع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کاش کہ یہ کام جلد ہو سکے اور ادبی حلقے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ راقم نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی ہے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں یہ کوئی باقاعدہ انتخاب نہیں ہے۔

سیکڑوں ہوں گے وہاں چاک گریباں قاصد

اس کے کوچے کا یہ ہم تجھ کو پتہ دیتے ہیں

ہر قدم پر دست وحشت نے نئی بیداد کی

چپ ہوا تو پاؤں کی زنجیر نے فریاد کی

دل اپنا اس کی زلفِ پریشاں میں پھنس گیا
اک غم گسار تھا سو وہ زنداں میں رہ گیا

چشم کے گوشوں میں نہ سرمہ تو گلِ تر دینا
مست کے ہاتھوں میں اچھا نہیں خنجر دینا

اس غیرتِ مسیح کو دیکھا جو میرے پاس
فوراً مرے سرہانے سے آ کر قضا پھری

رقیب بیٹھا ہے محفل میں یار کے بدلے
خزاں چمن میں ہے گویا بہار کے بدلے

پھولوں سے رخسار پہ قطرے پسینے کے نہیں
ہے چراغِ گل میں پانی اور گلِ روغن میں آگ

باغ میں لالہ تو گردوں پہ قمر پُر داغ ہے
رشکِ رخ سے مہر رکھتا ہے دلِ روشن میں آگ

چوٹی میں ان کی جلوۂ مو بات سبز ہے
اندھیر ہے کہ سانپ زمرد نگل گیا

جو بد ہیں انہیں نیکوں کی صحبت کا اثر کیا
کب خار میں خو آتی ہے قربِ گلِ تر کی

طپش کے مراثی کے بارے میں ذمہ دار حضرات سے علم ہوا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم (مصنفِ دبستانِ دبیر) کے پاس بمبئی میں موجود تھے راقم نے فاروقی مرحوم کے ورثا سے حاصل کرنے چاہے لیکن ناکامی رہی۔

سیّد ابوالحسن فرقتی

سید ابوالحسن فرقتی کا تعلق نسل سید شرف الدین شاہ ولایت سے ہے۔ آپکے اسلاف کا تفصیلی ذکر آپ کے پسر سید حسن ضیاؔ کے باب میں موجود ہے۔ آپ کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ امروہہ کے مورخین نے آپ کا ذکر بڑے جلی الفاظ میں کیا ہے۔ "تاریخ اصغری"۔ "تواریخ واسطیہ"۔ "مخزنۃ التواریخ"۔ "تاریخ ساداتِ امروہہ"۔ اور "شجراتِ ساداتِ امروہہ" میں آپ کا ذکر موجود ہے آپ کے والد کا اسم گرامی سید نیاز علی تھا۔ صاحب "واسطیہ" لکھتے ہیں کہ

"یہ شاعر و ناشر خوش نویس ہیں۔ ان کے امروہہ میں بہت آدمی شعرگوئی و انشاپردازی اور املا نویسی و خوش نویسی میں شاگرد ہیں اہلِ کمال شہر لکھنؤ بھی ان کے کمال کے بہت معترف و مداح ہیں۔" (صفحہ ۲۹۷)

مولوی سید بشیر حسن اپنی کتاب "شجراتِ ساداتِ امروہہ" میں لکھتے ہیں کہ

"سید ابوالحسن فارسی میں دست گاہ کامل رکھتے تھے اردو کے بڑے شاعروں میں سمجھے جاتے تھے ہر صنفِ سخن میں شعر کہتے تھے شہر کے اکثر شعرا آپ سے اصلاح لیتے تھے نثر بھی اچھی لکھتے تھے میر انیس لکھنوی نے آپ کے لیے مسلّم الثبوت شاعر کے الفاظ لکھے تھے۔ ضیا الصنائع۔ دیوان

عقیق جگری ۔ مدحِ پیغمبر ۔ و رسالہ ضیا البدائع آپ کی تصنیفات ہیں حکیم شفا الدولہ لکھنوی نے آپ کے قصیدے کی بہت تعریف کی"۔ (صفحہ ۱۶۵)

فرقتی کی ولادت و وفات کے سلسلے میں کسی تاریخ میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن فرقتی کے پوتے سید زہیر قین مرحوم کی اہلیہ کے بیان کے مطابق ان کا انتقال تقریباً ۹۵ سال کی عمر میں ۱۳۳۰ھ میں ہوا ہے۔ اس طرح فرقتی کی سن ولادت تقریباً ۱۲۳۶ھ ہوگی۔

فرقتی نہ صرف صاحبِ دیوان شاعر تھے بلکہ اپنے دور کے رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی کلام بھی کافی ہے۔ غزل ۔ قصیدہ ۔ سلام ۔ مرثیہ ۔ قطعہ ۔ رباعی اور نظم وغیرہ فرقتی کے سرمایے میں موجود ہیں۔

فرقتی اپنے دور کے استاد اور صاحبِ دیوان شاعر تھے ان کے شاگردوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے مخصوص شاگردوں میں سید حسن ضیا ۔ سید رضا حسن رضا ۔ سید سعید حسن سعید ۔ سید حسن حسن ۔ سید خورشید حسین خورشید ۔ سید بنیاد علی بنیاد ۔ سید حامد نذر حامد ۔ شیخ محمد تسلیم احمد تسلیم ۔ دوست محمد خاں زار ۔ سید سبطِ حسن رسا ۔ سید شاکر حسین شاکر اور سید حامد حسین لامع وغیرہ تھے۔

راقم کی نظر سے فرقتی کی تصانیف میں "دیوانِ فرقتی" (معروف بہ عقیق جگری ۱۲۹۷ھ) "مدحِ پیغمبر" مطبع اعجاز محمدی آگرہ اور نسخہ میں "ضیا الصنائع" وغیرہ گزری ہیں۔ فرقتی کے دیوان میں کئی سو غزلیں ۔ قطعات ۔ رباعیات اور قصائد ہیں۔ جس کی طبع کی تواریخ فرقتی کے بہت سے شاگردوں کے علاوہ سلیم ۔ سعید ۔ برتر ۔ تجلی ۔ سراج ۔ نعیم ۔ کشمان ۔ رضا اور فیاض وغیرہ نے کہی ہیں۔ "مدحِ پیغمبر" ۱۳۰۶ھ کی فرقتی کی فارسی تصنیف ہے جس کے طبع کی تواریخ سلیم ۔ صفی اور رضی نے کہی ہیں "ضیا الصنائع" ۱۲۹۷ھ کی تصنیف ہے جس میں صنعتوں کا بیان کیا گیا ہے سب سے پہلے ۱۴۲ اشعار پر مشتمل ایک فارسی نعت ہے مندرجہ ذیل مطلع ہے ؎

محمدؐ بادشاہِ جن و انساں

محمدؐ رہ نمائے دین و ایماں

اس کتاب میں تقریباً ۳۰ صنعتوں کا ذکر مع قسموں کے کیا گیا ہے نمونے کے طور پر سلیم اور ضیا کے زیادہ تر اشعار پیش کیے ہیں۔ طبع کی تواریخ سلیم، نعیم، سراج اور سعید نے کہی ہیں۔

جہاں تک فرقتی کی مرثیہ نگاری کا تعلق ہے تو اس بات کے حوالے ملتے ہیں کہ انہوں نے مرثیے کہے ہیں اور یقیناً کافی تعداد میں کہے ہیں لیکن وہ وقت کے ہاتھوں ضائع ہوگئے کیوں کہ طبع نہ ہو سکے تھے۔ سید وجاہت حسین دربار میراں خاں امروہہ کے خاندانی بستے سے صرف ایک سرورق حاصل ہو سکا ہے کیوں کہ وہ تمام مراثی بوسیدہ حالت میں ہیں۔ مرثیہ کا مطلع ہے ؎

ع اے آفتاب برج شرافت طلوع کر

تاریخِ تحریر ۸ ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء اور تعداد بند ۱۰۲ دی ہوئی ہے۔ سرورق پر تحریر ہے کہ

"مرثیہ مشتمل بر احوالِ امام ہشتم حضرت امام علی رضا علیہ السلام در تصانیف سرِ دفتر سخن سنجانِ یکتائے زماں مسیحائے سخن میر سید ابوالحسن صاحب فرقتی رئیسِ امروہہ۔ بقلم سید سعادت حسین ساکن امروہہ محلہ نوگیاں دربار سید محمد میراں صاحب مرحوم"۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جو شاعر امام علی رضاؑ کے حال کا مرثیہ ۱۰۲ بند میں کہہ گا وہ کیسے ممکن ہے کہ شہدائے کربلا کے حال میں مرثیہ نہ کہے۔ یقیناً فرقتی نے کئی مرثیے کہے ہوں گے جو طویل بھی ہوں گے اور تمام اجزا پر مشتمل بھی ہوں گے۔ فرقتی کے سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اگرچہ ہند میں ہیں فرقتی پر ہر گھڑی دل سے

تصور میں طوافِ روضۂ شبیرؑ کرتے ہیں

کیا تم کو ڈر ہے فرقتی کنجِ مزار میں

سر کو ہٹاؤ حیدرِ کرارؑ آئے ہیں

اے فرقتی سوچو تو بھلا ہند میں کیا ہے
تدبیر کرو جلد مدینے کے سفر کی

ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لکھوں گر وصفِ رخسارِ رسولِ جن و انساں کا
ہو میرے کاغذِ ابری پہ عالم مہرِ تاباں کا
درِ شہ کا گدا ہیں وہ درِ جنت کا خادم ہے
مرے رتبے سے رتبہ کس طرح مل جائے رضواں کا
کجا ادنیٰ، کجا اعلیٰ، کجا یوسفؑ، کجا احمدؐ
وہ معشوقِ زلیخا اور یہ معشوق یزداں کا
نبیؐ جیسا تھا ویسا ہی اسے حق نے ولی بخشا
محمدؐ کیوں نہ کرتے فخر، فخرِ آلِ عمراں کا

فرقتی نے مختلف موضوعات پر رباعیاں بھی کافی کہی ہیں۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں

بلبل میں نہ عشق اور نہ گل میں بو ہے
نے سرو پہ قمری کی صدا کو کو ہے
ہر ایک میں ہے اے کریم جلوہ تیرا
ہر چیز میں ہر رنگ میں تو ہی تو ہے

اوصافِ محمدؐ کو علیؑ سے پوچھو
شانِ اسد اللہ نبیؐ سے پوچھو
ان کے یہ شناسا ہیں وہ ان کے ماہر
ہیرے کی قدر جوہری سے پوچھو

فرقتی نے قطعاتِ تاریخ بھی کافی تعداد میں کہے ہیں جو تصانیف کی طباعت، عمارات کی تعمیر۔ مشاہیر کی وفیات یا منصب کی ترقی کے مواقع پر کہی گئی ہیں۔ ان قطعات میں اکثر قطعات فارسی میں بھی ہیں۔ کچھ قطعات تاریخ کلکٹر و دیگر حکام کی آمد یا رخصت (الوداع) کے موقع پر بھی مدحیہ قصائد کے انداز میں کہے ہیں اس کے علاوہ منظوم رقعات بھی کچھ لوگوں کے نام لکھے ہیں۔

فرقتی کا مقام ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے غزلوں کے چند اشعار

ملاحظہ ہوں ؎

غضب یہ ہے کہ عیادت کو بھی نہیں آتے
ہمارے مرنے کا وہ انتظار دیکھتے ہیں

دل وہ کیا جس میں غم کا جوش نہیں
کعبہ کیا جو سیاہ پوش نہیں

کہنہ ہوا ہے جامۂ ہستی خدا کا شکر
مدت سے تنگ رہا تھا مرا دل کفن کی راہ

اک بت کے تجسس میں جو نکلا کبھی گھر سے
پتھر مرے سر پہ در و دیوار سے برسے

اب سرد ہونے والا ہے خم خانۂ وجود
تھوڑی سی دیر گرم ہے بازارِ زندگی

آنکھ غیروں سے لڑائی دیکھئے
ان کے دیدے کی صفائی دیکھئے

جلایا چال سے ٹھوکر سے مارا
نیا میرے مسیحا کا چلن ہے

وہ شاعری کے بنیادی اصول اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

فرحتی ایسی غزل لکھ کہ کسی مصرعے میں
لفظ بے جا نہ ہو مہمل نہ ہو بے کار نہ ہو

شاعرانہ تعلی بھی ملاحظہ ہو ؎

موجدِ عصر ہوں پوچھے مرے شعروں سے کوئی
میں نے ایجاد کیے شعر و سخن کے انداز

ایک موقع پر تلمیح دیکھئے ؎

اسمِ داوؔد کا فرقت میں جل پڑھ اے دل
موم ہوتا نہیں دیکھوں تو وہ آہن کب تک

قناعت پسندی ملاحظہ ہو ؎

فقر میں چاہیئے کیا مسندِ شاہی ہم کو
بوریا اپنے لئے تختِ سلیماں ہوگا

جذبہ حب الوطنی اور مذہبی عقیدت بھی ملاحظہ ہو گا ؎

پژمردہ دل ہے وہ جو وطن سے نکل گیا
غنچہ وہ کیا کھلے جو چمن سے نکل گیا
خاکِ شفا کے رکھتے ہی جامہ گناہ کا
ایک ایک تار ہو کے کفن سے نکل گیا

فرستیقی کے کلام کی اس دور کے نامور علماء مولوی حکیم شفاالدولہ لکھنوی۔ مولوی سید محمد ریاست گوالیار۔ مولوی سید کاظم ریاست پٹیالہ۔ مولوی سید سجاد حسین گجرات اور نواب محمد جعفر علی خاں لکھنوی وغیرہ نے بہت تعریف کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں میں شہرت رکھتے تھے۔

سیّد ریاض الحسن نکہت

نسلِ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت میں سید عبد المجید عرف میر مجا عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ میں شاہی منصب پر فائز تھے اور بڑی نام ور شخصیت تھے ۔ میر مجا کی اولادیں بڑے نام ور شجاع ۔ عالم اور فنکار ہوئے ہیں ۔ میر مجا کے چار فرزند ہوئے ۔ چھوٹے فرزند سید عبدالحلیم تھے جن کی اولاد نے مرثیہ خوانی کا فن خاص طور سے اپنایا اور اس فن کو امروہہ میں ترقی دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے ۔ سید محمد تقی (عہدِ محمد علی شاہ) اور سید تصدّق حسین اپنے اپنے ادوار کے ممتاز و مشہور مرثیہ خوان ہوتے ہیں ۔ میر مجا کے دوسرے فرزند سید عبد الرحیم کی اولاد میں سید ولایت بخش ، سید حسن بخش ، سید خادم علی اور سید حیدر علی نے امروہہ میں اس فن کو معراج بخش دی ۔ ان حضرات کی مرثیہ خوانی کا چرچا دُور دُور تک تھا ۔ ان لوگوں کی تمام عمر اسی فن کی مشق اور مظاہرے میں گزری ۔

سید حیدر علی کے فرزند سید ریاض الحسن نکہت ہوتے ۔ جنہوں نے نہ صرف اپنے خاندان کی مرثیہ خوانی کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ خود شاعری بھی کی اور مرثیہ بھی کہا ۔ حالانکہ ہزل گو بھی تھے ۔ زندگی کا آخری حصہ بڑی پریشانیوں اور اقتصادی تکالیف میں گزارا ۔ اور مسجد محلہ

بنگلہ کے موذن بھی رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک مسدس بھی کہا جس سے مرثیہ نگاری کی جانب طبیعت کے رجحان کا بھی اندازہ ہوتا ہے مسدس کا مطلع اس طرح ہے ؎

مع جب زیب دہ مسجد بنگلہ ہوا نکہت

سید دلاور حسین واصف کے بیان کے مطابق نکہت کی وفات تقریباً ۱۹۲۲ء میں ہوئی اور بوقت وفات ان کی عمر تقریباً ۹۵ سال تھی۔ اس طرح ان کی ولادت تقریباً ۱۸۲۷ء میں ہوئی۔ امروہہ کے کئی بزرگوں نے نکہت کی مرثیہ نگاری کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے ورثاء کے پاس نکہت کا کلام نہیں ہے۔ نکہت کے اخلاف میں ان کے فرزند سید شفیق حسن بھی امروہہ کے مشہور مرثیہ خوان ہوتے ہیں۔ راقم نے اپنی کم سنی میں شفیق حسن کو دیکھا ہے۔

راقم الحروف نے بڑی تلاش کے بعد نکہت کا ایک مرثیہ حاصل کیا ہے۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

جب یوسفِ نبیؐ کے خریدار مر گئے — سب فاطمہؑ کے لال کے غمخوار مر گئے
بھائی، بھتیجے، بھانجے، دلدار مر گئے — جو تھے ہر ایک دکھ میں مددگار مر گئے
شیر اللہ اُن کے لاشوں پہ رو گیا
تا ظہر سب بھرا ہوا گھر صاف ہو گیا

اس مرثیے میں ۱۸ بند ہیں۔ جن میں کہیں کہیں زبان کی خرابی ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نکہت نے باقاعدہ کسی سے فن کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی انھوں نے اپنے خاندانی ماحول سے متاثر ہو کر پہلے مرثیہ خوانی کی اور آگے چل کر یہی شوق مرثیہ نگاری میں بدل گیا۔ مرثیے کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

کھاتے ہیں تیر فاقوں میں مولا کھڑے ہوئے — چو گرد ہیں عزیزوں کے لاشے پڑے ہوئے
زخمی ہیں سر سے تا بہ قدم بے لڑے ہوئے — کہتے ہیں ظلم آج تو ہم پر بڑے ہوئے

سب دوست مر گئے مرے دم توڑ توڑ کر
جنت کو چل بسے ہمیں جنگل میں چھوڑ کر

امدادِ کردگار کا خواہاں حسینؑ ہے — سو جاں سے حق کے نام پہ قرباں حسینؑ ہے
پیاروں کے رنج و غم میں پریشاں حسینؑ ہے — دنیا میں تھوڑی دیر کا مہماں حسینؑ ہے

آیا ہے اب بچانے شہِ خوش خصال کو
جب رو چکا حسینؑ برابر کے لال کو

اب جی کے کیا کریں گے بھرا گھر اُجڑ چکا — شانے کٹا کے نہر پہ بھائی بچھڑ چکا
آلِ رسولِ پاک میں کہرام پڑ چکا — اے بھائی بیکسوں کا مقدر بگڑ چکا

اب یہ خوشی ہے قتلِ شہِ خاص و عام ہو
آجائے وقتِ عصر تو قصہ تمام ہو

بولا حسینؑ اپنی کمائی لٹا چکے — پیری میں نوجوان کا لاشہ اُٹھا چکے
بے شیر کو بھی ننھی لحد میں سُلا چکے — فاقے میں شاہ داغ بہتر کے کھا چکے

گردن کٹے گی اب دلِ زہراؑ کے چین کی
دشمن ہوئی ہے ساری خدائی حسینؑ کی

نرغے میں کُل کا شاہ ہو تو گھر کو لوٹ آئے — غم میں نبیؐ کا ماہ ہو تو گھر کو لوٹ آئے
کشتیٔ دیں تباہ ہو تو گھر کو لوٹ آئے — زہراؑ تو صرف آہ ہو تو گھر کو لوٹ آئے

کھاتی ہوں بنتِ صاحبِ تطہیر کی قسم
اب میں نہ دودھ بخشوں گی شبیر کی قسم

مادر سے ہاتھ جوڑ کے زعفر نے تب کہا — مانی نہ ایک شاہ نے، کی لاکھ التجا
حکمِ امامِ پاک میں کچھ میرا بس نہ تھا — ناچار گی کی سمت میں روتا ہوا پھرا

آقا کو چھوڑنا تو غلامی سے دور ہے
لیکن بتائیے کہ مرا کیا قصور ہے

مقطع بھی ملاحظہ ہو ؎

نکہت قلم کو روک دے اب حشر ہے بپا | کر عرض شاہ دیں سے کرالے گلے مقتدی
مشکل کو میری کیجئے حل بہر مصطفےٰ | اک اور بھی ہے دل میں یہ خادم کے مدعا

بندے پہ گر کرم ہو امام غیور کا
اک بار میں بھی دیکھ لوں روضہ حضور کا

سید علی مجاہد محلہ گدری نے نکہت کا ایک سلام راقم کو اپنے بستے سے دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سلامی عاشقانِ شاہ جب کوثر پہ جاتے ہیں
علیِ مرتضےٰ خود جام بھر بھر کر پلاتے ہیں
فرشتے مجھ سے کہتے ہیں پئے تعظیم اُٹھ جلدی
تری تربت میں خاتونِ حیدرِ کرار آتے ہیں
شہِ دیں کہتے تھے عباسؑ آؤ میری نصرت کو
بڑھاپے میں جواں بیٹے کا لاشہ ہم اٹھاتے ہیں
کسے ہوتی ہے الفت بعد مرنے کے بھلا نکہت
محبت دیکھئے خود دوست مٹی میں ملاتے ہیں

سیّد امیر حسن امیرؔ

امیرؔ کا سلسلۂ نسب شاہ ولایتؒ کے تعلق سے امام نقیؑ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد کا نام سید تصدق حسین تھا۔ صاحبِ اصغری نے امیرؔ کو سلیم الطبع اور شاعر و مورخ لکھا ہے۔ صاحب تواریخ "واسطیہ" آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

"یہ بڑے موقر و معزز ہیں اور محکمہ لوکل بورڈ کے ممبر ہیں۔ کتب فارسی و علم عروض خوب جانتے ہیں، مرجعٔ اہل محلہ ہیں سب ان کو مانتے ہیں۔ ذی وقعت و ذی مقدرت ہیں۔ ایک کتاب ترجمہ روضۃ الشہدا ان کی تصنیف بہت خوبی و فصاحت روزمرہ سے محلی اور حسنِ عبارت و لطفِ مضامین سے مجلّی ہے اور التزام یہ کیا ہے کہ جس مقام پر فارسی اشعار روضۃ الشہدا میں مرقوم ہیں اسی بحر اور اسی مضمون کے اشعار اردو کتاب ترجمہ میں مذکور ہیں انھوں نے اپنی تصنیف سے ثبت کئے ہیں اور قصائد و اشعار و غزلیات و سلام بھی ان کے عمدہ مصنفات سے ہیں۔ اور یہ تاریخ گوئی میں بھی اچھا ملکہ رکھتے ہیں۔" (ص ۱۳۵)

امیرؔ کی ولادت تقریباً ۱۸۳۰ء میں امروہہ میں ہوئی اور ۸۰ سال عمر پانے کے

بعد ۱۹۱۱ء میں وفات ہوئی۔ مندرجہ بالا تصنیف کے علاوہ ”مطلع کشمیمین“ ”خمسہ ہفت بند کاشی“ بھی امیر کی یادگار تصنیف ہے جس کا سن تصنیف ۱۳۱۶ھ اور سن طباعت ۱۳۱۶ھ ہے۔ آپ کے ذریعے اس خاندان میں علم و ادب اور شعر و سخن کا ایسا سلسلہ قائم ہوا کہ جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آپ کے پسر سید نفیر حسن نفیر بھی شاعر تھے۔ نفیر کے چار فرزند ہوئے اور یہ چاروں شاعر تھے۔ سید نفیس حسن نفیس، سید انیس حسن ہلال، سید وحید حسن کدا اور سید شفیق حسن ایلیا۔ انیس حسن ہلال کی اولاد میں سید امیر حید کمال اور شفیق حسن ایلیا کی اولاد میں رئیس امروہوی، محمد تقی صدرا اور جون ایلیا جیسے شاعر ہوئے۔

امیر کے ورثاء کے پاس سے کچھ منتشر حالت میں مراثی کے بند حاصل ہو سکے ہیں جن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کئی مرثیے تصنیف کئے تھے۔ ایک جگہ حضرت علی اکبرؑ کا رجز بیان کرتے ہیں کہ۔

پسر حسینؑ علیؑ کا ہوں اور علیؑ ہوں میں ⠀⠀ ولیِ حق کے ولیِ عہد کا ولی ہوں میں
ابِ خدا ولادرِ سجادِؑ متقی ہوں میں ⠀⠀ نبیؐ نہیں وہے ہم صورتِ نبیؐ ہوں میں

ہوں سبطِ شاہِ عجم، جدِ شہ عرب میرا
عرب، عجم پہ ہے روشن حسب نسب میرا

جو فاطمہؑ کی ہے جاں، اسکی جان ہے اکبرؑ ⠀⠀ علیؑ کے نام و نشاں کا نشان ہے اکبرؑ
نظیر جس کا نہیں وہ جوان ہے اکبرؑ ⠀⠀ جہاں میں خالقِ اکبر کی شان ہے اکبرؑ

بگوشِ ہوش شنو یہ ہے احترام مرا
اذاں میں اسم الٰہی سے ضم ہے نام مرا

یہ دی ہے حق نے مجھے قوتِ جدال و قتال ⠀⠀ کہ میرے سامنے رستم سا پہلوان ہے زال
پڑا ہے گور میں بہرام میرے ڈر سے نڈھال ⠀⠀ کرو مقابلہ میرا تمہاری کیا ہے مجال

بگاڑی مجھ سے تو نقشِ فنا بنادوں گا

تمہارے خون کا دریا ابھی بہا دوں گا

ایک موقع پر حضرت عباسؑ کا رجز اس طرح بیان کرتے ہیں۔

مشہورِ خلق، ہم بنی ہاشم کے ماہ ہیں
نورِ خدائے پاک کے نورِ نگاہ ہیں
ہم حاملِ نشانِ شہِ کم سپاہ ہیں
اور ہم ہژبر بیشۂ شیرِ الٰہ ہیں

کس کی ہے تاب ہم سے کوئی ہم نبرد ہو
دیکھیں نگاہِ قہر سے جس کو وہ سرد ہو

او غافلو کنندۂ خیبر ہمیں تو ہیں
او موذیو! درندۂ اژدر ہمیں تو ہیں
روح الامیں کے قاطعِ شہپر ہمیں تو ہیں
جن کا نہیں نظیر وہ صفدر ہمیں تو ہیں

ہم وہ ہیں جن کو چرخ سے تلوار آئی ہے
لوہا ہمارا مانتی ساری خدائی ہے

حضرت عباسؑ کی میدانِ جنگ کے لئے رخصت ملاحظہ ہو۔

بھائی عباسؑ گردشِ کی مصیبت پہ نگاہ
بھانجے ہیں نہ بھتیجے ہیں، نہ باقی ہے سپاہ
ہر طرف دیکھ کے رو دیتے ہیں بانالۂ آہ
قابلِ رحم ہے اب حالِ امامِ ذیجاہ

بھائی کی زیست کا ہوتا ہے سہارا بھائی
تم نہ ہوگے تو جئے گا نہ تمہارا بھائی

اے شجاعِ ازلی، اے اسدِ شیرِ خدا
اے مرے لختِ جگر! تم پہ ہو شبیرؑ فدا
نہ رضا دینے پہ تم ہو گئے بھائی سے خفا
خیر گر ہے یہی مرضی تو کرو عزمِ وغا

راہِ حق میں ہمیں سب کچھ ہے گوارا بھائی
جاؤ اللہ نگہبان تمہارا بھائی

تم کو بیٹوں کی طرح بھائی نے پالا بھائی
تھا آنکھوں کی ضیا، گھر کا اُجالا بھائی
نامِ حق تم نے جواب ہوش سنبھالا بھائی
کئے جاتے ہو مرا گھر تہ و بالا بھائی

حیف صد حیف تمہیں ہاتھوں سے کھوؤں عباسؑ

تم نہیں روؤ مجھے، میں تمہیں روؤں عباسؑ

پسرانِ جنابِ زینبؑ جب امام حسین علیہ السلام سے جنگ کی اجازت مانگتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ۔

اے عونؑ و محمد میں کہوں مرنے کو جاؤ ۔ پھل برچھیوں کے آہ تم اس طفلک پہ کھاؤ

میں آنکھوں سے دیکھا کروں تم خوں میں نہاؤ ۔ ماں باپ کو شادی کے عوض داغ دکھاؤ

ماموں تمہیں مرنے کی رضا دے یہ نہ ہوگا

ہمشیر کی دولت کو لٹا دے یہ نہ ہوگا

ایک موقع پر جنابِ زینبؑ اپنے پسران عونؑ اور محمدؑ پہ نصرتِ حق میں تاخیر کے سبب اس طرح اظہارِ ناراضگی کرتی ہیں کہ

ان دونوں سے کہہ دو کہ وہ اب گھر میں نہ آئیں ۔ راضی نہیں میں مجھ کو وہ صورت نہ دکھائیں

گھر باپ کا جا کر وہ مدینے میں بسائیں ۔ اور یاد مری بھول کے اب دل میں نہ لائیں

ہیں غیرت میں نفرت سے اب ان کی ہماں ہوں

بیٹے ہیں وہ میرے نہ میں ان دونوں کی ماں ہوں

امام حسینؑ کی پرورش اور کم سنی کا ایک جگہ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ۔

تھے توقیر و شانِ نورِ چشمِ ساقیؑ کوثر ۔ نہیں ہے کوئی مثل ان کا سوائے حضرتِ شبرؑ

چڑھاتے تھے انہیں کاندھے پہ اپنے روز پیغمبرؐ ۔ کبھی لیتی تھیں زہراؑ اور کبھی آغوش میں حیدرؑ

کبھی روح الامیں شہزادہ کا گہوارہ جنباں تھا

یہ عمدہ پرورش کا سبطِ پیغمبر کی ساماں تھا

امام حسینؑ نے جب مدینے سے کربلا کے سفر کی تیاری کی اور ساتھیوں کو ہمراہ لیا۔ لیکن بیمار بیٹی فاطمہ صغریٰؑ کو بیماری کے سبب کربلا نہیں لے جانا چاہا تو جنابِ صغریٰؑ کی والدہ

شکر مند ہوئیں۔

کہنے لگی یہ سنتے ہی بانوئے نیک نام
کیونکر اکیلے گھر میں رہے گی وہ یا امام

صغرا کے حالِ زار پہ ہے رحم کا مقام
بچی مری ابھی سے ہوئی جاتی ہے تمام

جب سے سنا ہے سید ابرار جاتے ہیں
چل کر تو دیکھئے اسے غش پر غش آتے ہیں

ایک جگہ مادر جناب علی اکبرؑ کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

اے بانوئے بیکس کے جگر، شاہ کے دلبر
کیا تم نے پیام آہ سنایا مجھے اکبرؑ

یہ دھیان نہ آیا تمہیں مرجائے گی مادر
بانو سے کرو تم یہ سخن وائے مقدر

کہتے ہو یہ ماں سے کہ ہمیں رن کی رضا دے
اکبرؑ مجھے اس جینے سے اب موت قضا دے

مادر تمہیں مرنے کی رضا دے یہ نہ ہوگا
اک عمر کی دولت کو لٹادے یہ نہ ہوگا

ہاتھوں سے تمہیں آہ گنوادے یہ نہ ہوگا
خود گھر کا چراغ اپنے بجھادے یہ نہ ہوگا

کھو کر تمہیں اے لعل کہاں پائے گی بانو
جانے کا لیا نام تو مرجائے گی بانو

امیر کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

زیب دہن و کام و زباں ہے یہ نام
آرام دل و راحت جاں ہے یہ نام

قربان علیؑ کے نام نامی کے امیر
ایماں کا نام اور نشاں ہے یہ نام

ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہو۔

بار شمشیر سے دکھ جائے سرِ دست نہ ہاتھ
تیغ ابرو سے فقط قتل کرو تم مجھ کو

کھل گئے غنچہ نمط آب گل زخم امیر
آگیا یاد جو قاتل کا تبسم مجھ کو

(پیامِ یار اکتوبر ۱۸۸۴ء)

سیّد اعظم علی اعظم

آپ کا تعلق بھی اولادِ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ہے آپ کے آبا و اجداد میں قاضی سید الہدیٰ کے بارے میں صاحب "تواریخ واسطیہ" لکھتے ہیں کہ "عہد ہمایوں بادشاہ وجلال الدین محمد اکبر بادشاہ میں عہدہ منصب امر قضا پر مفرد و ممتاز تھے ان کے عہدہ منصب امر قضا کا حال مضمون فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ موسومہ قاضی سید طاہر ولد قاضی سید سالار سے بخوبی ظاہر ہے یہ عہد موصوفہ میں بڑے عالم و فاضل اعلیٰ مراتب والامناصب گزرے ہیں۔" (صفحہ ۲۰۸)

قاضی سید الہدیٰ کی اولاد میں کئی نسل بعد مولوی سید رمضان علی ناطق اپنے دور کے مشہور عالم و شاعر ہوئے ہیں۔ آپ کے بارے میں سید رحیم بخش لکھتے ہیں کہ "یہ شاعر عمدہ تھے تخلص ناطق تھا ان کو علم عربی و فارسی کافی حاصل تھا۔ بہ عہدہ مدرسی ملازم سرکار تھے۔ اور مولوی و متقی پرہیزگار و مشہور و معروف تھے۔ ان کے انتقال کی تاریخ ان کے بیٹے سید اعظم نے نظم کی ہے۔" (تواریخ واسطیہ صفحہ ۲۲۳)

مولوی رمضان علی ناطق کے ہی لائق فرزند سید اعظم علی اعظم ہوئے۔ جن کے بارے میں

تمام مورخین نے لکھا ہے کہ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔

امروہہ کے چند بزرگوں کی یادداشت کی مدد سے یہ معلوم ہوسکا ہے کہ اعظم کی وفات تقریباً ۷۵ سال قبل یعنی ۱۹۰۷ء میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ہوئی یعنی ان کا سنِ ولادت تقریباً ۱۸۳۲ء تھا۔ صحیح سنِ وفات یا ولادت کا علم نہیں ہوسکا۔

ظاہر ہے کہ اعظم کو شاعری اپنے والد ناطق سے ورثے میں ملی تھی۔ والد مدرس تھے اس لیے ابتدائی تعلیم بھی والد سے ہی حاصل کی ہوگی۔ اعظم کو تمام تواریخ نے صاحبِ دیوان شاعر لکھا ہے لیکن غالباً ان کا دیوان زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکا۔ راقم نے جو تلاش کی ہے اس میں غزلیات کے چند منتشر اشعار۔ چند تواریخ۔ ایک مرثیہ اور سلام مل سکے ہیں۔ مرثیہ بے حد مشہور ہے اور امروہہ میں ماہِ محرم میں جگہ جگہ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ مرثیہ اعظم کا ہے کیوں کہ عام طور پر لوگ منتخب بند پڑھتے ہیں۔ لیکن سید ظہیر الحسن (محلہ جعفری) کے پاس جو بستہ ان کے بزرگوں کا ہے اس میں یہ مرثیہ مع مقطع ہے۔ مرثیہ کا مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

حسینؑ بے کس پہ کی چڑھائی عدو کے لشکر نے کربلا میں
تمام دریا کے گھاٹ روکے ہر اک ستم گر نے کربلا میں
نہ بوند پانی کی پائی ابنِ قسیمِ کوثر نے کربلا میں
جفائیں جھیلیں ستم اٹھائے امام مضطر نے کربلا میں

کہا لعینوں سے بے کسوں نے بھلا ستانے میں فائدہ کیا
پلانا پانی مسافروں کو نہیں ہے کوفے میں قاعدہ کیا

اس مرثیے میں ۳۷ بند ہیں۔ آگے چل کر اسی طرح امام فوجِ یزید سے مخاطب ہوتے ہیں

کیا ہے تم نے جو بند پانی یہ کیا غضب ہے یہ کیا ستم ہے
سب اہلِ بیتِ نبیؐ ہیں پیاسے سبھوں کے اوپر ہجومِ غم ہے

صغیر بچوں کا اے لعینوں بغیر پانی لبوں پہ دم ہے
عجب تردّد، عجب تفکّر، عجب مصیبت، عجب الم ہے
کروگے سیراب تم جوان کو تو اجر ہوگا ثواب ہوگا
نہ دوگے پانی تو حشر کے دن عتاب ہوگا عذاب ہوگا

اس کے بعد تین دن تک امام حسینؑ اور ان کے اہلِ حرم کی پیاس کا ذکر کیا ہے۔ تیسرے دن وہ وقت بھی آیا کہ جب حق کی نصرت میں امام کے تمام ساتھیوں نے قربانیاں پیش کیں۔

غرض یگانوں کو باری باری ملی جو اسدم رضائے میداں
سبھوں کو حاصل ہوئی شہادت سبھوں نے جنت کے پائے ایواں
جب آئی ابنِ حسنؑ کی باری تو شاہ بولے بچشمِ گریاں
ابھی نہ میداں کو جاؤ قاسمؑ حسینؑ صدقے حسینؑ قرباں
ہے گو کہ رخصت قلیل مجھ کو نہ میرے دل کو سرور ہوگا
تمہارے بابا نے کچھ کہا تھا ہیں وہ کرنا ضرور ہوگا

امام حسینؑ نے امامِ حسنؑ کی وصیت کے مطابق جناب قاسمؑ اور جناب کبریٰ کا عقد پڑھا۔ اس سلسلے میں جو روایات تاریخ میں دی ہوئی ہیں وہ اعظم نے نظم کی ہیں۔ اس کے بعد روزِ عاشورہ جناب قاسمؑ کی میدان کے لئے رخصت، اجازت طلبی اور شہادت وغیرہ نظم کی ہے اعظم کہتے ہیں کہ

یہ کہہ کے قاسمؑ ہوتے روانہ الم کا کبریٰ پہ کوہ ٹوٹا
پکاری گھبرا کر فلک ستائی کہ ہائے قاسمؑ کا ساتھ چھوٹا
کی ایسی طالع نے بدسلوکی کہ اُلٹی قسمت، نصیب پھوٹا
ہے مقدر نے مجھ کو لوٹا، فلک نے لوٹا، قضا نے لوٹا
شریک کبریٰ کے ہو کے اس دم سب اہلِ ماتم تمام روئے
ہوا یہ شیون حرم سرا میں کہ خوب رن میں امام روئے

اس کے بعد جناب علی اکبرؑ، حضرت عباسؑ اور جناب علی اصغرؑ کی شہادت مختصر بیان کی ہے اور پھر امام حسینؑ کی رخصت اور شہادت کے بیان پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے۔ امام کی رخصت ملاحظہ ہو ؎

سکینہ گودی میں تھی جوش کی اسے اُتارا بہ آہ وزاری
سبھوں کو حفظِ خدا میں سونپا منگائی شہ نے جو ہی سواری
چڑھایا بغلوں میں ہاتھ دے کے بہن نے گھوڑے پہ ایک باری
حسینؑ راہی ہوئے اُدھر کو اِدھر ہوئی خوب اشک باری
رسولؐ زادے کا تھا جو ماتم بپا رسولِ خدا کے گھر میں
عجب طرح کی مچی قیامت شفیعِ روزِ جزا کے گھر میں

مقام اس دن کیا وہیں پر عدو کے لشکر نے کر ٹھکانہ
سحر کے ہوتے ہی شام کو سب حرم کے بندے ہوئے روانہ
کمال رستے میں رنج دیکھا پڑا ستم پر ستم اُٹھانا
مقیدانِ جفا کو آخر دکھایا قسمت نے قید خانہ
لکھوں میں زنداں کا ماجرا کیا نہ تاب ہے کی نہ ہوش ہے گا
بجوشِ اعظم کہ شہ کے ماتم کا بزمِ ماتم میں جوش ہے گا

اعظم کا یہ مرثیہ ایک مخصوص رنگ، منفرد لہجہ اور عام مراثی سے مختلف زبان میں ہے۔ اس میں مشرق اور فصیح کے رنگ کی جھلک ہے۔ اس رنگ میں مرثیہ کہنے والے امروہہ میں صرف تین شاعر ہوتے ہیں اعظم، سلیم اور حافظ۔ اعظم کا یہ مرثیہ انیسویں صدی عیسوی کی تحریر ہے اس کے بعد بھی اعظم ۸ - ۱۰ سال حیات رہے اس دور میں بھی انہوں نے مرثیے کہے ہوں گے لیکن یہ زمانے کی بے اعتنائی کر ضائع کر دیا اور محفوظ نہ رہ سکے۔

اعظم کا ایک سلام سید نہال حسن قاضی زادہ کے بستے سے حاصل ہوا ہے چند اشعار

ملاحظہ ہوں ۔

مجرئی ہوے ہیں بنتِ بوتراب آنے کو ہے
ارض میں لرزہ گگن میں آفتاب آنے کو ہے
ذکرِ شہ ہونے کو ہے چشموں میں آب آنے کو ہے
ہم عزاداروں کے حصے میں ثواب آنے کو ہے
میں تمہیں پانی پلاؤں گی سکینہ کہتی تھی
اے علی اصغر نہ گھبراؤ کہ آب آنے کو ہے
ہر گھڑی کہتی تھیں زینب یا الٰہی خیر ہو
اکبرِ گل فام پر عہدِ شباب آنے کو ہے
عمر اپنی صرف کر اعظم علیؑ کے وصف میں
خواب کب تک ہے جاگ اب یزِ حسا آنے کو ہے

ماہنامہ "نسیم چمن" انیسویں صدی میں شائع ہوتا تھا اس میں اکثر اعظم کی غزلیات شائع ہوتی ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دل محوِ دید عارضِ گل پیرہن میں ہے
بلبل ہزار شوق سے سیرِ چمن میں ہے
عشق اس کا کل رخ کا سحر و شام مجھے
ظلمتِ کفر ہوتی ہمسرِ اسلام مجھے
چین سے چرخ نے دم بھر نہ بٹھایا اعظم
ہم تو دنیا میں فقط رنج اٹھانے آئے
مثل اعظم غلط ہے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے
کہ اس سے مجھ کو الفت ہے اور اس کو مجھ سے نفرت ہے

اعظم کو تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل تھی انہوں نے "تواریخ واسطیہ" کی تاریخ کہی ہے۔
اور اپنے والد کی وفات پر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تاریخیں کہی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں ؎

کرد چوں مولوی رمضاں علی زیں جا رحلت
فادخلی الباب بفرمود مقیم جنت

زاہد و متقی و عابد و بے ریو و ریا
بود انسان ولی داشت فرشتہ سیرت

شاعر و نکتہ رس و عالم و عاقل ہم بود
ہر یکے وصف چو گفتم ہمہ دارد شہرت

فیض بخش طلبا خلق مجسم سید
ماند نقش بر لحد پاک نزولِ رحمت

خوش بر آمد دم افکار ز نامش اعظم
یعنی از مولوی رمضاں علی سالِ ہجرت

اردو تاریخ مندرجہ ذیل ہے ؎

جب گئے دارِ فنا سے جانب خلدِ بریں
عابدِ شب زندہ دار و مولوی متقی

فیض بخش طالبان و قاعدہ دانِ علوم
صرفی و نحوی رموز آگاہ سرِ منطقی

فکرِ تاریخِ وفات سید مرحوم میں
آہ کھینچ اعظم پکارا آہ رمضانِ علی

اعظم کے اخلاف میں شاعری کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ اب کئی نسلوں کے بعد ان کی اولاد میں سید شمیم حیدر شمیم نے اس جانب توجہ کی ہے ان کا شمار اچھے شعرا میں ہوتا ہے۔

سیّد جواد حسین شمیم

سید جواد حسین شمیم امروہوی کا تعلق سادات تقوی سے ہے آپکا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں کے بعد امام محمد تقی علیہ السلام سے ملتا ہے آپ کے پر دادا سید احمد رضا ابن سید علیم الحق صاحب علم و دولت تھے دادا سید خادم حسین بھی باحیثیت انسان تھے۔ اور والد سید حیدر حسین یکتاؔ نہ صرف صاحب حیثیت اور باوقار تھے بلکہ عالم و شاعر بھی تھے۔ باپ سے ہی شمیمؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔

خاندانِ شمیمؔ کا ذکر صاحب "تحقیق الانساب" نے ان الفاظ میں کیا ہے

"اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ مولانا سید محمد اشرف دانش مند بن سید سعید خاں عہدِ جہاں گیر میں نہٹور (ضلع بجنور) سے امروہہ آئے بزرگوں کا وطن زید پور (اودھ) تھا جہاں سے ان کے جد اولاً جونپور پھر جونپور سے نہٹور چلے آتے تھے۔ یہ سلسلۂ نسب موسیٰ مبرقع بن محمد تقی بن امام علی رضا سے بایں طریق متصل ہوتا ہے۔ اس خاندان کی سیادت تواتر اور شہرت کی بنا پر مسلّم ہے۔ اس میں عہدِ سابق سے علما و فضلا و اربابِ باطن ہوتے رہے بعض اشخاص نام ور منصب دار و جاگیر دار بھی ہوتے۔" (صفحہ ۷۵)

سے تھا اس لیے جلد ہی مرثیہ گوئی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ لیکن کسی سے اصلاح نہیں لی جب ۱۸۷۸ء میں اشرف الناس مفتی سید محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہٗ امروہہ تشریف لائے تو آپ نے ایک مرثیے پر ان سے اصلاح لی اور شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ چنانچہ ایک مرثیہ مطبوعہ "ریاضِ شمیم" جلد اول ۱۸۹۳ء میں اس سلسلے میں اشارہ کرتے ہیں ؎

ہیں حضرت عباسؑ سے بے علاقا
یہ عباس استاد ہیں اور وہ آقا

مگر شمیم کو یہ تلمذ محض رسمی تھا تاکہ لوگ بے استادہ نہ کہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ شعر گوئی کا مادہ آپ کو مبدأ فیاض سے عطا ہوا تھا جس میں کثیر مطالعے، مہارتِ فن، مشقِ سخن اور ریاض نے نکھار پیدا کر دیا تھا۔

شمیم نے کسی استاد سے تو کوئی خاص فیض نہیں اٹھایا البتہ بے شمار شاگردوں کو اپنی صحبتِ علمی سے فیض پہنچایا۔ شمیم کے مخصوص شاگردوں کی بھی فہرست تیار کی جائے تو وہ بھی کافی طویل ہوگی۔ چند شاگردوں کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں حامد۔ رام پور۔ سید برجیس حسین برجیس۔ فیض محمد فیض سیار جن میجر اودے پور۔ قمر الدین خاں قمر رام پوری۔ سید ابن الحسین کلیم امروہوی۔ سید سعید حسن قضا۔ حکیم فصیح الزماں اثر مینجر رسالہ "نہالِ سخن" بریلی۔ سید صغیر احمد صغیر۔ شیخ داود علی داود۔ محمد سراج الحق سراج۔ محمد عبد الرحیم خاں فدا حسن پوری۔ سید ناظر حسین ناظر۔ سید عسکری رضا عرشی وزیر۔ منشی حکمت اللہ خاں حکمت۔ آغا اشہر لکھنوی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ وزیر محمد خاں مشتاق۔ منشی محمد محب علی محب۔ حافظ مسیتا۔ سید ابو الحسن نجم۔ منشی سیف اللہ احمد۔ سید حامد حسین حامد۔ سید سبط احمد صفت۔ منشی نیاز علی عجز۔ علی مستحسن سکتہ۔ ناصر حسین یتیم۔ مولوی سید حسین منذر حکم۔ مجاہد حسین جوہر۔ ڈاکٹر بانکے لال ولد رام چندر اگروال۔ بھوکن سرن شبنم ولد گوکل چند۔ شیو گر سہلائے ور ما نسیم۔ حیدر بخش حیدر۔ خلیفہ آلِ نبی مضطر۔ نواب باقر علی خاں فہیم جانشین

شمیم نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ امروہہ اور رام پور میں گزارا لیکن حیدر آباد دکن۔ لکھنؤ اور دہلی وغیرہ بھی جانا ہوا۔ ان کی زندگی کے یوں تو بہت سے واقعات مشہور ہیں جن سے شمیم کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ آغازِ جوانی میں ہی شمیم کو امروہہ میں پوری طرح شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ پہلا ہی مرثیہ جو اہلِ امروہہ نے سُنا تو بہت سے صاحبانِ علم کو یہ یقین نہیں آیا کہ یہ شمیم کا کلام ہے اور یہی شمیم کی شاعری کی عظمت کی سب سے پہلی دلیل تھی۔ شمیم کے مرثیے پر جب امروہہ میں جگہ جگہ چرچے ہوتے تو کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ مرثیہ نفیس یا خاندانِ انیس میں سے کسی کا ہے شمیم ایسا مرثیہ نہیں کہہ سکتے جب شمیم کو یہ اطلاع ملی تو شمیم نے میر نفیس کو لکھنؤ ایک منظوم خط لکھا جس میں کہا کہ اگر یہ مرثیہ کسی لکھنؤ کے شاعر کا ہے تو فوراً اس شاعر سے آگاہ کریں ورنہ اس مرثیے کی تاریخ کہہ کر بھیج دیں۔ کافی دن تک میر نفیس کا جواب نہیں آیا۔ جس سے امروہہ میں اور بے چینی بڑھ گئی شمیم کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا آخر کار پھر ایک خط میر نفیس کو لکھا جس کے جواب میں میر نفیس نے تاخیر کی معذرت چاہی اور مرثیے کی تاریخ کہہ کر بھیجی جس کے مندرجہ ذیل مصرع سے سنِ تصنیف برآمد ہوتا ہے ؎

کلامِ شمیم سخن آرا است

۱۸۵۴ء

نفیس کی یہ تاریخ آنے کے بعد امروہہ میں شمیم کی شاعری کا سکہ بیٹھ گیا اور بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

شمیم کی زود گوئی کا بھی کافی چرچا تھا اکثر لوگوں نے یہ بھی چاہا کہ شمیم کا کسی موقع پر امتحان لیں۔ شمیم ایک مرتبہ امروہہ سے کہیں جانے کے لیئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے اس وقت ایسے بھی کچھ لوگ وہاں تھے جنہوں نے فوراً یہ طے کیا کہ ریل جب سامنے نظر آجائے تو شمیم کو کوئی بہت مشکل مصرع دے دیا جائے تاکہ اس پر مصرع لگائیں اور اتنے کم وقت میں شمیم مصرع لگا نہیں سکیں گے۔ غرض کہ ریل نظر آگئی تو شمیم کو مندرجہ ذیل مصرع دیا گیا اور کہا کہ اس پر

مصرع لگائیں۔

ع قسمت کی خوبی دیکھو کبوتر کا گر پڑا

شمیمؔ نے مصرع سنا اور کہا مصرع لکھو

ع وہ پر کہ جس میں تھا مرا نامہ بندھا ہوا

یہ مصرع سن کر وہ لوگ حیرت کر گئے اور شمیمؔ کی قادر الکلامی کے دل سے معترف ہو گئے۔

شمیمؔ کے مزاج میں ہلکی سی شوخی بھی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ وہ مسجد کی چوکی سے وضو کرکے اٹھ رہے تھے کہ سامنے سے ایک فقیر کا گزر ہوا اس نے سوال کیا۔ شمیمؔ نے جواب دیا ؎

ع جب کچھ نہیں ہوتا تو اذاں دیتے ہیں

یہ کہہ کر اذان دینی شروع کر دی۔ شمیمؔ کی ظرافت کے سلسلے میں امیرؔ مینائی بھی لکھتے ہیں کہ وہ (شمیمؔ) نہایت باخبر اور پابندِ اصول شاعر تھے اور بہت جلد کہتے تھے۔ مزاج میں ظرافت بہت تھی کوئی ملاقات اس سے خالی نہ جاتی کہ وہ کچھ لطائف نہ فرماتے ہوں۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ اپنے شوق سے مرثیے اور سلام کہتے تھے فرمائش سے کسی اور قسم کے کلام میں بھی بند نہ تھے۔"

شمیمؔ کو مسلمانوں کے تمام فرقوں میں کتنی مقبولیت حاصل تھی اس کا ذکر ان کے شاگرد سید عابد حسین جوہرؔ مراد آبادی ایک واقعے میں اس طرح کرتے ہیں کہ "فخر الشعرا مولوی سید جواد حسین صاحب شمیمؔ کو ایک محفلِ میلاد میں پڑھنے کے واسطے عمداً تکلیف دی تھی اور اس جلسے میں تمام مسلمانانِ آباد اور خاص کر دیوبندی عقائد کے حضرات کو شریک کیا تھا اور یہ جلسہ منشی منظور حسین صاحب بدایوں ساکنِ حال مراد آباد کے مکان پر ہوا تھا استاد موصوف نے تین گھنٹے کامل مرثیہ میلاد شریف پڑھا اور اپنے کمالات اور شاعرانہ نکات دکھاتے لیکن کیا ممکن تھا کہ کوئی لفظ خلاف عقائد کسی شخص کے تو مرثیے سے ظاہر ہو جاتا۔ تمام محفل وجد کی حالت میں تھی ہر شخص محو تھا اور نہایت ہی حیرت انگیز نظروں سے موصوف کو دیکھ رہا تھا۔" (ماہ نامہ اتحادِ اسلام مئی ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۰)

شمیمؔ کی زود گوئی کے سلسلے میں ان کے پوتے مولانا نسیمؔ امروہوی نے راقم کو بتایا کہ شمیمؔ

ایک مرتبہ سید بنیاد علی محلہ بنگلہ امروہہ کے ہاں بیٹھے ہوتے تھے جاڑے کا موسم تھا۔ دیوان خانے میں گاؤں سے آئے ہوئے گنّے رکھے تھے۔ شمیم گنّے کے بہت شوقین تھے۔ دھوپ میں بیٹھ کر گنّا چوسنا شروع کیا۔ لوگوں نے فرمائش کی کہ محرم آنے والا ہے لہٰذا چاند رات کے لیے کوئی مرثیہ کہہ دیں۔ شمیم نے ایک شخص کو پاس بٹھایا اور کاغذ قلم دے دیا خود گنّا چوستے رہے اور درمیان میں مرثیہ لکھاتے رہے غرض کہ پورا مرثیہ ایک ہی نشست میں مکمل کرکے اٹھے مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

شاہ کو ماہِ محرم نے جو دکھلایا جمال　　غم سے کاہیدہ ہوا ماہِ علی مثلِ ہلال

ماہِ نو دل پہ لگانے لگا شمشیرِ ملال　　ابروئے چرخ میں بل تھا شکن سے کمال

چاند دیکھا تو نیا داغ پڑا سینے میں

خنجرِ شمر نظر آگیا آئینے میں

شمیم کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ وہ بیک وقت اپنے کئی شاگردوں کو مختلف اصناف سخن کے شعر بے تکان لکھاتے رہتے تھے۔ کسی کو غزل۔ کسی کو سلام اور کسی کو مرثیہ۔ زلفوں پر ہاتھ پھیرتے جاتے اور مضامین کا دریا موجیں مارتا۔ اس طرح ہر روز سیکڑوں اشعار کہتے جب شمیم کی زود گوئی۔ خوش گوئی اور پُر گوئی کی یہ شہرت لکھنؤ پہنچی تو اہل لکھنؤ کو بھی شمیم کا کلام سننے ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ "حسین آباد" لکھنؤ کے شاہی امام باڑے میں شمیم کو مدعو کیا گیا۔ یہ تشریف لے گئے زیارت کے بعد سلام پڑھا جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

رات دن کرکے شہید کربلا کی یاد ہم

کعبۂ دل کو بنائیں گے حسین آباد ہم

سلام کے بعد شمیم نے خیبر کے حال کا مرثیہ پڑھا۔ مطلع مندرجہ ذیل تھا ؎

مع　میں جرعہ نوشِ بادۂ خمِ غدیر ہوں

لکھنؤ میں پڑھنے کے لیے شمیم نے یہ مرثیہ خاص طور سے کہا تھا اور زبان کی صفائی پر خاص طور سے زور دیا تھا۔ مرثیہ ابتداء سے ہی بہت کامیاب چل رہا تھا جب تئیسویں بند پر پہنچے تو لوگوں

میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور یہ چرچا شروع ہوگیا کہ یہ میرانیس کا مرثیہ ہے۔ بند یہ تھا ؎

مرحب کو دیدباں نے خبر دی کہ الحذر — بیٹھا ہے کس خیال میں کچھ اپنی فکر کر
احمد نے آج جنگ کو بھیجا ہے شیر نر — اللہ رے ہیبت کہ لرزتے ہیں بام و در
کر جلد صلح، خیر نہیں اب بگاڑ میں
اک ہاتھ نیزہ گاڑ دیا ہے پہاڑ میں

مجلس میں اس شوشے سے انتشار پیدا ہو گیا تھا مگر زورِ کلام نے دبا دیا۔ مجلس کے بعد یہ چرچا شمیم کے کانوں تک پہنچا تو بہ نفسِ نفیس میر نفیس کے پاس پہنچے انہوں نے پورا مرثیہ پڑھ کر تحریراً توثیق فرمائی کہ اس میں ایک مصرع بھی میر انیس کا نہیں ہے۔ میر نفیس کی اس توثیق کے ساتھ مطبع نول کشور نے ۱۸۹۲ء میں "روشنئ طبع" کے عنوان سے یہ مرثیہ شائع کیا۔ مرثیے میں ۱۲۱ بند ہیں۔

یہ واقعہ آپ کی اس ملک گیر شہرت کا آغاز تھا جس نے آپ کے کلام کے شائقین ملک کے گوشے گوشے میں پیدا کر دیئے۔ شاید ہی کسی مرثیہ خوان کا بستہ ایسا رہا ہو جس میں شمیم کے مراثی نہ ہوں۔ لکھنؤ۔ دہلی۔ حیدر آباد۔ بریلی۔ کانپور۔ الہ آباد۔ ساداتِ بارہہ اور بدایوں کے علاوہ رتلام۔ اجین۔ مالوہ۔ سارنگپور۔ جاورہ۔ بھوپال۔ جے پور۔ آگرہ اور دھول پور وغیرہ میں شمیم کے مراثی خاص طور سے پڑھے گئے۔

رام پور کے قیام کے دوران جب نواب رام پور نے "فرزوقِ ہند" کا خطاب عطا فرمایا تو شمیم نے شکریے کے طور پر ایک قصیدہ استاد ذوق کی زمین میں کہا۔ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

یوں تری ذات ہے حق کی جبروتی پہ دلیل
جیسے کعبہ سندِ حرمت و اعزازِ خلیل
دستِ فیاض کو کیا بحر سے افضل کہئے
منصرف ہو نہ سکے گا کبھی رسمِ تفصیل

تیرے مارے ہوئے شیریں کی جو کھالیں مل جائیں
پوست کندہ تری جرأت وہ کہیں بالتفصیل
رشتۂ سال گرہ میں گرہیں اتنی لگیں
جن کی نسبت سے کواکب بھی لگنے جائیں قلیل

شمیمؔ کی زندگی کا سب سے اہم حادثہ ان کے جوان اور لائق فرزند برجیس حسن برجیسؔ کے انتقال کا تھا۔ جس سے وہ بے حد متاثر ہوتے تھے۔ کئی مراثی میں بھی اس کا ذکر کیا ہے ایک سلام کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

پسر کے داغ نے ایسا کیا نحیف شمیمؔ
وہی زباں ہے مگر وہ سخنوری نہ رہی

شمیمؔ کے ہم عصر شعرا میں داغؔ دہلوی۔ شادؔ عظیم آبادی۔ میر نفیسؔ۔ مرزا اوجؔ۔ عارفؔ لکھنوی۔ طپشؔ امروہوی۔ صفیؔ امروہوی۔ مولوی اولاد حسن سلیمؔ امروہوی۔ ابوالحسن بحرؔ تیغؔ امروہوی۔ وغیرہ ہوتے ہیں۔ شمیمؔ کی کسی سے شاعرانہ چشمک نہیں تھی البتہ طپشؔ امروہوی نے ایک موقع پر ایک سلام کہا جس کا مقطع تھا ؎

لوگ پھولے تھے طپشؔ اپنی زباں دانی پر
یہ نہ سمجھے کہ یہاں اہلِ زباں اور بھی ہیں

طپشؔ پہلے ناسخؔ پھر میر عشقؔ لکھنوی کے شاگرد رہے تھے اس مقطع کا ذکر کچھ لوگوں نے شمیمؔ سے بھی کیا اور کہا کہ یہ آپ پر چوٹ کی گئی ہے۔ طپشؔ کا نام نذرالحسن تھا اور ایک آنکھ میں ہلکا سا کج تھا۔ شمیمؔ نے جواب میں کہا ؎

یک چشم ہے اور طپشؔ نار سے بچا
نذرِ حسینؑ جس نے دو آنسو بہا دیئے

اس واقعے کے علاوہ شمیمؔ اور طپشؔ کے درمیان کسی طرح کی شاعرانہ چشمک کا کوئی

ذکر نہیں ملتا۔ شمیم کے تعلقات اپنے تمام ہم عصر شعراء سے استوار تھے۔ مرزا اوج کے ساتھ رامپور کے دربار سے وابستہ رہے لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ داغ دہلوی کو ایک مرتبہ ۵ اشعار کا رقعہ بھیجا جو مندرجہ ذیل ہے ؎

آسماں تک ہوئی ہے شہرتِ داغ
ماہ کامل ہے داغِ حسرتِ داغ
سرخروئی کبھی نصیب نہ ہو
گر نہ لالہ پہ ہو عنایتِ داغ
گرچہ محروم ہیں زیارت سے ؎
اپنے دل میں ہے داغِ فرقتِ داغ
ہم بھی خدمت سے بہرہ ور ہوں شمیم
گر ہو معلوم وقتِ فرصتِ داغ

ایک شعر یاد نہیں رہا۔ بہر حال داغ کے پاس شمیم کا جب یہ رقعہ پہنچا تو انہوں نے بھی منظوم جواب دیا۔ ایک شعر مندرجہ ذیل ہے۔

مشتاق ہے دماغ ہمارا شمیم کا
جویا ہے دل بھی صاحب طبع سلیم کا

"کوئی وقت فرصت نہیں اور ہر وقت فرصت ہے کل ۸ بجے صبح تشریف لایئے۔ داغ دہلوی۔"
اس کے بعد داغ سے شمیم کی ملاقات ہوئی اور داغ بھی شمیم سے مل کر بہت متاثر ہوئے۔
شمیم جب حیدر آباد دکن پہنچے تو ۴۲ اشعار کا ایک قصیدہ کہہ کر نظام کی خدمت میں پیش کیا۔ مطلع اور مقطع مندرجہ ذیل ہے ؎

جوش پر ہے بہارِ حسنِ کلام
کیوں نہ ہو باغ باغ حرفِ تمام

تو بھی آ نکلا ہے دکن میں شمیم
ہاں دعا کر پے جناب نظام

شمیم کی زندگی کا زیادہ تر حصہ عیش و آرام اور چین و سکون سے گزرا تھا گھر کی جائداد۔ ریاست رامپور کی عنایات اور نظام دکن کا فیض لیکن فیاض طبیعت اور سخاوت پسند مزاج ہونے کے سبب کچھ بھی بچا کر نہ رکھ سکے اور اس دریا دلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری عمر اس عیش و عشرت میں نہ کٹ سکی جس سے ابتدا ہوئی تھی۔ بزرگوں سے جو کچھ لیا تھا وہ اسی دنیا کو دے کر رخصت ہو گئے۔ لیکن اردو ادب کے لیے وہ بیش بہا سرمایہ چھوڑا کہ ادب کے خزانے کا ایک حصہ بن گیا اور جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۲۵ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ کو صبح کی نماز کے بعد تلاوت کے لیے آپ نے قرآن مجید کھولا تو اس میں مرحوم فرزند برجیس کی تصویر پر نظر پڑی جسے دیکھ کر دل تھام لیا اور اک آہ کی۔ غش کھا کر گر پڑے اور مرض الموت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رام پور سے بیماری کے سبب امروہہ لائے گئے دو دن تک مختلف اطباء اور ڈاکٹروں نے علاج کیا لیکن ۲۷ ذی الحجہ کو معالجین نے مایوسی کا جواب دے دیا۔ ان پر زیادہ تر بے ہوشی کی کیفیت رہنے لگی۔ لیکن جب جب ہوش آتا تو اپنے بعد اپنے مراثی کا بستہ ضائع ہونے کی فکر کا اظہار کرتے۔ کیوں کہ فرزند اکبر معز حسین کو شاعری یا مرثیہ خوانی سے دلچسپی نہیں تھی۔ دوسرے فرزند برجیس انتقال کر چکے تھے۔ چھوٹے فرزند سکندر حسین فہیم کی عمر صرف ۴۔۵ سال رہی تھی نبیرگان میں قائم رضا نسیم اور حاتم رضا بھی کم سن تھے۔ آخر کار شمیم کے شاگردِ رشید سید باقر علی خاں فہیم کو جانسٹھ (مظفر نگر) سے بلوایا گیا اور بستہ سپرد کر دیا گیا۔ جس میں کم از کم ڈھائی سو مراثی تھے۔ دو دن کے بعد یکم محرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۱۳ء کو وفات پائی۔ امروہہ ریلوے اسٹیشن کے قریب قبرستان میں دفن ہوئے۔ جنازے میں ہر قوم و ملت کے ہزاروں افراد نے شرکت کی امروہہ کے آسمان پر غموں کے سیاہ بادل چھا گئے اور شمیم اس گلشن ہستی سے خوشبو کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ شمیم

کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مولفِ "انوارِ قمر" اور صاحبِ "تاریخِ اسلام جلد پنجم" کا بھی یہی بیان ہے۔ بہت سے شعرا نے قطعاتِ تاریخِ وفات کہے۔

صاحبِ "خمخانۂ جاوید"۔ صاحبِ "مخزنۃ التواریخ"۔ صاحبِ "تواریخِ واسطیہ"۔ صاحبِ "تاریخِ اصغری"۔ صاحبِ "تاریخِ امروہہ"۔ صاحبِ "تاریخِ ساداتِ امروہہ"۔ صاحبِ "بحر ساداتِ امروہہ" وغیرہ نے شمیم کے فن کی بہت تعریف کی ہے۔ باکمال۔ نامور۔ مسلّم اُستاد زود گو۔ مشّاق۔ کثیر التصنیف اور بسیار گو وغیرہ لکھا ہے۔

شمیم کی تصانیف میں "روشنیِ طبع" نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۹۲ء میں طبع ہوئی۔ "ریاضِ شمیم" مراثی کا مجموعہ سات جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد ۱۸۹۳ء میں سید المطابع امروہہ سے دوسری سے چھٹی تک ۵ جلدیں ۱۹۱۵ء میں جوہر پریس امروہہ سے اور ساتویں جلد ۱۹۲۱ء میں مطبع اثنا عشری دہلی سے طبع ہوئی۔ ہجویات اور واسوخت کا ذخیرہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ کراچی کے علاوہ اس قسم کا بہت سا کلام لکھنؤ میں سید محمد رشید کے ذاتی کتب خانے جعفر منزل میں بھی موجود ہے۔ دو ڈرامے جو امانت کی اندر سبھا کے طرز پر لکھے تھے دسہرے کے موقع پر اب تک امروہہ میں اسٹیج کیے جاتے تھے بہت سے ہندو اداکاروں کے سینے میں محفوظ ہیں۔ یہ ڈرامے منظوم ہیں۔ لیلیٰ مجنوں اور جانِ عالم انجمن آرا ان کے نام ہیں۔

شمیم کے مراثی کی تعداد تو یقیناً ڈھائی سو سے زیادہ ہے لیکن رام پور میں کلام رہ جانے اور باقی بستہ جا نشینوں چلے جانے کے سبب مراثی منتشر ہو گئے۔ دوسری بات یہ کہ جو مراثی شمیم کے نامکمل تھے وہ ان کے پوتے نسیم امروہوی نے بعد کو مکمل کیے۔ کچھ ذاکرین (تحت اللفظ خوان) نے اپنے پڑھنے کی مناسبت سے بھی شمیم۔ برجیس اور نسیم کے مراثی کو خلط ملط کر دیا۔ بہرحال راقم نے جب شمیم کے مراثی کی تحقیق شروع کی تو سو سے بھی زیادہ مراثی صرف امروہہ سے حاصل ہو سکے۔ چند شاہکار مطبوعہ مراثی کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں ؎

معراجِ سخن کس مہِ کامل کی ثنا ہے
کس مہرِ منور کے لیے سہرا جہنا ہے

کس شمع سے یہ روشنیٔ دارِ فنا ہے ۔۔۔ خود فوجِ ملک قایلِ لا علم لنا ہے

ہاں اس کے شرف سے کوئی آگاہ نہیں ہے

حقا کہ وہ حق ہے مگر اللہ نہیں ہے

عروسِ حجلۂ رحمت ثنائے باری ہے ۔۔۔ بہارِ باغِ ولایت ثنائے باری ہے

چراغِ راہِ ہدایت ثنائے باری ہے ۔۔۔ خدا سے قرب کی صورت ثنائے باری ہے

کسی عمل کا یہ رتبہ نہ احترام ہوا

خدا کی حمد سے احمد نبیؐ کا نام ہوا

ریاضِ دہر بھی گویا طلسم خانہ ہے ۔۔۔ ہر ایک وقت نیا دن نیا زمانہ ہے

گلوں کی جان پہ آفت ہنسی کا آنا ہے ۔۔۔ کلی چٹکتے ہی بو کی روش روانہ ہے

بہار ہی ہیں گلوں پر یہ غم کا بار افسوس

نہ بلبلوں پہ جفا یہ ستم ہزار افسوس

مدحِ شہ نجف سے زباں کامیاب ہے ۔۔۔ جس سے فروغِ حق ہے یہ وہ آفتاب ہے

کحل البصر غبارِ درِ بوترابؑ ہے ۔۔۔ حاجت روائے خلق علیؑ کی جناب ہے

ایسا سخی فلک نے نہ پایا خدائی میں

سائل کو ذوالفقار عطا کی لڑائی میں

کیوں چرخ میں ہے آج زمینِ دشتِ بلا کی ۔۔۔ لشکر کا یہ عالم کہ یہ شان کی تو وہ باکی

اک غل ہے کہ آمد ہے شہِ ہر دو سرا کی ۔۔۔ اللہ رے شوکت پسرِ شیرِ خدا کی

نصرت کا نشاں حضرت جبریل لیے ہیں

قرنا کے عوض صورِ سرافیل لیے ہیں

مصحفِ منزلِ اعجاز و کرامت ہیں علیؑ ۔۔۔ والیٔ کشورِ دیں شاہِ ولایت ہیں علیؑ

واہ رے شان کہ اللہ کی آیت ہیں علیؑ ۔۔۔ نصرتِ دیں کے لیے فتح کی سورت ہیں علیؑ

انس و جاں آپ کی تلوار کو آفت سمجھے
شورِ میداں میں انہیں حشر کی صورت سمجھے

خضرِ چرخ عجب شاہدِ سبز ینہ ہے — بختِ فیروز میں سرسبزیٔ دیرینہ ہے
آئینہ خانۂ گردوں پہ عجب مینا ہے — حسنِ طوطی کا سماں رنگ سے آئینہ ہے

ہو بہو جلوۂ سبزانِ چمن پایا ہے
حسنِ احسن پہ سنورنگ حسن پایا ہے

جبرئیل نے حیدر کو خبر دی یہ جناں میں — نیرنگ سے بدلی ہے ہوا باغِ جہاں میں
اک حسن کے غنچے پہ بہار آئی خزاں میں — ہنستی ہوئی گل صورتِ بلبل تھی فغاں میں

اک تازہ شگوفہ تھا کہ خوش حال بھی دیکھا
سبزے کی روش پر اُسے پامال بھی دیکھا

سرمایۂ فروغِ شرافت ہے فاطمہؑ — گل گونۂ جمالِ سعادت ہے فاطمہؑ
پیرایۂ عروسِ عبادت ہے فاطمہؑ — معراج پائے گاہِ شفاعت ہے فاطمہؑ

پر اوجِ ماہ کا نہ عروجِ آفتاب کا
قوسین کا حجاب ہے گوشہ نقاب کا

شمیم کے مندرجہ ذیل مراثی بھی راقم کو حاصل ہو سکے ہیں ؎

ع مصحفِ منزلِ تطہیر ہے صورت کس کی
ع حضرت کے مصاحب بھی عجب صاحبِ دیں تھے
ع جب شاہِ خاوری کا نشاں جلوہ گر ہوا
ع فلک پہ صبح کا تارا جو ضو دکھانے لگا
ع آپ الم سے خاکِ بشر کا خمیر ہے
ع کیا تہلکہ ہے یہ کہ زمیں بے قرار ہے

ع یارب ظہورِ مہدیِ آخرالزماں دکھا

ع جس کا مداح ہے رب اس کی ثنا پڑھتا ہوں

ع نورِ خورشیدِ نبوت بخدا ہے اسلام

ع جب کہ فردوس کا عازم حُرِ جانباز ہوا

ع جب فلک پر سحرِ قتل کا تارا چمکا

ع باغِ جہاں میں فصلِ خزاں کی بہار ہے

ع شاہد نظم میں اندازِ عروسانہ ہے

ع خلق میں باعثِ اعزازِ سخنداں ہے سخن

ع موسیٰؑ کی طرح طالبِ دیدارِ سخن ہوں

ع یارب اس باغ کو گلِ زارِ تمنا کر دے

ع جب شہیدانِ محبت کا سفر ختم ہوا

ع خدا کے نور کا جلوہ کس آفتاب میں ہے

ع جب وقتِ عصر شاہ کے یاور بچھڑ گئے

ع یارب مرے شعروں کی زمیں چرخِ بریں ہو

ع شاہِ دیں آئینۂ حق ہیں تو جوہر عباسؑ

ع باغِ عالم کو سدا رنگ بدلتے دیکھا

ع غل ہوا دشت میں حیدرؑ کا اسد آتا ہے

ع یارب کوئی امید میں ناکام نہ ہووے

ع کیوں ہر صریرِ کلک میں اندازِ صور ہے

ع جب اہلِ بیتِ پیمبرؐ کا گھر تباہ ہوا

ع اے آفتاب ہم پہ فلک مہرباں ہے آج

ع جب مہرِ جہاں تاب چھپا پردۂ شب میں

ع پھر گلشنِ سخن میں بہارِ جناں ہے آج

ع کس شاہ کا روضہ ہے ریاضِ سخن اپنا

ع ساقی بہار آئی مئے لالہ فام دے

ع گل زارِ کربلا میں جناں کی بہار ہے

ع وہ دن دکھا کہ دلوں کو سرور ہو یارب

ع اے تیغِ زباں حمدِ خدائے دو جہاں کر

ع عباسؑ بازوئے شہِ گردوں سریر ہیں

ع جب رن میں شہ نے فوج سے حجت تمام کی

ع گھر میں شبیرؑ کے اک روز جو آئی اسما

ع میں دل دادۂ گل عذارِ سخن ہوں

ع باغِ جناں کا نخلِ تمنا حسینؑ ہے

ع پہنچا جو کربلا میں سلیمانِ کربلا

ع نقدِ وفا کا خلق میں صرّاف کون ہے

ع نخل بندِ چمنستانِ معانی ہوں میں

ع دریائے مغفرت کا سفینہ حسینؑ ہے

ع کس طرح یوسفِ زہراؑ سے نہ ہو چاہ مجھے

ع دولتِ مدحِ نبیؐ دین کا سرمایہ ہے

ع رخصت ہے پدر سے علی اکبر سے جواں کی

ع لوحِ طلسمِ باغچۂ روزگار ہے

ع میں بلبلِ شیریں سخنِ باغِ علیؑ ہوں

ع مدّاحِ علم دارِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

ع یارب مجھے گل چینِ گلستانِ سخن کر

ع مختار جب کہ قید سے چھٹ کر وطن میں آئے

ع جب رن میں باغِ فاطمہ زہراؑ اجڑ چکا

ع خود کبریا کو شانِ محمدؐ پہ ناز ہے

ع آمد ہے بوستانِ جہاں میں بہار کی

ع اعجازِ انبیاء کا خزانہ حسینؑ ہے

ع جب گیسوئے مشکیں کی گرہ شام نے کھولی

ع چمنِ دہر میں راحت کا سرانجام نہیں

ع اے مہر خیر ہے کہ ترا رنگ زرد ہے

ع میں جرعہ نوشِ بادۂ خمِ غدیر ہوں

ع دشتِ غربت میں وطن سے شہِ دیں جاتے ہیں

ع اے غنچہ دہانِ خرد بستہ وا ہو پھر

ع کس شیر کی آمد ہے جہاں کانپ رہا ہے

ع بنتِ حیدرؑ نے بھی کیا شیر سے دل بر پائے

ع کیوں آسماں زمین پہ محوِ سجود ہے

ع عروسِ نظم کا زیور ہے مدحِ جانِ حسنؑ

ع مدحِ محبوبِ الٰہی کا عجب پایہ ہے

ع میداں میں آمدِ علی اکبر کی دھوم ہے

ع شہِ دیں کے مونس و اقربا ہوتے جب شہید رہ رضا

ع لاشِ قاسم کی جو رن سے شہِ والا لائے

ع جب فاطمہؑ کا شیر لہو ہو کے بہہ گیا

ع حُرِ ذی جاہ نے جس وقت کہ جنت پائی

ع کس کے غم سے گرچہ چرخِ بریں پُر غم ہے

ع جب خلد کو شبیہہ پیمبرؐ رواں ہوا

ع جب خاک پر ستارہ عرش علا گرا

ع جب صبح حضرتِ شہِ مرداں عیاں ہوئی

ع جب دُخترِ تشنہ بالوئے ناچار سے بچھڑی

ع جہاں سے اصغرِ ناداں جو تیر کھا کے چلے

ع شاہ کو ماہ محرم نے دکھایا جو جمال

ع جب شہ نے قتل گاہ میں اکبرؑ کی لاش پائی

ع آفاق میں ولادتِ حیدرؑ کی دھوم ہے

مندرجہ بالا فہرست میں ان مراثی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو شمیم نے نا تمام چھوڑے تھے بعد میں نسیم نے مکمل کیے۔ اور نہ ہی ان مراثی کا ذکر ہے کہ جن کو تحت اللفظ خوان حضرات نے خلط ملط کر دیا ہے۔ جب ہم ان مراثی کا جائزہ لیتے ہیں تو نہ صرف وہ تمام مضامین شمیم کے ہاں مل جاتے ہیں جن کا بیان ان کے قدما نے کیا ہے بلکہ نہ جانے کتنے نئے مضامین اور جدید موضوعات بھی شمیم کے مراثی میں ملتے ہیں۔ شمیم کا ذہنی طور پر تعلق دبیر کے اسکول سے تھا۔ لیکن زبان کی صفائی ان کے ہاں زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ شمیم نے خود ایک موقع پر کہا ہے کہ ؎

خالق نے عجب خامہ پُرضو مجھے بخشا　　　خورشید بھی جس پہ ہے وہ پرتو مجھے بخشا

مصرع کوئی چاہا تو مہِ نو مجھے بخشا　　　لو منشیٔ گردوں کا قلم دو مجھے بخشا

غل ہے کہ شمیم سخن آرا ہوا پیدا

ہمتائے دبیر اور ستارا ہوا پیدا

شمیمؔ کے مراثی میں انیسویں صدی کی مرثیہ نگاری کی تمام خصوصیات موجود ہیں انہوں نے قدیم شعرا کا پوری طرح مطالعہ کیا تھا۔ ساتھ ہی اپنے عہد کی شاعری سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے مراثی کے چہروں میں مختلف مضامین ملتے ہیں۔ شاعری کی اہمیت "کلام" اور "سخن" کو موضوع بنا کر اکثر شعرا نے مراثی کے چہرے لکھے ہیں۔ شمیمؔ بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

خلق میں باعثِ اعزازِ سخنداں ہے سخن
سو ہنر جس میں ہیں جوہر وہ نمکداں ہے سخن
رشکِ جنت کہ ہے جس کا وہ گلستاں ہے سخن
جس سے ہر روح کو راحت ہو وہ ریحاں ہے سخن
باغِ عالم میں کہاں ہے کوئی گلفام ایسا
خونِ دل پینے سے ملتا ہے دل آرام ایسا

نظم آساں ہے پر ذی فہم کو دشوار بھی ہے
زخمِ دشمن کو نمک ہے، پر غمِ وار بھی ہے
یہ مسیحا نہیں ہر دم، کبھی آزار بھی ہے
ہر جگہ گل ہی نہیں ہے کہیں خار بھی ہے
مصرعہ کا ہکشاں بھی کہیں زنجیر بھی ہے
جیسی تقریر اسی طرح کی توقیر بھی ہے

کس شاہ کا روضہ ہے ریاضِ سخن اپنا
جنت سے بھی اعلیٰ ہے نرالا چمن اپنا
سرچشمۂ اعجاز ہے گویا دہن اپنا
گل زارِ حسینی ہے کلامِ حسن اپنا
ہر شعر کا غُل ہے کہ بڑھا بیتِ ارم سے
بستی مری بستی ہے شمیمؔ اپنے ہی دم سے

یارب بحرِ شعروں کی زمیں چرخِ بریں ہو
ہر شاہدِ معنی مہِ کنعاں سے حسیں ہو
نقطہ بھی ترے مہر سے خورشیدِ مبیں ہو
ہر نقشِ سلیماں کا سخن زیرِ نگیں ہو
یہ نظم کی خوبی کا قرینہ نظر آئے
ہر لفظ انگوٹھی پہ نگینہ نظر آئے

موسیٰ کی طرح طالبِ دیدارِ سخن ہوں | میں شیفتۂ جلوۂ رخسارِ سخن ہوں
میں مشتریِ یوسفِ بازارِ سخن ہوں | سر بیچ کے پاؤں تو خریدارِ سخن ہوں

مول اس کا جواہر ہے نہ دولت ہے نہ زر ہے
اس نظم کے سودے کو مناسب عمر ہے

میں مشتریِ یوسفِ کنعانِ سخن ہوں | میں کشتۂ ابروئے شہیدانِ سخن ہوں
پروانۂ شمعِ رخِ تابانِ سخن ہوں | ہر فصل میں گل چینِ گلستانِ سخن ہوں

دامن میں ہیں وہ گل کہ نہ دیکھے نہ سنگھے ہیں
جو پھول ہزاروں میں ہیں چیدہ وہ چنے ہیں

شاعری کے بارے میں شمیم اپنے نظریہ کی بھی وضاحت ایک موقع پر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ

اس پہ یہ مدحِ سخن ہے کہ ہے مقبولِ امام | خاص اس کی یہ صفت ہے کہ سمجھتے ہیں علم
صنعتوں سے ہے کراہت کہ نہ مغلق ہو کلام | گر کبھی مرثیہ گوئی ہے تو اپنا ہے سلام

غیر ایہام نہیں لطفِ رعایت کا نہیں
مرثیہ ہے کوئی واسوختِ امانت کا نہیں

اپنا نظریۂ فن بتانے کے بعد اپنی شاعری پر خود تبصرہ بھی کرتے ہیں

جبریلِ امیں بلبلِ گلزارِ سخن ہیں | عیسیٰ جو مسیحا ہیں وہ بیمارِ سخن ہیں
الفاظ حسیں یوسفِ بازارِ سخن ہیں | اللہ پیمبرؐ بھی خریدارِ سخن ہیں

یہ جنس وہ ہے جس کو ہر اک شاہ خریدے
کیوں مجھ کو نہ سودا ہو جب اللہ خریدے

ایماں کی ضیا دین کی زینت یہ سخن ہے | گلزارِ ولا باغِ ولایت یہ سخن ہے
جنت کی جو قیمت ہے وہ دولت یہ سخن ہے | حیدرؑ کے فقیروں کی کرامت یہ سخن ہے

اس مدح کی تاشیمؔ میں سیف زباں ہیں
گو بندۂ عاجز ہوں پہ اعجاز بیاں ہوں

میں غیر سعادت کوئی عادت نہیں کرتا — میں نظم ہیں لفظوں کی رعایت نہیں کرتا
بندہ تو بدائع میں بھی بدعت نہیں کرتا — دل سے کبھی ایجاد روایت نہیں کرتا

پر نظم میں اقوالِ عدو جمع کیے ہیں
موتی مرے سچے ہیں پر جھوٹوں سے لیے ہیں

شمیمؔ کے مراثی میں خاصہ حصہ مدحِ رسولؐ کا بھی ہے طرح طرح سے اپنی طبیعت کے جوہر دکھاتے ہیں۔ قرآن اور احادیث کی جانب اشارے ہیں تاریخی واقعات کا بیان ہے اور سیرتِ رسولؐ کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ شعرا نے اپنے مراثی میں مدحِ رسولؐ اس طرح کی ہے کہ جس کا مقابلہ بہت سے نعت گو شعرا کی نعتوں کے مجموعے بھی نہیں کر سکتے ان میں سے ایک شمیمؔ بھی ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

خدا کے نور کا جلوہ کس آفتاب میں ہے — جلالِ مہر مبیں کس فلک جناب میں ہے
جمالِ دوست کس آئینۂ خوش آب میں ہے — خدا کے ہاتھ کی تحریر کس کتاب میں ہے

یہ حسن مصحفِ روئے نبیؐ نے پایا ہے
جبھی تو نور کا سورہ ثنا میں آیا ہے

نبیؐ کی معرفت و امتیاز واجب ہے — یونہی محبتِ شاہِ حجاز واجب ہے
کہ جیسے بندگیٔ بے نیاز واجب ہے — اطاعت آپ کی مثلِ نماز واجب ہے

یہ اقتدار و وقارِ رسولِ عادل ہے
کہ بے درود کے حق کی نماز باطل ہے

نبیؐ کو عشق خدا نے یہ سر بلند کیا — کہ بے نیاز نے اپنا نیاز مند کیا
کمالِ حسن نے رخ چاند سے دو چند کیا — بس انتہا ہے کہ خالق نے خود پسند کیا

جہاں پناہ ہوئے آسماں وقار ہوئے

خدائی مل گئی محبوبِ کردگار ہوئے

جو عرشِ معلّٰے کا مکیں ہے وہ محمدؐ   یوسفؑ سے جو بڑھ کر نمکیں ہے وہ محمدؐ

جو منزلِ قرآنِ مبیں ہے وہ محمدؐ   جو خالقِ اکبر کا معیں ہے وہ محمد

گر آپ نہ آتے تو بن آئی تھی بتوں کی

اللہ کے گھر میں بھی خدائی تھی بتوں کی

کعبہ کا یہ کلمہ تھا کہ اے قبلۂ دیں آؤ   قرآں کی صدائیں تھیں کہ یٰسینِ مبیں آؤ

تکبیر کے نعرے تھے کہ اے عرش نشیں آؤ   طاعت کا وظیفہ تھا کہ اے رکنِ رکیں آؤ

فرقت سے کمر خم ہے یہ صورت ہے محمدؐ

کلمہ کو بھی تکلیفِ شہادت ہے محمدؐ

شمیمؔ نے صرف مدحِ رسولؐ کے ہی دریا نہیں بہاتے ہیں بلکہ خدا سے رسولؐ کا تعلق اور قربت بھی بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کی ہے مصرعوں میں روانی ہے اور زبان میں صفائی ہے

محمودِ خدا ہے، تو محمدؐ مرے حضرت   وہ وحدتِ مطلق تو یہ آئینۂ وحدت

وہ معنیٔ توحید، یہ توحید کی صورت   وہ نور ہے یہ طور، وہ رحمٰن یہ رحمت

وہ قابلِ تسبیح تو دانہ ہیں محمدؐ

اللہ جو یکتا تو یگانہ ہیں محمدؐ

خالق کی جو قدرت وہ کرامات نبیؐ کی   جو بات خدا کی ہے وہی بات نبیؐ کی

اثباتِ صفاتِ احدی، ذات نبیؐ کی   حقا کہ صلاۃ اس کی ہے صلوٰۃ نبیؐ کی

اللہ کا جو کچھ ہے تمام ان کے لیے ہے

اس کی ہی نمازوں میں سلام ان کے لیے ہے

شمیمؔ کے مراثی میں نہ صرف نعت پوری آب و تاب کے ساتھ پائی جاتی ہے بلکہ حمد کا

بھی کافی جز ہے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

وہی ہے حمد کے قابل کہ جس کا مثل محال　　وہ ذی کمال کہ جس کو عروج ہے نہ زوال
جو آج رنگ ہے ماضی میں بھی یہی تھا حال　　وہی ہے فاعلِ ماضی و حال و استقبال
ہر ایک حال میں وہ مصدرِ عجائب ہے
کہ حاضر و متکلم ہے پھر بھی غائب ہے

کوئی بھی اس کے سوا قابلِ سجود نہیں　　بغیر ذاتِ احد ایک کی نمود نہیں
یہ کون فرض کرے واجب الوجود نہیں　　بغیر آب حبابوں کی ہست و بود نہیں
ظہورِ بحر جہان خود ظہور باری ہے
نمائشِ فقط آنکھوں کی پردہ داری ہے

وہی مرید وہی پیر و مرشد و مرسد　　وہی فرید وہی فرد اور وہی مفرد
اسی کا نام ہو اللہ ذاتِ پاک احد　　وہی ہے حمد وہی لم یلد و لم یولد
وہی کریم وہی ذوالجلال جل اللہ
بغیر کفو ہے وہ لا الہ الا اللہ

شمیمؔ نے پنج تن پاک کی خلقت کا سبب اور فضیلت بھی بیان کی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

اسی سے حضرتِ خیبر شکن کا نور بنا　　پھر اس کے جز سے حسینؑ و حسنؑ کا نور بنا
جدا ہر اک سے علیؑ کی دلہن کا نور بنا　　پکاری قدرتِ رب پنج تن کا نور بنا
ہر اک طرف جو تجلی مثالِ سیل گئی
تو پنج تن کی ضیا شش جہت میں پھیل گئی

فروغ پائیں جہاں میں شیوخ ذیشاں پانچ　　کہ پانچ وقت عبادت اور اس ارکان پانچ
اگر حروف کو دیکھو تو جز و قرآں پانچ　　اصولِ دینِ نبی پانچ حرفِ ایماں پانچ

یہ انگلیوں سے بتاتے ہیں ہر بدن کے ہاتھ
کہ دو جہان کی روزی ہے پنج تن کے ہاتھ

رسولؐ کے جسمِ اطہر کا سایہ نہ ہونے کی ایک جگہ دلیل پیش کرتے ہیں ؎

کوئی کہے کہ یہ رتبہ کسی نے پایا ہے — کسی کا آیۂ اسریٰ میں ذکر آیا ہے
خدا نے عینِ بصیرت انہیں بتایا ہے — جبھی تو قامتِ موزوں بغیر سایہ ہے

کہاں سے ہو شہِ عالم پناہ کا سایہ
کسی نے آنکھ سے دیکھا نگاہ کا سایہ

شمیمؔ کے وہ مراثی جن میں مدحِ رسولؐ کی گئی ہے ان میں صرف رسولؐ کی مدح ہی بیان نہیں کی بلکہ ان کے فضائل کے ساتھ ساتھ دیگر انبیاء کا بھی ذکر ہے۔ ان سے موازنہ بھی ہے اور حضرت محمد مصطفٰےؐ کی افضلیت بھی ثابت کی ہے۔ رسولؐ کی سیرت کے علاوہ تاریخِ اسلام کے وہ اہم واقعات بھی بیان کیے ہیں جو رسولؐ کے دور کے ہیں۔ معراج کا واقعہ بھی ایک مرثیے میں بڑی تفصیل سے نظم کیا ہے جس میں رسولؐ کی تیاری۔ آغازِ سفر۔ افلاک سے گزر۔ دوزخ کا بیان۔ جنت کی سیر۔ براق اور رفرف کا ذکر اور خداوندِ عالم سے مکالمے بھی نظم کیے ہیں مثلاً دوزخ کا بیان کرتے ہیں ؎

لہو سے لال وہ لب سب زبان درازوں کے — وہ کہنیوں سے قلم ہاتھ جعل سازوں کے
وہ رنگ خون سے پیلے قمار بازوں کے — وہ سر جھکے ہوئے خفت سے بے نمازوں کے

وہیں ٹوٹتے رہے جس انجمن میں گانا تھا
انہیں تو عید تھی گانا نہ تھا دوگانا تھا

گلوں کی وید سے کیا کیا عذاب ٹوٹتے ہیں
جو آنکھیں سینکتے تھے وہ کباب ٹوٹتے ہیں

دوزخ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد جنت کا ذکر اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

درِ جناں پہ جو پہنچے جنابِ خیرِ بشر　　سلام کر کے فرشتوں نے جلد کھولا در
کھُلا کواڑ تو نکلی صدائے یا حیدرؑ　　نبیؐ نے ہنس کے کہا شکرِ خالقِ داور

علیؑ کے ذکر سے دل اپنا شاد کرتا ہے
درِ بہشت بھی حیدرؑ کو یاد کرتا ہے

اردو مرثیہ ہی وہ واحد صنفِ شاعری ہے کہ جس میں تمام اصنافِ سخن کی خوبیاں موجود ہیں۔ اس میں رزم بھی ہے بزم بھی۔ جلال بھی ہے جمال بھی۔ فلسفہ بھی ہے عشق بھی۔ ہجو بھی ہے قدح بھی غم بھی ہے مسرت بھی یہاں تک کہ تغزل بھی ہے۔ جنت کے ہی ذکر میں حوروں کا بھی شمیمؔ نے ذکر کیا ہے۔ ذرا تغزل ملاحظہ ہو ؂

وہ ان کے چاند سے چہرے، وہ تا کمر گیسو　　وہ رشکِ مہر جبیں، وہ ہلال سے ابرو
لبوں میں ان کے وہ اعجاز آنکھوں میں جادو　　وہ گول گول بدن وہ بھرے بھرے بازو

گلوں کو دیکھ کے دل سب کے زیست سے ہٹ جائیں
جہاں میں آئیں تو پھر پارسا گلے کٹ جائیں

دوزخ کے ذکر، افلاک سے گزر اور جنت کی سیر کے بعد محبوب و محب کی ملاقات کا وقت قریب آ گیا اس موقع پر شمیمؔ فرماتے ہیں کہ ؂

زبانِ پاک پہ جاری تھا حمد و شکرِ کریم　　لکھا ہے آپ جو پہنچے قریبِ عرشِ عظیم
اتارنے لگے نعلین افتخارِ کلیم　　ندا یہ آئی کہ اے باعثِ نعیم و جحیم

خود اپنے گھر کا ادب یہ نیا تکلف ہے
چلے بھی آؤ محمدؐ یہ کیا تکلف ہے

رسولؐ کی مدح و ثنا کے بارے میں شمیمؔ کا خیال ہے کہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے انسان کتنی ہی کوشش کرے لیکن اس مدح کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جس کی وجہ کچھ انسانی مجبوریاں ہیں۔ کہتے ہیں کہ

پر اس ثنا کی لیاقت بشر نہیں رکھتے — جو صاحبانِ خبر ہیں ہنر نہیں رکھتے
جو صاحبانِ ہنر ہیں خبر نہیں رکھتے — بہت جو اہلِ سخن ہیں نظر نہیں رکھتے
بہت سے اہلِ نظر ہیں تو خوش بیاں نہیں
زباں کے آنکھ نہیں آنکھ کے زباں نہیں

ہنر کا زعم نہ دعوائے خوش بیانی ہے — مزاج میں نہ تعلّی نہ لن ترانی ہے
ہماری سیف زبانی فقط زبانی ہے — خدا کا لطف پیمبرؐ کی مہربانی ہے
کلام اس میں ہے کیا، واقعی تو کہتے ہیں
جو کچھ نبیؐ نے کہا ہے وہی تو کہتے ہیں

اردو مرثیے کا ایک ایسا بھی دور تھا کہ جب ساقی نامے کی اس میں بہت اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ شمیمؔ کے بھی کئی مراثی ایسے ہیں کہ جن میں ساقی نامہ موجود ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

بہار آئی ہے ساقی شرابِ ناب پلا — اگر حساب کا ڈر ہے تو بے حساب پلا
مئے ولائے حبیبِ خدا شتاب پلا — شمیمؔ کی ہے ہوس پھول ہے گلاب پلا
یہ رنگ و بو ہو کہ کھلتے ہی ڈاٹ بوتل کی
فلک پہ عطرِ حنا کا زمین صندل کی

ساقی بہار آئی مئے لالہ فام دے — جامِ ولائے عترتِ خیر الانام دے
ساقی جو حق پرست کرے وہ مدام دے — ہاں نامِ پنج تن پہ مجھے پانچ جام دے
ساقی فقیر مست ہوں سن لے صدا مری
عید مباہلہ ہے نہ لے بد دعا مری

ساقی شراب دے کہ یہ روزِ سعید ہے — عیدین سے شرف میں فزوں تر یہ عید ہے
اس عید نہ خوش ہو یہ تجھ سے بعید ہے — اس عید کو چھپائے تو خوفِ وعید ہے

اعدا نے یوں چھپایا کہ بے قدر کر دیا
عید مباہلہ کو شبِ قدر کر دیا

اب ستم گار سوئے مار رواں ہے ساقی　　اب بہارِ چمن کف خزاں ہے ساقی
اب تامل کی مجھے تاب کہاں ہے ساقی　　یہ محرم مجھے ماہ رمضاں ہے ساقی
خیر کیا جام کی خاطر اب شکوہ کھولے
رند کیا آتش سیال سے روزہ کھولے

مرثیے کو جب وسعت حاصل ہوئی تو اس میں مدح کا جز بھی شامل ہو گیا اور کہیں کہیں مدح کا یہ جز قصیدے کی سرحدوں میں داخل ہو گیا۔ شمیم کے ہاں بھی کافی مدحیہ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

مصطفےٰ آئینۂ حق ہیں تو جوہر ہیں علیؑ　　وہ اگر روضۂ جنت ہیں تو کوثر ہیں علیؑ
وہ اگر قلزم رحمت تو شناور ہیں علیؑ　　خضرِ ایماں ہیں نبی شرع پیمبر ہیں علیؑ
گر نبی عین یقیں ہیں تو نظر ہیں حیدرؑ
گر وہ حکمت کا مدینہ ہیں تو در ہیں حیدرؑ

نام علیؑ سے جان جنوں کی نکلتی ہے　　ہیبت سے اس قدر کہ قضا بھی دہلتی ہے
کیسی قضا، قدر بھی تو مرضی پہ چلتی ہے　　چمکی تو تیغ دھوپ کے سانچے میں ڈھلتی ہے
قدرت یہ دی ہے حق نے شہ انس و جان کو
میں یا علیؑ کہوں تو الٹ دوں جہان کو

مرثیہ نگار شعرائے میدان جنگ کا منظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سراپا نگاری بھی کی ہے۔ حضرت علی اکبر کا سراپا اس طرح شمیم بیان کرتے ہیں ؎

زلف رسا کو کہتے ہیں اہلِ کلام لام　　لیلیٰ مشک فام میانِ انام نام
بیدام سب ہیں آہوئے بیت الحرام رام　　پہنچا ہے بہر بلبل سدرہ مدام دام

آنکھوں کے پاس زلفیں ہیں صدمے کثیر ہیں

دامِ بلا میں آ ہوئے کعبہ اسیر ہیں

کافی ہے ایک بات دلیلیں فضول ہیں

سایہ اگر نہ ہو تو یہ بالکل رسولؐ ہیں

مرثیہ میں اگر منظر نگاری نہ ہو تو اس کا لطف آدھا رہ جائے کیوں کہ مرثیہ تاریخ ہے اس لیے قاری یا سامع کے ذہن کو ماضی میں لے جانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بیان اس طرح ہو کہ وہ سب کچھ ایسا محسوس کرے کہ جیسے خود دیکھ رہا ہو۔ منظر نگاری کے لیے دو مقامات بہت اہم ہیں ایک تو کسی وقت یا موسم کا بیان دوسرے جنگ کا ذکر۔ شمیم کے ہاں یہ سب کچھ ہے اور نہایت فنکارانہ طریقے سے ہے۔ صبح کا منظر ملاحظہ ہو ؎

جب فلک پر سحرِ قتل کا تارا چمکا　　دورے نور کے دریا کا کنارا چمکا

مہر خالق سے جو خورشیدِ دل آرا چمکا　　باغ کا حسن شگوفوں کا ستارا چمکا

چمنِ شب میں بہت پھول تھے پر اوس پڑی

گلِ خورشید کھلا چاندنی پر اوس پڑی

وہ بیاضِ سحری وہ ورقِ مہرِ منیر　　خطِ ابیض میں فقط نور کا سورہ تحریر

اللہ اللہ رے بادِ سحری کی تاثیر　　شمع کا نور تو گُل ہو گئی گُل چیں گُل گیر

خود پئے سیرِ چمن رحمتِ باری آئی

رُت پھری پھول کھلے فصلِ بہاری آئی

گُل وہ نازک کہ عنادل کی صدا جن پہ بار　　ایک بلبل کی بھی آواز انہیں صیتِ ہزار

جلوۂ مہر سے ایک ایک چمن باغ و بہار　　جس طرح داغِ غمِ شاہ سے شیعوں کے مزار

شفقِ صبح نے یوں رنگِ سیہ کو دھویا

جیسے خونِ حرِ غازی نے گنہ کو دھویا

باغِ پُرنور ہوتے وادیٔ ایمن کی طرح
آنکھ نرگس کی کھلی دیدۂ روشن کی طرح

وہ ہر اک پھول پہ شبنم کی گہر افشانی ۔ لہلہاتے ہوئے سبزے کی وہ نکھت دھانی
نہر کے حسن پہ آئینے کو بھی حیرانی ۔ چہرہ حور کے سائے سے بھی ہلکا پانی

یہاں منظر کشی تو اپنی جگہ ہے لیکن کچھ نادر تشبیہات بھی قابلِ داد ہیں۔ شمیمؔ نے اپنے مراثی میں جنگ بیان کرنے پر بھی خاص طور سے توجہ دی ہے۔ تمام شہدائے کربلا کی جنگ کا تفصیلی حال ان کے مختلف مراثی میں ملتا ہے۔ اس حصے میں انہوں نے کچھ ندرت بھی اختیار کی ہے ایک موقع پر کہتے ہیں کہ ؎

اے فکرِ نظم سب کو دکھا دے عروجِ جنگ
پر قید ہے جدید ہو بندش، نیا ہو ڈھنگ

شمیمؔ کے مراثی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں چند بند ملاحظہ ہوں ؎

نعرہ کیا وہ روکنے والے کدھر گئے ۔ تیغیں وہ کس طرف ہیں وہ بھالے کدھر گئے
شمر و عمر کی گود کے پالے کدھر گئے ۔ لے کے خطِ شکست رسالے کدھر گئے
زندہ ابھی ہے یا عمرِ سعد مر گیا
خالی پڑا ہے دشت وہ خولی کدھر گیا

گو بجا اسد کہ خوف ہے بے جا ابھی نہ جا ۔ ظالم ہمیں شکست تو دے جا ابھی نہ جا
ٹھنڈا تو کر لے اپنا کلیجہ ابھی نہ جا ۔ ناری یہ مشک تو بھی لیے جا ابھی نہ جا
پھر آگر جان بلب ہے اجل اشتیاق میں
دوزخ کو ہو گئی تپ کہنہ فراق میں

[illegible] ہاں او شغال آنکھ

یہ ساتھ [illegible] اٹھاتے

جب تیغ چلی رن [illegible] عالم — یہ مورچہ پامال وہ صف درہم و برہم
یہ غول پریشاں وہ [illegible] رہ بے دم — تیروں کی زباں بند کمانوں کی کمر خم
گوشوں میں کماں دار اماں پا نہیں سکتے
ناوک بھی یہ سمجھے ہیں کہ چلا نہیں سکتے

جناب عون و محمد کی جنگ کا بھی منظر ملاحظہ ہو ؎

بچوں کی وغا سے کوئی بے پیر نہ چھوٹا — بے سر کو جھکائے فلکِ پیر نہ چھوٹا
گوشے میں بھی چھپ کر کوئی رہ گیر نہ چھوٹا — بل چل میں کماں چھوٹ گئی تیر نہ چھوٹا
ہر ایک کماں نے الم تازہ اٹھایا
انگڑائیاں لینے کا یہ خمیازہ اٹھایا

فوجِ یزید کے سپاہی سے جنابِ عون و محمد کے مکالمے ملاحظہ ہوں ؎

اشک آنکھوں میں بھر کر کہا اس نے بہ زخوشی تو — وہ وار لگاؤں گا کہ پانی بھی نہ مانگو
افسوس مرا لختِ جگر ایک تھا تم دو — فرمایا کہ ساتھی ترے سنتے ہیں یوں رو
کیا قہر ہے بھائی کوئی رونے کی جا ہے
اک لال کے دو ہو گئے خوش ہونے کی جا ہے

مرثیے میں جنگ کا ذکر ادھورا ہے اگر تلوار کا ذکر نہ آئے۔ تلوار اور گھوڑے کا بھی ذکر ایسا ہے جس میں شعرا نے مرثیے کو تغزل سے بھی قریب کر دیا ہے۔ شمیم نے بھی خوب خوب تلوار اور گھوڑے کی تعریف کی ہے نئے نئے مضامین تلاش کئے ہیں جنہیں نئی تشبیہات اور استعارات کے ساتھ پیش کیا ہے تلوار کا ذکر ملاحظہ ہو ؎

سنگ ملے بھی دلِ سخت کو نرما کے اٹھی — سیکڑوں ہو گئے فی النار جو گرما کے اٹھی

جو اٹھی فوج میں سو ... نوک جس جس لیں ورآئی اسے برملے اٹھی

لاکھ جب اے ...

خون کا جنگ کے میدان میں ...

دم بدم خون بہاتی تھی اِدھر اور اُدھر — اک قیا ... آئی تھی اِدھر اور اُدھر

سیر دوزخ کی دکھاتی تھی اِدھر اور اُدھر — آگ پانی میں لگاتی تھی اِدھر اور اُدھر

آنچ سے اس کی عدو مثلِ اگر جلنے لگے

گرم تھا موت کا بازار جگر جلنے لگے

یوں لپکتی تھی کہ جس طرح شرارہ لپکے — جس طرف آئی عدو بہرِ نظارہ لپکے

اس طرح تیغ کی جانب ستم آرا لپکے — جیسے کھانے پہ کوئی قحط کا مارا لپکے

موت یوں تکتی تھی شمشیر دلاور کی طرف

جیسے مومن کی نظر یاس میں حیدرؑ کی طرف

کیسی لپک لپک کے چلی تیغ شعلہ در — بل کھائے جس طرح کسی معشوق کی کمر

جوبن میں چور اس پہ یہ رفتار الحذر — چلتی ہے جس طرح نئی دلہن جھکا کے سر

جی میں یہی بسی ہے اُجاڑے گی شام کو

یہ وہ بنی ہے جو کہ بگاڑے گی شام کو

تھا خون سے فلک لال زمیں لال نما لال — گل زار میں گل کوہ میں تھے سنگ بھی لال

شمشیر کے لب لال تھے زخموں کے دہاں لال — تیغوں نے کہا ڈر سے کیوں ہو زباں لال

گردوں کے بند ٹوٹے میں یوں چھپی ہے

چمکا مہ نو دن میں شفق پھول رہی ہے

ایک بند جس میں تلوار اور گھوڑے دونوں کا ذکر ہے وہ بھی ملاحظہ ہو

سمند اُڑتا ہے اور تیغ سر اُڑاتی ہے — یہ دل اڑاتا ہے اور وہ جگر اڑاتی ہے

یہ عقل و ہوش، وہ مرغِ نظر اڑاتی ہے — یہ جن کی جان، وہ قدسی کے پر اڑاتی ہے

یہ قہر ہے وہ غضب، یہ بلا وہ آفت ہے
اگر وہ برق کی آیت، یہ جن کی سورت ہے

گھوڑے کے ہی بارے میں ایک بیت اور ملاحظہ ہو ــ

جو پیمبرؐ کو پسند آیا یہ وہ گھوڑا ہے
گردشِ چشم کی آواز لیے کوڑا ہے

عرب کے دستور کے مطابق جنگ سے قبل سپاہی رجز پڑھا کرتا تھا۔ شمیم نے بھی حسینی مجاہدین کے رجز نظم کیے ہیں کہتے ہیں کہ ــ

علیؑ کی تیغ سے دنیا میں اہلِ شر نہ بچے — جنوں کے گھر نہ بچے سرکشوں کے سر نہ بچے
پروں کا ذکر تو کیا قدسیوں کے پر نہ بچے — اگرچہ نور کے بازو ملے تھے پر نہ بچے
کمالِ حضرتِ داؤدؑ کا نظر آیا
کہ در اکھاڑا تو لوہے میں ہاتھ در آیا

فرمایا اکبرؑ وارثِ بدر الدجیٰ ہیں ہم — گر تم ہو چار رکن تو قلعہ کشا ہیں ہم
تم ڈھال کے ہو پھول تو تیغِ قضا ہیں ہم — تم چار ہو تو خامسِ آلِ عبا ہیں ہم
پنجے میں اپنے ہے شہِ خیبر شکن کا زور
خالق نے ایک تن کو دیا پنج تن کا زور

حجت ہے فتحِ بدر ہمارے کمال پر — شاہد ہے آفتاب کی رجعت جلال پر
والفتح کو بھی وجد ہے خیبر کے حال پر — اب تک نشانِ ضرب ہے قدسی کے بال پر
ہر چند غیظ میں شہِ عالی پناہ تھے
پر بچ گئے کہ روحِ امیں بے گناہ تھے

حضرت عباسؑ کے علم کے بارے میں بھی مرثیے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ شمیم نے بھی اس علم

کا منظر کئی مواقع پر پیش کیا ہے ؎

جب خیمہ حسینؑ سے نکلا نشانِ فوج   تن تن کے دیکھنے لگے پیر و جوانِ فوج
دیکھیں کسے عطا ہو یہ آرام جانِ فوج   کس مہ جبیں سے آج بڑھے عز و شانِ فوج

بے خود ہیں ورثہ دار شہ قلعہ گیر کے
سب جھومتے ہیں شیر جنابِ امیر کے

اس علم کے لیے امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کا انتخاب کیا لیکن جناب زینبؑ کے فرزند بھی خواہش مند تھے یہ بات جناب زینبؑ کو ناگوار گزری فرماتی ہیں کہ ؎

ہاں اب میں وہ زینبؑ نہیں جو وقتِ سحر تھی   اس دم مری آنکھ اور ہے جب اور نظر تھی
کیا جانے کس امید میں یہ محنتِ جگر تھی   یہ جینے پہ مرتے ہیں مجھے یہ نہ خبر تھی

یاں ان کو نہ لاتی تو یہ انجام نہ ہوتا
دنیا میں مرا دودھ تو بدنام نہ ہوتا

جناب زینبؑ کے پسران علم داری کے منصب کو اپنے لیے ورثہ سمجھتے ہیں اس کا جواب جناب زینبؑ اس طرح دیتی ہیں ؎

اعجاز و شرف مالِ وراثت تو نہیں ہے
قاسمؑ کی بھی قسمت میں امامت تو نہیں ہے

شمیمؔ نے اپنے مراثی میں صرف وہ موضوعات ہی نہیں بیان کیے جو ان سے قبل یا ان کے دور میں جاری تھے بلکہ اور بھی بہت سے موضوعات کو اپنایا ہے جو یا تو اچھوتے تھے یا جن پر کم شعراؔ نے توجہ دی مثلاً جناب علی اکبرؑ کی تقریب مکتب کا بیان کرتے ہیں ؎

حالِ مکتب کا پڑھوں مدح سرا بسم اللہ   لوحِ دل دے کے شہِ دیں نے کہا بسم اللہ
شاہ کا لاڈلا پڑھنے کو چلا بسم اللہ   کس فصاحت سے پڑھی نام خدا بسم اللہ

غُل ہوا لہجہ لیقین ہے ماشا اللہ

پہلی بسم اللہ پہ تحسین ہے ماشا اللہ

حضرتِ علی اکبر کی رخصت کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو۔

رعب و ہیبت و دبدبہ و سطوت و جلال   صبر و رضا و غیرت و حلم و غم و ملال

حسن و شباب و سیرت خوش صورت و جمال   خلق و حیا و الفت و علم و فن و کمال

پیمانِ عزم عالمِ انسانی لیے ہوئے

جاتی ہے سب کو مرگِ جوانی لیے ہوئے

شمیم نے حضرت تمام شہدا کے حال کے مراثی کہے ہیں بلکہ مخدرات عصمت کے حال کے بھی مرثیے کہے ہیں یہاں تک کہ جناب فضہ کے حال میں بھی مرثیہ کہا ہے ایک بند ملاحظہ ہو۔

نامِ فضہ پہ تصدق میں زر و سیم کروں   سیم و زر کیا زر ایمان کو تقسیم کروں

اپنی مخدومہ کی لونڈی کو میں تسلیم کروں   گوش زد تذکرہ حرمت و تحریم کروں

ھل اتیٰ حق نے علیؑ کو جو عنایت کی ہے

سب کی ہم راہی میں اس نے بھی سخاوت کی ہے

شمیم کے ہاں زندگی کی ناپائیداری اور دنیا کی بے ثباتی کا بھی ذکر ہے۔ ایک بند پیش ہے۔

باغِ جہاں میں فصلِ خزاں کی بہار ہے   نیرنگِ چرخ سے یہ چمن خارزار ہے

پھل اک طرف کہ پھول بھی پودے پہ بار ہے   سبزے سے رنگِ زہر دغا آشکار ہے

جو حشر تک جئیں انہیں یاں کب فراغ ہے

پوچھو جو خضر سے تو کہیں بس یہ داغ ہے

شمیم کے ہاں مراثی میں مرثیت بھی کافی نمایاں ہے ان کا کوئی مرثیہ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں ۱۵، ۲۰ بند مصائب کے نہ ہوں اور جو دل خراش نہ ہوں۔ ان کے ہاں مصائب میں نفسیاتی اشارے بھی ہیں اور سچی تصویریں بھی ہیں مثلاً جناب زینبؑ اپنے بچوں کے لاشوں پر

فرماتی ہیں کہ

تمہارے غم کی مصیبت میں پڑ کے آئے ہیں
اٹھو کہ ملنے کو مکتب کے لڑکے آئے ہیں

امام زین العابدین فرماتے ہیں کہ

سرہانے بیٹھ کے قاسم تو سر دباتے تھے | خود اپنے ہاتھ سے عمو دوا پلاتے تھے
فقط نماز کو اکبر یہاں سے جاتے تھے | حضور بھی تو یہاں بار بار آتے تھے

ہر اک کو صبح سے بیمار یاد کرتا ہے
کسی نے یوں بھی نہ پوچھا کہ کون مرتا ہے

امام حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں کہ

کوئی بزرگ نہ اب ہے نہ خورد ہے بیٹا
نبیؐ کی آل تمہارے سپرد ہے بیٹا

یہ سن کے بولے کہ ہے ہے یہ کیا کہا بابا | پسر کی زیست میں بابا پہ یہ جفا بابا
مریض کو بھی فدا کیجیے میں فدا بابا کا | قریب مرگ ہوں جینے کا کیا مزا بابا

حسینؑ بولے کہ تم رن پہ چڑھتے ہو سجادؑ
نماز تک تو اشاروں سے پڑھتے ہو سجادؑ

ہمارے بعد تمہیں رنج و غم اٹھانا ہے | حرم کے ساتھ ستم پر ستم اٹھانا ہے
ٹھہر ٹھہر کے ہر اک جا قدم اٹھانا ہے | جو ہم سے اٹھ نہ سکا وہ الم اٹھانا ہے

کہو وہ طوق گلوگیر کون پہنے گا
جو تم نہ ہو گے تو زنجیر کون پہنے گا

حقیقت یہ ہے کہ شمیم کے مراثی میں وہ سب کچھ ملتا ہے جو اس دور کی مرثیہ نگاری کا رواج بنا ہوا تھا۔ چہرے میں بہار۔ زندگی کی ناپائیداری۔ دنیا کی بے ثباتی۔ صبح کا منظر۔

شام کا منظر۔ دوپہر کا منظر۔ رات کا منظر۔ ساقی نامہ۔ حمدِ خداوندِ عالم۔ نعتِ رسولؐ۔ مدحِ انبیاؑ۔ منقبتِ ائمہ۔ حالاتِ انبیاؑ و ائمہؑ۔ سیرتِ رسولؐ۔ معراج۔ مباہلہ۔ غدیر۔ غزوات اسلام شاعرانہ تعلّی۔ شاعرانہ انکسار۔ بزم کے جلوے۔ تیاری جنگ۔ رخصت۔ سراپا۔ آمد۔ گھوڑے کی تعریف۔ تلوار کی تعریف۔ علم اور مشک کا ذکر۔ ہتھیاروں کا ذکر۔ رجز۔ جنگ۔ شہادت بین۔ مختار نامہ۔ زعفر جن کا حال وغیرہ وغیرہ کی کامیاب مثالیں شمیمؔ کے ہاں موجود ہیں صفحات کی تنگی کے سبب مزید مثالیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ ان تمام موضوعات کے بیان میں واقعہ نگاری۔ منظر نگاری۔ مکالمہ نگاری۔ سراپا نگاری۔ کردار نگاری۔ جذبات نگاری۔ نفسیات نگاری پُر تاثیر اور مثالی ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات میں ندرت ہے استعارات میں جدت ہے۔ مضامین کی تلاش ہے۔ زبان کا لطف ہے اور رعایتِ لفظی نے ان کے پورے کلام میں ایک خاص مزا لطف پیدا کر دیا ہے۔ ان کے اسلوب میں سادگی ہے۔ اور وہ ہر قسم کے مضامین کے بیان میں پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انہیں تمام صنعتوں کے استعمال پر بھی پوری قدرت ہے۔ شمیمؔ کے مراثی کی گذشتہ مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ ان کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت مناسبتِ لفظی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رعایتِ لفظی کے بادشاہ ہیں۔

شمیمؔ نے مراثی کے علاوہ قصیدہ۔ منقبت۔ نعت۔ غزل۔ سلام۔ مثنوی۔ رباعی۔ قطعات۔ واسوخت۔ چاربیت۔ ہجویات۔ گیت۔ ٹھمری۔ تاریخ۔ نوحہ اور ڈرامہ وغیرہ بھی لکھا ہے۔ تمام اصنافِ سخن کی مثالیں پیش کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ البتہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؂

شمیمؔ کے تقریباً سو سے بھی زیادہ سلام راقم کو حاصل ہوئے چند اشعار اس طرح ہیں ؂

میداں میں ڈوبنے کو ہے خیرالبشر کا چاند
خالق کا نور عرش کا تارا سحر کا چاند
اللہ رے فروغِ رخِ بادشاہِ بدر
خالق کے گھر کی شمع پیمبرؐ کے گھر کا چاند

کبریٰ سی گر بنی ہو تو قاسم سا ہو بنا
یہ اپنے گھر کا چاند ہے وہ اپنے گھر کا چاند

قدرِ عزائے سیدِ ابرار دیکھئے
آنسو سا دُر خدا سا خریدار دیکھئے
سر دے چکے جو شہ تو فرشتوں نے یہ کہا
ہاں یہ بشر ہیں صادق الاقرار دیکھئے
مدت سے آرزوئے زیارت ہے اے شمیم
کب تک بلائیں سیدِ ابرار دیکھئے

رواں ہیں مجلسِ شاہِ فلک جناب میں پاؤں
چلے ہیں لے کے مجھے جادۂ ثواب میں پاؤں
نکل کے کیا دلِ پُر آبلے سے آنکھ میں آئیں
ہیں طفلِ اشک سمیٹے ہوئے حباب میں پاؤں
جناں سے لایا ہوں میں چُن کے یہ دُرِ مضموں
کہو صبا سے کہ دھو کے دھرے گلاب میں پاؤں

سرِ تاجِ عرش ہیں شہِ خیرالوریٰ کے پاؤں
دوشِ نبیؐ کی زیب ہیں دستِ خدا کے پاؤں
اللہ رے اوجِ مہرِ نبوت سے مس ہوئے
اے چرخ جھک کے چوم لے دستِ خدا کے پاؤں
کہتے تھے ذوالجناح کی سرعت پہ انس و جن
وہ دیکھے شیر دیکھے ہوں جس نے ہوا کے پاؤں

دیتے ہیں خارِ خشک کو بھی آبلے کا جام
دستِ سخا سے کم نہیں نینِ لعبا کے پاؤں

چمک رہا ہے غمِ شہ کا داغ تربت میں
یہی خدا کا دیا ہے چراغ تربت میں
تجھ کو جاؤں گا اے قدسیونِ جناں کیسی
مجھے دکھاؤ نہ یہ سبز باغ تربت میں
قسیمِ خلد نے جنت کی کھڑکیاں کھولیں
شمیم کیوں نہ رہے باغ باغ تربت میں

زوال میں بھی فروغِ کمال رہتا ہے
ہزار چاند گھٹے پر ہلال رہتا ہے
عروج خلق میں ہوتا ہے انکساری سے
شجر زمین پہ جھک کر نہال رہتا ہے
ہنر کے سامنے کیا مال ہے بہ یدل شمیم
کہ مال رہ نہیں سکتا کمال رہتا ہے

سلامی جانتا ہے رنج و غمِ خاصانِ داور کا
نبی کا فاطمہ کا حیدر و شبیر و شبر کا
خدائے شاہ ہو کر حر نے کس کس کا شرف پایا
اویس و زید کا مقداد کا سلماں کا بوذر کا
شمیم اس کلمۂ وحدت کا ہر دم ورد رکھتا ہوں
میں بندہ ایک کا دو تین کا نو کا اکہتر کا

شمیم کی نعتوں میں بڑی سادگی پائی جاتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جہاں پڑھتا ہے کلمہ اے حبیبِ کبریا تیرا
خدائی کیوں نہ ہو تیری خدا کا تو خدا تیرا

خدائی کیا تجھے جانے کہ کیا ہے مرتبہ تیرا
نہیں لیتا خدا بھی نام بے صلِّ علیٰ تیرا

قدم جس فرش پہ رکھے وہ عرشِ ربِّ اعلیٰ ہو
ہوا تختِ سلیماں کی اڑا دے بوریا تیرا

ترے چھوٹے برادر کو نصیری جب خدا سمجھے
تو پھر ہم کیا کہیں تجھ کو کہ رتبہ ہے بڑا تیرا

غرض کیا ہے مجھے پیرِ مغاں کی اب مریدی سے
فقیرِ مست نے مرشد پیالہ پی لیا تیرا

تمنا ہے کہ محشر تک رہے گلزار امروہہ
ہزاروں پھول اس غنچے میں ہیں اے مصطفےٰؐ تیرا

سیہ کارِ زمانہ ہوں تجھے کیا منہ دکھاؤں گا
قیامت ہوگی جس دن سامنا ہوگا مرا تیرا

شمیمؔ نے قصائد بھی کافی کہے ہیں پروفیسر نانا مختار حسین مرحوم کا بیان ہے کہ انہوں نے شمیمؔ کے قصائد شمیم کی زبانی ۱۳ رجب کی محفل میں سُنے ہیں وہ زلفوں پر ہاتھ پھیر کر جھوم جھوم کر قصیدہ پڑھتے تھے۔ چند اشعار اس طرح ہیں ؎

ساقیا زردہیں مدہوشیِ افکار سے ہم
آج تو غسل کریں گے مے گلنار سے ہم

آفتاب آئے تو آنکھوں کی طرح سیکیں نم
نیم بسمل ہیں ترے ناز کی تلوار سے ہم

ہاں ولا یوسفِ مضموں کی یہ چاہت ہی تک
آج کعبے کو چلیں مصر کے بازار سے ہم
آج ناقوس سے بھی آتی ہے حق حق کی صدا
کلمہ سنتے ہیں عرب کے در و دیوار سے ہم
آج کیا پہلے پہل حکمِ خدا آیا ہے
آرزو ہے کہ سنیں احمدِ مختار سے ہم
درِ علم نہ ہوئے گی رسائی زندو
سر کو ٹکرایا کریں شہر کی دیوار سے ہم
خلق میں چرخ سے انجم ہیں، شجر سے پتّے
ابر نیساں سے گہر، احمدِ مختار سے ہم
اگر اس مہرِ رسالت کی عنایت ہو شمیم
کھینچ لیں عطرِ حنا مشکِ شبِ تار سے ہم

شمیم نے رباعیاں سیکڑوں کی تعداد میں کہی ہیں۔ جس طرح ایک مرثیے میں مرزا دبیر سے اپنے ذہنی تعلق کا ذکر کیا ہے اسی طرح ایک رباعی میں میر انیس سے بھی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں

جو کوئی غلط نویس سے انس رکھے — بندہ نہ پھر اس رئیس سے انس رکھے
استادوں کا دشمن مرا دشمن ہے شمیم — مونس ہے اگر انیس سے انس رکھے

چند رباعیات ملاحظہ ہوں ؂

تربت میں چلے چھوڑ کے مسندِ زر کی — تکیہ کی نہ کی فکر نہ کچھ بستر کی
دنیا کا حشم ساتھ لیا کچھ نہ شمیم — کیا خاک ہوا بندھ گئی خاکستر کی
اے اہلِ عزا موسمِ ماتم آیا — عالم میں غمِ شاہِ دو عالم آیا
مصروف ہو کاروبارِ دنیا میں شمیم — اب عیش حرام ہے محرّم آیا

مے خانۂ عشق کا شرابی ہوں میں — بندوں میں علیؑ کے انتقابی ہوں میں
ڈرنے کا نہیں فشارِ مرقد سے شمیمؔ — واقف ہے زمیں کہ بوترابی ہوں میں

واحد ہے خدا اور احد ہیں چودہ — کیا فکر ہمیں بہر مدد ہیں چودہ
ثابت ہے مرے نام سے چودہ کی ولا — دیکھو تو جوادؔ کے عدد ہیں چودہ

ہاتھوں میں مضامین کا گلدستہ ہے — پڑھتا ہوں آوازِ [illegible] ستہ ہے
بس فیضِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے یہ شمیمؔ — بستہ انہیں [illegible] ستہ ہے

قائل ہوں کلیم خوش مقال ایسا ہو — یوسف کو [illegible] ا ہو
اللہ رے اعجازِ نبیؐ صلِّ علےٰ — مہتاب کو [illegible] یسا ہو

پس جائے گہر تو آبرو رہتی ہے — مفلس ہو سخی تو وہ ہی بو رہتی ہے
گھٹتی نہیں بے زری سے ہمت ہرگز — مرجھاتے ہزار پھول بو رہتی ہے

شمیمؔ نے قطعاتِ تواریخ یوں تو بہت کہے ہیں لیکن انہوں نے اپنے مکان کے صدر دروازے کی تعمیر پر جو تاریخ کہی وہ بہت مشہور ہے جو دروازے پر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آج گردشِ زمانہ نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ تاریخ مندرجہ ذیل ہے ؎

ہوا القا بہ لطفِ شاہِ خیبر
شمیمِ حیدرِ یکتا کا ہے در

۱۲۸۳ھ

حیدر حسین یکتؔ شمیمؔ کے والد تھے۔

شمیمؔ کے نوحے بھی دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب بھی محرم میں بہت سی جگہ کچھ نوحے پڑھے جاتے ہیں۔

شمیمؔ کی غزلیں تو شائع نہ ہو سکیں لیکن اب بھی امروہہ کے کچھ بزرگوں کو شمیمؔ کی غزلوں کے کچھ اشعار یاد ہیں۔ کاظم علی خاں نے اپنے انتخاب "گل پارے" میں کچھ اشعار دیے ہیں

ملاحظہ ہوں سے

بات کرنے ہی گزرتی ہے ملاقات کی رات
بات ہی کیا ہے جو رہ جاؤ گے اک رات کی رات
ایسے کہاں نصیب شب ماہ تاب ہیں
وہ آئے اور آکے نہ جائے تمام رات
اُٹھائیں جو زلفیں تو بولے منجم
وہ دیکھو نکل آیا سورج گہن سے

قدیم مورخین اور اہل قلم حضرات نے تو شمیم کے فکر و فن کی تعریف کی ہی ہے۔ عصر حاضر میں بھی رئیس امروہوی۔ اشفاق حسین بیکس۔ حسین اعظمی۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی۔ جون ایلیا۔ ہلال نقوی۔ تقی الحسن سفارش حسین رضوی اور ممتاز احمد نقوی نے شمیم کی مرثیہ نگاری کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان کے فکر و فن کی بڑی تعریف کی ہے۔ صرف سفارش حسین رضوی اور ممتاز احمد نقوی کی رائے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

آخری چوتھائی کے آنے پر تین مرثیہ گو اور ابھرے جنہوں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا مرثیہ تو یہ پہلے سے کہہ رہے تھے مگر اب ان کا فن اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اساتذہ کے کلام کے ہم پلہ کیا جا سکے۔ یہ تھے شاد عظیم آبادی۔ عارف لکھنوی اور شمیم امروہوی ـــــ شمیم امروہوی سب سے الگ روایتی مرثیہ گوئی کی ڈگر پر چلتے رہے آپ نے ایک بند میں بوڑھے مجاہد حبیب ابن مظاہر کی جہاد پر روانگی کی تصویر یوں دکھائی ہے۔ سے

شوقِ وغا میں رُخ پہ عجب نور ہو گیا | پیری کا رنگ خوف سے کافور ہو گیا
وشتِ بلا بھی نور سے معمور ہو گیا | بل آ گیا کمر میں وہ خم دور ہو گیا
بیٹھے جو تن کے توسنِ گردوں رکاب پر
رعشہ عروج پا کے چڑھا آفتاب پر"

(سفارش حسین رضوی اردو مرثیہ صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴)

پروفیسر ممتاز احمد نقوی لکھتے ہیں کہ

"شاید ہی اردو مراثی سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص فرزدقِ ہند حضرت شمیمؔ مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے نام نامی سے ناواقف و بے خبر ہو۔ افسوس یہ ہے کہ مرحوم کا مجموعۂ سخن (سوائے بیس پچیس مراثی کے) ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔ ورنہ دنیا دیکھتی کہ انیسؔ و دبیرؔ کی بزم سخن دوسرے صاحبانِ کمال کے وجودِ گرامی سے کبھی خالی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ شمیمؔ مرحوم کے مرثیے زورِ بیان، حسنِ ادا۔ جدتِ خیالات۔ ندرتِ تشبیہات و استعارات و نیز محاسنِ لفظی و معنوی اور سب سے بڑھ کر مرثیت کے اعتبار سے کسی باکمال مرثیہ نگار کے شاہکار سے کم نہیں۔ شمیمؔ کی طبیعت ایک سدابہار گلشن تھی جس میں شعر و سخن اور علم و ادب کے ہزاروں پھول کھلتے رہتے تھے۔ اور اس کلیہ کے مصداق تھے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" وہ فنِ شعر کی ہر صنف میں استادانہ مہارت رکھتے تھے اور یہ ان کی طبیعت کی بوقلمونی اور رنگارنگی کا ثبوت تھا کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں ہے جس میں مرحوم نے اپنے کلام و کمال کا ذخیرہ نہ چھوڑا ہو۔ غزل قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ واسوخت۔ چار بیت۔ ڈرامہ۔ ہزل۔ گیت۔ ٹھمری۔ نوحہ۔ سلام اور مرثیہ غرض کہ شمیمؔ نے ہر میدان میں زورِ طبع دکھایا ہے اور ہر منزل میں کامیاب ہیں"۔ (اسازِ حریت۔ صفحہ ۱۲-۱۳)۔

حافظ سیّد محمد اسمٰعیل حافظ

حافظ سید محمد اسمٰعیل کے مورثِ اعلیٰ سید محمد میر عدل تھے۔ جو گزشتہ سات صدیوں کی امروہہ کی ممتاز ترین شخصیت تھے۔ صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" لکھتے ہیں کہ ؎

"مخزنِ جود و فیض صاحبِ بذل
میر سید محمد میر عدل

ابن سید منتجب کہ جو بعد سات واسطوں کے پوتے مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت قدس سرہٗ العزیز کے تھے۔ وہ بہت بڑے بزرگ مشہور و نام دار صاحبِ اقتدار منصب و عالی وقار عالم باعمل فاضل اجل یہاں گزرے ہیں کہ جن کی وفات کی تاریخ "سید فاضل" ہے اور کتاب آئینِ اکبری میں ان کا نام نامی نہ صدی منصب داروں میں مرقوم ہے اور کتاب طبقاتِ اکبری ـــــ ذکرِ اسماءِ علماء و فضلا میں یہ عبارت بنام ان عالی مقام مرقوم ہے ـــــ پاک اعتقاد بڑے متقی اور پرہیزگار اور عالی ہمت تھے۔ شجاعت میں بے نظیر تھے اور تواضع ان کی ایسی تھی کہ بڑے اور چھوٹے کو یکساں سمجھتے تھے۔ غرض جتنی صفتیں کاملوں کو چاہئیں۔ سب ان میں موجود تھیں۔ جس زمانے میں وہ لاہور میں حاکم تھے۔ بغرضِ مطابقت پیغمبر خدا

صلی اللہ علیہ والہ وسلم فقط نانِ جویں پر اکتفا کرتے تھے۔ کئی ہزار پرانی مسجدیں تعمیر کرائیں ــــ کبھی تہجد کی نماز ان کی فوت نہ ہوتی تھی۔ جماعت کے بھی بڑے پابند تھے لاکھوں اور کروروں روپیہ کی جاگیر رکھتے تھے۔" (صفحہ ۱۰۹۔ ۱۱۱)

سید محمد میر عدل عہدِ جلال الدین محمد اکبر میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے اور کچھ عرصے گورنر بھی رہے۔ ان کے چار فرزند تھے سید ابوالفضل۔ سید ابوالحسن۔ سید ابوالقاسم اور سید ابوالمعالی۔ یہ چاروں بھائی اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور انہوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے۔

سید ابوالحسن کی نسل میں سید محمد زماں زماںؔ ہوئے جو اپنے وقت کے نامور شاعر تھے۔ شعرا کے اکثر تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ سید محمد زماں کے پوتے سید جیون علی تھے جو حافظ سید محمد اسمٰعیل کے والد تھے۔ سید محمد اسمٰعیل کا تخلص حافظؔ اور کمالؔ تھا۔

حافظ سید محمد اسمٰعیل کے بارے میں سید اصغر حسین لکھتے ہیں کہ

"سید محمد اسماعیل ولد سید جیون علی حافظ کلام اللہ شیعہ مذہب، مرثیہ گو اور مورّخ ہیں۔" (تاریخ اصغری صفحہ ۶۲)

حافظ سید محمد اسمٰعیل کی ولادت امروہہ میں ہوئی تھی لیکن دامنِ شاہی سے وابستہ ہونے کے سبب کلکتہ میں زندگی کا کافی وقت گزرا۔ آپ تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کے ہاں عرصے تک ملازم رہے اور وہاں بہت عزت و وقار حاصل کیا۔ بادشاہ سے آپ کی کافی قربت رہی۔ سید رحیم بخش لکھتے ہیں کہ

"مذہب شیعہ میں یہ بڑے حافظِ باکمال۔ متحمل نام وار تھے۔ سوائے اس کے مورّخ و شاعر مرثیہ گوئی مقام مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ والی لکھنؤ کے عرصے تک ملازم ہے۔ شاہ موصوف نے ان کو خطاب سید الحفاظ کا عطا فرمایا۔" (تواریخ واسطیہ صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰)

حافظ سید محمد اسمٰعیل کے بارے میں ان کے پوتے سید مغفور حسن اوجؔ کا بیان ہے کہ

آپ پیدائشی نابینا تھے۔ اور اسی دور میں آپ نے قرآنِ مجید حفظ کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں بصارت آگئی تھی۔

آپ کو قرآنِ مجید اس طرح حفظ تھا کہ اول سے آخر تک اور آخر سے اول تک پڑھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ واجد علی شاہ کے دربار میں بہت سے حفاظ جمع تھے۔ سب سے بادشاہ موصوف نے تلاوت کی فرمائش کی۔ جب حافظ محمد اسمٰعیل کا نمبر آیا تو آپ نے کہا کہ شروع سے آخر تک سناؤں یا آخر سے شروع تک۔ پورا دربار اس بات پر حیران تھا۔ بادشاہ نے آخر سے سنانے کا حکم دیا تو آپ نے اس کا کفارہ بتایا۔ اور پھر آخر سے شروع کی جانب قرآنِ مجید شروع کیا۔ بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی۔ کفارہ بھی ادا کیا اور حافظ سید محمد اسمٰعیل کو سید الحفاظ کے خطاب سے نوازا۔ یہ واقعات سید مغفور حسن اوج نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنے ہیں۔

قرآنِ مجید کو دونوں طرح ایک ہی روانی سے پڑھنے کی تصدیق مولوی سید بشیر حسن بھی کرتے ہیں کہ

"حافظ سید محمد اسمٰعیل صاحب کمال حافظِ قرآن تھے اول سے آخر تک اور آخر سے اول تک بے تکلف پڑھ سکتے تھے شاعر بھی تھے۔ مرثیہ خوب کہتے تھے۔ اور منبر پر پڑھتے بھی تھے۔ واجد علی شاہ کے دربار میں ملازم تھے شاہ موصوف نے سید الحفاظ کا خطاب دیا تھا۔" (شجراتِ ساداتِ امروہہ حصہ دوم صفحہ ۳۳)

صاحب "تاریخِ اصغری" اور "تواریخ واسطیہ" کے بیان سے حافظ محمد اسمٰعیل کا نواب واجد علی شاہ کے ہاں ملازم ہونے کا تو پتہ چلتا ہے لیکن ملازمت کیا تھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں سید تقی الحسن اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ

"حافظ محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم شاہِ اودھ نواب واجد علی شاہ کے یہاں کتب خانے کے انچارج تھے بڑے قابل اور ذہین ترین انسان تھے اور آپ کو بڑی عزت حاصل تھی۔"

(امروہہ گزٹ کراچی فروری ۱۹۶۴ء صفحہ ۳)

حافظ کی ولادت کے بارے میں کسی تاریخ سے کوئی علم نہیں ہوتا البتہ آپ کی سنِ وفات ۱۹۰۸ء ہے۔ آپ کی وفات پر مولوی سید اولاد حسن سلیم نے آپ کی تاریخ کہی ہے

"ہائے حافظ محمد اسمٰعیل"

آپ کے چھوٹے پسر سید نیر حسن کی اہلیہ کے بیان کے مطابق آپ کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہوئی اس طرح آپ کا سنِ ولادت تقریباً ۱۸۳۸ء ہوا۔

آپ کے ۴ پسر حافظ سید محمد اسرائیل طوبیٰ، سید محمد خلیل، سید محمد عقیل، اور سید نیر حسن نیرؔ اور ایک دختر ہوئیں۔ پسران میں حافظ سید محمد اسرائیل طوبیٰ اور نیرؔ شاعر ہوئے۔ طوبیٰ کی اولاد پاکستان منتقل ہو گئی۔ سید نیر حسن کے فرزند سید غضنفر حسن آوج ہیں جن کے ذریعہ اس خاندان میں شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔

حافظ سید محمد اسمٰعیل کی شاعری اور خصوصاً مرثیہ نگاری سے متعلق ایک واقعہ بہت اہم ہے جسے ہلال نقوی اس طرح لکھتے ہیں کہ

تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں امروہے میں سید محمد اسمٰعیل کمالی مرثیہ گو گذرے ہیں یہ آخری تاجدارِ اودھ نواب واجد علی شاہ کے دربار میں ملازم تھے بادشاہ نے انہیں سیدالحفاظ کا خطاب دیا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ایک روز انیس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ذوقِ مرثیہ خوانی کی تسلی کے لیے ان کے مراثی مانگے لیکن جیسا کہ اس زمانے میں شعراء کا طریقہ تھا کہ وہ اپنے قلمی مرثیے کسی کو دیا نہیں کرتے تھے انیس نے بھی انکار کر دیا۔ یہ اداس اداس لوٹ آئے لیکن اس عزم کے ساتھ کہ خود مرثیہ کہیں گے۔ عزمِ دل نے عملی شکل اختیار کی اور انہوں نے مرثیہ کہا۔" (مرثیہ عظیم صفحہ ۱۹)

حافظ نے جب مرثیے کہنے اور پڑھنے شروع کئے اس سے پہلے کا کلکتہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک مجلس کا انتظام کیا گیا جس میں حافظ محمد اسمٰعیل سے بھی کہا گیا کہ کچھ پڑھیں تو آپ نے صرف ایک رباعی پڑھی جو مندرجہ ذیل ہے

اعلیٰ تو وہ ہے جو پڑھے اعلیٰ کا کلام　　لائے تو کوئی عالم بالا کا کلام
نسبت کسی ذاکر سے اسے کیا حافظ　　پڑھتا ہو جو اللہ تعالےٰ کا کلام

راقم نے جب حافظ کے کلام کی تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ کلکتہ میں ملازمت کے سبب زیادہ مراثی وہیں رہ گئے پھر بھی مندرجہ ذیل مراثی حاصل ہو سکے ہیں ؎

امام بے کس کو جب سکینہ کا رڑتے رڑتے خیال آیا
اٹھا محبت کا جوش گویا کہ دیگ دل میں اُبال آیا
بھرا ہوا خوں میں سر سے پا تک جو گھر میں وہ خستہ حال آیا
کہا کسی نے سکینہ بالی کا باپ، نہ برآ کا لال آیا

نکال خوں سند ہمکے دوڑی سنا جو آئے ہیں پیارے بابا
مگر نہ پہچانا جب پدر کو، کہا تمہیں ہو ہمارے بابا

میر انیس سے حافظ کا مراثی مانگنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہیں انیس کے رنگ سے خاص دل چسپی تھی۔ لیکن ان کا زیرِ نظر مرثیہ اس بات کی دلیل پیش کرنے کے بجائے مختلف نظر آتا ہے۔ اس لیئے یہی امکان قوی ہے کہ یہ حافظ کے ابتدائی دور کا مرثیہ ہو۔ اور حافظ اپنے ابتدائی دور میں فصیح اور مشرق سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ حافظ کی مرثیہ نگاری کا اصل عہد کلکتہ کے قیام کا عہد تھا۔ اور یقیناً مراثی کی تعداد بھی کافی ہوگی۔

حافظ کا مندرجہ بالا مرثیہ پوری طرح فصیح کے رنگ میں نظر آتا ہے۔ مطلع کے بعد حافظ کہتے ہیں کہ

پکارے سرور کہ آؤ جانی گلے سے لپٹو ہمیں پدر ہیں
ڈرو نہ صورت سے میری بیٹا وہی ہیں ہم پر لہو میں تر ہیں
تمہاری الفت ہے کھینچ لائی اگرچہ مجروح سر بسر ہیں

پدر سے دل بھر کے خوب مل لو جہاں سے ہم عازم سفر ہیں

وہ بولی صدقے سکینہ واری کہو تو صورت کو کیا ہوا ہے
تمہاری آواز تو وہی ہے مگر یہ نقشہ تو کچھ نیا ہے

اس کے بعد جناب سکینہ کی امام حسینؑ سے گفتگو شروع ہوتی ہے جس میں انھوں نے شب عاشور کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ جناب زینبؑ نے اس شب میں بچوں سے کیا گفتگو کی اور پھر پسرانِ جناب زینبؑ نے کیا جواب دیا ؎

یہ کہہ رہی تھیں صغیر سن ہو تمہارے صدقے میں غم کی ماری
ہے کل قیامت کا روز پیارو کرو نہ ماموں سے جان پیاری
یہ دھیان رکھنا کہ آئے جس دم علی اکبرؑ کی رن میں باری
گرے پسینہ جہاں پہ اس کا تو اپنا خوں واں بہانا واری

اگرچہ میں بھی ہوں خوب واقف کہ قابل جنگ سن نہیں ہے
مگر ہے مرگ اس سے بہتر کوئی زمانے میں دن نہیں ہے

وہ ننھے ننھے سے جوڑ کر ہاتھ عرض کرتے تھے اپنی ماں سے
ہمیں تمہارے ہی غم کا غم ہے اٹھا دیا تھا اب ہمای جاں سے
خدا جو چاہے تو اماں صاحب نہ جیتے آئیں گے جا کے یاں سے
خبر یہ سن لیجیو کہ قاسمؑ سے پہلے اٹھ جائیں گے جہاں سے

یہی وصیت ہے خادموں کی ہماری خدمت قبول کرنا
سنو جو مرنا ہمارا اماں نہ اپنے دل کو ملول کرنا

جناب زینبؑ کی اپنے بچوں سے گفتگو کے بعد جناب ام کلثوم کا ذکر جناب سکینہ اس طرح کرتی ہیں ؎

بہن جو چھوٹی حضور کی ہیں انکا احوال کیا سناؤں
خدا سے کرتی تھیں عرض رو رو زمین شق ہو تو میں سماؤں
کمالِ شرمندگی ہے مجھ کو اقی کو منہ کس طرح دکھاؤں
نہ میرے شوہر نہ میرے بیٹا کمک کو حضرؑ کی کس کو لاؤں
نہ کیا کیا ہو گی مجھے ندامت ہر ایک بی بی تو نذر دے گی
مگر یہ نادار ہاتھ خالی خموش چپکی کھڑی رہے گی

جناب سکینہ نے یہ سب گفتگو امام حسینؑ سے اس لیئے کی کہ انہیں یہ بتانا تھا کہ مجھ کو پہلے سے اندازہ تھا کہ میرے بابا مشکل میں گرفتار ہیں اور پیاسے قتل ہوں گے اس لیئے امام کے ہمراہ میدان میں روانہ ہونے کی خواہش ظاہر کی تاکہ فوج یزید سے کہیں کہ میرے بابا کو قتل نہ کرو۔ حافظ فرماتے ہیں کہ ؎

حسینؑ بولے اگر اسی کا یقین کامل ہے تم کو بیٹا
تو میرے ہمراہ کیوں ہو جاتی تمہارے جانے سے فائدہ کیا
وہ بولی جاتی ہوں اس لیئے میں کہ جا کے میدان میں دُکھا
کہوں گی بکتی ہوں مول میرا یہی ہے چارو نہ میرا بابا
علیؑ مشکل کشا کی پوتی رسولِ حق کی عزیز ہوں میں
جو میرے بابا کو چھوڑ دو تم، تمہاری دل سے کنیز ہوں میں

یہاں باپ سے بیٹی کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور کوئی بھی صاحب اولاد اس بند پر غور کرے تو کچھ دیر کو اس کا دل ضرور ٹھہر جائے گا۔

لیکن بچی کی یہ حالت دیکھ کر اور بیان سُن کر امام سے نہ رہا گیا۔ حافظ کہتے ہیں کہ ؎

امام بے تاب ہو کے روئے جو دیکھی اس درجہ اس کی حالت
ہے اپنا مرنا تلک گوارہ کہا کہ اللہ رے محبت

الہیٰ کیسی ہے سخت مشکل ہے دل کو بے طرح کی اذیت
طلب ہے رن میں اُدھر، ادھر ہے قدم کی زنجیر اس کی اُلفت

ہزار مرنے سے ہے زیادہ بس ایک اس کا فراق مجھ کو
چھٹا ہوں سب سے رہا ہوں صابر پر اس کا چھٹنا ہے شاق مجھ کو

باپ اور بیٹی کی اس گفتگو کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اس طرح مقطع پر حافظؔ مرثیے کا اختتام کرتے ہیں ؎

یہ کہہ رہے تھے کہ یک بیک یہ فلک سے آئی ندائے باری
سکینہ پیاری کو چھوڑ دو تم اگر ہے الفت تمہیں ہماری
یہ سن کے اٹھے حسینؑ روتے رہی تڑپتی وہ غم کی ماری
نگاہ حسرت سے تک رہی تھی کہ شہ کی رن کو گئی سواری

نہ لکھ تو حافظؔ یہ واقعۂ غم، قلم کی مانند سینہ شق ہے
دوات آنکھیں، مداد آنسو ہیں، مثل کاغذ کے رنگ فق ہے

اس کے علاوہ حافظؔ کا ایک مرثیہ مندرجہ ذیل ہے

مطلع

سلطانِ کربلا سے جو اکبرؑ بچھڑ گیا — گھر فاطمہؑ کے لال کا رن میں اُجڑ گیا
برچھی جگر میں نشترِ غم دل میں گڑ گیا — بیٹے سے باپ چھوٹ کے آفت میں پڑ گیا

حامی نہ تھا جو کوئی شہِ دل فگار کا
ہر سو برن برن کا تھا غل مار مار کا

اس مرثیے میں ۳۹ بند ہیں حضرت علی اکبرؑ اور حضرت علی اصغر کی شہادت کا حال نظم کیا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ جنگ کے دوران گھوڑے سے گرتے ہیں بابا کو پکارتے ہیں۔ امام حسینؑ کو میدان سے بیٹے کی آواز آتی ہے۔ میدان میں پہنچ کر بیٹے کے سینے میں لگی ہوئی برچھی کا زخم دیکھتے

ہیں۔ علی اکبرؑ کا لاشہ خیمے میں لانا چاہتے ہیں لیکن مادرِ علی اکبرؑ کا خیال آتا ہے اور خیمے کی جانب یہ سوچتے ہوئے تنہا واپس آتے ہیں ؎

کیا کرتی ہے محبت اکبرؑ کے جوش میں
بے ہوش ہو گئی ہے کہ بیکس ہے ہوش میں

لیکن اس کے بعد جب نوجوان بیٹے کا لاشہ خیمے میں لے آئے تو اس وقت کا منظر عجیب تھا۔ حافظ کہتے ہیں کہ

حضرت کھڑے تھے سامنے نیچی کیے نظر — رومال جھل رہی تھی وہ مظلوم نوحہ گر
شہ بولے محو مری اے سوختہ جگر — کیوں چپ ہو پوچھتی نہیں بیٹے کی کچھ خبر
تم رہ گئیں یہ داغ اٹھانے کے واسطے
بیٹے کو کھو دیا مرے بچانے کے واسطے

اس کے بعد کے مکالمے اور نفسیاتی کیفیت بھی ملاحظہ ہو ؎

کہتا نہ تھا کہ بھیجو نہ اکبرؑ کو زینہار — جانے دو قتل گہ میں مجھے بہرِ کارزار
بانو نے جب یہ دیکھا کہ والی ہے شرمسار — بولی ہزار اکبرؑ و اصغرؑ کروں نثار
اکبرؑ کا ہے نہ رنج نہ اصغرؑ کا غم مجھے
درکار ہے فقط یہی حضرت کا دم مجھے

اللہ آپ کو رکھے قائم جہان میں — روشن رہے چراغ نبیؐ کے مکان میں
ہر دم رہیں حضور خدا کی امان میں — حضرت کے دم سے جان ہے ہم سب کی جان میں
درکار ہے نہ مال نہ اولاد چاہیے
زہراؑ کی گود دائمی آباد چاہیے

یہاں امام حسینؑ کی زوجہ کا یہ دعا نہ مانگنا کہ بچوں کے سر پہ سایہ رہے یا میرا سہاگ قائم رہے بلکہ یہ کہنا کہ ؎

روشن رہے چراغ نبیؐ کے مکان میں

انداز بیان اور بلاغت کی عمدہ مثال ہے

یہ دعا مانگنے کے بعد زوجہ امام حسینؑ عورت ہونے کے ناطے جو فطری تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کرتی ہیں کیوں کہ عورت کو اپنا سہاگ بھی بہت عزیز ہوتا ہے اس لیے وہ بات بھی زبان پر آہی جاتی ہے۔ بیوگی کے تصور سے عورت کا قلب کانپتا ہے۔ ہر چند کہ سہاگ کی دعا نہیں مانگی لیکن پھر بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ

گردش میں آج صبح سے میرا نصیب ہے

رخصت ہے اب سہاگ رنڈاپا قریب ہے

حافظ کی عمر کا زیادہ تر حصہ امروہہ سے باہر گزرا لکھنؤ بھی آمد و رفت رہی کلکتہ بھی طویل قیام رہا۔ انیس کے بھی قدردان تھے اسی وجہ سے کہیں کہیں حافظ کا رنگ لکھنؤ کی مرثیہ نگاری سے بہت ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حافظ کہتے ہیں کہ

اصغر کے پاس آئے یہ کہہ کر شہ زماں — دیکھا تو برگ گل کی طرح خشک ہے زباں

پوچھا پسر کے کان میں جھک کے بصد فغاں — چلتے ہو میرے ساتھ؟ اشارہ کیا کہ ہاں

چلائی ماں کہ باپ کو مادر پہ فوق ہے

اصغر کو کمسنی میں شہادت کا شوق ہے

حضرت علی اصغر کو امامؑ گود میں لے کر خیمے سے میدان کی جانب جانے کا قصد کرتے ہیں اس وقت کی منظر کشی ملاحظہ ہو ؎

القصہ اپنی گود میں سلطان بحر و بر — لے کے چلے صغیر کو پہنچے قریب در

یاں آ تماگی آنچ یہ بھڑکی کہ الحذر — دوڑی پسر کی سمت کو بانوئے نوحہ گر

اس کے بعد بچے سے فرمایا کہ ؎

آئے گی کل نہ مجھ کو تمہارے فراق میں
میں بھی ابھی سے سو گئے ہوں اشتیاق میں

الغرض امام بچے کو لے کر چلے میدان میں پہنچے فوج یزید سے مخاطب ہوتے ہے

مثلِ کمان خمیدہ چلے سرورِ زمیں ۔۔۔ سائے میں اپنے کر لیے رخسارِ نازنیں
بانو کے ماہتاب کو وہ آفتابِ دیں ۔۔۔ خورشید سے بچا کے گیا پیشِ فوجِ کیں
فرمایا تم میں سنتا ہے فریاد بھی کوئی
آخر تو ہوگا صاحبِ اولاد بھی کوئی

حضرت یہ کہہ رہے تھے بصد عجز و انکسار ۔۔۔ بچے کے حلق سے جو ہوا تیرِ ظلم پار
مادر اُدھر تڑپ گئی یاں شاہِ نامدار ۔۔۔ اصغر کا حلق بازو تے سرورِ ہوا فگار
ماں باپ کا جگر تو ادھر غم سے پھٹ گیا
بچہ ادھر دل کے گلے سے لپٹ گیا

اس کے بعد امام عالی مقام بچے کو لے کر خیمے کی جانب چلے لیکن علی اصغر کی ماں سے شرمندگی تھی کیوں کہ پانی پلانے کے لیے کہہ کر لے گئے تھے۔ دوسری طرف مادرِ علی اصغرؑ نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو یہ احساس کیا کہ اگر وہ گریہ کرتی ہیں تو امام کو اور بھی ملال ہوگا۔ ان احساسات کی ترجمانی حافظؔ نے بہت اچھے انداز میں کی ہے ؎

حضرت جھکائے سر گئے بانو کے روبرو ۔۔۔ اصغر لہو میں غرق تھا مجروح تھا گلو
گوشہ ردا کا پھاڑ کے دوڑی وہ نیک خو ۔۔۔ سرور کا بازو باندھا وہیں پونچھ کر لہو
فرمایا شاہِ دیں نے خجالت نہ دیجیے
لال اپنا لے کے روئیے کچھ بین کیجیے

بانو نے ضبطِ گریہ کیا تھا یہی خیال ۔۔۔ رونے سے بیر اور بھی ہوگا انہیں ملال
مہماں ہے کوئی آن کا بس فاطمہ کا لال ۔۔۔ رونا ہے ساری عمر یہی اس کا ہے مآل

شہ بولے اذن دیتے ہیں ہوتے کا ہم تمہیں
رو رو بیاں کرو مرے سر کی قسم تمہیں

آخر امام کے اذن پر مادرِ علی اصغرؑ نے بیان شروع کیے ہے

اصغر تمہارے واسطے جاگی تھی رات بھر — جھولے میں ڈر نہ جاؤ کہیں تھا یہ مجھ کو ڈر
تاریک شب، یہ غیر جگہ، دشت پُر خطر — اب تم کہاں ہو ماں کہاں ڈھونڈوں میں کدھر
سوئے گا کون ہاتھ کے اب عالی صفات کو
لوری کہے گا کون؟ جو چونکو گے رات کو

آخر میں حافظ اپنے لیے دعا پر اس طرح مرثیے کا اختتام کرتے ہیں ہے

حافظ بس اب خموش نہ طولِ کلام کر — بس روک لے قلم کو مسدس تمام کر
آئے پسند سب کو، ہے لازم وہ کام کر — اللہ سے دعا یہی ہر صبح و شام کر
چشمِ کرم رہے مرے اوپر حسینؑ کی
میری بھی مغفرت ہو، مرے والدین کی

اس کے علاوہ سید محمد احمد مرحوم (محلہ منڈی چوب امروہہ) نے ایک ملاقات میں حافظ کے ایک مرثیے کا مطلع سنایا تھا۔ جس میں ان کے بیان کے مطابق ۱۰۰ سے زیادہ بند ہیں۔ مرحوم نے کافی تلاش کیا لیکن ان کے کاغذات میں وہ مرثیہ گم ہو گیا۔ مطلع ہے ہے

اے کلک لوحِ قلب پہ طغرا نویس ہو — پاکیزہ حرف حرف ہو مضموں نفیس ہو
مطلب بلیغ ہو تو عبارت سلیس ہو — طرزِ دبیر لطفِ کلامِ انیس ہو
کوشش رہے مدام اسی کارِ نیک میں
جب ہے مزا کہ لطف ہو دونوں کا ایک میں

اس مطلع سے مرثیہ نگاری اور فنِ شاعری سے متعلق حافظ کے نقطۂ نظر کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ حافظ کے دو مراثی سید مہذب حسین صاحب ایڈووکیٹ محلہ کٹکوئی کے ہاں سے

ان کے خاندان کے قدیم بستوں سے بھی ملے ہیں۔ جن کے مطلعے اور مقطعے مندرجہ ذیل ہیں ؎

جب شہ سے شہ کا قوتِ بازو جدا ہوا ‏ پہلو سے قلب، قلب سے پہلو جدا ہوا
بھائی کی جاں برادرِ خوش خو جدا ہوا ‏ کہتے تھے ہم مرتے، یہ نہیں تو جدا ہوا

بے بے گئی وہ چاند سی تصویر کس طرح؟
جائے تلاش کرنے کو شبیر کس طرح؟

حافظ بس اب خموش نہ دے مرثیے کو طول ‏ رکھتے نہیں پسند طوالت ذوی العقول
ہو بارگاہِ شہ میں یہ ہدیہ ترا قبول ‏ روضے کی شاہ کے ہو زیارت تجھے حصول

راضی ہو کبریا تو خوش اس کا حبیب ہو
تجھ کو شرف غلامیٔ شہ کا نصیب ہو

اللہ نہ دے صدمۂ اولاد کسی کو ‏ مالک نہ کرے شاد سے ناشاد کسی کو
خالق نہ کرے خلق میں برباد کسی کو ‏ بچھڑے ہوئے بیٹے کی نہ ہو یاد کسی کو

اس صدمے کی لذت شہِ دلگیر سے پوچھو
شبیرؑ سے یا بانوئے شبیرؑ سے پوچھو

بس روک لے اب کلک کو تحریر سے حافظ ‏ کیا فائدہ طولانی تقریر سے حافظ
کر اب یہ دعا مالکِ تقدیر سے حافظ ‏ ہوں میرے پسر صدقۂ شبیرؑ سے حافظ

آرام رسا طالعِ قرآن رہوں یارب
عالم بہ عمل حافظِ قرآں ہوں یارب

حافظ کے زیرِ نظر مراثی جو تحقیق و تلاش ہو سکے ہر چند کہ یہ حافظ کو پوری طرح سمجھنے میں نامکمل ہیں لیکن اس کے باوجود بھی حافظ کی عظمت کا اعتراف کرانے کے لیے کافی ہیں۔ حافظ کو مرثیے سے خاص ذہنی لگاؤ تھا۔ وہ ہر رنگ میں مرثیہ کہنے کی قدرت رکھتے تھے۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قرآن۔ تاریخِ اسلام احادیث

پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے عہد بلکہ اپنے سے قدیم مراثی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔
جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی ذاکری کرتے تھے۔ درحقیقت ذہنی طور پر وہ فصیح
سے انیس تک کے فاصلے کو طے کرتے ہیں۔

نہیں ہوتا۔ جب راقم نے ضیاؔ کے چھوٹے فرزند سید زہیر قیصر مرحوم کی اہلیہ سیدہ فہمیدہ خانم (جو نہایت نیک مومنہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ذاکرِ امامِ حسینؑ اور ادارہ خدام الزائرین کی ناظم بھی ہیں) سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے بتایا کہ ضیاؔ کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہوئی ہے۔
ضیاؔ کی وفات پر مولوی اولاد حسن سلیمؔ نے مندرجہ ذیل تاریخ وفات کہی جس کے مطابق وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی اس طرح ۷۰ سال کی عمر کے حساب سے ضیاؔ کی ولادت تقریباً ۱۲۵۶ھ میں ہوئی۔

آتشِ تپ نے جلایا کیسے کیسے جان کو
اے فلک بتلا ترا دل اب تو ٹھنڈا ہو گیا
روتی ہے شامِ غریباں ڈھانپ کر منہ رات بھر
دامنِ صبحِ شہادت پارہ پارہ ہو گیا
سالِ رحلت سن کے ہاتف نے صدا دی اے سلیم
آہ جانے سے ضیاؔ کے کیا اندھیرا ہو گیا

۱۳۲۶ھ

اس قطعہ تاریخ کے مصرعِ اول میں آتشِ تپ کا ذکر اس مناسبت سے کیا گیا ہے کہ ضیاؔ نے بخار میں مبتلا ہو کر ۲۲ صفر ۱۳۲۶ھ کو انتقال فرمایا۔ تیسرے مصرع میں "شامِ غریباں" کا ذکر ہے جس تصنیف کو مرحوم نامکمل چھوڑ گئے اور چوتھے مصرع میں کتاب "صبحِ شہادت" کا ذکر ہے جو مکمل تھی اور طبع بھی ہوئی۔

بہر حال ضیاؔ نے اپنی پوری عمر علم وادب اور شعر وسخن کی خدمت میں گزار دی اور وہ بحیثیتِ شاعر وادیب بھی کامیاب تھے اور وکیل بھی۔ گھر کے ماحول کے سبب ان کی شاعری کی ابتدا کم عمری سے ہی ہو گئی تھی۔ ان کی زندگی سے متعلق جو سب سے

اہم واقعہ ہے وہ زیاراتِ مقاماتِ مقدسہ کے سلسلے میں ہے جب وہ ۱۳۰۸ھ میں زیارات کو تشریف لے گئے تھے جس کا بیان وہ خود اس طرح "فریادِ ضیا" میں کرتے ہیں:

"یہ امرِ عجیب لکھتا ہوں مگر خدا شاہد ہے کہ ایک لفظ بھی اس راستی کے خلاف نہیں ہے جو خداوند تعالےٰ نے عطا فرمائی ہے ـــــ بعد نمازِ مغربین ہمارا سب جلسہ حاضرِ روضۂ مقدس ہوا اور ہر شخص مصروف بہ اوراد تھا روشنی کا سامان اس قدر ہوتا ہے کہ ہر شخص جہاں چاہے بیٹھ کر اپنی اپنی کتاب سے ادعیہ پڑھ سکتا ہے۔ ضریح مقدس کے پاس پسِ پشت حضرت امام محمد تقی کی قبر مطہر کے ضریح مقدس کے گوشۂ غربی و شمالی کے قریب بیٹھا ہوا مصروف اوراد تھا آدمیوں کی جو کثرت ہوتی ہے وہ دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے ہر ہر شخص اپنے اپنے حال میں مصروف خشوع و خضوع کی کیفیت وہی قلوب خوب جانتے ہیں جن پر یہ حالت طاری ہوتی ہے ایک کو دوسرے سے بات چیت کرنے کا نہ موقع ملتا ہے نہ قلب گوارا کرتا ہے ہمارے جلسے کے لوگ بھی اسی طرح مصروفِ اوراد تھے۔ جہاں جس کسی کو جگہ مل گئی وہیں مصروفِ زیارت خوانی۔ قرآں خوانی۔ ادعیہ۔ تہلیل۔ تکبیر۔ تمجید۔ تسبیح میں مشغول ہوگیا ـــــ جن لوگوں کے پاس کتابیں نہیں ہوتیں وہ دوسروں کے شریک ہو جاتے ہیں ـــــ ایک صاحب جن کے چہرے سے آثارِ بزرگی و جلالت ہویدا تھے ملبس بہ لباسِ عرب میرے ایسے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور اس شان سے طرزِ نشست واقع ہوئی تھی کہ گویا میں ان کی گود میں تھا۔ جب تک میں دیگر اوراد میں مصروف رہا اس وقت تک وہ حضرت بھی کچھ پڑھتے رہے۔ آخر کار مجھ سے بزبان فارسی ارشاد ہوا کہ دعائے کمیل پڑھو۔ میرے پاس کتاب موجود تھی میں نے دعائے کمیل پڑھنا شروع کی اور یہ خیال کیا کہ شاید دعا یاد نہیں۔ میرے ساتھ جیسا کہ عام طریقہ جاری ہے پڑھنا چاہتے

ہیں اسی خیال سے میں نے کسی قدر بلند آواز کے ساتھ پڑھنا شروع کیا کہ ان کی سمجھ میں بخوبی آسکے مگر میں یہ دیکھتا تھا کہ میرا خیال صحیح نہیں۔ وہ خود پڑھتے چلتے جاتے ہیں اول میں یہ سمجھا کہ شاید دعا کے اوائل فقرہ جات یاد ہوں گے مگر آخر کار یہ خیال بھی صحیح نہیں ہوا۔ اول سے آخر تک یکساں یہی حالت رہی۔

سب سے زیادہ یہ امر لائق بیان ہے کہ جس قدر میں چاہتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اپنے تلفظ کو ان کے تلفظ سے آگے بڑھا دوں ناممکنِ محض تھا۔ آخر کار میں نے ان کے اتباع میں پڑھنا شروع کیا اس کے بعد بعض بعض مقام پر غلطی زیر و زبر کی میری کتاب میں برآمد ہوئی اس کی صحت فرما کر مجھے ارشاد ہوا کہ اس غلطی کی تصحیح کتاب میں کر لینا بعض مقام پر قرأت کی غلطی کی صحت فرمائی گئی۔ جب دعائے کمیل ختم ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ درودِ طوسی بھی اسی طرح آپ کے ہمراہ پڑھوں اگر آپ اجازت دیں۔ چنانچہ بعدِ حصولِ اجازت درودِ طوسی بھی اسی شان سے ختم کیا مگر فی الحقیقت اس لطف کے ساتھ دعائے کمیل و درودِ طوسی میں نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ عجیب و غریب حال تھا کہ جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد وہ حضرت کھڑے ہوئے میں نے مصافحہ کرنے میں دریافت کیا کہ اسم شریف؟ ارشاد ہوا۔ علی۔ میں نے عرض کیا دولت خانہ؟ جواب ملا۔ نجف۔ ان جوابات کو میں ابھی ایک سکتہ کی سی حالت میں کچھ عجیب طرح کی نظر سے دیکھ ہی رہا تھا کہ گوشۂ شمالی و غربی ضریحِ مقدس تک مجھ سے بہت قریب تھا وہ جمالِ با کمال پیشِ منظر رہا اور پھر یکایک میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ (صفحہ ۷۔۸۔۹)

ضیا دوسری مرتبہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ کو امروہہ سے بہ ہمراہ جناب مولوی سید اعجاز حسن صاحب مع اپنے بڑے فرزند سید ابن حسن زیارات کو تشریف لے گئے تھے۔ اور ان کا ایک فارسی ہفت بند روضۂ اقدس میں خادم نے مخصوص مقام پر

نصب کیا تھا جو وہاں کافی مقبول ہوا۔ جب مولوی سید اولاد حسن قبلہ سلیم کے ساتھ ایک قافلہ زیارات کو گیا تو اس کا مندرجہ ذیل شعر مولوی اولاد حسن قبلہ کے جواہر قلم مبارک سے ایک گلٹ کے سوا گز مربع تختہ پر تحریر کرا کے ضیا نے نجف اشرف بھیجا جو وہاں جا کر نصب ہوا۔

بر حصارِ احمدی فضلِ علی باب‌ُہا

شد کلیدِ او تولائے امیرالمومنین

اس کے علاوہ ضیا کے حالاتِ زندگی کتب تواریخ اور تصانیف ضیا میں نہیں ملتے۔

ضیا کے اخلاف میں چار پسر ہوئے حاجی سید ابن حسن۔ سید محمد حسن۔ سید زائر حسین اور سید زہیر حسین۔ سید ابن حسن کی اولاد میں سید علی بزرگ۔ سید زوار حسین۔ سید ظہور مہدی۔ سید مسیب حسین۔ سید محمد خامس اور سید محمد سادس ہوئے۔ سب زیورِ علم سے آراستہ تھے۔ سید زوار حسین کے پسر ڈاکٹر سید محمد شفاعت ہندوستان میں اپنے بزرگوں کے وقار کی نشانی ہیں۔ سید ابن حسن کی باقی اولاد زیادہ تر پاکستان منتقل ہو گئی۔ ضیا کے دوسرے پسر سید محمد حسن کی اولاد میں سید ذہین احمد۔ سید رضوان حیدر اور سید افضال حیدر وغیرہ بھی پاکستان چلے گئے۔ ضیا کے تیسرے پسر سید زائر حسین خود بھی ایک اچھے شاعر تھے پہلے زائر بعد کو زہیر تخلص کیا۔ ان کا ایک مجموعہ "گلستانِ عقیدت" پاکستان میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے آپ پہلی مرتبہ کم سنی میں زیارات کو تشریف لے گئے تھے اور دوسری مرتبہ انتقال سے چند روز قبل حج و زیارات سے واپس آئے تھے۔ سید زائر حسین کی بھی تمام اولاد پاکستان میں منتقل ہو گئی۔ ان کی اولاد میں سید غلام السیدین۔ سید حبیب الثقلین۔ سید ظفر حسنین۔ سید محمد سبطین۔ سید مظہر حسین اور سید ضیا حسن ہوئے۔ سب لائق ہیں اور اعلیٰ

عہدوں پر فائز ہیں کیپٹن سید ظفر حسنین قومی خدمات سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ "انجمن سادات امروہہ کراچی" کے جنرل سکریٹری بھی رہے ہیں۔ ضیاؔ کے چوتھے پسر سید زبیر قین مرحوم ہندوستان میں اعلےٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ سید زبیر قین کے فرزند سید ابن قین قوم کے ہونہار نوجوان ہیں درس و تدریس کے علاوہ بزرگوں کے اثاثے کی نگرانی بھی ان کے ہی سپرد ہے۔ لیکن ضیاؔ کی نسل میں سید نثار حسین کے بعد شاعری کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

ضیاؔ کی مرثیہ نگاری سے متعلق میر انیس لکھنوی کا نوٹ مندرجہ ذیل ہے:

"معائنہ مضامین رنگین و تناسب الفاظ و رعایت لفظی و معنوی مرثیہ ہذا از نتائج افکار گوہر بار سید حسن صاحب ضیاؔ سلمہٗ اللہ تعالےٰ خلف الصدق شاعر عزا مسلم الثبوت کہ بمقام امروہہ فی الحقیقت دریں فن علاوہ دیگر صفات کامل و یکتا مرحوم بجناب سید ابو الحسن صاحب فرقتیؔ اند کلام روشن ضیاؔ موصوف الصدر تیز شمیم تکمیل بمشام فرد میر ساند چندان از حد محفوظ گردیدہ مفرد مصرف طباعی و خوش فکری و ذہن و ذکاوتی سید حسن صاحب است اللہم زد ولا نقص"۔ (تواریخ واسطیہ صفحہ ۳۰۳)

اس کے علاوہ ضیاؔ کی مرثیہ نگاری پر تو نہیں البتہ "فریادِ ضیاؔ" پر اس دور کے ممتاز عالم ممتاز حسین جونپوری نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے کہ

"ہر مظلوم چاہتا ہے کہ زوردار سے زوردار لفظوں میں عرضِ حال کرے شاعر کو خدا نے یہ قوت بھرپور عطا کی ہے چنانچہ ضیاؔ اگر "فریادِ ضیاؔ" کی صورت میں نظماً اپنے اور دوسرے اپنے سے کمزور کے لئے دنیا میں نہ چھوڑ جاتے تو بڑی کمی رہ جاتی۔ فریادِ ضیاؔ لکھ کر ہفت بند ملا کاشی کے بعد اسی پر چڑھی۔ اسی لائن۔ اسی سید ھے خطہ۔ اسی صراطِ مستقیم کے متوازی جناب ضیاؔ دوسرا ہفت بند تیار کر کے ہمارے ہاتھ

میں بطور ایک سند دے گئے"۔ (یادِ ضیا صفحہ ۸)

ضیا کے مراثی کے سلسلے میں مورخین نے بیسوں کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن چوں کہ مجموعے کی شکل میں شائع ہو کر وہ منظرِ عام پر نہیں آئے اس لیے ان کی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ جب راقم نے اس سلسلے میں تلاش و تحقیق شروع کی تو مندرجہ ذیل مراثی ضیا کے پوتے سید ابنِ قمین (شفاعت پورہ) سید امیر حسن (دربارِ کلاں) سید طہیر حسن (چاہ غوری) اور سید امیر الدین (شفاعت پورہ) سے حاصل ہو سکے۔

؏ مشاطۂ شفق نے سنوارا جو روئے صبح	بند	۱۹۰
؏ ہاں ساقیا سرور کے دن ہیں شراب دے	بند	۱۳۱
؏ جملۂ نظم میں لیلائے سخن آتی ہے	بند	۱۶۲
؏ انصارِ شہِ دیں جو سوئے خلد سدھارے	بند	۲۸
؏ آئی جو لٹ کے آلِ پیمبرؐ مدینے میں	بند	۱۴
؏ اے شہ کے عزادار دیہ ہے بیٹھنے کی جا	بند	۱۴
؏ رخصت کو آئے خیمے میں سردارِ دوجہاں	بند	۱۸
؏ نورِ نگاہِ اہلِ بصیرت حسینؑ ہے	بند	۲۴
؏ اے عاشقانِ شاہ یہ ہے بیٹھنے کی جا	بند	۲۲
؏ ہاں قلم معرکۂ قاسمؑ نوشاہ دکھا	بند	۳۰
؏ خورشیدِ آسماں ہوا خانہ نشینِ غم	بند	۲۳
؏ شور ہے ضیغمِ میدانِ وغا آتا ہے	بند	۷۲
؏ گزر گئے جو بہت دن حرم کو زنداں میں	بند	۲۲
؏ جس گھڑی لوٹ سے اعدا نے فراغت پائی	بند	۱۴
؏ مقتل میں جب حسینؑ کی سرکار لٹ گئی	بند	۲۳

ع جب کربلا میں فوجِ حسینی ہوئی تباہ — بند ۱۲

ع پیدا ہوا جو ثانیِ عبد علیؑ کا لال — بند ۱۳

ع جب کہ خیمے شہِ مظلوم کے تاراج ہوتے — بند ۱۱

ع جب عازمِ وغا ہوتے عباسؑ نامدار — بند ۱۵

ضیا کے مندرجہ بالا مراثی میں امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی سے اہلِ بیتؑ کے لُٹے ہوئے قافلے کی مدینے تک کی واپسی کے تمام حالات کا ذکر مختلف حصوں میں مل جاتا ہے اور ضیا نے تمام ہی واقعات بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں۔ مثلاً روزِ عاشورہ امام اور ان کے ساتھیوں کی نمازِ صبح کا ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

اے عابدو کلامِ عبادت کا وقت ہے — اے ذہن پر حصولِ سعادت کا وقت ہے
اس دم خدائے پاک کی طاعت کا وقت ہے — اٹھ کر وفر کے ساتھ اقامت کا وقت ہے
صدقے ملک بھی جانِ شورِ اذاں پہ ہوں
قد قامت الصلوٰۃ کے نعرے زباں پہ ہوں

کہہ کر اذاں کو زیبِ جماعت ہوئے جناب — صف باندھ کر کھڑے ہوئے سب مقتدی شتاب
تکبیر کہہ کے شاہ نے اس دم بہ آب و تاب — الحمد کو شروع کیا مثلِ بوترابؑ
حضرت ثنا جو کرتے تھے خالق کی شان پر
الحمد شکر کرتی تھی شہ کی زبان پر

آگے چل کر ضیا نماز کے بارے میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور نماز کے ہر ہر رکن کا ذکر پورے شاعرانہ سلیقے اور بہترین منظر نگاری کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں ؎

آیا زباں پہ قدر، تو قدرِ سحر بڑھی — سب جھومتے تھے یادِ الٰہی میں مقتدی
ہاں کیوں نہ ہوتی، وجد میں ہر ایک کو خوشی — شہ کی زباں، کلامِ خدا، لہجہ نبی
سب دشت کوہ سننے کو خاموش ہو گئے
طائر بھی صبح کے ہمہ تن گوش ہو گئے

یہاں بیت میں کس قدر انیس کا رنگ جھلک رہا ہے۔ اگلا بند ملاحظہ ہو ؎

سورہ تمام کر کے کیا شہ نے جب رکوع — ذکر خدائے پاک کیا تب بصد خضوع
جس دم اٹھایا سر، تو ہوا مہر کا طلوع — فرمایا شاہ نے سمع اللہ بصد خشوع
تکبیر کہہ کے سر کو جھکایا جناب نے
سر خاک پر رکھا پسرِ بوترابؑ نے

صبحِ عاشورہ کی نماز کے ذکر کے بعد جو تشریح آگے چل کر اس صبح کی ضیاؔ نے کی ہے وہ بے حد دل خراش ہے ؎

یہ وہ سحر ہے، جس کو لٹا فاطمہؑ کا گھر — یہ وہ سحر ہے، ہو گئی زینبؑ برہنہ سر
یہ وہ سحر ہے، ہو گئے سجادؑ بے پدر — یہ وہ سحر ہے، روئے جسے سید البشر
ہنگام عصر قتل کیا تشنہ کام کو
زینبؑ کے بازو باندھے گئے جس کی شام کو

کائناتِ عالم کی تاریخ میں عاشور کی رات بڑی اہم تھی۔ اسی رات میں امامِ عالی مقام نے اپنے سب اعزا و انصار کو یکجا کیا اور جو خطبہ ارشاد فرمایا اسے ایک مرثیے میں ضیاؔ نے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

القصہ شاہِ دیں نے پس از حمدِ کبریا — خطبہ بلیغ، شان میں اللہ کی پڑھا
بعد از درودِ پاک شہنشاہِ انبیاءؐ — اصحاب با وقار سے ارشاد یہ کیا
ایسے جری نبیؐ و وصیؑ کو ملے نہیں
اصحاب اس طرح کے کسی کو ملے نہیں

جرار ذی شعور، وفادار، باوقار — طاعت گزار، نیک عقیدہ، وفا شعار
سب رہروانِ راہِ خدا، اور بردبار — صافی مزاج، نیک طبیعت، نجستہ کار
اللہ اپنے فیض سے دار النعیم دے
تم کو جزائے خیر خدائے کریم دے

سن لو بگوشِ ہوش اسے ناصرانِ دیں　　　تم سے کسی طرح کی شکایت مجھے نہیں
بیعت سے اب رہا کیا میں نے کرو یقیں　　　جاؤ وطن کو چھوڑ کے تنہا مجھے یہیں

لو ساتھ اہلِ بیت رسالتمآبؐ کو
اس جا پہ چھوڑ دو پسرِ بوترابؑ کو

یہ خطبہ سننے کے بعد امام حسینؑ کے انصار فرماتے ہیں کہ ؎

مرنے کے بعد آپ کے زندہ رہیں غلام　　　مولا ہی جب نہیں تو غلاموں کا کیا ہے کام
جینے کا لطف کچھ نہیں مر جائیں جب امام　　　اس زندگی پہ خاک جو صحبت ہے فاہو نام

لائیں کہاں سے دل جو سہیں اس ملال کو
تنہا یہاں پہ چھوڑ دیں زہراؑ کے لال کو

پیشِ خدا بتائیے کس منہ سے جائیں گے　　　محبوبِ ذوالجلال کو کیا منہ دکھائیں گے
ایسی سعادتِ ابدی پھر نہ پائیں گے　　　ہم سب خدا کی راہ میں گردن کٹائیں گے

سینہ سپر کریں گے شہِ تشنہ کام پر
ہو جائیں گے لاکھ جان سے صدقے امام پر

یہاں ضیا نے اصحاب امام حسین کا کردار بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے ان کا جذبۂ جاں نثاری، وفاداری اور فداکاری و امام سے عقیدت کا اظہار پوری طرح ہوتا ہے۔ واقعی ناصرانِ امام حسینؑ نمازی بھی ایسے ہی تھے اور غازی بھی ایسے ہی۔ بقولِ ضیا ؎

سر فروش ایسے نہ ہونگے نہ مجاہد ایسے
زاہد کہہ دے گا کہ دیکھے نہیں زاہد ایسے

عاشور کی شب میں یہ زاہد و سر فروش اپنے لیے کیا دعا کر رہے تھے۔ ملاحظہ ہو ؎

پسرِ فاطمہؑ زہراؑ کی وِلا دے ہم کو — موت ایسی دے کہ تا حشر جِلا دے ہم کو
احد و بدر کے کشتوں سے مِلا دے ہم کو — صدقہ شبیرؑ کا فردوس دِکھا دے ہم کو

سر کو ہم دل سے تری راہ میں قرباں کریں
شہِ مظلوم کے قدموں پہ فدا جاں کریں

امام حسینؑ کا وہ چھوٹا سا قافلہ جو مدینے سے کربلا کی جانب روانہ ہوا تھا۔ اس میں کا ہر ہر فرد بہترین سیرت و کردار کا نمونہ تھا۔ یہ قافلہ صبر و شجاعت۔ عزم و ہمت۔ عبادت و سخاوت۔ زہد و تقویٰ۔ ایثار و قربانی اور مہر و وفا کے پھولوں کا ایک خوب صورت گلدستہ تھا۔ ضیا نے اس قافلے کی صورت و سیرت دونوں بیان کی ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

کوئی ہے فاطمہؑ زہرا کا گلِ تر ان میں — ہے کوئی جعفرِ طیار کا دلبر ان میں
کوئی شہ زور ہے اور کوئی دلاور ان میں — ہے علم دار کوئی اور کوئی سرور ان میں

راحتِ قلب انہیں پھولوں سے وابستہ ہے
گلشنِ احمدِ مختار کا گل دستہ ہے

ان کے رخساروں کی ضو اور نگینی دیکھو — دیکھ کر جن کو نہ آئینہ جبینی دیکھو
سرو آنکھوں سے گرے ان کی جو بینی دیکھو — خوش قدی، غنچہ لبی، ماہ جبینی دیکھو

چشمِ گردوں نے کبھی دیکھے نہیں غازی ایسے
سجدہ شمشیروں میں کرتے ہیں نمازی ایسے

کوئی نوخیز ہے بستانِ جوانی کا شجر — ہے کوئی آئینہ رو اور کوئی رشکِ قمر
کوئی گل رو ہے گلستانِ شجاعت گلتر — ہے گل اندام کوئی اور کوئی خوش رنگ گلِ تر

جب نسیمِ سحری ان سے گزر جاتی ہے
دور تک لشکرِ اسلام کی بو آتی ہے

یہاں ضیا نے مرثیے میں ایک خاص تغزل پیدا کر دیا ہے اور نسیم سحری کا قافلے

سے ہو کر گزرنے کے بعد دور تک لشکرِ اسلام کی بو آنا تلاشِ مضامین اور ندرتِ بیان کا بہترین نمونہ ہے اور صرف اس بیت سے ہی قافلۂ امام حسین کے کردار پر مکمل روشنی پڑ جاتی ہے۔

اردو مرثیے کو سب سے زیادہ وسعت میر ضمیرؔ نے دی ہے تلوار اور گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی ان کے ہی اضافے ہیں۔ ضمیرؔ کی پیروی انیسویں صدی کے تمام ہی مرثیہ نگار شعراء نے کی ہے۔ ضیاؔ کے مراثی میں بھی دونوں موضوعات پر کافی حصہ ملتا ہے۔ ایک جگہ گھوڑے کی تعریف ملاحظہ ہو۔ جس میں اس کی صفات کے ساتھ سراپا بھی بیان کیا ہے ؎

تیز دم، تیز قدم، خوش لقا، خوش کردار　　یال چنچال، خوش اقبال، پری وش، طرّار
پلکیں دل دوز، جگر سوز ہیں سو قلب پہ بار　　ٹاپیں خوں ریز، نظر تیز، انوکھی رفتار
نہیں چلتی ہے سبک بادِ بہاری ایسی
غنچے سوسن کے فدا، تھوتنی پیاری ایسی

گھوڑا کس موج میں دریا کی طرف جاتا ہے　　لہریں آتی ہیں ہوا نہر کی جب کھاتا ہے
جھومتا مثلِ نسیمِ سحری آتا ہے　　دل سوئے آبِ خنک دیکھ کے للچاتا ہے
چاہ ظاہر ہوئی جاتی ہے تنگ و دو ہو کر
نہر کی سمت وہ جاتا ہے سبک رو ہو کر

تلوار کی تعریف بھی ملاحظہ ہو ؎

سب مورچوں کو مار کے مسمار کر دیا　　جامِ فنا ہر ایک کو بس مار کر دیا
تن پر ہر اک لعین کے سر، بار کر دیا　　خونِ عدو سے دشت کو گلنار کر دیا
جس دم چمک کے وہ صفِ دشمن پہ گر پڑی
غل تھا کہ برق کوند کے خرمن پہ گر پڑی

سر پہ عدو کے پھرتی تھی تقدیر کی طرح — سیدھی وہ جا کے پڑتی تھی تدبیر کی طرح
تاکا جسے پہنچ گئی بس تیر کی طرح — لیتی تھی جان زہر کی تاثیر کی طرح
جاتی تھی جس طرف کو ظفر ساتھ ساتھ تھی
اس دن کی تیغ حیدرِ صفدر کے ہاتھ تھی

سینوں سے جگر، قلب سے جاں، جسم سے راحت — میداں سے اماں، رگ سے لہو، دل سے محبت
بازو سے تواں، سر سے خودی، منہ سے طلاقت — کس ہاتھ سے، نور آنکھ سے، کانوں سے سماعت
ہر پیر سے تدبیر، تو بس زور جواں سے
اس تیغ نے سب کھینچ لیے یک لخت جہاں سے

تلوار کی تعریف میں اس بند کا اہتمام خاص طور سے قابلِ تعریف ہے اور یہ ضیاؔ کی مہارت کا ثبوت ہے۔

ضیاؔ کے مراثی میں امام حسینؑ۔ حضرتِ عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ کے سراپا خاص طور سے ملتے ہیں۔ ایک جگہ حضرتِ عباسؑ کا سراپا ملاحظہ ہو ؎

واہ رے عارضِ تاباں کی صفائی ہے عجب — اور خط اس پہ ہے شان زہے قدرتِ رب
لب شیریں ہیں بس باغِ جناں کے رطب — اس کا مطلب یہی ہے کچھ اور جو کہتے ہیں لب
خط میں لکھا ہے کہ مرنے کا یہی بس دن ہے
لب یہ کہتے ہیں بتیس ۳۲ برس کا سن ہے

ہاتھ وہ ہاتھ جو کرتے ہیں شکارِ ضیغم — قوتِ دست، سرِ دست عدو سے گی رقم
کیا لکھوں رعب، قلم خوف سے ہوتا ہے قلم — قوتِ بازوئے شبیرؑ ہیں خالق کی قسم
شیر ہیں اور اسد اللہ کے دلبند ہیں یہ
ہاتھ کہتے ہیں ید اللہ کے فرزند ہیں یہ

حضرتِ عباسؑ کے ہی ذکر میں ایک اور بند ملاحظہ ہو جس سے یہ اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ ضیاؔ کو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی ۔

رُخِ عباسؑ کے صدقے، تنِ زیبا کے نثار   اس تہوّر کے فدا، ہمتِ والا کے نثار
ان کی جرأت کے تصدق، دلِ شیدا کے نثار   اس علم دار کے قربان، سراپا کے نثار
حوریں کرتی ہیں اشارے ہمیں مشتاق ہے
ہنس کے فرماتے ہیں یہ، اور کوئی دم باقی ہے

یہاں ضیاؔ نے ایک ہی مقصد کے لیے چار الگ الگ الفاظ استعمال کیے ہیں جب کہ ردیف بھی ان ہی الفاظ کی مترادف ہے یعنی ۔ صدقے ۔ فدا ۔ تصدق ۔ قربان اور ردیف نثار ۔ یہ ضیاؔ کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے ۔ ضیاؔ نے مختلف مجاہدوں کی جنگ کا بھی بیان کیا ہے جس میں بڑا زور ۔ صفائی اور روانی ہے ۔ کہتے ہیں ؎

ہاں ضیاؔ سرورِ عالم کی لڑائی دِکھلا   ہاتھ کی ابنِ یداللہ کے صفائی دِکھلا
ہر طرف لشکرِ اعدا میں تباہی دِکھلا   ساری مخلوق کو ہاں شانِ خدائی دِکھلا
شیرِ نر آگیا رُوباہوں کے اب مسکن پر
ناخدا کشتیِ اُمّت کا چڑھا ہے رن پر

تیغ چلتی تھی دمادم کہ جگر کانپتے تھے   خوف سے چرخ پہ جبریل کے پر کانپتے تھے
تیر چلاتے تھے اور اہلِ ہنر کانپتے تھے   شام میں تہلکہ تھا، کوفے کے در کانپتے تھے
ہاتھ رکھتے تھے جری خوف سے سب کانوں پر
جن یہ کہتے تھے کہ ہے آج بنی جانوں پر

چہرے کٹے تو دفترِ عالم اُلٹ گیا   ہر ایک تیر خوف سے ترکش میں کٹ گیا
جاں لینے سے دلِ ملک الموت ہٹ گیا   مرتیغ الاماں کی سپر میں سمٹ گیا
ہیبت سے فوجِ کیں کے علم ٹوٹنے لگے
لگتے نہ تھے کہ سینوں میں دم ٹوٹنے لگے

تیغ کا میان سے کھنچنا تھا کہ آفت آئی — حشر برپا ہوا ہر اک پہ مصیبت آئی
کوئی بولا کہ زمانے میں قیامت آئی — شامی چلاتے تھے گوشوں میں کہ شامت آئی

ڈھال نے روکا، نہ جوشن نہ زرہ نے روکا
اس کی ضربوں کو سرِ اہلِ جفا نے روکا

چہرے کٹنے سے دفترِ عالم الٹنا۔ ملک الموت کا جان لینے سے دل ہٹنا۔ مریخ کا الاماں کی سپر میں سمٹنا۔ ضرب روکنے میں سب کا ناکام ہونا اور جفاکاروں کے سروں کا ضرب روکنا۔ وغیرہ کا بیان قابلِ داد ہے۔

ضیاؔ کو مصائب کہنے میں خاص مہارت حاصل تھی کچھ مرثیے تو ان کے ایسے ہیں جن میں صرف مصائب کا بیان ہے اور مختلف مواقع کے حالات وکیفیات کا بیان ضیاؔ نے بڑے فطری اور نفسیاتی انداز میں کیا ہے۔ مثلاً امام حسینؑ کی میدانِ جنگ کے لیے رخصت

رخصت ہوئے ہر ایک سے سلطانِ عرش جاہ — آئے درِ خیام پہ حضرت بہ اشک و آہ
دیکھا نہ ہیں عزیز نہ خادم نہ ہے سپاہ — کچھ سوچ میں کھڑا تھا محمدؐ کا رشکِ ماہ

خواہش تھی یہ حسین علیہ السلام کی
تھامے رکاب آکے کوئی خوش خرام کی

لکھا ہے یہ کتاب سیر میں بہ حالِ زار — آئی درِ خیام پہ تب ایک سوگوار
کہتی تھی ہائے تیری غریبی کے نثار — کس سوچ میں ہے اے مرے نانا کی یادگار

خادم نہیں ہے پاس، یہ پیہ نوحہ گر تو ہے
کوئی نہیں یہ زینبؑ خستہ جگر تو ہے

زینبؑ نے بڑھ کے تھامی رکابِ امامِ دیں — گھوڑے پہ تب سوار ہوئے سید میں
تھرایا چرخ دشت کی ہلنے لگی زمیں — ایسا ستم زمانے میں ہرگز ہوا نہیں

کیوں چرخ بے مدار یہ کیا کج ادائی ہے
زینبؑ رکاب تھامنے بھائی کی آئی ہے

درحقیقت ضیاؔ نے اپنی زیادہ تر شعری صلاحیتوں کا استعمال مرثیے کے لیئے کیا۔ اور ضیاؔ کے مراثی صرف مقدار کے اعتبار سے ہی باوزن نہیں بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی اعلےٰ ہیں۔ وہ صفِ اول کے مرثیہ نگار تھے۔ اپنے عہد کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن ایک خصوصیت ان کے ہاں بہت زیادہ نمایاں ہے اور وہی ضیاؔ کی دوسرے مرثیہ نگاروں کے درمیان پہچان بن جاتی ہے۔ ضیاؔ کی وہ خصوصیت ہے صنعتوں کا استعمال۔ شاید کوئی ایسی صنعت باقی نہیں ہے جو ضیاؔ نے مراثی میں استعمال نہ کی ہو۔ ان کے مراثی میں حسنِ تعلیل۔ رعایتِ لفظی۔ رعایتِ معنوی۔ تلمیح۔ لف ونشر مرتب۔ لف ونشر غیر مرتب۔ تشبیہ واستعارے کے علاوہ صنعتِ تجنیس۔ صنعتِ ترصیع۔ صنعتِ خیفا۔ صنعتِ ذوقافیتین۔ صنعتِ مہملہ۔ صنعتِ تحتانیہ۔ صنعتِ فوقانیہ۔ صنعتِ سیاقۃ الاعداد۔ صنعتِ منقوط۔ صنعتِ قلب کل وقلب بعض۔ صنعتِ تنسیق الصفات۔ صنعتِ تضاد اور صنعتِ حذف وغیرہ کی بھی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

مصدرِ علم وعطا، مورد اکرام اللہ

مطلعِ مہر علوم عمل اسلام کا ماہ

بے خوف تھی، خونریز تھی، سفاک تھی تلوار — خونخوار تھی، بے رحم تھی، بیباک تھی تلوار

بجلی کی طرح خلق میں چالاک تھی تلوار — گر کر جو اٹھی برسرِ افلاک تھی تلوار

دشمن کے لئے موت تھی ناگن تھی بلا تھی

سچ یہ ہے کہ آفاق میں وہ برق قضا تھی

وہ فضا چرخ کی وہ نیر تاباں کی چمک — وہ تراوت کی ہوا اور وہ گلستاں کی مہک

شور بلبل کا وہ ہر سمت وہ ریحاں کی چٹک — ذرجھپکتی تھی ذرا نرگسِ حیراں کی پلک

ضیاؔ کو دراصل صنعتوں سے اتنا زیادہ لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ جس کا ثبوت یہ

ہے کہ ایک صنعت انہوں نے خود بھی ایجاد کی اور اس کا نام صنعتِ ضیائیہ رکھا۔ جس کا ذکر سید ابوالحسن فرقتی اپنی کتاب ضیاء الصنائع میں اس طرح کرتے ہیں کہ "یہ وہ صنعت ہے کہ شاعر کسی شعر میں حروف منقوط تحتانی و فوقانی کو بہ ترتیب لاتے۔" (صفحہ ۳)

اس صنعت میں ضیا کا ہی ایک بند ملاحظہ ہو۔

غل یہ تھا چرخ پہ کراروں کی صورت دیکھو
واہ چھپتن ہیں یہ زور اور یہ شجاعت دیکھو
مستعد مرگ پہ دونوں ہیں یہ ہمت دیکھو
وھیان پانی کا نہیں دل میں حمیت دیکھو

دیکھ لو رن میں لہو کی ڈر واں دھاریں ہیں
ہاتھ کیا صاف ہیں کیا قہر کی تلواریں ہیں

ضیا کا صنعتوں سے شوق کا دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ ایک پورا مرثیہ صنعتِ ذوقافیتین میں کہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مرثیے کا عنوان ضیا نے "مجمع الصنائع" رکھا ہے۔ جو صنعتوں سے لبریز ہے کوئی بند صنعت سے خالی نہیں ہے۔ اور کہیں کہیں ہر ہر مصرعے میں صنعت کا استعمال ہے اس طرح ضیا کے مراثی کی یہ ایک بہت بڑی خصوصیت ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے مرثیہ نگار نے صنعتوں کا اتنا استعمال کیا ہو۔

آج عام طور پر یہ رائے ہے کہ عنوان کے ساتھ مرثیہ لکھنے کی ابتدا جدید مرثیہ نگار شعرا نے کی ہے اور جو گذشتہ ۵۰ سال میں ہوئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحقیق کرنے پر اس بات کا سہرا ضیا کے سر پر نظر آتا ہے اور ضیا کا جو مرثیہ صنعتِ ذوقافیتین میں ہے وہ حضرت علی اکبرؑ کے حال کا ہے اس کا عنوان ضیا نے "اعجازِ اکبر" رکھا ہے اس عنوان کے ساتھ اس مرثیے کا ذکر "ضیاء الصنائع" میں بھی موجود ہے جو ۱۲۹۷ھ کی تصنیف۔ ضیا کے دوسرے مرثیے کا عنوان "مجمع الصنائع" ہے۔ اس طرح اردو مرثیے کو عنوان دینے کے ضیا بانی ہیں۔

ضیاؔ نے سلام اور نوحے بھی کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خلق میں جو بھی گدائے بابِ حیدرؑ ہو گئے
مالک خلدِ بریں تسنیم و کوثر ہو گئے

مجرئی شاہ کو جینے کا جنوں
ہیں وہ محبوبِ خدا ان کو تمنا کیا ہے

اگر تسکین نہ کرتے مجرئی شبیرؑ زینبؑ کی
تو بے شک پھونک دیتی آہِ پُر تاثیر زینبؑ کی

کہا شہ نے لہو کس کس جگہ کا دھوؤں اے اصغر
کہ ہیں خونِ گلو سے تر۔ گریباں۔ آستیں دامن
ہمارے دستِ ماتم کی گواہی۔ آسماں دیں!
کہ پہنچے تا فلک اُڑ کر۔ گریباں۔ آستیں۔ دامن

ضیاؔ کی مندرجہ ذیل 'الوداع' بھی بہت مشہور ہے جسے اب بھی اکثر جگہ پڑھا جاتا ہے۔ جس کا مطلع ہے کہ ؎

اے عزادارو کہو شاہِ شہیداں الوداع
الوداع اے بادشاہِ جن و انساں الوداع

ضیاؔ نے نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی نعتیں اور قصائد کہے ہیں۔ جو ان کی مختلف تصانیف میں شامل ہیں جن میں مدح کے علاوہ فریاد اور دعا کا بھی کافی رنگ ہے۔ نعت کا ایک بند جس میں حضورِ اکرم کی ولادت کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو۔ کیا روانی ہے ؎

یہ وارثِ خلیل کی آمد کا وقت ہے
پیغمبرِ جلیل کی آمد کا وقت ہے
مختارِ سلسبیل کی آمد کا وقت ہے
مخدومِ جبرئیل کی آمد کا وقت ہے
شمعِ جہاں حضور کی آمد کی لو میں ہے
اسلام ساتھ ساتھ، ہدایت جلو میں ہے

ضیاؔ نے قطعاتِ تاریخ بھی کہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر تاریخیں فارسی میں کہی ہیں۔ "تاریخِ اصغری"، "تواریخِ واسطیہ" اور دیوانِ فرقتیؔ وغیرہ پر ان کے قطعاتِ تاریخ موجود ہیں۔

ضیاؔ کی غزلیات کا ذکر تو تواریخ میں ملتا ہے لیکن راقم کی نظر سے غزلیں نہیں گزریں۔ البتہ صرف مندرجہ ذیل دو شعر "نگار" پارے "مرتبہ کاظم علی خاں میں راقم کی نظر سے گزرے ہیں ؎

نہ میں خاموش بیٹھا ہوں نہ میں بیکار بیٹھا ہوں
تصور میں بلائیں لے رہا ہوں روئے جاناں کی

لگایا جب سے میں نے دل کسی زہرہ شمائل سے
مری آنکھوں کو نفرت ہوگئی ہے ماہِ کامل سے

ضیاؔ کی تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے۔ جو منظوم اور منثور دونوں ہیں مثلاً "صبحِ شہادت"، "شامِ غریباں"، "تذکرۂ کامل"، "تذکرۂ زیبا" (سفرنامۂ کربلا معلےٰ جو "اصلاح" میں قسط وار شائع ہوا) "فریادِ ضیاؔ" (پانچ مرتبہ طبع ہوئی) "انقلاب"، "تکذیب الکذاب"، "روح"، "قرآن"، "عقل"، مسدس میلادِ پنجتن وغیرہ وغیرہ لیکن ضیاؔ کے مراثی طبع نہ ہو سکے۔ کاش وہ صحیح وقت پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئے ہوتے تو مرثیے کی تاریخ میں آج ضیاؔ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے یہ مراثی ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرانے کے لیے ہر طرح مکمل ہیں۔ ممکن ہے ضیاؔ کی نسل میں کوئی ان مراثی کی طباعت کی جانب مستقبل میں متوجہ ہو۔

سید مومن حسین صفی

سید مومن حسین صفیؔ کا تعلق نسلِ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ہے۔ آپ کے اسلاف بڑے صاحبِ دولت و منصب ہوتے ہیں۔ سید اصغر حسین "تاریخ اصغری" میں صفیؔ اور ان کے والد سید ولی حسین ولیؔ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ
"سید ولی حسین خطِ نسخ و نستعلیق و طغرا و گلزار و شکستہ بہت خوشنما اور دلچسپ لکھتے تھے انہیں کے فیض سے اس شہر میں خوش نویسوں کی کثرت ہو گئی شاعری میں بھی دخل تھا ولیؔ تخلص کرتے تھے ــــــ چندے ملازم سلطنت اودھ بھی رہے ان کے بڑے بیٹے سید مومن حسین صفیؔ تخلص فارسی اور اردو کا شعر کہنے میں مشاق اور تاریخ گوئی میں بے مثل خوشنویسی میں شہرۂ آفاق ہیں بعد عذر عدالت منصفی تلہر ضلع شاہ جہاں پور میں متفرق عہدوں پر مثل سادہ نویسی اور ڈگری نویسی اور محرری ناظر کے مامور رہے۔ پھر بند و بست جدید میں تخفیفاً برخاست ہوتے۔ مثنوی "اسوۃ الصرف" علم صرف میں۔ اور مثنوی "بساطین" ترجمہ حدیث بزبان فارسی اور مثنوی "طوبیٰ العروض" علم عروض میں بزبانِ اردو سوائے دیوان اشعار اردو موسوم

بنام تاریخی "نغمۂ صفویہ" ان کی تالیف ہیں۔" (تاریخ اصغری صفحہ ۱۶۱)

سید محمد آلِ حسن مودودی نے "نخبتہ التواریخ" میں صفیؔ کے ذکر میں ان کی شاعری اور خوش نویسی کی کافی تعریف ہے۔ سید رحیم بخش نے "تواریخ واسطیہ" میں صفیؔ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "یہ بھی خوش نویس ہفت قلم شیریں رقم وشاعروناشر ومورخ ذی کمال نازک خیال بے مثال ہیں۔ صفیؔ تخلص ہے۔ ان کی تالیفات وتصنیفات سے چند کتب علم صرف وحدیث وعروض وغیرہ دیوان "نغمۂ صفویہ" ان کے موجود ہیں"۔ (صفحہ ۲۸۳)

صاحب "تاریخ ساداتِ امروہہ" صفیؔ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ "سید ولی حسین جو شاعر اور بے مثل خطاط تھے ولیؔ تخلص تھا ان کے لائق فرزند سید مومن حسین صفیؔ بھی شاعرِ نازک خیال تھے۔ دور دور تک ان کی شاعری مشہور ہے خطاط بھی تھے"۔ (صفحہ ۳۵۶)

صفیؔ کی شاعری اور خوش نویسی کی شہرت کے سلسلے میں مولوی سید بشیر حسن لکھتے ہیں کہ "استاد مومن حسین صفیؔ فنِ خوش نویسی وشعر گوئی میں دور دور اپنا جواب نہ رکھتے تھے"۔ (شجراتِ ساداتِ امروہہ حصہ دوم صفحہ ۴۹)

صفیؔ کا ذکر لالہ سری رام نے "خم خانۂ جاوید" میں اس طرح کیا ہے کہ "سید مومن حسین نام، صفیؔ تخلص۔ امروہہ کے رہنے والے تھے ذکیؔ مرادآبادی سے فنِ شعر میں تلمذ تھا بہت پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔

امروہہ کے ممتاز ادیب مولوی سید صفی مرتضےٰ نے بھی صفیؔ کے حالات اور کلام کی تحقیق کی ہے ان کی رائے ہیں "صفیؔ امروہوی بھی ان شخصیتوں میں سے ہیں جو امروہہ اور آگرہ میں شمعِ محفل بنے شاعرانہ کمالات کا مظاہرہ کیا۔ دیوان تیار کیا۔ تصنیفات چھوڑیں۔ لیکن زمانے کی بے توجہی اور ناقدری نے اس کو اس طرح عزیز از جان سمجھ کر محفوظ کر دیا کہ آج قدر دانوں کی نگاہیں اس کے دیدار کو ترستی ہیں ــــ سید مومن حسین نام صفیؔ اور ضیائیؔ تخلص کرتے تھے لیکن ضیائیؔ نہ چمکا۔ والد سید

ولی حسین بھی شاعر تھے۔ ولی تخلص کرتے تھے لیکن فنِ خطاطی کی ولایت کے مسلم الثبوت ولی تھے امروہہ میں خوش نویسی کے اکثر باکمال حضرات انہیں کے شاگرد ہوئے ہیں۔ (ماہنامہ آج کل دہلی جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۶)

صفی کی زندگی کا ایک بہت اہم واقعہ جو امروہہ کی ادبی تاریخ کا بھی اہم واقعہ ہے وہ اس طرح ہے کہ صفی کے مکان پر ہر جمعہ کو ایک مشاعرہ ہوتا تھا ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا صفی نے یہ مشاعرہ بند کرنا بھی چاہا لیکن بند نہ کر سکے کیوں کہ ہر مشاعرے کے اختتام پر کوئی طرح دار اُٹھتے اور آئندہ جمعہ کے لیے مصرع طرح دے دیا کرتے۔ صفی کو مجبوراً طرح دینی پڑتی اور آئندہ جمعہ کو بھی مشاعرے کا انتظام کرنا ہوتا۔ آخر ایک مرتبہ اثنائے مشاعرہ میں صفی نے اعلان کیا کہ کوئی صاحب آئندہ جمعہ کے لیے مصرع طرح نہ دیں وہ خود مصرع طرح دیں گے۔ چنانچہ ختمِ مشاعرہ پر اربابِ ذوق ہمہ تن گوش ہو گئے اور صفی نے مندرجہ ذیل مصرع طرح دیا ؎

سوالِ وصل ہے اس گل عذار غنچہ دہن سے

مصرع سُن کر مشاعرے میں چہ می گوئیاں ہوئیں جلسہ برخواست ہوا۔ مجمع منتشر ہوا۔ جمعہ تک عجیب حال رہا۔ غرض جمعہ آنے پر کثیر مجمع ہوا لیکن مصرع طرح پر غزل کہنے والے صرف چار شاعر تھے۔ خود صفی۔ سید ابوالحسن ساکت۔ سید فضل حسین سعید چوتھے کوئی اور بزرگ تھے اس طرح مصرع طرح میں ایک رُکن کی زیادتی سے شعر گوئی پر کھلی گئی۔ ختمِ مشاعرہ پر یہ اعلان ہوا کہ آج معلوم ہو گیا کہ امروہہ میں صرف ہم شاعر ہیں اس لیے آئندہ کو یہ سلسلہ بند کیا جاتا ہے۔

یہ واقعہ مولوی سید صفی مرتضےٰ مرحوم نے بھی اپنے مقالے میں بیان کیا ہے۔ صفی کی ولادت کا جہاں تک تعلق ہے اس بارے میں تواریخ امروہہ میں کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن سید علی امام نقوی (پاکستان) نے مولوی سید اعجاز حسن مرحوم کی بیاض کے حوالے

سے بتایا کہ صفیؔ کی ولادت ۱۲۵۹ھ میں ہوئی تھی اور ۶۱ سال کی عمر میں ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں آگرہ میں وفات ہوئی۔ یہی بیان صاحب "تاریخ اسلام" جلد پنجم کا ہے۔

صفیؔ کو فنِ خطاطی اور شاعری اپنے دادا اور والد سے ورثے میں ملے تھے خطاطی میں والد کے شاگرد تھے لیکن شاعری میں سید یعقوب علی معجزؔ امروہوی اور ملک الشعراء ذکیؔ مرادآبادی سے تلمذ تھا۔ معجزؔ امروہوی سے تلمذ کا ذکر صفیؔ اپنی ایک واسوخت "شمع محفل" کے آخری بند میں اس طرح کرتے ہیں ؎

نظم اسلوب یہ سب کی رہے گا ورد دل میں
کیوں نہ ہو جب کہ ہوں معجزؔ کے میں شاگردوں میں

ذکیؔ مرادآبادی سے تلمذ کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں نول کشور پریس سے مثنوی مولانا روم کا نسخہ شائع ہوا اس کی طباعت پر مختلف اہلِ قلم نے تاریخیں کہیں صفیؔ کا قطعۂ تاریخ بھی اس میں شامل ہے اور عنوان میں صفیؔ کا نام ان الفاظ میں دیا ہوا ہے۔

"قطعۂ تاریخ طبع زاد شاعرِ تیز طبع سید مومن حسین متخلص بہ صفیؔ تلمیذِ رشید شیخ مہدی علی ذکیؔ۔"

صفیؔ کے اخلاف میں دو پسر ڈاکٹر سید زیرک حسین رضیؔ اور سید لائق حسین قویؔ ہوتے دونوں بھائی نہ صرف خطاط بلکہ شاعر و ادیب بھی تھے۔ رضیؔ نے قرآنِ مجید کا ترجمہ بھی لکھا ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ رضیؔ کے چھوٹے بھائی سید محسن حسین سنیؔ بھی شاعر تھے اور سنیؔ کے فرزند سید عین الحسن جریؔ بھی شاعر ہوتے غرض کہ یہ پورا خاندان علم دوست اور ادب پرور تھا۔ اب رضیؔ قویؔ اور جریؔ کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ سب پاکستان ہجرت کر گئے۔

یوں تو صفیؔ کے شاگرد امروہہ اور آگرہ میں کافی تعداد میں ہوتے لیکن صفیؔ کے

مخصوص شاگردوں میں سید محسن حسین سخیؔ۔ سید لائق حسین قویؔ۔ سید زیرک حسین رضیؔ۔ محمد عثمان خاں عثمانؔ۔ محمد اسحاق پرویںؔ۔ شبیر خاں شبیرؔ۔ سید رضا حسن رضاؔ وغیرہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد مجتبیٰ نے "عرفانِ نسیم" میں ثاقب لکھنوی کو بھی صفیؔ کا شاگرد لکھا ہے اور "ساداتِ امروہہ ایک تعارف" کے مطابق محشر لکھنوی بھی صفیؔ کے شاگرد تھے۔

صفیؔ کے بارے میں سید محمود حسن قیصرؔ لکھتے ہیں کہ "سید مومن حسین صفیؔ امروہہ کی ان باکمال ہستیوں میں ہیں جو ایک صدی میں دوچار ہی پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کے نام سے عوام تو عوام خود ادبی حلقے بھی بہت کم واقف ہیں ـــــ ممکن تھا کہ ان کو اگر رام پور کا دربار مل جاتا تو آج ان کا نام بھی داغؔ اور امیر مینائیؔ کے ساتھ لیا جاتا ـــــ وہ نہایت زود گو اور عام سطح سے بہت بلند کہنے والوں میں تھے۔ سلاستِ زبان۔ مشاقی۔ مضمون آفرینی۔ ضائع بدائع ان کی شاعری کے خاص جوہر ہیں استبدادِ زمانہ نے اب اگرچہ ان پر پردہ ڈال دیا لیکن اپنے زمانے میں وہ لکھنؤ اور دہلی کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے مشاعروں میں ان کے کلام کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک زمانے تک وہ امین الفصاحت۔ ناطق الملک۔ سید الشعراء کے القاب سے مشہور رہے ـــــ مولانا حسرت موہانی جو اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد تھے صفیؔ کے کلام سے بہت متاثر تھے۔ مرحوم جب امروہہ تشریف لائے تو یہاں کے ادب نوازوں سے ان کی صرف یہی فرمائش ہوتی تھی کہ صفیؔ امروہوی کا جس قدر کلام ان کو یاد ہو وہ سنائیں چنانچہ آپ ان کے اشعار کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے اور اپنی نوٹ بک میں احتیاط کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے۔ صفیؔ سے ان کا خصوصی تاثر ان کے اس قطعے سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں انہوں نے اپنے کچھ پسندیدہ شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں ایک نام صفیؔ کا بھی ہے۔" (ماہ نامہ "آج کل" دہلی جولائی ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۔۶۔۷)

جہاں تک صفیؔ کی تصانیف کا تعلق ہے وہ نہ صرف شعری مجموعے ہیں بلکہ علمِ صرف نحو اور حدیث و عروض پر بھی مشتمل ہیں مثلاً علمِ صرف میں "اسوۃ الصرف" اور "رباطین" عروض میں "طوبیٰ العروض" اس کے علاوہ ایک دیوان "نغمۂ صفویہ" اور "شمعِ محفل" داسوختت صفیؔ کی تصانیف ہیں۔ "طوبیٰ العروض" مطبوعہ نول کشور ۱۲۸۱ھ اور "شمعِ محفل" مطبوعہ "افضل المطابع" امروہہ ۱۲۷۱ھ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

کتبِ تواریخ کے علاوہ کچھ معلومات صفیؔ کے بارے میں ان کے کلام سے بھی حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ قوتِ سامعہ سے قدرے بے بہرہ تھے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ

سنوائیں مجھے ہر کس و ناکس کی زباں ہیں — ممنون دل و جاں سے نہ کیا کر ہوں کری کا

گر تجھ میں نہ ہوتا یہ صفیؔ عیب کری کا — ہوتے یہ صفیؔ کان ترے کانِ جواہر

یا اس کے علاوہ اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ صفیؔ کا ایک دیوان چوری بھی گیا ہے۔ مصحفیؔ بھی دلّی جا کر دیوان کھو آئے تھے۔ لیکن صفیؔ کے ساتھ یہ حادثہ امروہہ یا آگرہ میں پیش آیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

اپنی تصنیف کا بستہ تو گیا سب چوری

کورے پھر رہ گئے ہم صاحبِ دیواں ہوکر

صفیؔ کا کلام مولوی سید صفی مرتضےٰ مرحوم کی نظر سے گزرا ہے وہ صفیؔ کی شاعری پر اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ

"ان کی شاعری زندگی کا درخشاں رُخ پیش کرتی ہے۔ نہ وہاں غم کی گھٹائیں ہیں نہ یاس و قنوطیت کی تاریکیاں نہ زندگی سے فرار ہے نہ کشمکشِ روزگار کے مقابلے میں سپردگی و سپر اندازی۔ حیات اور اس کے لوازم، نشاط اور اس کے 'عناصر' جو معمارِ مستقبل ہیں بدرجہ اتم ان کے ہاں موجود ہیں ـــــ صفیؔ کا کلام حیات اور زندگی کی شعاعوں، نمو و ارتقا کی موجوں اور حرکت و عمل کے محرکات سے پُر ہے

ان کے یہاں حیاتِ نوخیز کے خدوخال دلکشی و رعنائی کے ایسے پیکر ہیں جو پڑھنے والے کے دل میں امیدوں کی لہک اور آنکھوں میں زندگی کی چمک پیدا کرتے ہیں۔" (ماہ نامہ آج کل دہلی جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۹)

راقم سے پہلے صفی پر دو بزرگوں نے تحقیقی کام کیا ہے۔ یعنی مولانا سید صفی مرتضے اور سید محمود حسن قیصر ان دونوں محققین کے مقالے ماہ نامہ "آج کل" میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان حضرات کے مقالوں میں صفی کی شاعری میں حمد و نعت مثنوی و قطعات۔ غزل اور واسوخت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ کسی نے بھی صفی کی مرثیہ نگاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن راقم نے بڑی کوشش اور تلاش کے بعد صفی کے دو مرثیے حاصل کیے ہیں۔ پہلا مرثیہ خود صفی کی تحریر میں ہے اور سید وجاہت حسین عابدی نے اپنے والدِ مرحوم کے بستے سے نکال کر دیا ہے۔ اس قلمی مرثیے کے سرِ ورق پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے "مرثیہ ع "جولانی پہ ہے آج توشبدیز طبیعت" تصنیف سید مومن حسین بن سید ولی حسین امروہوی۔ راقم ایضا۔ مصنف مرثیہ ھٰذا"

اس مرثیے کے صرف ابتدائی ۴۴ بند حاصل ہو سکے ہیں باقی آگے کے صفحات ضائع ہو گئے۔ مرثیہ کا مطلع ہے ؎

جولانی پہ ہے آج توشبدیز طبیعت   کاوے پہ لگا ہے فرسِ تیز طبیعت
اب توسنِ بندش پہ ہے مہمیز طبیعت   مواج ہے دریائے گہر ریز طبیعت
یوں قفلِ مضامیں کی ہے کنجی مرے کف میں
پوشیدہ ہو جیسے دُرِ نایاب صدف میں

مرثیے کے مطلع سے ہی صفی کے استادانہ رنگ اور قادر الکلامی کا اندازہ ہو جاتا ہے اکثر شعرا نے مرثیے کے چہرے میں طبعِ رسا۔ طبعِ موزوں۔ پروازِ فکر۔ بلندیٔ تخیل اور طائرِ عقل و ہوش کا ذکر کیا ہے۔ لیکن صفی کے ہاں ایک خاص انفرادیت نظر آتی ہے۔

ان کے فن میں پختگی ہے۔ شروع کے چار مصرعوں میں اپنی طبیعت کا حال بیان کرنے کے بعد بیت میں نہ صرف نادر و نایاب تشبیہ کا استعمال کیا ہے بلکہ بڑی خود اعتمادی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔

صفی کا طرز بیان، اسلوب اور لب و لہجہ نہ صرف منفرد ہے بلکہ مقبول بھی ہے اور اس بات کا خود ان کو بھی احساس ہے۔ اس مقبولیت کا سبب وہ اپنے امام کا اعجاز سمجھتے ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ ؎

اب جوش پہ ہے ابرِ گہر بارِ طبیعت ۔۔۔ اور نزہت و رونق پہ ہے گلزارِ طبیعت
اُڑتی ہے شمیمِ گُل بے خارِ طبیعت ۔۔۔ کیا رنگ و لطافت پہ ہیں اثمارِ طبیعت
مشتاق ہزاروں جو ہیں اس طرزِ بیاں کے
اعجاز ہیں یہ سبطِ رسولِ دو جہاں کے

یہاں قوافی کے ساتھ جو تراکیب استعمال کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفی نئی تراکیب تراشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اثمارِ طبیعت اور شمیمِ گُل بے خارِ طبیعت صفی کے ذہن کی خوب صورت پیداوار ہیں۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ ؎

یہ نظم ہے سلکِ دُرِ شہوارِ طبیعت ۔۔۔ ہیں صاف عیاں جوہرِ افکارِ طبیعت
کیوں گرم نہ ان روزوں ہو بازارِ طبیعت ۔۔۔ خواہاں درِ مضموں کا ہے تجارِ طبیعت
مداح ہوں میں سبطِ رسولِ مدنی کا
ہے جمع خزانہ یہاں شیریں سخنی کا

درِ مضمون کا استعمال تو پرانا ہے لیکن طبیعت کا بازار گرم ہونا۔ تجارِ طبیعت یا شیریں سخنی کا خزانہ جمع ہونا نیا تخیل اور نئی تراکیب ہیں۔

لاریب درست آج ہے اندازِ طبیعت ۔۔۔ ہے مرغِ مضامیں پہ جھکا بازِ طبیعت
ہے زردۂ تصنیف پہ مہمازِ طبیعت ۔۔۔ چالاک ہے شبدیز سرافرازِ طبیعت

مشہور نہ کیوں خلق میں اعجاز بیاں ہو
ہیں ذاکرِ فرزندِ رسولِ دو جہاں ہو

مرغِ مضامین پر بازِ طبیعت کا جھکنا تلاشِ مضامین کی بہترین مثال ہے۔ صفی کو اپنے فن پر کتنا اعتماد اور کتنا بھروسہ تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل بند سے ہو سکتا ہے۔

کرتا ہوں میں اب ایک نیا مرثیہ مرقوم　　مطلوب طبائع ہو زمانے میں پڑے دھوم
تا زورِ طبیعت ہو مشایق کو معلوم　　ہو حسن ہر اک بند میں اور عیب ہو معدوم
انداز نزاکت ہو وہ گفتار سے پیدا
تعریف ہو حسن کی لبِ حضار سے پیدا

شاعر کا یہ کہنا کہ اب ایک نیا مرثیہ مرقوم کرتا ہوں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کچھ مراثی لکھے جا چکے ہیں۔ آگے چل کر صفی شاعرانہ تعلّی سے بھی کام لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے نظریۂ فن کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ؎

ہاں چہرۂ زیبائے سخن کا میں ہوں بانی　　بے شبہہ بلاغت میں ہوں سحبان کا ثانی
الفاظ نہ بے جا ہوں غلط ہوں نہ معانی　　ہاتھوں سے نہ دوں رشتۂ فرخندہ بیانی
بندش وہ رکھوں مرثیہ شاہِ زمن کی
حاسد نہ مجال اس میں کہیں پائے سخن کی

مرثیے میں بندش ایسی رکھنا کہ حاسد قریب نہ آ سکے ندرتِ فکر و بیان ہے۔ صفی میں حاسدوں سے مقابلے کی بھی ہمت ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کے حاسد ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

رکھتے ہیں کہاں تاب یہ حسّاد بد آئیں　　میرے سخنِ پاک میں ہوئیں جو سخن چیں
تقریر جو ہے صاف تو شفّاف مضامیں　　ہر ایک ثمر نخلِ طبیعت کا ہے شیریں
تقریر میں گفتار میں نقصان نہیں ہے
ہرگز مرے اشعار میں نقصان نہیں ہے

یہاں لفظِ "نقصان" کا استعمال جن معنوں میں ہے وہ بہت خوب ہے۔

میرؔ کو خود پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ کہتے تھے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ صفیؔ بھی جو کچھ فرماتے ہیں اسے اپنا ارشاد بتاتے ہیں ؎

ہر مصرع موزوں صفت سرو ہے آزاد   اس مرثیے میں بیتیں ایسی کروں ارشاد
بس قمریٔ دل جس کو کرے دیکھ کے فریاد   بیت ابروئے معشوق کی آجائے معاً یاد

اعجازِ شہِ دیں کی یہاں جلوہ گری ہے
ہر بیت غمِ شاہِ شہیداں سے بھری ہے

مصرع کا سرو کی طرح آزاد ہونا۔ قمریٔ دل کی ترکیب اور بیت کے لیے بھرا ہونا، کا استعمال شاعر کے ماہرِ فن ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ صفیؔ کا اپنی مرثیہ نگاری کے بارے میں جو پختہ یقین و اعتماد ہے اس کا ذکر آگے چل کر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

اس مرثیے میں لفظ جو بے جا ہو تو کیا دخل   مضموں کوئی ناقص کہیں باندھا ہو تو کیا دخل
معنی میں رکاکت کہیں پیدا ہو تو کیا دخل   اس سے جو کوئی مرثیہ اعلیٰ ہو تو کیا دخل

اس مرثیے میں محکم و راسخ ہے ہر اک بیت
منسوخ کا کیا ذکر کہ ناسخ ہے ہر اک بیت

مندرجہ بالا بند میں صفیؔ نے تمام شعری عیوب کو بڑے سلیقے سے بہت جامع انداز میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی الفاظ کا غلط استعمال۔ معنی میں رکاکت اور مضامین میں نقص وغیرہ۔ یہی شاعری میں بنیادی چیزیں ہیں۔ صفیؔ چونکہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ خطاط بھی ہیں اس لیے اب وہ دوسرے نقطۂ نظر سے بھی مرثیے کو دیکھتے ہیں جس سے تغزل کی چاشنی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ؎

تحریر میں انداز ہے نازک کمری کا
جو نقطہ ہے وہ خال ہے رخسارِ پری کا

مرثیے کے چہرے کے بعد صفی اصل موضوع کی جانب گریز کرتے ہیں اور پھر امام حسینؑ کی ولادت کا ذکر کرتے ہیں۔ ولادت کے بعد گھر کا منظر کیا تھا۔ کون کون پیغامِ تہنیت پیش کر رہا تھا۔ صفی بیان کرتے ہیں ۔

بولا کوئی یا احمدِ مختارؐ مبارک　　بولا کوئی یا حیدرِ کرار مبارک
پیدا ہوا فرزندِ خوش اطوار مبارک　　ہو آپ کو شبیرؑ سا دلدار مبارک

پیدا جو نواسہ ہوا، دل شادِ نبیؐ تھے
خوش بیٹے کے میلاد سے زہراؑ و علیؑ تھے

اس کے بعد فطرس کا واقعہ بیان کیا ہے اور کچھ معجزات کی جانب بھی اشارات ہیں۔ پھر امام حسینؑ کو کوفے سے خطوط آنے کا ذکر اور سفر کے لیے تیاری۔ ساتھیوں سے امام حسینؑ کی گفتگو۔ جناب صغرا کا امامؑ کے ساتھ چلنے کا اصرار اور امامؑ کا تسلی دینا وغیرہ نظم کیا ہے امام حسینؑ جناب صغرا سے فرماتے ہیں

تکرار اور اصرار مناسب نہیں بی بی
بیمار بھی چلتے ہیں سفر میں کہیں بی بی

گر جان سلامت ہے تو پھر آئیں گے صغرا　　صورت تمہیں پھر آن کے دکھلائیں گے صغرا
آنا نہ ہوا تو تمہیں بلوائیں گے صغرا　　ہم بھیجیں گے اکبر کو وہ لے جائیں گے صغرا

اے فاطمہؑ بیمار نہ گھبرائیو گھر میں!
ہم آئیں گے یا تم کو بلائیں گے سفر میں

یہاں گفتگو کس قدر فطری اور سادہ انداز میں صفی نے نظم کی ہے اس کے بعد سفر کا آغاز، سفر کے مختصر حالات۔ کربلا پہنچ کر گھوڑے کا ٹھہرنا۔ امامؑ کا اس سے مخاطب ہونا اور خیموں کا میدانِ کربلا میں لگنا وغیرہ وغیرہ نظم کیا ہے۔ کربلا میں قیام کے بعد پانی کا بند ہونا امام کے قافلے کی پیاس کی کیفیت اور امام کا تسلی دینا بیان کیا ہے۔ صفی کہتے ہیں کہ

دو روز رہی تشنہ دہن آلِ پیمبر　　مچھلی کی طرح بچے تڑپتے تھے زمیں پر
ہرگز ہوئی اک بوند نہ پانی کی میسّر　　اور صبر کی تاکید انہیں فرماتے تھے سرور
گو پانی میسّر نہیں دو دن سے ہے پیاسے
ہر وقت مگر لب رہیں تر شکرِ خدا سے

اس مرثیے کا مندرجہ بالا بند نمبر ۴۴ ہے اس کے بعد کے صفحات ضائع ہو چکے ہیں لیکن اندازہ ہے کہ کم از کم ۲۰ - ۲۵ بند اور بھی ہوں گے۔

صفیؔ کا دوسرا مرثیہ سید امیر حسن اقبرؔ (دربار شاہ ولایت امروہہ) کے کتب خانے سے حاصل ہوا ہے جس میں ۳۸ بند ہیں۔ مرثیہ کا مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

رخصت شہِ دیں گھر سے جب ہونے لگے رن کو　　زینبؑ نے کہا دیکھ کے تب شاہِ زمن کو
ہے ہے نہ اجل آئی مجھ آوارہ وطن کو　　بھیّا یہ کہو، چھوڑ کے جاتے ہو بہن کو
جنگل میں ہمارا کوئی والی نہیں بھائی
عابدؑ ہے سو وہ ضعف سے خالی نہیں بھائی

اس مرثیے کی زبان بڑی دردناک اور منظر نگاری بہت دل خراش ہے آگے چل کر جناب زینبؑ فرماتی ہیں کہ ؎

کن آنکھوں سے دیکھے گی بہن بھائی کا مرنا　　بیکس کا گرفتارِ محن بھائی کا مرنا
بھولا تھا نہ مسموم حسن بھائی کا مرنا　　درپیش ہوا تشنہ دہن بھائی کا مرنا
مر جاتے یہ دکھیا شہِ دل گیر کے آگے
بھائی کو اجل آئے نہ ہمشیر کے آگے

بھیّا طرفِ فرقۂ گمراہ نہ جاؤ　　سادات کے دشمن ہیں یہ سب آپ نہ جاؤ
بے مہروں میں اے فاطمہؑ کے ماہ نہ جاؤ　　صدقے ہو بہن آپ پہ للّٰلہ نہ جاؤ

دل سینے میں تشویش سے گھبراتا ہے میرا
صدمے سے جگر منہ کو چلا آتا ہے میرا

جنابِ زینبؑ کی خواہش ہے کہ بھائی میدان میں نہ جائیں کسی طرح بھی جان بچ جائے۔ امامؑ بہن کو طرح طرح سے تسلی دیتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔ آخر کار جناب زینبؑ فرماتی ہیں کہ ؎

زینب نے کہا سب ہیں بجا آپکے ارشاد — افسوس ہے اماں کی کمائی ہوتی برباد
کس طرح بھلا میں نہ کروں نالہ و فریاد — کچھ بس نہیں اب کیا کرے یہ بیکس و ناشاد
جی کھول کے میں آہ و بکا کروں تو جاؤ
اماں کی وصیت کو ادا کروں تو جاؤ

اس کے بعد امامِ حسینؑ نے جناب زینبؑ سے جنابِ فاطمہؑ کی وصیت معلوم کی۔ جنابِ زینبؑ نے اس وصیت پر عمل کیا۔ اس کے بعد جناب سکینہ سے ملے انہوں نے تشنگی کا بیان کیا اور پانی کا شکوہ کیا۔ امامؑ نے فرمایا ؎

شہ بولے ہم اعدا سے ہیں مجبور سکینہ
پانی انہیں دینا نہیں منظور سکینہ

جناب سکینہ نے پانی پر تو صبر کر لیا لیکن امامؑ سے گذارش کی کہ میدان میں نہ جائیں۔ فرماتی ہیں کہ ؎

دنیا سے میں اس غم میں گزر جاؤں گی بابا
جب تم کو نہ پاؤں گی تو مر جاؤں گی بابا

امامؑ نے ادھر اپنی بہن زینبؑ اور بیٹی سکینہ کو تو تسلی دے دی لیکن شریکِ حیات کی عجب کیفیت تھی۔ امام جب رخصت کو گئے ؎

وہ کہتی تھی کیوں کریں اٹھوں اے عرش تاج — والی انہیں قدموں کی بدولت ہے معراج
سر پر جو نہ ہوگا پسرِ صاحبِ معراج — چادر کے لیئے خلق میں ہو جاؤں گی محتاج

چھوٹے جو قدم مرتبہ گھٹ جائے گا میرا
قربان گئی تخت الٹ جائے گا میرا

امامؑ جواب میں فرماتے ہیں کہ سے

زینبؑ کو تو دیکھو کہ ہے کس غم میں گرفتار — ایسا کوئی اس گھر میں نہیں بیکس و ناچار
تنہا ہے کہ بے جاں ہوئے دو چاند سے دلدار — دنیا سے گیا اکبرؑ ناشاد سا غم خوار

بیٹے بھی نہیں گود کا پالا بھی نہیں ہے
اس کا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے

مندرجہ بالا مکالموں کے لیئے تصور شرط ہے۔ یہ اس قدر فطری اور پُر تاثیر مکالمہ نگاری ہے کہ جس سے کوئی قلب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آخر کار امامؑ نے میدان کی تیاری کی۔

فرما کے یہ باندھے شہِ مظلوم نے ہتھیار — ہمشیر سے پرُ ملِ کے ہوتے راکبِ رہوار
تنہا چلے میدان کو اُدھر سیدِ ابرار — خیمے میں اِدھر ہو گیا اک حشر نمودار

پیٹی یہ وہ اجارشہ غم ناک پہ بانو
غش ہو کے نقاہت سے گری خاک پہ بانو

اس کے بعد امام کی جنگ کا مختصر ذکر اور شہادت کا بیان کیا ہے۔ بعدِ شہادت

سر پیٹ کے زہراؑ نے کہا ہائے حسینا — ماں اس تری حالت پہ فدا ہائے حسینا
جانی تجھے پانی نہ ملا ہائے حسینا — غربت میں ہوئی تجھ پہ جفا ہائے حسینا

واری ترا سر تن سے اتارا گیا ہے ہے
دو روز کا بے آب تو مارا گیا ہے ہے

چادر نہ اڑھائی تنِ صد پاش کو ہے ہے
بے گور و کفن چھوڑ دیا لاش کو ہے ہے

جناب فاطمہ زہراؑ کے بین کے بعد اس طرح مرثیے کا مقطع پر اختتام ہوتا ہے ؎

خاموش صفیؔ اب نہیں تقریر کا یارا — کر عرض شہِ دیں سے بصد عجز و تمنا
تم صادق الاقرار ہوا اے سیّدِ والا — اے صلِّ علےٰ سر دیا پر عہد نہ توڑا
مشکل کو کرو حل خلفِ عقدہ کشا ہو
مجھ سے بھی جو کچھ وعدہ ہے اب وہ بھی وفا ہو

ہر چند کہ صفیؔ کے صرف دو ہی مرثیے حاصل ہو سکے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت اور کمالِ فن کا اقرار کرا لینے کے لیے کافی ہیں وہ اپنے دور کے مسلّم الثبوت استاد تھے انہیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے ہاں انوکھے مضامین کی تلاش ہے۔ نئی تراکیب ہیں نادر تشبیہات و استعارات ہیں اور فکر کی پرواز بہت بلند ہے۔

صفیؔ نے مراثی کے علاوہ سلام بھی کہے ہیں۔ ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مجلسوں سے کچھ ملک شیشوں میں بھر کر لے گئے
لے گئے آنسو خدا جانے کہ گوہر لے گئے

ہم اسی در کے گدا ہیں ہم اسی در کے فقیر
بھیک جس در سے فرشتے آ کے اکثر لے گئے

عرصۂ محشر میں تھا مستِ مئے خمِ غدیر
مجھ کو ہاتھوں ہاتھ سوئے حوضِ کوثر لے گئے

در سے پہنچے درِ شاہِ نجف پر ہم فقیر
ایک عہدہ تھا غلامی کا وہ قنبر لے گئے

صفحۂ قرطاس پر چلتے لرزتا ہے قلم!
عابدِؒ بیمار کو تا شام کیوں کر لے گئے
سنگ دل تھے کیا انہیں دردِ یتیمی کا قلق
کان سے بالی سکینہ جو گوہر لے گئے
کیا کہیں ہم تو صفی دیتے نہ تھے اپنا کلام
پر بہت اسرار سے جبریل آ کر لے گئے

سلام سے بھی صفی کی پختہ کاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

صفی بحیثیت غزل گو زیادہ متعارف ہوتے اور حقیقت یہ ہے کہ سرزمین امروہہ نے شاید جس طرح اٹھارویں صدی میں مصحفی سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا اسی طرح انیسویں صدی میں صفی سے بڑا غزل گو بھی پیدا نہیں ہوا۔ صفی کی غزلیات سے اشعار کا انتخاب کرنا بھی آسان نہیں ہے بہر حال چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا توبہ شکن جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ساقی ہو جہاں شیخ وہ میخانہ ہے اس کا
تلخ کامی مری دنیا کو مزا دیتی ہے
موت بھی تو مجھے جینے کی دعا دیتی ہے
سایہ افگن ہوا نہ قاصدِ یار
یعنی سایہ نہ تھا پیمبرؐ کا
ہم جو پیری میں جوانی کے لئے روئے صفی
طفلِ اشک ایسے ہنسے لوٹ گئے دامن پر
ان کے ہونٹوں پہ ہنسی انجمن غم میں رہے
بات تو جب ہے خوشی بھی مرے ماتم میں رہے

کرلیں آپس میں چلو طور کی تجلی تقسیم

روشنی تم میں رہے اور تڑپ ہم میں رہے

صفی کی شاہکار غزل جو انہوں نے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں بھی پڑھی تھی مندرجہ ذیل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جبیں پر ان کی قشقہ اس گھڑی ہے

چراغِ ماہ میں بتی پڑی ہے

یہ صافی مے کی شیشے پر پڑی ہے

پری کھینچے ہوئے گھونگٹ کھڑی ہے

نہیں ہے آنکھ میں سرمے کی تحریر

عصا ٹیکے ہوئے پتلی کھڑی ہے

تمہاری مانگ خود دل مانگ لے گی

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

گلی جاتی ہیں میری بیڑیاں تک

جنوں کے بن کی دھوپ ایسی کڑی ہے

کئے جاتے ہیں وہ غصے کی باتیں

قیامت پاؤں باندھے چپ کھڑی ہے

نہیں یکساں مقدر خاک کا بھی

کہیں مردہ کہیں دولت گڑی ہے

صفی کے ہاں صنائع اور بدائع کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں مثلاً ان کی ایک غزل صنعتِ ترجمہ میں ہے اس میں ہر مصرع کا آخری لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ ہے چند اشعار اس طرح ہیں ؎

زد مضطربی بر درِ تعظیم تو مارا
سیماب نزد ین راہ زسر ساختہ پارا
برخود نگر د پیش کہ نازد بہ دم نحس
اختر چہ قصور کند آں زلف دوتارا

صفی کا دور وہ دور تھا کہ جب علم بدیع پر شعراء کی خاص توجہ تھی صفی کے ہاں بھی اس کے اعلےٰ نمونے ملتے ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

متوالے! شراب کو چھپا کر پینا — مت۔ والے شراب کو چھپا کر پینا
یہ دُختر زر ہے اس کی حُرمت ہے ضرور — مت۔ والے۔ شراب کو چھپا کر پینا

پہلے مصرع میں متوالے کے معنی مست۔ دوسرے میں 'مت' کے معنی عقل تیسرے مصرع میں 'مت' کے معنی 'نہیں'۔ 'وا' کے معنی کھلا ہوا استعمال کئے ہیں۔

ایک جگہ رعایتِ لفظی بھی ملاحظہ ہو ؎

اگر وہ بدر ہیں بجھنے کا بھی خیال کریں
ہلال بن گئے جو ہم سے ملیں کمال کریں
وہ چاہتے ہیں کہ میں رُوٹھوں اور منائے صفی
اگر یہی ہے خوشی شوق سے ملال کریں

صفی کے ہاں ایک مثنوی میں حمد بھی ملتی ہے۔ نمونۂ حمد ملاحظہ ہو ؎

وہی کامل ہے لائقِ تعریف
ہے وہی خالق ثقیل و خفیف
کون ہے ہم ردیف اس رب کا
تنگ اس جا ہے قافیہ سب کا

اس مثنوی میں آگے چل کر شعراء کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

واہ کیا نیک نام ہیں شعرا
امراء الکلام ہیں شعرا
بزمِ حق میں ہے احترام انکا
ہے پسِ انبیاء مقام انکا
واہ کیا رتبہ شاعری کا ہے
جزو اک یہ پیمبری کا ہے

صفؔی کو تاریخ گوئی میں بھی غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ ان کے چند قطعاتِ تاریخ بہت اہم ہیں مثلاً انہوں نے اپنی تصنیف "شمعِ محفل" کی فارسی میں تاریخ کہی۔ یا مثنوی مولانا روم کی تاریخ طبع۔ اس کے علاوہ "تاریخِ اصغری" اور "دیوانِ فہمی" وغیرہ کی طبع کے قطعاتِ تاریخ کہے۔ کتابوں کے علاوہ اشرف المساجد کی تعمیر کی تاریخ کہی۔ مولانا سید محمد عسکری کی تاریخِ وفات کہی اور عربی میں صوفی خدا بخش کی تاریخِ وفات وغیرہ وغیرہ۔

اردو کے علاوہ صفؔی کا ادبی سرمایہ فارسی میں بھی کافی تعداد میں موجود ہے البتہ عربی میں کلام بہت کم ملتا ہے۔ صفؔی کی ذات وہ ہے کہ جن کے بغیر امروہہ کی شاعری کی تاریخ ناتمام ہے اور جو امروہہ کے ادبی وقار کے ضامن ہیں۔ ان کی ذات پر بجا طور پر سرزمینِ امروہہ کو فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اگر صفؔی کے تمام مراثی تلاش کے بعد طبع ہو سکیں تو یقیناً انیس و دبیر کے بعد کی صف میں ان کا مقام نمایاں ہو۔

خلیفہ سید آلِ نبی مضطر

خلیفہ آلِ نبی مضطر کا تعلق امروہہ کی جعفری سادات سے ہے جس کے زیادہ تر گھر محلہ دربارِ کلاں میں آباد تھے لیکن اس کی بڑی اکثریت پاکستان کو ہجرت کر چکی ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سید مبارک علی تھے۔ مضطر کے والد کا نام سید محمد تقی تھا۔ سید تمیز الدین نے اپنی کتاب "ذکرِ سادات امروہہ" میں اس خاندان کے شجرات بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر سیف جعفری کے بیان کے مطابق مضطر کی ولادت تقریباً ۱۸۴۹ء میں امروہہ میں ہوئی تھی اور ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوا۔

مضطر کی اولاد میں سبطِ نبی، اعجاز نبی اور غلام نبی اوج وغیرہ بھی پاکستان کو ہجرت کر گئے۔ جس کی وجہ سے مضطر کا ادبی اثاثہ بھی منتشر ہو گیا۔ صرف چند غزلیں قدیم رسائل "پیامِ یار"، "معیارِ سخن" اور "ساز و آواز" وغیرہ میں مل جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مضطر فرزدقِ ہند شمیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ شمیم امروہوی اپنے دور کے صفِ اول کے مرثیہ نگار تھے اس لیے ان کی صحبت کے اثر میں مضطر نے مراثی بھی کہے۔ مضطر کے مخصوص شاگرد رام سروپ بسمل امروہوی تھے۔

مضطر کو شاعری کے علاوہ خوش نویسی سے بھی کافی لگاؤ تھا اور ایک عمدہ خوش نویس تھے۔ اس لیے شغل بھی ایسا ہی اختیار کیا اور مراد آباد کلکٹریٹ میں سرکاری حکم نامے لکھتے تھے۔

مضطر کا ایک مرثیہ سید شانِ حیدر محلہ گزری کے بستے سے حاصل ہو سکا ہے مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

یوں رقم ہوتا ہے اب اکبرِ دل گیر کا حال تھا جو ہم شکلِ نبیؐ حضرتِ شبیرؑ کا لال
منتوں والا پسر اور حسیں نیک خصال عمرِ آغازِ جوانی میں تھا اٹھارہ سال
ظلم اس پر جو ہوئے کربلا میں سینئے
قتل کس طرح ہوا فوجِ جفا میں سینئے

مضطر کے اس مرثیے میں ۵۰ بند ہیں اور حضرت علی اکبر کی شہادت کے حالات بیان کئے ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

صبحِ عاشور ہوئی کرب و بلا میں جو عیاں باجے بجنے لگے فوجوں میں میانِ میداں
قتل سب ہو چکے انصارِ امامِ دو جہاں لے کے رخصت گئے میدان میں عباسؑ جواں
کٹ چکی ساری سپہ جب کہ شہنشاہی کی
علی اکبر کو اجازت ملی تب میداں کی

اذنِ جنگ مانگنے پہ رونے لگے شاہِ انام گر پڑے خاک پہ ہاتھوں سے جگر کو لیا تھام
گردِ شہ جمع ہوئیں بیبیاں آ کے تمام بانو سمجھی کہ چلا لڑنے کو میرا گل فام
اذن مرنے کا شبیہِ نبوی نے پایا!
فرقتِ داغِ پسر حق کے ولی نے پایا

مضطرؔ اس بین میں سب اہلِ حرم تھے مضطر شاہ کہنے لگے قاصد سے بصد سوزِ جگر
دل کو ہوتا ہے قلق ختم کر اب یہ منظر لاش کو لے گئے میداں سے شہِ جن و بشر
کر کے رخصت اسے یہ قاصدِ صحرا سے کہا
جا کے کہیو کہ ہمیں صبر کر دے صغرا!

مضطر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اُٹھے چمک کے میری شہادت کو حشر میں
ذرّے جو مہرباں ہوئے قتل گاہ کے

تیرِ جفا سے کرتے ہیں عاشق کے دل میں راہ
صدقے حضور آپ کی اس رسم و راہ کے

لے دل ربا جہاں میں ہے چلتا ہوا عمل
بن بیٹھے مقتدیہ کسی خانقاہ کے

نظارے کی ہوس عشق میں لائقؔ
ان آنکھوں کی بدولت گور جھانکی

("پیامِ یار" اپریل و مئی ۱۸۹۰ء)

کہ بیماری کے سبب ان کو امام اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے۔ سب رخصت ہوتے ہیں ؎

القصہ کہ ایک ایک نے صغرا کو کیا پیار   مل مل کے جدا ہو گئی سب عترتِ اطہار
اور ہودج و محمل میں ہوئے جا کے سب اسوار   آیا درِ دولت پہ غرض شاہ کا رہوار
نزدیک تھا ہو روح تنِ زار سے رخصت
جب شاہ دوبارہ ہوئے بیمار سے رخصت

رضاؔ کے اس مرثیے میں ۳۸ بند ہیں تمام بند بے حد مکمل اور بڑے دردناک ہیں۔ مقطع مندرجہ ذیل ہے ؎

صدمے دلِ غمگیں کے بیاں ہو نہیں سکتے   اوصافِ شہنشاہِ زماں ہو نہیں سکتے
مولا کے غم و رنج عیاں ہو نہیں سکتے   صغرا کے بیاں مجھ سے بیاں ہو نہیں سکتے
اب آگے رضاؔ کیا کہے معلوم ہے تم کو
مارے گئے شبیرؑ محرم کی دہم کو

رضاؔ کے استاد سید ابوالحسن فرقتیؔ تھے فرقتیؔ کا دیوان "عقیقِ جگری" جب طبع ہوا تو اس کی تاریخ رضاؔ نے بھی کہی اور نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی۔ مندرجہ ذیل شعر کے دوسرے مصرعے میں تاریخ ہے ؎

تاریخ کی تھی فکر رضاؔ دل نے ندا دی
کہہ دو یہی "یہ غیرتِ لعلِ یمنی ہے"

۱۹۸۰ء

مولوی سید اولاد حسن تسلیم

مولوی سید اولاد حسن تسلیم ایک ایسی باعظمت شخصیت کا نام ہے جس کے بغیر نہ امروہہ کے علماء کی تاریخ مکمل ہو سکتی نہ شعراء کی۔ وہ ایک جید عالم دین اور شیعہ جامع مسجد کے پیش امام تھے اور دوسری جانب صفِ اول کے شاعر اور ادیب۔ ان کے شاگردوں میں اگر ایک جانب بے شمار علماء تھے تو دوسری جانب امروہہ کے بیشتر شعراء کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب نقوی سادات امروہہ کے مورث اعلیٰ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے۔ آپ کے اسلاف میں بھی علمائے دین کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے۔ آپ کے والد مولوی محمد حسن۔ دادا مولوی محمد سیادت اور پردادا مولوی سید محمد عبادت تھے۔ اسلاف میں میر سید مبارک اور سید عبد الجلیل بہت نامور ہوئے جن کا ذکر صاحب "تواریخ واسطیہ" نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میر سید مبارک، موصوف عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ میں چہار صد پنجاہی ذات سہ صد سوار کے منصب پر ممتاز تھے اور اسی عہد میں ان کے بیٹے سید عبد الجلیل موصوف صد و بستی ذات کے منصب پر سرفراز تھے"۔ (صفحہ ۲۸۷)

سید محمد آلِ حسن مودودی لکھتے ہیں کہ

"مولوی سید محمد عبادت عالم مجاز امامت و صاحب نیابت مجتہد بود و ہم پسرش مولوی سید محمد سیادت عالم نائب مجتہد امامیہ بود و پیشوائے شیعانِ امروہہ برو قرار گرفت من بعد پسرش مولوی محمد عسکری نائب مناب اوشد وحلمی داشت و سخن بسیار کم می گفت اکنوں بجائے وی برادرش مولوی سید محمد حسن ست کہ عالم و طبیب وقت بدرجہ غایت بے تکلف و پاک از نخوت در یا و عجیب است و فرزند او مولوی سید اولاد حسن جوان صالح است و بہ تحصیل علوم مشغول و طبع مستقیم و ذہن سلیم میدارد و مجاز موروثی امامت نماز است۔ (نخبۃ التواریخ صہ ۵۸۔ ۱۲۹۶ھ)

(ترجمہ) مولوی سید محمد عبادت ایک ایسے عالم تھے جو امامت اور مجتہد وقت کی نیابت کے مجاز تھے۔ اور ان کے فرزند مولوی سید محمد سیادت بھی ایسے عالم تھے جو مذہب امامیہ کے مجتہد کے نائب تھے اور شیعانِ امروہہ کی پیشوائی انھیں کی ذات سے مخصوص تھی۔ ان کے بعد ان کے فرزند مولوی محمد عسکری ان کے نائب ہوئے جو صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ کم گو بھی تھے اب ان کی جگہ ان کے بھائی مولوی سید محمد حسن ہیں جو اپنے وقت کے عالم و طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ بے تکلف اور غرور و مکر و عجب سے پاک و دور ہیں اور ان کے فرزند مولوی سید اولاد حسن ہیں جو ایک نیک سیرت جوان ہیں اور تحصیل علوم میں مشغول ہیں اور طبع مستقیم و ذہن سلیم کے مالک ہیں اور یہ اپنے موروثی مرتبۂ امامتِ نماز کے مجاز ہیں۔

صاحب "تاریخ اصغری" مولوی سید اولاد حسن سلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"مولوی سید اولاد حسن سلیم تخلص زاد فضلہ بھی اسم با مسمی ہر فن میں اپنے والد ماجد کے قدم بر قدم ہیں۔ بڑے ابرار نوجوان صالح بغایت پرہیزگار قریب فضیلت ہیں۔" غرض کہ اس خاندان میں کوئی متنفس علم و ہنر سے خالی نہیں۔



مولوی سید اولاد حسن سلیم (مرحوم)

ہر سرِ دو بیت انتخاب ست   ایں خانہ تمام آفتاب ست"

(ص ۱۲۴ - ۱۲۵)

تسلیم کی ولادت ۱۲۶۸ھ میں امروہہ میں ہوئی۔ وہ نیک دل، سادہ مزاج، موزوں طبع، قادر الکلام، ہر دل عزیز اور انتہائی دلپسند انسان تھے۔ اور ان باتوں کا انھوں نے اپنی زندگی میں عملاً ثبوت دیا۔ وہ عالمِ باعمل تھے، ان کی عزت و احترام امروہہ کے مختلف فرقوں کے لوگوں میں یکساں تھا۔ محمود احمد عباسی ان کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ۔

"مولانا سید اولاد حسن تسلیم خلف مولوی سید محمد حسن نبیرۂ سید محمد شجاعت ۱۲۶۸ھ میں ولادت ہوئی۔ ابتداً اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی۔ پھر مفتی محمد عباس صاحب مجتہد سے لکھنؤ جاکر اخذِ علوم کیا۔ ادیب کامل، جامع معقول و منقول، نہایت درجہ منکسر المزاج نیک کردار و پاکیزہ خصلت، متقی و متورع اسلاف کا نمونہ تھے۔ خوشنویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ مزاج میں سادگی حد درجہ تھی۔ آبائی جائیداد کی آمدنی معقول تھی۔ آپ کی سادہ مزاجی، نیکی اور نیک دل کی وجہ سے ہندو، مسلمان، شیعہ و سنی ہر فرقہ کا شخص آپ سے باادب و احترام پیش آتا۔ اتحاد بین المسلمین کے عملاً حامی تھے۔ شگفتہ مزاج، موزوں طبع شاعر، شیریں مقال تھے۔ تسلیم تخلص تھا۔ فارسی اور اردو میں کلام کا ذخیرہ یادگار ہے۔ ہر صنفِ کلام پر پوری قدرت حاصل تھی۔ قدیم رنگ کی غزلیات کے علاوہ اردو و فارسی میں قصائد و قطعات و سلام و مراثی کا ذخیرہ موجود ہے۔ اکثر دوسروں کی فرمائش پر غزلیں اور قطعہ کہہ کر دیدیتے، ان کی نقول بھی اپنے پاس نہ رکھتے اس طرح کلام کا بڑا حصہ منتشر حالت میں ہے۔ شہر کے متعدد حضرات کو اس فن میں آپ سے تلمذ حاصل تھا۔" (تذکرۃ الکرام ص ۲۲۳ - ۲۲۴)

تسلیم کے [illegible] حصولِ علم اور درس و تدریس کے بارے میں سید رحیم بخش لکھتے ہیں کہ۔

"[illegible] لکھنؤ [illegible] بابرکت جناب شمس العلماء افضل الکملا مجتہد عصر و الزماں

جناب اکمل الناس مفتی سید محمد عباس صاحب میں رہ کر تحصیل علوم کیا۔ فن شعر میں ایسا کمال حاصل کیا کہ بے مثل ہیں۔ تسلیم تخلص کرتے ہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ انھیں کے دم سے جاری ہے۔" (تواریخ واسطیہ صـ ۲۹۶)

درحقیقت انیسویں صدی میں امروہہ نے چار نامور علمائے کرام پیدا کئے جو تاریخ ساز ثابت ہوئے۔ ایک نجم الملت مولانا سید نجم الحسن قبلہ، دوسرے حاجی مولوی سید مرتضیٰ حسین قبلہ، تیسرے مولوی سید اعجاز حسن قبلہ اور چوتھے مولوی سید اولاد حسن قبلہ تسلیم۔ نجم الملت نے اپنی خدمات علمی کا مرکز لکھنؤ کو بنایا اور "واعظین" و "ناظمیہ" کے نام سے علوم کے دریا بہائے۔ حاجی مولوی سید مرتضیٰ حسین نے امروہہ میں رہ کر مدرسہ نورالمدارس (اشرف المدارس) کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ مولوی سید اعجاز حسن قومی خدمات کے سبب قائد سادات امروہہ کہلائے اور مولوی اولاد حسین تسلیم نے دارالعلوم سید المدارس کے ذریعے ایک طرف علوم دین کا درس دیا تو دوسری جانب شعروادب کی بھی سرپرستی کی اور ایک بڑے حلقے کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔

صاحب "تاریخ سادات امروہہ" نے تسلیم کے حالات اس طرح لکھے ہیں کہ ـــ

"سید اولاد حسین تسلیم (پسر سید محمد حسن) اس دور شر و فتن میں آپ کا وجود مسعود درحقیقت سلف صالح کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ عالم و عامل، عابد و زاہد و ناظم و ناشر غرض جمیع صفات حسنہ سے آپ متصف تھے۔ آپ کی خوشنویسی پر اشرف المساجد کے در و دیوار گواہ ہیں۔ آیات قرآنی اس مسجد کی استرکاری پر آپ ہی کے قلم روشن رقم کی تحریر کردہ ہیں۔ تمام مسلمانان امروہہ، حتیٰ کہ اہل ہنود کو بھی آپ سے ایک خاص عقیدت تھی۔ شعر خوب کہتے تھے۔ تسلیم تخلص تھا۔"

(تاریخ سادات امروہہ جلد اول۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن صـ ۳۷۱-۳۷۲)

تسلیم کا انتقال ۷۰ سال کی عمر میں ۱۳۳۶ھ میں ہوا۔ تسلیم کے شاگرد مولوی سید

مجتبیٰ عرف چاند نے مندرجہ ذیل تاریخ وفات کہی۔

اولادِ حسن دائم در خلد بریں زیبد

۱۳۳۹ھ

مولوی مجتبیٰ کے علاوہ مرحوم کے دیگر شاگردوں نے بھی نہ صرف قطعاتِ تاریخ وفات کہے بلکہ اسد وغیرہ نے تو پورے مرثیے بھی کہے۔

مرحوم کے مراثی کے سلسلے میں جب راقم نے تسلیم کے فرزند استادِ محترم مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ کلیم سے معلومات کیں تو انھوں نے فرمایا کہ تمام مراثی محلے کے ایک بزرگ لے گئے تھے اور پھر انھوں نے واپس نہیں کیے۔ صرف ایک مرثیہ کا مطلع ر جو مندرجہ ذیل ہے۔

ع عجیب ناصر دیئے خدا نے حسینؑ مظلوم کربلا کو

مرحوم کے مراثی کے سلسلے میں جب راقم نے امروہہ کے کچھ قدیم بستے تلاش کئے تو مندرجہ ذیل ایک مرثیہ سید تصویر احمد مرحوم کے پاس ملا جو بقلم سید صغیر احمد ہے۔ اور سنِ تحریر ۱۳۲۱ھ ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ ۱۳۲۱ھ سے کافی قبل کی تصنیف ہو لیکن اگر ۱۳۲۱ھ ہی تصنیف مان لی جائے تب بھی یہ مرحوم کی وفات سے ۱۸ سال پہلے کی تصنیف ہے۔ یہ ۱۸ سال کی طویل مدت ایسی ہے کہ جس میں یقیناً کچھ اور مراثی بھی کہے ہوں گے اب یہ اردو ادب کا المیہ ہے کہ وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ مطلع ہے۔

کیا مرتبہ ہے نامِ جنابِ امیر کا — نامِ خدا ہے نام خدائے قدیر کا
ہے نقش مہرۂ دل شاہ و وزیر کا — جوشن ہے یہی جانِ صغیر و کبیر کا
عزت بشر کو دونوں جہاں میں یہ نام دے
مشکل پڑے تو جنگ میں سیفی کا کام دے

اس مرثیے میں کل ۲۷ بند ہیں۔ ابتدا میں حضرت علیؑ کی مدح، اسکے بعد مسجد کوفہ

میں بحالتِ نماز ابنِ ملجم کا تیغ چلانا۔ یہ خبر سنکر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا مسجدِ کوفہ میں پہونچنا۔ حضرت علیؑ کو مجروح دیکھنا۔ قاتل کا امام کے آگے پیش ہونا۔ امام کا قاتل کے ساتھ رحم کا سلوک کرنا۔ اسے شربت پلانا۔ پھر وصیتیں کرنا۔ حضرت عباسؑ کو امام حسینؑ کے سپرد کرنا اور اس کا سبب بتانا۔ اس کے بعد روحِ اقدس کی جسم سے پرواز اور پھر بین نظم کئے ہیں۔ ان تمام منزلوں سے سکیم بڑی کامیابی کے ساتھ گذرے ہیں۔ جس سے ان کے فنکارانہ انداز اور استادانہ رنگ کا اندازہ ہوسکتا ہے انھیں بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور ہر قسم کے جذبات کو پورے تاثر کے ساتھ نظم کیا ہے۔ مدحِ حضرت علیؑ میں ایک بند ملاحظہ ہو۔

کس طرح وصفِ شیرِ الٰہی کروں رقم | پائے ہیں کس نے خلق میں ایسے شرف، ہم
کس کو ملا یہ مرتبہ، یہ جاہ، یہ حشم | پیدا ہوئے ہیں خانۂ حق میں وہ ذی کرم

نائبِ رسولِ پاکؐ کا، زوجِ بتول ہے
بھائی بھی مصطفےٰ کا ہے نفسِ رسولؐ ہے

آگے چل کر حضرت علیؑ کی سخاوت کا ذکر کیا ہے۔ یہ کردار نگاری بھی ملاحظہ ہو۔

تعریف کیا سخاوتِ حیدرؑ کی ہو بیاں | دیتے تھے آپ جاکے یتیموں کو آب و ناں
بھوکا جو دیکھتے تھے اسیروں کے درمیاں | کھانا اسے کھلاتے تھے مولائے انس و جاں

کرتے تھے سیر جو کوئی محتاج پاتے تھے
بھوکوں کے گھر پہ آپ کھلانے کو جاتے تھے

ایسا سخی نہ ہوئے گا سارے جہان میں
فاقوں سے آپ بستے تھے بھوکوں کی دھیان میں

مقبول ہو جو بارگہہ بے نیاز میں
پائے وہی امام شہادت نماز میں

قاتل کی پیاس یاد جو کی اس امام نے
بھجوایا شیر اس کے لئے اپنے سامنے

مسجد کوفہ میں بحالت نماز ضربت لگتے وقت کیا منظر تھا وہ اس طرح بیان کیا ہے۔

لکھا ہے مرتضیٰ نے جو سجدے میں کھائی تیغ — سر پر پڑی جبین مبارک تک آئی تیغ
غل پڑ گیا علیؑ کو شقی نے لگائی تیغ — تھی زہر میں اسی لئے اس نے بجھائی تیغ

دو ٹکڑے حق کی یاد میں حیدرؑ کا سر ہوا
انگشت تیغ ظلم سے شق القمر ہوا

مندرجہ بالا بند میں جو محاکاتی انداز ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی متاثر کن لیکن بیت میں جس فنکارانہ انداز کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی قابل داد ہے۔

ضربت کے بعد کی جو کیفیت تھی وہ جب اولاد نے دیکھی تو اولاد کی کیا حالت ہوئی ملاحظہ ہو۔

دیکھا رسولؐ زادوں نے حضرت کا جب یہ حال — رونے کمال حزن سے زہراؑ کے نونہال
بیتاب ہو کے عرض یہ کی با غم و ملال — بابا کیا یہ آپ کو کس نے لہو میں لال

فرماؤ کس نے کعبۂ ایماں گرا دیا
کس نے لہو میں مہر ولایت چھپا دیا

اس مرثیے میں مکالمہ نگاری کے بھی اچھے نمونے موجود ہیں۔ بوقت آخر جب حضرت علیؑ نے سب کو جمع کیا اور امام حسنؑ کے سپرد کیا لیکن حضرت عباسؑ کے لئے خاموشی اختیار کی اس وجہ سے مادر حضرت عباسؑ ام البنین کو سخت صدمہ ہوا اور بے چین ہوئیں

انھوں نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ۔

سب کو سپردگی کی یہ دولت عطا ہوئی
عباسؑ سے مگر یہ کیا کچھ خطا ہوئی

اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ۔

اس سے زیادہ مجھ کو نہیں کوئی چیز ہے
تیرا تو یہ پسر مجھے سب سے عزیز ہے

اس کے بعد —

عباسؑ سے کہا کہ بس آگے کو تم بڑھو
لے دل رُبا حسینؑ کے ہاتھ۔ اپنا ہاتھ دو

لانا بجا وہ شوق سے جو اِن کا کام ہو
آقا ہیں یہ تمہارے، تم ان کے غلام ہو

اس کے بعد واقعاتِ کربلا کے بارے میں بتایا اور امام حسینؑ سے مخاطب ہوئے۔

تیری طرف سے لڑنے کو جائے گا نہر پر
عباسؑ اپنے ہاتھ کٹا لے گا نہر پر

اس طرح آپ مکالمہ نگاری میں بھی کافی کامیاب نظر آتے ہیں۔ مرثیے کا سب سے اہم حصہ مصائب ہوتا ہے۔ مرحوم نے اس میں بھی پوری کامیابی حاصل کی ہے۔

دنیا سے کوچ تھا جو ولایت پناہ کا
حضرت کے گرد شور تھا فریاد و آہ کا

سر پیٹ کے یہ کہتی تھی کیسا غضب ہوا

سجدے میں حق کے قتل۔ امیر عرب ہوا

تا عرشِ پاک جاتے تھے نوحے دہائی کے
روتا تھا جبکہ بھائی گلے مل کے بھائی کے

اس کے بعد مقطع میں سلیم مومنین سے اپنے لئے دعا کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور مرثیہ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

اب مومنیں سلیم کے حق میں دعا کریں
حیدرؑ بس اس کی داد میں جنت عطا کریں

مندرجہ بالا مرثیہ سے سلیم کی مرثیہ نگاری پر مکمل رائے تو قائم نہیں کی جا سکتی لیکن پھر بھی ان کے فن، ان کی زبان و بیان، ان کے اسلوب، ان کی طبع کی روانی اور ان کے رنگ کا ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کے سبب کہا جا سکتا ہے کہ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور مرثیے کے لئے ان کی طبع موزوں تھی۔

مولانا نے مرثیے کے علاوہ سلام بھی کافی کہے ہیں جو اکثر پرانی بیاضوں میں مل جاتے ہیں ان کا ایک سب سے طویل سلام جو ان کا شاہکار ہے اس میں ۱۷۶ اشعار ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مجرئی ہے کس قمر کے غم میں مضطر آفتاب
کس کے ماتم میں نکلتا ہے کھلے سر آفتاب

کب ہے لرزاں بے جہت بام فلک پر آفتاب
مانتا ہے رعبِ عباسِ دلاور آفتاب

دونوں خادم ہیں رواقِ روضۂ شبیرؑ کے
رات بھر حاضر ہے در پر ماہ، دن بھر آفتاب

نور کی بیتیں لکھی ہیں واہ تو نے اے تسلیم

اس بیاں کی داد دے گا روز محشر آفتاب

آپ کے مندرجہ ذیل سلام بھی کافی مشہور ہیں۔

ع۔ سلامی خونِ دل روتا ہے جب مضموں نکلتا ہے۔

ع۔ آرزو ہے درِ سلطانِ جہاں دیکھ تو لیں۔

ع۔ سلامی یاد نہ شہ کا الم رہے تو سہی

ع۔ خشکیدہ زباں سبطِ رسولِ عربی بود

ع۔ دل ہے جب تک غمِ شبیرؑ میں جلنے کے لئے

آپ نے قصائد بھی کہے ہیں۔ مذہبی قصائد کے علاوہ نواب کلب علی خاں رام پور اور نواب صفدر علی خاں رام پور کی مدح میں بھی قصیدے کہے ہیں۔ راقم کی نظر سے چند قصائد بھی گذرے ہیں۔ ابتدا اس طرح ہے۔

مرے دل پہ طاری ہے فرحت کا عالم
خوشی کی کشش ہے رگوں میں دما دم

اگر سنے مری رنگیں بیانیاں طوطی
تو گر پڑے پسِ آئینہ صورتِ تصویر

تسلیم کی غزلیات کا قلمی مجموعہ ان کے پوتے مولانا سید محمد سیادت صاحب قبلہ نے راقم کو دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ساقی وہ مے پلا کہ ہمیں عمر بھر نہ ہو
اس مبتدا کی ہو وے خبر گر خبر نہ ہو

پھونک دی سوزِ جنوں نے داغہائے تن میں آگ
ہے برنگِ شعلۂ جوالہ پیراہن میں آگ
بس کہ ہوں کشتہ کسی کے آتشیں رخسار کا
سرد ہووے گی نہ محشر تک مرے مدفن میں آگ

خدا آباد رکھے حضرتِ دل تم کو دنیا میں
تمہارے دم سے پُر رونق بیاباں ہوتے جاتے ہیں
اُڑیں گی دھجیاں کیسی جنوں جب زور لائے گا
ابھی سے چاک اپنے جیب و داماں ہوتے جاتے ہیں

آپ کو تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اس لئے قطعاتِ تاریخ بھی کافی کہے ہیں۔ اس دور میں اہلِ امروہہ کی شائع ہونے والی زیادہ تر تصنیفات ایسی ہیں کہ جن پر آپ کی تاریخ موجود ہے۔ مثلاً "تواریخ واسطیہ" از سید رحیم بخش۔ "دیوانِ فرقتیؔ"۔ "عقیقِ جگری"۔ از سید ابوالحسن فرقتیؔ۔ "مثنوی بیت الحزن" از مفتی سید محمد عباس۔ "مدیحِ پیغمبر" از سید ابوالحسن فرقتیؔ وغیرہ وغیرہ۔

دیوانِ فرقتیؔ کی تاریخ میں ۱۲۰ اشعار فارسی میں ہیں اور اس کے ہر مصرعے سے تاریخ نکالی ہے اور اس التزام کے ساتھ کہ ہر مصرعے سے سنِ عیسوی۔ سنِ ہجری۔ سنِ فصلی۔ سنِ سمت۔ سنِ منگلہ۔ سنِ فارسی یا سنِ نوروز وغیرہ وغیرہ برآمد ہوتی ہیں۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ جملہ اقسام صنائع و بدائع کا بھی استعمال کیا ہے اس سے مرحوم کی استادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فارسی تاریخ کے ساتھ دیوانِ فرقتیؔ کی تاریخ عربی میں بھی ۱۱۵ اشعار میں کہی ہے۔ دراصل آپ کو تاریخ گوئی پر پورا عبور حاصل تھا۔

کتابوں کے علاوہ آپنے کچھ عمارتوں کی بھی تاریخ کہی ہے جن میں سب سے زیادہ مقبول

عزاخانہ سید نورالحسن کے سائبان کی تاریخ ہے۔ جو عزاخانے پر کندہ ہے

فکر تھی تاریخ کی ہاتف پکارا ناگہاں

رونے والوں کے سروں پر نور کا ہے سائباں

سنہ ۱۳۱۳ھ

یوں تو مرحوم نے کچھ اہم شخصیات کے سانحۂ ارتحال پر بھی تاریخ کہی ہے لیکن ایک تاریخ حضرت شاہ ولایتؒ کے سن وفات اور ایک فارسی تاریخ جس میں ۲۱ اشعار ہیں مولانا سید حامد حسین قبلہ اور مفتی سید محمد عباس قبلہ (استاد تسلیم) کے سانحۂ ارتحال پر مشترک کہی ہے۔ یہ بہت اہم ہیں۔ ان دونوں علمائے دین نے ایک ہی سال کے دوران رحلت فرمائی تھی یہ تاریخ بے حد فنکارانہ اور استادانہ ہے۔ چند اشعار اس طرح ہیں۔

دریغ ازآں کہ بکنج لحد نہاں گشتند — دو ہادیانِ رہِ دینِ سیدِ عربی

جناب مولوی حامد حسین و مفتی ما — یکی خاص علمدار فوج سبطِ نبیؐ

چہ گویم از صفت فضل و جامعیت شاں — ز وصف علم کلام و معارف ادبی

ہزار حیف کہ آمد دو رخنہ در یک سال — بقصر محکم احکام سید عربیؐ

تسلیم نوحہ سالِ وفات ہر دو یکی است

زیا فتاد برابر دو رکنِ دینِ نبیؐ

سنہ ۱۳۰۶ھ

آپ نے جہاں مختلف صنعتوں میں اشعار کہے ہیں، سجع اور معمے بھی کہے ہیں۔ وہاں صنعتِ غیر منقوط میں بھی کوشش کی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کلمہ اس کا لا کلام ہو گر — حال اہل کمال کو ہو کمک

تسلیم کی تصانیف کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل راقم کی نظر سے بھی گذری ہیں۔

"فقہ الفرائض"۔ "دلائلِ حسینیہ"۔ "چراغِ ایمان"۔ "نہج الاشاعنہ"۔ "انوار المومنین"۔ "الفرائضِ فقہ"۔ "تعلیم الاطفال"۔ "نیرنگِ زمانہ (منظوم) اور "نہج البلاغت وغیرہ۔

یوں تو آپ کے شاگردوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ لیکن مخصوص شاگردوں میں علی تمکین تمکینؔ۔ اصغر حسین ماہرؔ۔ اسد اللہ اسدؔ۔ آلِ احمد نعیمؔ۔ اتقی حسن یکتاؔ۔ ممتاز حسن کمالؔ۔ ابنِ حید حیدرؔ۔ مولوی سید مجتبےٰؔ۔ غنی حسن غنیؔ۔ علامہ شفیق حسن اختر ایلیاؔ اور نسیم حسن ہلال وغیرہ وغیرہ تھے۔

آپ کے اخلاف میں اس وقت بہ فضلِ تعالیٰ آپ کے فرزند مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ کلیمؔ موجود ہیں جو اپنے اسلاف کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ شیعہ جامع مسجد امروہہ میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور بلند پایہ شاعر و ادیب بھی ہیں۔ کافی شعراء کو آپ سے تلمذ حاصل ہے۔ تسلیم کے ایک پوتے مولانا سید محمد سیادت ہندو ڈگری کالج امروہہ میں اردو لکچرر ہیں، شاعر بھی ہیں اور فہیمؔ تخلص کرتے ہیں۔ دوسرے پوتے ڈاکٹر محمد شفاعت فہیم ہیں جو اگر ایک طرف معالج ہیں تو دوسری جانب نئے لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ تسلیم کے باقی پوتے بھی زیورِ علم سے آراستہ ہیں اور اس طرح اخلاف میں علم و ادب کا سلسلہ جاری ہے۔

درحقیقت تسلیم امروہہ کے وہ شاعر تھے جنہیں بیک وقت اردو، فارسی اور عربی شاعری پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام اگر زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آجائے تو ان کی شاعری انھیں صدیوں زندہ رکھے گی۔

عزا خانۂ سید نورالحسن کے سائبان کی تاریخ ہے۔ جو عزا خانے پر کندہ ہے

فکر تھی تاریخ کی ہاتف پکارا ناگہاں

رونے والوں کے سروں پر نور کا ہے سائباں

۱۳۱۳ھ

یوں تو مرحوم نے کچھ اہم شخصیات کے سانحہ ارتحال پر بھی تاریخ کہی ہے لیکن ایک تاریخ حضرت شاہ ولایتؒ کے سنِ وفات اور ایک فارسی تاریخ جس میں ۲۱ اشعار ہیں مولانا سید حامد حسین قبلہ اور مفتی سید محمد عباس قبلہ (استادِ تسلیم) کے سانحہ ارتحال پر مشترک کہی ہے۔ یہ بہت اہم ہیں۔ ان دونوں علمائے دین نے ایک ہی سال کے دوران رحلت فرمائی تھی یہ تاریخ بے حد فنکارانہ اور استادانہ ہے۔ چند اشعار اس طرح ہیں۔

دریغ از آں کہ بکنج لحد نہاں گشتند دو ہادیانِ رہِ دینِ سیدِ عربی

جناب مولوی حامد حسین و مفتی ما تیمی خاص علمدارِ فوجِ سبطِ نبیؐ

چہ گویم از صفت فضل و جامعیت شاں ز وصف علم کلام و معارف ادبی

ہزار حیف کہ آمد دو رخنہ دریک سال بقصرِ محکم احکامِ سیدِ عربیؐ

تسلیم نوحہ سالِ وفات ہر دو گی است

زیبا فتاد برابر دو در رکنِ دینِ نبیؐ

۱۳۰۶ھ

آپ نے جہاں مختلف صنعتوں میں اشعار کہے ہیں، سجع اور معمے بھی کہے ہیں۔ وہاں صنعت غیر منقوط میں بھی کوشش کی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کلمہ اس کا لا کلام ہو گر حال اہل کمال کو ہو کمک

تسلیم کی تصانیف کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل راقم کی نظر سے بھی گذری ہیں۔

"فقہ الفرائض"۔ "دلائلِ حسینیہ"۔ "چراغِ ایماں"۔ "ہدیۂ الاشاعۃ"۔ "انوار المومنین"۔

"الفرائضِ فقہ"۔ "تعلیم الاطفال"۔ "نیرنگِ زمانہ" (منظوم) اور "ہدیۂ البلاغت" وغیرہ۔

یوں تو آپ کے شاگردوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ لیکن مخصوص شاگردوں میں علی تمکین تمکین۔ اصغر حسین ماہر۔ اسد اللہ اسد۔ آلِ احمد نعیم۔ اتقی احسن یکتا۔ ممتاز حسن کمال۔ ابنِ حید حیدر۔ مولوی سید مجتبےٰ۔ غنی حسن غنی۔ علامہ شفیق حسن اختر ایلیا اور نسیم حسن ہلال وغیرہ وغیرہ تھے۔

آپ کے اخلاف میں اس وقت بہ فضلِ تعالیٰ آپ کے فرزند مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ کلیم موجود ہیں جو اپنے اسلاف کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ شیعہ جامع مسجد امروہہ میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور بلند پایہ شاعر و ادیب بھی ہیں۔ کافی شعراء کو آپ سے تلمذ حاصل ہے۔ سلیم کے ایک پوتے مولانا سید محمد سیادت ہند ڈگری کالج امروہہ میں اردو لکچرر ہیں، شاعر بھی ہیں اور فہمی تخلص کرتے ہیں۔ دوسرے پوتے ڈاکٹر محمد شفاعت فہیم ہیں جو اگر ایک طرف معالج ہیں تو دوسری جانب نئے لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ سلیم کے باقی پوتے بھی زیورِ علم سے آراستہ ہیں اور اس طرح اخلاف میں علم و ادب کا سلسلہ جاری ہے۔

درحقیقت سلیم امروہہ کے وہ شاعر تھے جنہیں بیک وقت اردو، فارسی اور عربی شاعری پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام اگر زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آجائے تو ان کی شاعری انھیں صدیوں زندہ رکھے گی۔

سید حسین کامل

شرف الدین واسطی کی نسل میں قاضی سید عبدالرسول بن قاضی سید کبیر بن سید بہاء الدین ہوئے ہیں۔ سید عبدالرسول کے بڑے فرزند قاضی سید ولی محمد ہوئے جو حسب فرمان مورخہ ۲۹ محرم سنہ ۱۹ جلوس عالم گیر اورنگ زیب بادشاہ منصب امر قضا پر ممتاز ہوئے۔ قاضی سید ولی محمد کی ۶ نسل بعد سید حسین کامل ہوئے کامل کے والد کا نام سید نذر حسین تھا۔ صاحبِ واسطیہ لکھتے ہیں کہ

"یہ شاعر اچھے ہیں شعر گوئی میں طبیعت موزوں ہے تخلص ان کا کامل ہے صاحبِ دیوان ہیں۔" (صفحہ ۴۲۱

صاحب واسطیہ نے ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ کامل نے تحقیقات حالات میں مؤلف کی کافی مدد کی ہے۔ مولوی سید بشیر حسن نے بھی کامل کا ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ

"سید حسین کامل اچھے شعرا میں شمار کیے جاتے تھے کامل تخلص تھا۔ صاحب دیوان تھے۔"

(شجرات ساداتِ امروہہ صفحہ ۹۱)

اسی کے ساتھ ساتھ مولوی بشیر حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ کامل اساتذہ میں شمار کیے

جاتے تھے۔ سید علی امام نقوی کی تحقیق کے مطابق کامل کی وفات ۱۹۰۶ء میں ہوئی جب کہ ان کی عمر ۵۴ سال تھی اس طرح کامل کا سنِ ولادت ۱۸۵۳ء ہوا۔ کامل مومن حسین صفی اور جواد حسین شمیم کے شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں امروہہ کے مرثیہ نگار شاعر تھے پھر کیسے ممکن تھا کہ کامل نے مرثیہ نہ کہا ہو۔

راقم الحروف نے کامل کے مراثی کی بہت تلاش کی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اکثر بزرگوں نے یہ تصدیق کی کہ کامل مرثیہ نگار تھے۔ مورخین نے انہیں صاحبِ دیوان بھی لکھا ہے لیکن کامل کا دیوان بھی تلاش نہ ہوسکا یا تو کامل کا ادبی سرمایہ تلف ہوگیا یا پھر ان کے ورثا کے پاس پاکستان میں ہے۔

کامل کے صرف ایک فرزند سید حامد حسین ہوتے۔ حامد حسین کے ۵ فرزند ہوئے محمود حسن۔ منور حسین۔ تین بھائی علی رضا۔ جعفر رضا اور باقر رضا پاکستان چلے گئے۔ جن کی اولاد بھی سب پاکستان ہے۔

کامل نے امروہہ کی مخصوص عوامی صنفِ شاعری چہار بیت میں بھی کافی طبع آزمائی کی ہے۔ اب بھی کچھ پرانے لوگوں کو کامل کے کافی بند یاد ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اس بتِ ناآشنا کو خط کروں کیوں کر رقم — سیکڑوں نامہ بروں کے سر کٹواں پر قلم
ایک صورت ہے کہ جب پہنچے سرِ قصرِ صنم — چونچ سے نامہ مرا فوراً کبوتر چھوڑ دے
بے حجابی غیر سے اے میرے دل پر چھوڑ دے

سیّد فرحت علی فرحتؔ

عہدِ جلال الدین محمد اکبر میں سید قطب الدین بن سید غازی خاں اولادِ سید شرف الدین میں منصب دارِ شاہی گذرے ہیں۔ ان کی ہی نسل میں سید یاد علی (حقانی) ہوئے ہیں۔ سید یاد علی کے فرزند سید فرحت علی فرحت ہوئے۔ فرحت کی ولادت ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء کو امروہہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر کے بزرگوں سے حاصل کی اس کے بعد اردو اور فارسی کا باقاعدہ درس حاصل کیا۔ اس کے بعد محکمۂ پولس میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کے بعد تھانیداری کے عہدے تک پہنچے۔ دورانِ ملازمت اناؤ۔ بریلی۔ ایٹہ۔ مراد آباد۔ ٹھاکردوارہ اور اسمولی وغیرہ میں قیام رہا۔ ۱۹۱۰ء میں ایٹہ سے ریٹائر ہوئے۔

شاعری میں فرحت کے استاد مولوی اولاد حسن حلیم تھے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو امروہہ میں فرحت کی وفات ہوئی۔ اولاد میں دو پسران سید اختر حسین اور سید سرور حسین ہوئے۔ سرور حسین کے پسر سید جرار حسین دہلی میں مقیم ہیں۔ اختر حسین کے دو پسران سید علمدار حسین اور سید کرار حسین ہیں۔

فرحت نے ملازمت سے سبکدوش [illegible] تھا جس میں غزلیں

نظمیں۔ سلام۔ قصائد۔ قطعات۔ مراثی اور نوحے تھے۔ سید اختر حسین (پسر فرحت) کا بیان ہے کہ وہ قلمی دیوان ان کے داماد سید سرکار حیدر رشک کے پاس تھا جو ابتک واپس نہیں مل سکا
راقم نے چند مرثیہ خوان حضرات کے بستوں میں فرحت کے سلام دیکھے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غم کی یثرب میں گھٹا آج یہ آئی کیسی　　شور ہے کیسا مدینے میں، دہائی کیسی
مرنے کے بعد بھی ضیغم نہ ترائی سے ہٹا　　قبضہ اپنا ہی رکھا نہر پہ ائی کیسی
کوچ کرتے ہیں مدینے سے حسینؑ ابنِ علیؑ　　ہوتی ہے آج بھرے گھر کی صفائی کیسی

گلے پر شاہ کے اے ہمرہی شمشیر پھرتی ہے
علیؑ بے چین ہیں اور فاطمہؑ دلگیر پھرتی ہے
پڑی ہے لاش بے گور و کفن شبیرؑ کی رن میں
برہنہ سر غضب ہے خواہر شبیرؑ پھرتی ہے
بوقت ذبح قاتل سے یہ اپنے شاہ کہتے تھے
ذرا رک جا کہ آنکھوں میں مری ہمشیر پھرتی ہے
یہی کہتا تھا ہر اک دیکھ کر اکبرؑ کی صورت کو
رسولِ حق کی میرے سامنے تصویر پھرتی ہے
چلو جلدی مزارِ شاہ پر فرحت زیارت کو
رہی ہے عمر تھوڑی موت دامن گیر پھرتی ہے

سیّد آلِ محمد اقدس

سید حسین شرف الدین شاہ ولایت کی نسل میں میر سید مبارک ولد سید منتخب اپنے وقت کی نام ور اور مشہور شخصیت ہوتے ہیں ان کے بارے میں صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" کا بیان ہے کہ "سید مبارک ولد سید منتخب عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ میں چہارصد پنجاہی ذات کے منصب پر ممتاز و ذی رتبہ تھے" (صفحہ ۴۴۳) سید مبارک کے پسر سید عبدالغفار کے بارے میں صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" لکھتے ہیں کہ "حسبِ فرمان مورخہ ۹۸۳ھ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ان کا منصب یک صدی ذات تھا ان کی مہر میں سید عبدالغفار بندہ درگاہ کندہ تھا اس وقت کی ایک دستاویز پر مہر ان کی مولف کی نظر سے بھی گذری ہے" (صفحہ ۴۶۴)

سید عبدالغفار کی نسل میں سید محمد مختار۔ سید غضنفر علی۔ سید وارث علی۔ سید عبدالواحد اور سید منصور علی اپنے اپنے دور میں منصب دارانِ شاہی ہوتے ہیں۔ سید منصور علی کے پوتے سید عزیز علی ہوتے سید عزیز علی عہدِ نصیر الدین حید ربادشاہ میں داروغہ جیل خانہ و اصطبلِ خاص سلطانی تھے اور عہدِ محمد علی شاہ میں ہردوار کے



حاجی سید آل محمد اقدس (مرحوم)

میلے سے گھوڑے اور اونٹ حسب الحکم بادشاہ موصوف کے ... کیئے بہ عوض اس کارگذاری کے سرکار موصوفہ سے تحفہ خلعت ان کو عطا ہوا۔ اور عہدِ واجد علی شاہ بادشاہ میں پرگنہ کچھولی ہیبوڑہ کے تحصیل دار رہے۔ ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا۔

سید عزیز علی کے پوتے اور حاجی وزار سید اصغر حسین (مصنف تاریخ اصغری) کے پسر سید آلِ محمد اقدس ہوئے۔ سید آلِ محمد اقدس کا ذکر ان کے والد نے "تاریخِ اصغری" میں اس طرح کیا ہے۔ "سید آلِ محمد بڑا بیٹا مولف کا فارسی اور عربی اور کسی قدر طب اور فقہ بھی پڑھا ہے۔ نظم و نثر سے بھی طبیعت کو مناسبت ہے ایک رسالہ "اصل الاصول" بزبانِ عربی اور دوسرا رسالہ "معارفِ تقیہ" بہ عبارتِ فارسی اس کی تالیفات سے ہے۔ جس کو جناب مجتہد العصر ملک العلما مولانا سید بندہ حسین دام ظلہ العالی نے ملاحظہ فرما کر اپنی مہر اور دستخط سے مزین فرمایا" (صفحہ ۱۶۳)

مندرجہ بالا عبارت سے اقدس کی عربی و فارسی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولوی سید بشیر حسن نے بھی اپنی کتاب "شجراتِ ساداتِ امروہہ" میں اقدس کے بارے میں لکھا ہے کہ "علم عربی و فارسی میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔" (صفحہ ۵۰)

صاحبِ "تواریخ واسطیہ" اقدس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "سید آلِ محمد ولد سید اصغر حسین۔ یہ بھی حاجی وزار ہیں بڑے با وضع ذکی الطبع صاحب فہم بسیار ہوشیار خوش رو و خوب رو ہیں رفعت ارادت میں مشہور حرارتِ مذہب میں معروف خوش خط و خوش اخلاق۔ نظم و نثر میں شہرہ آفاق۔ صاحب علم ذی کمال۔ فرخندہ خصال ہیں۔ ان کی تالیف و تصنیف سے ... دیگر رسالے مناظرۂ مذہبی میں ہیں ان کی یہ تالیف و تصنیف مخبر تعریف و توصیف ان کی ہے الغرض یہ بڑے لئیق نیک کردار جوان صالح ہیں" (صفحہ ۲۸۶)

مندرجہ بالا حوالوں سے اقدس کے علم و فن۔ ذہانت و ذکاوت۔ تصنیف

وتالیف ۔ حاجی وزائر۔ وجیہہ وشکیل ۔ با اخلاق و با کردار ہونے کا پتہ چلتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو نہ صرف حاجی و زائر کا فرزند ہو بلکہ خود بھی عالم جوانی میں حاجی و زائر ہو جائے اس کی شاعری میں مذہبی اثرات کس قدر ہوں گے ۔ اس لیئے اس ماحول نے طبیعت میں ایک خاص رجحان پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے اقدس نہ صرف مذہبی موضوعات پر نثر لکھنے کو متوجہ ہوئے بلکہ مرثیہ نگار بھی بن گئے ۔

کتب تواریخ اقدس کی سن ولادت کے بارے میں خاموش ہیں ۔ لیکن "تاریخ اصغری" جو ۱۲۹۱ھ کی تصنیف ہے اس نے اقدس کی دو تصانیف کا ذکر کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ۲۰ سال کی عمر سے قبل کسی کی دو تصانیف ہونا ممکن نہیں ہیں لہذا اس وقت ۲۰ سال ہی عمر مان لیتے ہیں ۔ اقدس کی وفات کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک فرد سید علی امام نقوی ۱۳۵۲ھ بتاتے ہیں ۔ اور ہلال نقوی بھی "مرثیہ عظیم" میں ۱۹۳۶ء لکھتے ہیں جو تقریباً ۱۳۵۳ھ ہوتی ہے ۔ لہذا ۱۲۹۱ھ میں اقدس کی عمر ۲۰ سال ماننے کے بعد ۱۳۵۳ھ تک اقدس کی کل عمر تقریباً ۸۲ سال ہوتی ہے ۔ اقدس کونسل کے ممبر بھی رہے ۔ اقدس کے استاد طپش تھے ۔

جہاں تک اقدس کے مراثی کا تعلق ہے وہ سب غیر مطبوعہ ہیں ۔ راقم کو صرف مندرجہ ذیل مراثی حاصل ہو سکے ہیں ؎

ساقی مجھے شراب طہورہ کا جام دے ۔۔۔ تلچھٹ نہ جس میں ہو وہ مئے سرخ فام دے
کاسے پہ کاسہ صبح سے تا وقت شام دے ۔۔۔ وہ مے پلا کہ جو مجھے فرحت مدام دے
عاشق ہوں میں جناب رسولؐ انام کا
دے بھر کے جام ساقی کوثر کے نام کا ۔۔۔ (بند ۲ تحریر ۱۳۱۵ھ)

شیرازۂ صحیفۂ ایماں حسینؑ ہے ۔۔۔ روح رسولؐ فاطمہؑ کی جاں حسینؑ ہے
ملک غم و الم کا سلیماں حسینؑ ہے ۔۔۔ کرب و بلا کے دشت کا مہماں حسینؑ ہے

ایسے تھے محوِ عشقِ جنابِ الٰہ میں
بچے تلک فدا کیے خالق کی راہ میں (بند ۲۷ تحریر سنہ ۱۹۳۴ء)

جب حملہ ور صفوں پہ ہوا اکبرِ حسیں — نعروں سے اس دلیر کے ہلتا تھا فرشِ کیں
جس غول پر گئے صفتِ شیرِ خشمگیں — دادا کی مثل پاٹ دی لاشوں سے سب زمیں
جنگ اس ولی کی حیدرِ صفدر کی حرب تھی
اتنا ہی تو جلال تھا ان کی ہی ضرب تھی (بند ۲۷ تحریر سنہ ۱۳۱۶ھ)

اقدسؔ کے مندرجہ بالا مراثی کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقدسؔ نے مرثیہ پر پوری توجہ دی ہے۔ پہلا مرثیہ سنہ ۱۳۱۵ھ کی تحریر ہے جب کہ وفات سنہ ۱۳۵۳ھ میں ہوئی یعنی اس کے بعد ۳۸ سال اقدسؔ اور حیات رہے اس عرصے میں یقیناً اقدسؔ نے کافی مرثیے لکھے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ وہ مراثی آنے والے وقت میں سامنے آئیں۔ بہر حال ان مراثی میں جو بظاہر مختصر ہیں اقدسؔ نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ نعتِ رسولؐ۔ مدحِ علیؑ۔ مدحِ فاطمہؑ۔ مدحِ حسنؑ و حسینؑ اور مدحِ حضرت علی اکبرؑ کے علاوہ شہادتِ امام حسینؑ۔ شہادتِ حضرت علی اکبرؑ اور شہادتِ علی اصغرؑ بھی بیان کی ہے۔ ساقی نامے اور جنگ کی بھی ہلکی سی جھلک ہے۔ ایک جگہ ولادتِ رسولِؐ مقبول کا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ؎

ہر جا ہے آج رحمتِ غفار کا نزول — مسرور مومنین ہیں کفار ہیں ملول
ہوں گی دعائیں آج ہر اک شخص کی قبول — ہے آج روزِ عشرت و پیدائشِ رسولؐ
صف بستہ ہیں ملائکہ تعظیم کے لیے
ہر نخل ہے جھکا ہوا تسلیم کے لیے

اس رحمتِ مجسم کی آمد کا اثر کیا ہوا ؎
تھراتے بام اور لرزتے تھے کوہسار — آتش کدہ عجم کا ہوا سرد ایک بار

چہرے سے بت پرستوں کے ذلت تھی آشکار
روشن تھا دینِ حق ہوئے کافر ذلیل و خوار

غیرتِ وہ جناں چمنِ روزگار تھا
چہرے سے ان کے نورِ خدا آشکار تھا

ایک موقع پر ولادتِ حضرت علیؑ کا ذکر بھی ملاحظہ ہو ے

مسرور شادماں تھے رسولِ فلک سریر
پایا خدا کے گھر سے بڑی شان کا وزیر
جز مصطفیٰ نہیں ہوا جس کا کوئی نظیر
سلطانِ دیں امامِ اُمم شاہِ قلعہ گیر

مثلِ علیؑ زمانے میں کوئی ہوا نہیں
ایسا کسی رسولؐ کو نائب ملا نہیں
دے کر اذاں بھی جو اقامت جناب نے
چوما دہن کو مادرِ عفت مآب نے

ایک بیت میں جنابِ فاطمہؑ زہرا کی مدح بھی ملاحظہ ہو ے

لختِ دل و جگر ہیں رسولِ انام کی
یہ مادرِ جلیل ہیں گیارہ امام کی

اقدس نے کئی موقعوں پر جنگ اور شہادت کا بیان ایسے انداز میں کیا ہے کہ پڑھتے وقت منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جب حضرتِ علی اکبرؑ کی آواز میدانِ جنگ سے درِ خیمہ تک پہنچی اور امامؑ سوئے میدان روانہ ہوتے اس وقت اقدس کہتے ہیں کہ ے

در پر کھڑے تھے خیمے کے سلطان کربلا
پہنچی پسر کی گوشِ مبارک میں جو صدا
حضرت نے اس کو سن کے کہا وا مصیبتا
دوڑے حسینؑ دشت کی جانب برہنہ پا

طاقت نہ تھی جو تن میں قدم لڑکھڑاتے تھے
ہر ہر قدم پہ سبطِ نبیؐ بیٹھ جاتے تھے

جب امام حسینؑ میدان میں پہنچتے ہیں اس وقت کے مکالمے بھی بے حد دلخراش ہیں۔ امام فرماتے ہیں کہ ؎

اکبر جواب دو مجھے کس سمت آؤں میں — قسمت میں تھا کہ ٹھوکریں جنگل کی کھاؤں میں
پاؤں تمہاری لاش تو چھاتی لگاؤں میں — مجروح رخ کو چوم کے قربان جاؤں میں
کس گوشے میں پڑا جسد پاش پاش ہے
کہہ دو پکار کر کہ یہاں میری لاش ہے

امام حسینؑ کے یہ کلمات سننے کے بعد حضرت علی اکبرؑ نے کیا فرمایا۔ ؎

فرمایا تھے یہ شہ والا بہ شور و شین — اکبرؑ نے آنکھ کھول کے دیکھا سوئے حسینؑ
کی عرض شاہ دیں سے کہ یا شاہِ مشرقین — کس طرح بولے آپ سے قلب و جگر کا چین
اس وقت مجھ پہ ہے یہ مصیبت پڑی ہوئی
برچھی کی ہے انی مرے دل میں گڑی ہوئی

مصائب بیان کرنے میں بھی اقدس کو پوری قدرت حاصل ہے حضرت علی اصغرؑ کو جب امام عالی مقام میدانِ جنگ میں لے کر جاتے ہیں اور سوال آب کرتے ہیں وہ موقع بھی ملاحظہ ہو ؎

لب خشک جسم سرد انگوٹھا دہن میں ہے
دیکھو یہ آفتاب ہمارا گہن میں ہے

ایک جگہ امام حسینؑ کی بے کسی کا منظر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ؎

طاقت نہ تھی جہاد کی زہراؑ کے لال میں
بے کس حسینؑ رہ گئے دشتِ قتال میں
ایسے بھی ظلم و جور زمانے میں کم ہوئے
اقدس حسینؑ پیاسے پہ جو جو ستم ہوئے

ایک مرثیے کے مقطع میں اپنے لیے شفاعت کی اس طرح امید کرتے ہیں ؎

اقدسؔ خموش بزم میں ہے شیون و بکا		شاباش تجھ کو دیتے ہیں سلطانِ کربلا
کس درجہ خوب تو نے ہے یہ مرثیہ لکھا		دیں گے شہِ زمن تجھے اس بات کا صلا
بے شبہہ تجھ کو سبطِ نبیؐ بخشوائیں گے
ہمراہ اپنے خلد میں بھی لے کے جائیں گے

اقدسؔ زیاراتِ مقاماتِ مقدسہ سے مشرف یاب ہو چکے تھے ایک مرثیے میں انہوں نے دوبارہ زیارت کی دعا اس طرح کی ہے کہ ؎

اقدسؔ خموش طول مناسب نہیں ذرا		اس وقت اہلِ بزم میں ہے شیون و بکا
کر عرض شاہِ دین سے کہ یا شاہِ کربلا		بارِ دگر غلام کو پاس اپنے لو بلا
دونوں جہاں میں آپ کا مجھ کو سہارا ہے
بے چین ملکِ ہند میں اقدسؔ تمہارا ہے

اقدسؔ کے ان مراثی کے مطالعے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ مرثیہ نگار تھے۔ کاش کہ ان کے باقی مراثی بھی تلاش ہو کر منظرِ عام پر آسکیں۔ اقدسؔ نے سلام بھی کافی کہے ہیں۔ نمونۂ سلام اس طرح ہے ؎

جب کربلا کی سمت شہِ بحر و بر گئے
اے مجرئی مدینے کو ویران کر گئے

عرق گرا ہے زمیں پر حسینؑ کے رخ کا
دکیوں کھلیں چمنِ دہر میں گلاب کے پھول

عذابِ قبر کا دل میں نہ کر خطرہ ذرا اقدسؔ
محبوں کی وہاں شیرِ خدا امداد کرتے ہیں

ہر گھڑی اقدسؔ محزوں کی دعا ہے یا رب
زائرِ روضۂ پاکِ شہِ والا ہوں میں

اقدسؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن کم۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہم تو ہیں مستِ حُبِّ یداللہ سے مخمور
کس روز طلب گار ہوتے بنتِ عنب کے

ہے انتظار میں اس گل کے صورتِ نرگس
چمن میں ماہِ فلک چاندنی بچھاتے ہیں

اقدسؔ نے اپنے زمانے کے عام رواج کے مطابق قطعاتِ تاریخ بھی کہے۔ مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ "تاریخِ اصغری" کے طبع ہونے پر کہا۔

بہت کی سیرِ گلزارِ جہاں کی ۔۔۔ ہزاروں میں یہ پائی ایک تاریخ
جو فکرِ سال کی بولا یہ ہاتف ۔۔۔ کہ ہے تاریخ اس کی نیک تاریخ

۱۲۹۱ھ

اقدسؔ امروہہ کے نہ صرف ممتاز شعراء میں تھے بلکہ اچھے ادیب بھی تھے کاش کہ ان کے مراثی بھی نثری تصانیف کی طرح زیورِ طباعت سے آراستہ ہو سکیں۔ ان کی تصانیف میں "اصل الاصول"۔ "معارفِ تقیہ" اور "دُرۃ البیضا فی اثباتِ حقِ فاطمہ زہراؑ" وغیرہ ہیں۔

اقدسؔ کے چھوٹے بھائی ذکی حسن ذکیؔ بھی شاعر تھے۔ اقدسؔ کے تین فرزند اور دو دختران تھیں۔ آلِ یٰسین۔ آلِ عمران اور آلِ ہاشم۔ آلِ یٰسین شاعر تو نہیں البتہ مرثیہ خوان تھے اور اس فن میں کافی مقبول تھے۔ آلِ ہاشم کی اولاد پاکستان میں ہے۔ ایک دختر سید نفیس حسن نفیسؔ کو منسوب ہوئیں اس طرح اقدسؔ کے بعد ان کی نسل میں شاعری قائم نہیں رہ سکی۔

سیّد ذکی حسن ذکی

ذکی کا تعلق بھی اولادِ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ہے۔ آپ کے اسلاف کا ذکر سید آلِ محمد اقدس کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے آپ اقدس کے چھوٹے بھائی اور سید اصغر حسین مرتب "تاریخِ اصغری" کے فرزند تھے۔ صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" نے آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"سید ذکی حسن ولد سید اصغر حسین۔ یہ بھی زیارات عتبات عالیات عراق وغیرہ سے شرفیاب تھے۔ یہ بڑے نیک بخت دلیق و فہیم جوان صالح تھے انہوں نے عین شباب جوانی میں اپنے والد کی حیات میں انتقال کیا۔" (صفحہ ۲۸۷)

سید علی امام نقوی کے حوالے سے ہلال نقوی نے "مرثیہ عظیم" میں ذکی کا سنِ ولادت ۱۲۷۰ھ اور وفات ۱۳۰۶ھ لکھا ہے اس حساب سے ذکی کی عمر صرف ۳۶-۳۷ سال ہوئی۔

ذکی کا تعلق امروہہ کے ایک علمی گھرانے سے ہے کیوں کہ ایک طرف ان کے والد بڑے صاحبِ علم تو دوسری جانب بڑے بھائی اقدس اپنے وقت کے ممتاز شاعر۔ اسی ماحول میں ذکی کی تربیت ہوئی اور شعر گوئی کی جانب متوجہ ہوئے۔ لیکن عمر نے وفا نہیں کی ورنہ ممکن تھا

کہ ذکی بہت بڑا ادبی سرمایہ چھوڑ کر جاتے۔ بے حد کوشش و تلاش کے بعد ان کا ایک مرثیہ اور ایک سلام حاصل ہو سکا ہے۔

ذکی کے اخلاف میں ان کے ایک پسر سید عسکری حسن ہوئے سید عسکری حسن کے دو پسر سید محسن تقی اپنے دور کے نامور ادیب اور سید تقی حسن تقی شاعر ہوئے۔ سید تقی حسن کا انتقال ہو چکا سید تقی حسن علی گڑھ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ سید تقی حسن کے دو فرزند ہوئے۔ سید علی امام جو کراچی پاکستان میں سرکاری عہدے پر فائز ہیں ادیب ہیں اور سید حسن امام حسن امروہہ میں شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہیں شعر بھی کہتے ہیں۔ تقی حسن کے تین فرزند سید نقی امام سید سجاد امام اور سید عسکری امام ہیں۔ یہ بھی والد کے ساتھ علی گڑھ میں ہی رہتے ہیں۔

راقم کو ذکی کا جو مرثیہ حاصل ہوا ہے اس میں ۲۷ بند ہیں جس میں وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں کہ جب امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے وطن مدینے یہ خبر پہنچی۔ قاصد صغرا کا کربلا سے واپس ہونے کے بعد وہاں کے حالات بیان کرنا نظم کیا گیا ہے۔ مرثیہ سوز خوانی کے طور پر پڑھنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ اس میں واقعات مصائب نظم کیے گئے ہیں۔ مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

جو وطن میں شہِ بے کس کی سنائی آئی — خبرِ کرب و بلا یعنی رہائی آئی
ہر زباں پر وہ مصیبت کی کہانی آئی — شور یہ تھا کہ قیامت کی نشانی آئی

پنجۂ غم سے گریباں ہر اک چاک ہوا
پھر مدینے میں غمِ صاحبِ لولاک ہوا

کوئی کہتا تھا کہ ہے آج قیامت برپا — کوئی کہتا تھا کہ دلبندِ نبیؐ قتل ہوا
وا دریغا کوئی کہتا تھا کوئی واویلا — کوئی آنکھوں سے بہاتا تھا لہو کا دریا

خلق سر پیٹ کے ہر سمت جو چلاتی تھی

واحسینا کی صدا تا بہ فلک جاتی تھی

اس مرثیے کے آغاز سے ہی منظر نگاری پر زور دیا گیا ہے۔ ایک غم زدہ ماحول کو نظم کیا گیا ہے۔ آگے چل کر خاص نفسیاتی کیفیات اور سماجی رسوم کا ذکر کیا ہے۔ کسی بھی موت کے بعد چونکہ یہ دستور ہے کہ دیگر متعلقین و اہلِ وطن مرنے والے کے پسماندگان کے پاس جا کر پرسہ دیتے ہیں۔ اظہارِ رنج و ملال کرتے ہیں لیکن امام حسینؑ کی شہادت کے بعد مدینے میں پیمبر اور علیؑ کا گھر بند تھا لہٰذا اہلِ وطن کس کو جا کر پرسہ دیتے اس منظر کو ذکی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

شہر میں جب ہوا مشہور یہ پُر درد سخن　　لیتے تھے رو رو کے سب نام تشنہ دہن

جائیں پرسے کو کہاں سوچتے تھے اہلِ وطن　　نہ پیمبر ہیں نہ زہرہؑ نہ علیؑ ہیں نہ حسنؑ

جا کے دروازے پہ زہرہؑ کے یہ چلاتے تھے

روتے پھر روضۂ احمدؐ پہ چلے آتے تھے

جناب صغرا نے ایک قاصد مدینے سے کربلا بھیجا تھا اس قاصد کی کربلا سے مدینے کو جب واپسی ہوئی تو اس کا کیا حال تھا کس قدر غم زدہ تھا کیوں کہ وہ کربلا کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر واپس ہوا تھا ذکی بیان کرتے ہیں ؎

آیا تھا نامہ برِ فاطمہ صغرا جو وہاں　　مرقدِ احمدِ مختار پہ تھا گریہ کناں

سر پہ عمامہ نہ تھا خاک تھی منہ پر افشاں　　ماجرا دشتِ مصیبت کا یہ کرتا تھا بیاں

یا رسولِ عربی آپ کا پیارا شبیرؑ

ہو گیا ذبح وہ دلبند تمہارا شبیرؑ

گلِ گلزارِ امامت نے شہادت پائی　　سروِ بستانِ رسالت نے شہادت پائی

خلفِ شاہِ ولایت نے شہادت پائی　　جانِ خاتونِ قیامت نے شہادت پائی

کام اس شاہ نے ایسا دمِ شمشیر کیا

کر ادا سجدۂ خالق دمِ تکبیر کیا

لٹ گئے جنگلوں سے ہوئے یاور و انصارِ حسینؑ   نہ کوئی یار رہا اور نہ مددگارِ حسینؑ

تشنہ لب ذبح ہوئے مونس و غم خوارِ حسینؑ   ہیں گرفتارِ ستم عترتِ اطہارِ حسینؑ

کوئی وارث نہ رہا بیٹیوں کی غم خواری کو

بوجھ اٹھانا یہ پڑا عابدِؑ آزاری کو

آخرِ کار قاصد جناب صغرا کے دروازے پر پہنچا اس وقت جناب صغرا دروازے پر آئیں اور قاصد سے سوالات کیے۔

وہ اسی سوچ میں تھا آئی جو صغرا بیمار   پوچھنے یوں لگی قاصد سے بچشمِ خوں بار

اے مرے نامہ رساں تجھ پہ یہ بیمار نثار   کہہ کہ ہیں خیر سے بابا مرے شاہِ ابرار

پھر کے پردیس سے کس روز وطن آئیں گے

کبھی ہو گا کہ یہاں شاہِ زمن آئیں گے

اس کے بعد جناب صغرا نے اپنے چچا عباسؑ۔ بھائی علی اکبرؑ چھوٹے بھیا اصغرؑ چچا زاد بھائی قاسمؑ وغیرہ کو معلوم کیا یہ سوالات سننے کے بعد قاصدِ صغرا نے کیا جواب دیا اور اس کی کیا کیفیت ہوئی ذکی بیان کرتے ہیں کہ

یہ کہے فاطمہ صغرا نے جو قاصد سے کلام   رو دیا وہ نامہ اور پیٹ اٹھی خلق تمام

گر پڑا تربتِ احمدؐ پہ جگر ہاتھ سے تھام   کہا اے فاطمہ ہے شہ کا زبانی یہ پیام

پوتی زہراؑ کی ہو تم صبر ہے درکار تمہیں

صبر ہی چاہیے اے فاطمہ بیمار تمہیں

جب کہ لے بیکس و بیمار میں پہنچا تو وہاں   قتل سب ہو چکے تھے لاشیں تھیں خوں میں غلطاں

تنِ تنہا تھے گھرے بادشہِ کون و مکاں   چور سر تا بہ قدم زخموں سے تھا خون رواں

بے کسی یہ تھی کہ رقت ہی چلی آتی تھی
شکل اس شاہ کی پہچانی نہیں جاتی تھی

ہائے روتا ہوا اس شہ کے جو بیٹھا میں قریں | اور کیا مجرا ادا چوم کے دالیں نے زمیں
رو کے فرمانے لگے شاہ بہ آواز حزیں | کون ہے تو کہ مرا دوست یہاں کوئی نہیں
عرض کی میں نے کہ فدوی شہ ابرار کا ہوں
نامہ بر آپ کی میں دخترِ بیمار کا ہوں

اس کے بعد ذکی نے تمام وہ گفتگو مرثیے میں نظم کی ہے جو قاصد نے جناب صغرا سے کی یہ دردناک واقعات ذکی نے بڑے پرتاثیر انداز میں بیان کیے ہیں۔ اور اس طرح مقطع پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے ؎

آہ یہ حال کیا جس گھڑی قاصد نے بیاں | شور محشر ہوا پیدا یہ ہوئی آہ و فغاں
شدتِ ضعف سے غش آ گیا صغرا کو وہاں | بیبیاں گھر میں اٹھا لے گئیں اشک گریاں
بین صغرا کے مجھے لکھنے کی اب تاب نہیں
کون سا دل ہے جو اس غم سے ذکی آب نہیں

مندرجہ بالا مرثیہ جس میں منظر نگاری۔ مکالمہ نگاری۔ واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کی اچھی مثالیں موجود ہیں ظاہر ہے کہ ذکی نے جوانی میں کہا ہوگا کیوں کہ ذکی نے عمر ہی بہت کم پائی تھی کاش ان کی عمر وفا کرتی تو یقیناً وہ اور بھی مرثیے کہتے۔

ذکی کا ایک مرثیہ جس کا مطلع ہے

؎ چور زخموں سے جب امام ہوئے

راقم کو ساجد حسین دربار کلاں امروہہ سے حاصل ہوا ہے اس میں ۲۲ بند ہیں قدیم اور بوسیدہ ہونے کے سبب پڑھنے میں دشواری ہوتی۔ مقطع ہے ؎

آگے کس کو بیاں کی طاقت ہے

اے ذکی بس مقامِ رقت ہے

ذکی کا ایک سلام بھی راقم کو سید تصویر احمد (مرحوم) نے دیا ہے۔ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

مجرئی شبیرؑ کا لختِ جگر ملتا نہیں
ڈھونڈتے ہیں ہر طرف نورِ نظر ملتا نہیں

کہتی تھی صغراؑ کہ خط کیوں کر پدر تک جائے گا
نانی صاحب مجھ کو کوئی نامہ بر ملتا نہیں

رن میں اکبرؑ کو ندا دیتے تھے شاہِ کربلا
تیرا لاشہ مجھ کو اے نورِ نظر ملتا نہیں

شاہ فرماتے تھے کیوں دیتے ہو تم ایذا مجھے
کچھ ستانے سے مرے اے اہلِ شر ملتا نہیں

اے ذکی گریاں ہو غم میں حضرتِ شبیرؑ کے
بے غمِ سبطِ نبیؐ جنت میں گھر ملتا نہیں

سید علی تمکین تمکینؔ

سید علی تمکین تمکینؔ کا سلسلۂ نسب سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے۔ تمکینؔ کے والد سید نبی بخش فلسفیؔ بھی شاعر تھے جن کے بارے میں سید رحیم بخش راوی ہیں کہ "یہ بڑے صاحبِ کمال شاعر و عامل مشاہیر شہر تھے تخلص ان کا فلسفی تھا تاریخ گوئی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا عملیات میں بھی استعداد عمدہ تھی۔ قواعدِ علم و فارسی و عروض میں عمدہ درجہ کی آگہی رکھتے تھے ان کی تصنیفات تالیفات نظم و نثر کے چند رسالے یادگار ہیں۔ غرض کہ یہ صاحب کمال مشہور و معروف تھے"۔ (تواریخِ واسطیہ صفحہ ۱۷۴)

فلسفیؔ کی وفات ۱۸۹۴ء سے قبل ہوئی۔ فلسفیؔ کا مکتوبہ قلمی قرآنِ مجید پاکستان میں موجود ہے۔ صاحبِ تاریخِ اصغری نے ان کو شاعر اور کئی رسائل کا مولف لکھا ہے۔

فلسفیؔ کے ہی لائق فرزند اور جانشین سید علی تمکین تمکینؔ ہوتے تواریخِ واسطیہ میں ان کو بھی اچھا شاعر نیک طریقہ جوان صالح اور سرکاری ملازم لکھا ہے۔ تمکینؔ کے سلسلے میں ان کے پرپوتے سید علی ذہین کا کہنا ہے کہ ولادت ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء

(امروہہ) اور وفات ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں ہوئی ۶۵ سال کی عمر پائی (گلدستۂ تمکین صفحہ ۱۶)

تمکینؔ کے استاد ان کے والد فلسفیؔ اور اولاد حسن سلیمؔ تھے آپ بنارس میں امین تھے اور بسلسلۂ ملازمت کافی وقت امروہہ سے باہر گذارا لیکن ایام محرم اور اربعین وغیرہ میں اپنے گھر امروہہ ضرور آتے تھے اور اپنے محلے کے امامباڑہ (جھگہ) میں مجالس پڑھتے تھے۔ پروفیسر مختار حسین نقوی مرحوم کا بیان تھا کہ تمکینؔ اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر اور تحت اللفظ خواں تھے انہوں نے تمکینؔ کی کئی مجالس میں شرکت کی تھی۔ کلام میں دبیرؔ کے رنگ کی جھلک زیادہ تھی۔ اکثر فی البدیہہ کہہ دیا کرتے تھے ایک روز مولوی سید مجتبیٰ عرف مولوی چاند مرحوم اپنے مکان پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تمکینؔ بھی وہاں تشریف لے گئے اور اسی وقت مندرجہ ذیل شعر کہا

چاند پر آفتاب آیا ہے

ماہ رو پر شباب آیا ہے

تمکینؔ کے استاد تو فلسفیؔ اور سلیمؔ تھے لیکن مولوی سید اعجاز حسن جو اس دور کے ممتاز عالم تھے ان کی صحبت کا بھی تمکینؔ نے کافی اثر لیا اور ان اساتذہ کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ جس سے تمکینؔ کے کلام میں پختگی۔ روانی۔ برجستگی۔ الفاظ کی بندشیں۔ علمیت اور اعلےٰ زبان پائی جاتی ہے۔ تمکینؔ کے کلام میں مرثیہ۔ سلام قصیدہ، نعت۔ رباعی۔ قطعہ۔ مثنوی اور نظم کے اعلےٰ نمونے موجود ہیں۔ تاریخ گوئی میں تمکینؔ کو خاص ملکہ حاصل تھا انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔

امروہہ کے تمام مرثیہ نگار شعراء میں تمکینؔ کا مقام بہت اہم ہے کیوں کہ انہوں نے مرثیہ نگاری کو خاص طور سے اپنایا اور اس صنف میں پورے خلوص کے ساتھ پوری محنت کی اور اپنی شعری صلاحیتوں کو زیادہ تر مرثیے کے لیئے وقف رکھا۔ امروہہ کے

اساتذہ سے قربت ۔ بنارس میں ملازمت اور اکثر لکھنؤ جانے کے سبب وہ اپنے عصر کی مرثیہ نگاری سے پوری طرح واقف رہے اور اسے مدِّ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی طبع کے جوہر دکھائے اسی وجہ سے تمکین کے مراثی اردو مرثیہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہیں کاش کہ یہ مراثی صحیح وقت پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئے ہوتے تو آج تمکین اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہوتے ۔ ان کا سارا کلام غیر مطبوعہ ہے ۔

جب راقم نے سید علی یقین صاحب سے رابطہ قائم کیا جو تمکین کے پوتے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ تمکین کا کلام ان کے ایک فرزند اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے تھے جو وہاں سے واپس نہ آسکا صرف ایک بستہ ادھر رہ گیا تھا جس کا کچھ حصہ بوسیدہ اور منتشر ہوگیا لیکن پھر بھی تقریباً ۲۰ مراثی تمکین کے اس بستے میں موجود ہیں ۔ ان مراثی کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں ؎

اے طبعِ عجز حمد کا ہاں اعتراف کر　　کارِ بشر نہیں ہے بیاں صاف صاف کر
عاجز ہیں انبیاء و ملک بس معاف کر　　گوشے میں بیٹھ ذکر سرِ اعتکاف کر
بے مثل ہے عدیل ہے کل کا ملیک ہے
وردِ زباں رہے کہ خدا لاشریک ہے

آئینہ ایماں کی جلا روئے حسنؑ ہے　　محرابِ عبادت خمِ ابروئے حسنؑ ہے
والیل کا سورہ ہے کہ گیسوئے حسنؑ ہے　　خوش آتے پیمبر کو جو وہ روئے حسنؑ ہے
زہراؑ و علیؑ محو ہیں اس حسنِ حسنؑ پر
ہے بلبلِ سدرہ بھی فدا غنچہ دہن پر

غدیرِ خم کی جو منزل پہ آفتاب آیا　　قمر بھی خانۂ کعبہ سے ہم رکاب آیا
جلو میں عرش نشیں کے فلک جناب آیا　　جلوس دیکھنے خورشید بے نقاب آیا

عیاں تھی رحمتِ پروردگار کی ساعت
رکاب بوس تھی نصف النہار کی ساعت

باغِ مدحت کا گلِ تر ہے ریاضت میری　　سیرِ گلزارِ امامت کی ہے عادت میری
شمعِ ایوانِ بلاغت ہے فصاحت میری　　سب پہ روشن ہے کہ قرآں سے ہے ملت میری

کیوں فصاحت نہ بڑھے قاریِ قرآں ہوں میں
نطق گویا ہے کہ ناطق کا ثنا خواں ہوں میں

غزوۂ بدر جو مطلع ہے وہ کس ماہ کا ہے　　لا فتیٰ کہتے ہیں لقب کس شہِ ذیجاہ کا ہے
شورِ لا سیف یہ کس تیغِ ظفر خواہ کا ہے　　وصف حیدر کا وہ یہ سیف ید اللہ کا ہے

جز علیؑ کس کو جواں اہلِ جہاں کہتے ہیں
اسی تلوار کو تیغِ دو زباں کہتے ہیں

شمشادِ باغِ مرتضوی پہ ہے کیا بہار　　کرتی ہیں نذر ڈالیاں جھک جھک کے گل نثار
نورس ثمر بھی چومتے ہیں منہ کو بار بار　　کرتا ہے پیار خود چمن آرائے روزگار

جھولا فرشتگانِ مقرب جھلاتے ہیں
میوے انہیں بہشت کے جبریل لاتے ہیں

ستائش گلشنِ محمد عجب فضا خیز بوستاں ہے　　بہارِ باغِ سخن بھی گویا نمونۂ روضۂ جناں ہے
نبیؐ و حیدرؑ سے تا بہ مہدیؑ یہ خاندانِ عرش آستاں ہے　　فلک نشیں تو مسیح بھی ہیں مگر وہ چوتھا ہی آسماں ہے

خدا سے باتیں کلیم نے کیں کبھو نہ سمجھا کسی کا لہجہ
کھلی یہ معراج سے حقیقت کلامِ حق تھا علیؑ کا لہجہ

غازۂ عارضِ ایماں ہے ضیائے شبیرؑ　　آیۂ سورۂ قرآں ہے بقائے شبیرؑ
موجبِ بخششِ عصیاں ہے ولائے شبیرؑ　　عینِ خوشنودیٔ یزداں ہے ثنائے شبیرؑ

جلوہ آرائے جہاں نورِ امامت ان کا
زینتِ روضۂ رضواں قد و قامت ان کا

مرے دل کو جوشِ ولائے علیؑ ہے — نگاہوں کو شوقِ لقائے علی ہے
نفس میں سراسر ہوائے علیؑ ہے — نظر طالبِ خاکِ پائے علیؑ ہے
فلک سے ولایت مآب آرہے ہیں
زمیں شاد ہے بوترابؑ آرہے ہیں

کعبے کو شرف کس کی ولایت سے ملا ہے — مشہورِ جہاں کس کا لقب عقدہ کشا ہے
وہ کون ہے جو نائبِ شاہِ دوسرا ہے — بندہ ہے مگر نام خدا شیرِ خدا ہے
ابنِ عم و دامادِ رسولؐ عربی ہے
واللہ علیؑ ہے وہ علی ہے وہ علیؑ ہے

قمر سے مہر کو تازہ جو اتحاد ہوا — نثار لیلیٰ شبِ نور با مداد ہوا
فلک کو سورۂ والفجر خوب یاد ہوا — یہ لیل قدر ہے قدر کا اس صاد ہوا
گماں ہے دھوپ کا وہ چاندنی غضب کی ہے
فروغ یوں ہے کہ اب تیرہویں رجب کی ہے

گلزارِ مشیت کے گلِ تر ہیں محمدؐ — لولاک کے افلاک کے اختر ہیں محمدؐ
کرسی کی ضیا عرش کے جوہر ہیں محمدؐ — جس پر نظرِ حق ہے وہ منظر ہیں محمدؐ
مافوق اولی الامر ہے احمدؐ کی اطاعت
اللہ کی طاعت ہے محمدؐ کی اطاعت

ثمرِ خلد بریں میوۂ جنت ہے حسینؑ — نو شگفتہ گلِ گلزارِ امامت ہے حسینؑ
تازہ تر نکہتِ ریحانِ رسالت ہے حسینؑ — عطرِ پاکیزۂ مجموعۂ قدرت ہے حسینؑ
دو جہاں جس سے معطر ہیں یہ وہ نکہت ہے
رنگ و بو ان کی بہارِ چمنِ قدرت ہے

نورِ لیلائے سخن ہے یہ مرقّع میرا ‏ ابروئے حورِ فصاحت ہوا مصرعِ میرا
دُرِ مضموں سے ہے ہر شعر مرصّع میرا ‏ آفتابِ فلکِ نظم ہے مطلع میرا
برجِ میزان مری اس بحر کا پیمانہ ہے
روشن اس مہر سے ہر بیت کا کاشانہ ہے

گوہرِ قلزمِ تحقیق عطا کر یارب ‏ علمِ توحید کی توفیق عطا کر یارب
قلب کو طاقتِ تصدیق عطا کر یارب ‏ حمد و تقدیس کی توفیق عطا کر یارب
قیدِ ہستی سے چھٹیں غم سے رہا ہو جائیں
ہو بقا گر رہِ عرفاں میں فنا ہو جائیں

ع جزوِ نورِ شہِ لولاک ہے نورِ حیدرؑ

ع آمد ہے مہر و ماہ کی دشتِ غدیر میں

ع جو امام ابنِ امام ہے وہ اسیرِ فوجِ یزید ہے

ع منزل کو منزلت ہے یہ راہِ ثواب میں

تمکینؔ کے مندرجہ بالا مراثی میں کم از کم ۳۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ بند ہیں۔ جب ہم ان مراثی کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں حمد۔ نعت اور مدحِ ائمہ کے اعلےٰ نمونوں کے ساتھ ساتھ منظر نگاری۔ کردار نگاری۔ جذبات نگاری۔ سراپہ نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ کا بھی ایک بلند معیار ملتا ہے۔ اکثر مراثی میں کچھ ایسے مضامین بھی نظم کئے گئے ہیں جو یا تو بالکل اچھوتے ہیں یا جن پر بہت کم شعرا کی نظر گئی ہے پہلے مرثیے میں حمدِ خدا۔ ذکرِ روزِ نزولِ آیۂ بلغ۔ گرمی کی شدت کا بیان۔ ذکرِ میدانِ غدیر۔ رسولؐ کی تقریر۔ ولایتِ علیؑ کا اعلان۔ جبریل کا وحی لانا اور مدحِ علیؑ وغیرہ کا بیان ہے۔ دوسرے مرثیے میں مدحِ امامِ حسنؑ۔ ولادتِ امامؑ۔ نام رکھنے پر گفتگو۔ تجویزِ نام۔ آمدِ جبریل۔ امام کا سراپا۔ طبعِ رسا سے خطاب۔ خدا کی عظمت و بزرگی کا ذکر۔

سلطانِ روم کا دینی مسائل کے لیئے امامِ حسنؑ کو بلانا۔ علوم پر بحث۔ کتب سماوی کا تذکرہ زہر دینے کا واقعہ اور مصائب وغیرہ ہیں۔ اکثر مراثی میں قرآن اور احادیث کی جا بجا اشارے ہیں۔ ایک جگہ حمد ملاحظہ ہو

انبیا کتنے کئے خلق ہدایت کے لیئے
اوصیا بھیجے بہت دیں کی حمایت کیلیئے
بس ترا فضل ہے بندوں کی کفایت کیلیئے
کام جو تونے لیئے ہم سے عنایت کیلیئے
رہ نمائی کے لیئے خلق کی رہبر بھیجا
کی یہ رحمت کہ محمدؐ سا پیمبرؐ بھیجا

ایک موقع پر محاکات کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو

ظاہر ہے ان پہ پیار تھا نانا کا کس قدر
لکھا ہے ایک روز پیمبرؐ تھے اپنے گھر
ناگاہ واں حسینؑ حسیں کا ہوا گذر
آغوش میں اٹھا لیا حضرتؐ نے دوڑ کر
تسلیم کی حسین علیہ السّلام نے
بوسے لیئے دہن کے رسولِؐ انام نے

تمکین نے صبح۔ شام۔ رات اور دوپہر کی کئی جگہ منظر کشی کی ہے گرمی کی شدت کا منظر ایک مرثیے میں بہت تفصیل سے بڑے کامیاب انداز میں پیش کیا ہے

بے برگ و بار دھوپ میں جلتے ہیں سب شجر
مژگاں کی چھاؤں ڈھونڈتے ہیں طائرِ نظر
پھل سوختہ کرن نے کیئے ہیں سنانوں کے
جلتے ہیں آفتاب سے نیچے نشانوں کے
چشمہ اگر کہیں ہے تو گرم اسکا آب ہے
پانی میں منہ چھپائے ہوئے آفتاب ہے
چنگھاڑتے ہیں شیر عطش سے کچھار میں
تپ تپ کے سنگ پھٹنے لگے کوہسار میں

آتش برس رہی ہے کہ پھولا گیا ہے صور   ہوسا یوں کو پیش ہے ہنگامۂ نشور
برقِ تپش کی تاب سے سرمہ ہے کوہِ طور   گرمی ہے یا قیامتِ کبریٰ کا ہے ظہور
اونچی نہیں زمیں بھی یہ امرِ غریب ہے
پھر کیوں یہ آفتاب کی منزل قریب ہے

امام حسینؑ کے میدانِ کارزار میں تلوار میان سے نکالنے کے وقت فوجِ یزید کی کیا کیفیت ہوئی وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

چلّایا غیظ سے عمرِ سعدِ نابکار   کیوں بدحواس فوج ہے کیا ہے انتشار
نامی دلاورانِ نمک خوار کیا ہوئے   لشکر کو روکتے نہیں سردار کیا ہوئے

فوجِ یزید کا ایک اور منظر بھی دیکھئے اور رعایتِ لفظی ملاحظہ ہو ؎

جس جس نے منہ کی جنگ میں خندق کی کھائی تھی
بہرِ نمود سب سے الگ صف جمائی تھی

مرثیہ اردو شاعری میں رزمیہ کی بھی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کچھ شعرا کے ہاں بہت نمایاں ہے اور انہوں نے بڑے مخصوص انداز میں مرثیے کے اس حصے پر خاص زور اور توجہ دی ہے۔ تمکین کے ہاں بھی بڑی متاثر کن جنگ کا بیان ہے ؎

بھولے عدو سپاہ گری کے تھے جو ہنر   بے سر ہوا ذرا جو اٹھایا کسی نے سر
فی الفور تیغ نے کیا فی النار والسقر   چلائی موت۔ ہیں۔ مجھے مطلق نہ تھی خبر
لو اب کھلا کہ یاد تجھے یہ ہنر بھی ہے
قبضے میں ذوالفقار قضا و قدر بھی ہے

مصروفِ جنگ تھے خلفِ شیرِ ذوالجلال   اعدائے دیں پہ تنگ ہوا عرصۂ قتال
درپے قصاص کے تھے جو خیبر کے بدمآل   ماضی سے بھی خراب تھا ان کے لئے یہ حال
گرداں وہی تھی حاملِ فعلِ فرار تھے
اقرار تھا قرار کا پر بے قرار تھے

مرثیہ میں کردار نگاری بڑا نازک مرحلہ ہے تمکینؔ کی کردار نگاری بھی ملاحظہ ہو۔ جناب زینبؑ فرماتی ہیں کہ ؂

ذریتِ نبیؐ سے یہ بدعت بوالجہال	بازو پہ میرے ہاتھ رکھے کیا تری مجال
دکھلاتی اے لعیں تجھے میں تری جلال	پر کہہ گئے ہیں صبر کو شبیرؑ خستہ حال
اماں کا صبر بھی ہے فلک کی ستاتی ہیں
رسّی مجھے دے باندھوں گی میں خود دکھلاتی ہیں

سراپا نگاری کے سلسلے میں سینے کے بارے میں صرف ایک بند ملاحظہ ہو ؂

اس سینے میں ہے علم نبیؐ نورِ امامت	تسلیم و رضا، عدل و کرم، صبر و قناعت
الطاف و عطا، جود و سخا، بذل و کرامت	اخلاق و وفا، حلم و حیا، زہد و عبادت
ارکانِ ہدایات کا معدن ہے یہ سینہ
اسرار کا اللہ کے مخزن ہے یہ سینہ

سلطانِ روم کے دربار کا امام حسنؑ کا واقعہ بھی تمکینؔ نے نظم کیا ہے اُس موقع پر سلطانِ روم کے دربار میں امامِ حسنؑ سے جب کچھ سوالات کیئے گئے وہ مکالمہ نگاری بھی قابلِ داد ہے۔

چیزیں ہیں وہ کیا سات یہ فرمایئے ہم سے	خلقت نہیں جن چیزوں کی مادر کے شکم سے
گویا ہوا زہراؑ کا پسر حق کے کرم سے	پہلے ہیں وہ آدمؑ جو یہاں آئے عدم سے
قادر کے کرم سے جو مقدر ہوئیں حوّا
بے ماں کے سب انسانوں کی ماں ہوئیں حوّا

مرثیے کی روح رثائیت ہے۔ شاعر کا اس جز میں کامیاب ہونا بہت ضروری ہے۔ تمکینؔ کے ہاں نہ صرف مصائب کی بلکہ پُرتاثیر مصائب کی بھی کمی نہیں ہے۔

آخر ہوا یہ ضعف کہ گھوڑے پہ ڈگمگائے   تیورا کے عرشِ زین سے جلتی زمیں پہ آئے
وہ ریگ گرم وہ تنِ مجروح ہائے ہائے   زہراؑ کہاں ہے چادرِ تطہیر جو بچھائے
غش آگیا ہے فاطمہؑ کے نورِ عین کو
مسند بچھا کے کون لٹائے حسینؑ کو

کیا دورِ نیرِ فلکِ بدخصال ہے
زہراؑ کا پھول پیاس سے کیسے نڈھال ہے
اسپِ حسینؑ کی جو حرم نے سنی صدا   حسرت سرا کی ڈیوڑھی پہ آئی بصد بکا
دیکھا کہ بے سوار ہے رہوارِ باوفا   زخمِ سنان و تیر بدن پر ہیں جا بجا
کھینچی اک آہِ سرد یتیمِ حسینؑ نے
ارض و سما ہلا دیئے زینبؑ کے بین نے

غرض کہ تمکینؔ نے مرثیے کے جن اجزا کو اپنایا ہے ان میں وہ ہر طرح کامیاب نظر آتے ہیں ان کے ہاں تلوار اور گھوڑے کی بھی تعریف ہے لیکن زیادہ نہیں۔ رجز اور ساقی نامہ بھی ہے لیکن کم ہے۔ مدح اور واقعات نگاری پر انہوں نے زیادہ توجہ دی ہے اور یہ ان کے ہاں پورے کمال پر ہے۔

تمکینؔ نے نعت و قصائد میں بھی اپنی طبع کے جوہر دکھاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل نعتیں اور قصائد تمکینؔ کے شاہکار ہیں۔

ع مرے محبوب کا محبوب خلاقِ دو عالم ہے
ع کوثر و سلسبیل سے اب جو عطا ہوں جام دو
ع مبدأ نورِ رسالت مطلعِ حسنِ جبیں
ع شبیرؑ کا سوگوار ہوں میں
ع کوئی نہ اور تمنا دلِ حزیں میں رہی

تمکینؔ نے سلام بھی کافی کہے ہیں۔ ان سلاموں میں بھی بڑی روانی۔ تنوع۔ نئی زمینوں کی تلاش اور ایجاد کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ثنا ہو یا بکا گویا دہن یوں بھی ہے اور یوں بھی
زباں پر اپنی ذکرِ پنجتن یوں بھی ہے اور یوں بھی

زمانے سے ہے روشن نورِ سلطانِ حسن پہلے
بنائے شش جہت سے تھی ضیائے پنجتن پہلے!

نہ کوئی قدرداں تمکینؔ نہ قابل قدر کے تم ہوا!
مزادادِ سخن کا لے گئے اہلِ سخن پہلے!

ہوا نازل خدا کے گھر سے بیت اللہ میں قرآں
کہ جس کے نطق کی اب ہر میں گھر گھر تلاوت ہے

تمکینؔ کے تقریباً ۲۰-۲۵ سلام راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ چند رباعیاں بھی ملاحظہ ہوں ؎

احمدؐ کو سرِ عرش جو معراج ہوئی
تقریب حجابِ قدس سرتاج ہوئی
کل دوشِ نبیؐ پہ تھی علیؑ کی منزل
دو ہاتھ غدیر میں بلند آج ہوئی

شب کٹ گئی آہ صبح ہونے آئی
شبنم پھولوں میں دُر پرونے آئی
چبھتا رہا خارِ ہجرِ احباب افسوس
فرقت مری بے کسی پہ رونے آئی

قرآنِ ناطق جو کعبے سے پایا ہے
اللہ کے گھر کا ہاں وہ سرمایہ ہے
ہاتھوں پہ نبیؐ کے ہیں علیؑ یومِ غدیر
یا منزلِ شمس میں قمر آیا ہے

قطعاتِ تاریخ کہنے میں تمکینؔ کو بڑا ملکہ تھا ان کی کہی ہوئی مندرجہ ذیل کئی تاریخیں بہت اہم ہیں۔ انھوں نے اپنے محلہ (بنگلہ) کے عزاخانے کی مندرجہ ذیل تاریخ فارسی میں کہی جو آج بھی عزاخانہ پر کندہ ہے اس وقت تمکینؔ کی عمر تقریباً ۷ اسال تھی۔

تعمیر گشتِ روضۂ شاہِ فلک جناب | شیعوں پہ مقتضائے ولائے حسینؑ ہے
تمکینؔ نے گفت سالِ پیدائش بطرزِ نو | کیا بیت حق میں بیتِ عزائے حسینؑ ہے

۱۲۹۴ھ

امروہہ کی ایک معزز شخصیت سید نصیر حسن نصیرؔ کے انتقال پر تمکینؔ نے مندرجہ ذیل تاریخِ وفات کہی

برائے سال یہ ہاتف نے دی ندا تمکینؔ
بنا نصیر حسن کو جناں میں قصرِ نفیس

۱۳۴۱ھ

امام عصرؑ کی بھی تاریخ ولادت کہی ہے جو مندرجہ ذیل ہے

مولودِ مقتدیٰ بس محمدؐ ہے نام | لو بیّنہ و زبر اس کے تمام ؎
گن کر ابجد سے آل کے جملِ جمل | نامی عددوں؟ کیجئے بس ادغام
تمکینؔ بس ولادتِ ہادیِ دین | القا کہئے اسے نہیں گر الہام

اے صلِّ علیٰ محمدؐ صاحبِ امر
بر آلِ محمدؐ درود اور سلام

۲۵۵ھ ۸۶۹ء

تمکینؔ کے ذہن کی ایک اور جدت یہ ہے کہ انہوں نے تلقین کو بھی نظم کیا ہے جس میں ۱۲۰ اشعار ہیں۔ مطلع ؎

مسافر عدم کے جو آتے ہوئے ہیں
سرِ خاک بستر بچھائے ہوئے ہیں

تمکینؔ جس زمانے میں بنارس میں سرکاری ملازم تھے وہاں ان کا واسطہ ایک بہت سخت مزاج افسر سے پڑا تھا انہوں نے وہاں سے حاجی سید مقبول احمد مرحوم کے نام ایک منظوم خط، مثنوی کی ہیئت میں لکھا جس میں ان حالات کا ذکر ہے چند

اشعار اس طرح ہیں ؎

نہ آتا اگر آب و دانہ نہ ہوتا | یہاں تیرِ غم کا نشانہ نہ ہوتا
خدا ہی اگر ناخدائی کرے گا | تو بحرِ الم سے رہائی کرے گا
اٹھائی امانت میں جو جاں فشانی | وہ سب عرض کردونگا اگر زبانی
نہیں لغو اس میں یہ سب تسمیہ ہے | مرا حال لاریب اِک مرثیہ ہے

تمکین کے اخلاف میں دو فرزند سید علی حسین اور سید آلِ یٰسین ہوئے سید آلِ یٰسین نے اپنے علم و فضل کے باعث اجازہ امامت حاصل کیا لیکن امروہہ آنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ تمکین کے بعد ان کی اولاد میں شاعری باقی نہ رہ سکی البتہ اس وقت ان کے ایک پرپوتے سید علی ذہین کو علم و ادب کا ذوق ہے اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ یونیورسٹی دہلی سے مرثیے کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

سیّد ابن الحسین کلیمؔ

سید ابن الحسین کلیمؔ اولادِ شاہ شرف الدینؒ سے تعلق رکھتے تھے ان کے مورثِ اعلیٰ سید میر محمد عدل تھے لیکن دربارِ کلاں کے بجائے انھوں نے اپنے نانا سید تصدق حسین کے ہاں محلہ مجاپوتہ میں سکونت اختیار کی۔ کلیمؔ کے والد کا نام سید حسین تھا۔

کلیمؔ کی ولادت تقریباً ۱۸۶۰ء میں امروہہ میں ہوئی۔ شاعری میں فرزدقِ ہند حضرت شمیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں حیدرآباد دکن چلے گئے وہاں ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ کلیمؔ کا ادبی سرمایہ بھی ان کے ساتھ حیدرآباد چلا گیا۔ امروہہ میں ان کے مراثی سید شفیق حسن مرحوم مرثیہ خواں کے پاس تھے جو تلف ہو گئے۔ واصف امروہوی نے کلیمؔ کی غزل کا ایک شعر سنایا تھا۔

حال کیا میرا کوئی اس کو بتاتا ہوگا
جا کے اس بزم میں اپنی ہی جتاتا ہوگا

کلیمؔ کے فرزند محقق حسین اور مشفق حسین بھی حیدرآباد ہجرت کر گئے تھے۔

سیّد آلِ احمد نعیمؔ

سیدآلِ احمد نعیم کا سلسلۂ نسب اولادِ شاہ ولایت میں سید محمد شفاعت کے ذریعے سید عبدالوالی خاں سے ملتا ہے جو عہدِ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ میں چہار صدی ذات جاگیر یک صد سوار کے منصب پر فائز تھے۔ ان کی اولاد میں چند نسل بعد سید ہزبر علی ولد سید ببر علی ہوئے جو منصفی سہسوان میں طویل مدت تک وکالت کرتے رہے۔ سید ہزبر علی کے ہی لائق فرزند سید آلِ احمد نعیم ہوئے۔ جو اپنے وقت کے نہ صرف کامیاب وکیل تھے بلکہ ایک اچھے شاعر و ادیب بھی تھے۔

سید آلِ احمد نعیم کا تاریخی نام محمد ظریف تھا۔ اس طرح ان کی سنِ پیدائش ۱۲۸۲ھ ہے۔ آپ کے حالاتِ زندگی انجمن وظیفۂ ساداتؔ مومنین کے سلور جبلی نمبر (مرتبہ سید اعجاز حسین جارچوی) میں اس طرح دیتے ہیں:

"آپ قصبہ سہسوان ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی اسمِ گرامی محمد ظریف ہے۔ آپ کے والد ماجد سہسوان میں بڑے نام ور وکیل تھے۔ قریب ۴۲ سال وکالت کی اور بڑا نام اور شہرت حاصل کی۔ مکان پر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور



سید آل احمد نعیم (مرحوم)

موقع پر کہا ہے کہ ؎

اپنا امروہہ زمانے میں چمن مشہور ہے | پر یہاں نا قدریوں سے اس کی خوشبو دور ہے
سر چڑھایا ہے سوا داؤں نے تم کو اے نعیم | قدرِ گل گلزار میں ہوتی نہیں دستور ہے

سید رحیم بخش نے بھی نعیم کے بارے میں ذی علم، وضعدار، مخیر، با مروت، خردمند اور ہوشیار کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ہر طرح توصیف کے لائق ہیں۔ شعر بھی عمدہ کہتے ہیں۔ نعیم کے استاد مولوی سید اولاد حسن سلیم تھے۔

نعیم کے فرزند سید عطا حسین کی ڈائری کے مطابق (جوان کی اہلیہ نے راقم کو دکھائی) نعیم کی وفات ۷ ار شوال ۱۳۶۰ھ بروز شنبہ مطابق ۸ ر نومبر ۱۹۴۱ء کو ہوئی اور امروہہ میں ہی عزا خانہ مسماۃ میمونہ خاتون (محلہ پوتا) میں دفن ہوئے۔ در اصل یہ عزا خانہ نعیم کے عزیز اور مخصوص دوست حاجی سید مجو حسین (راقم کے دادا) نے اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔ حاجی صاحب سے نعیم کے قریبی مراسم کے تحت نعیم کی خود ہی یہ خواہش تھی۔ نعیم کے انتقال پر بہت سے شعرا نے تاریخِ وفات کہیں جو اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ حاجی سید اصطفے احسن (محلہ بگلہ) نے مندرجہ ذیل تاریخ کہی ؎

آلِ احمد گئے جو دنیا سے | خلق کو صدمۂ عظیم ہے یہ
فکرِ تاریخ کی تو آئی ندا! | وارثِ جنتِ نعیم ہے یہ

یہاں نعیم کی ایک تصنیف "جنت النعیم" کی جانب بھی اشارہ ہے۔

نعیم کے پسر سید عطا حسین مرحوم کی اولاد میں سید لقا حسین۔ سید نعیم حیدر۔ سید کلیم حیدر ہیں جو سب زیورِ تعلیم سے آراستہ ہیں لیکن کوئی شاعر نہیں ہے۔

چوں کہ نعیم کے فرزند سید عطا حسین کا بھی کافی عرصے قبل انتقال ہو گیا اس لئے نعیم کے مراثی بھی ضائع ہو گئے۔ پھر بھی مندرجہ ذیل اردو مراثی نعیم کے گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا ؎

ع آگیا ماہِ عزا تے بادشاہِ مشرقین

ع شبیرؑ کا لال عازم دشتِ قتال ہے

ع دیکھا جب ہند نے سجادؑ کو زنداں میں اسیر

نعیم نے دراصل مراثی تو اور بھی کہے لیکن ان کی زندگی کا زیادہ تر وقت سہسوان ضلع بدایوں میں گزرا اس لیے ان کے کچھ مراثی محفوظ نہ رہ سکے۔ صرف وہ دیگر کلام جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوگیا موجود ہے۔ بہر حال مندرجہ بالا مراثی غیر مطبوعہ ہیں دوسرا مرثیہ بقلم نعیم ان کے ہاں موجود ہے اور ۱۲ر فروری ۱۹۳۹ء کی تحریر ہے جس کے بعد نعیم تقریباً ۱۴ سال زندہ رہے جس مدت میں کافی مراثی کہنے کے امکانات ہیں۔

جناب قاسمؑ جب میدانِ جنگ کا قصد کرتے ہیں۔ ماں تیار کرتی ہیں خیمے میں دوسرے لوگ بھی موجود ہیں ایک عجیب منظر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بیٹے کو ماں لگاتی ہے سینے سے بار بار
گھوڑے کی لے رہی ہے بلائیں کمالِ زار
خلعت پنہا رہے ہیں امامِ فلک وقار
خیمے میں اک قیامت کبریٰ ہے آشکار
دولہا کا تختِ عقد کے دن فرشِ خاک ہے
تحت الحنک بندھی ہے گریباں چاک ہے

رو رو کے ماں یہ کہتی ہے اے میرے نونہال
کرتے ہو تم چمن مرا جنگل میں پائمال
کیوں کر جئے یہ دکھ جلی ماں شکستہ حال
ناشاد و نامراد چھٹے جب کہ تجھ سا لال
دولہا بنے عروسِ اجل بیاہ لاؤ گے
مادر کو اپنا داغِ جدائی دکھاؤ گے

ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر اور گفتگو سننے کے بعد جناب قاسم کس طرح ان کو تسلی دیتے ہیں ؎

مادر کے بین سن کے یہ بولا وہ گل عذار
اماں نہ رو و اس طرح تم ہو کے بے قرار

رخصت کرو خوشی سے مجھے بہرِ کردگار شادی یہی ہے اپنے چچا جاں پہ ہوں نثار

اماں نہ اس طرح مری خاطر بکا کرو

جیتے رہیں چچا یہی ہر دم دعا کرو

پھر دست بستہ مادرِ دل خستہ سے کہا جاتا ہوں میں، تمہارا نگہبان ہے خدا

یہ کہہ کے اٹھا حضرتِ شبرؑ کا دلربا سیدانیوں میں رخصتِ قاسمؑ کا غل ہوا

راہِ خدائے پاک میں سر کو لیے ہوئے

خیمے سے نکلے تیغ [illegible] ہوئے

ماں سے اجازت لینے ا[illegible]ے بعد امامِ عالی مقام سے بھی اذنِ جنگ لینا تھا۔ اس لئے جنابِ قا[illegible] امامِ حسینؑ [illegible] قدم بوسی کی اور پھر کس طرح میدان کو روانہ ہوتے نعیم فرماتے ہیں کہ ؎

دیکھا کہ سامنے ہیں کھڑے شاہ نامدار قدموں پہ گر پڑا شہِ دیں کے وہ گلعذار

کی عرض خواستگار ہے رخصت کا جاں نثار روتے حضور، اذن دیا، خود کیا سوار

دولہا بنا ہوا سوئے افواجِ کیں چلا

حمو پہ صدقے ہونے کو وہ مہ جبیں چلا

نعیم کے مراثی میں مرثیے کے مختلف اجزاء ملتے ہیں جن میں رخصت۔ رجز۔ جنگ۔ شہادت۔ بین وغیرہ بھی ہیں۔ جناب قاسمؑ نے میدانِ جنگ میں جاکر جو رجز پڑھا وہ ملاحظہ ہو ؎

آیا جو رزم گاہ میں فرزندِ مجتبیٰؑ فرمایا شامیوں سے کہ اے قومِ بے حیا

آؤ مقابلے کو مرے دیکھتے ہو کیا چکھو ہماری تیغِ شرربار کا مزا

پیاسوں سے تین دن کئے رنج جدال ہے

اے بے حمیتوں تمہیں کچھ بھی خیال ہے

جناب قاسمؑ نے میدانِ جنگ میں شجاعت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ یزیدی فوج کے بڑے بڑے بہادروں کو ٹھکانے لگا دیا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فوج نے چاروں جانب سے گھیر لیا۔ نعیم فرماتے ہیں کہ ؎

یہ سن کے پھر تو ٹوٹ پڑے سارا لشکر — ابنِ حسنؑ پہ ہونے لگے ہر طرف سے وار

تا دیر واں لڑا کیا شبرؑ کا یادگار — آخر کو زخم کھا کے گرا رن میں ایک بار

آواز د[illegible] یہ سید عالی کو دور سے

ہے آخر[illegible] ہمارا حضورؑ سے

بھتیجے کی یہ آواز سننے کے بعد چچا [illegible] گزری اور بھتیجا بھی وہ جو بھائی کی نشانی ہے اور صرف دو روز کا دو[illegible]۔ امام خیمے سے روانہ ہوئے اور میدان میں پہنچے۔ وہاں کیا کیا دیکھا۔ اور وہ سب کچھ دیکھ کر دل پر کیا گزری اس موقع کی منظر کشی نعیم نے کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

سن کر صدا بھتیجے کی سلطان بحر و بر — چلائے آہ قاسمؑ نوشہ گئے کدھر

روتے ہوئے سوار ہوئے ذوالجناح پر — پہنچے جو قتل گاہ میں، کی ہر طرف نظر

دیکھا تڑپتے خاک پہ دولہا کی لاش کو

گھیرے ہوئے ہے فوج تن پاش پاش کو

اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری جانب خیمہ عترت اطہار میں جناب قاسمؑ کی شہادت کی خبر پہنچ گئی ؎

آئے قریب خیمہ جو مظلوم کربلا — پہنچی فغان و نالہ حضرتؑ کی واں صدا

زینبؑ پکاریں بیبیو! یہ ہے غضب ہوا — رن میں چراغ بھائی حسنؑ کا بھی گل ہوا

بھیا ادھر کو روتے ہوئے رن سے آتے ہیں

ہے ہے وہ لاش قاسمؑ نوشہ کی لاتے ہیں

خیمے میں لاش کا آنا تھا کہ ایک کہرام بپا ہوگیا اور ماں نے تڑپ تڑپ کر بین شروع کر دیئے ؎

کہتی تھی رو کے مادرِ قاسمؑ بہ حالِ زار ۔۔۔ اے فدیۂ حسینؑ یہ ماں تجھ پہ ہو نثار
برلایا آرزوئے دلی آج کردگار ۔۔۔ شبیرؑ پر نثار ہوا میرا گلِ عذار
تم فدیۂ حسینؑ ہوئے آبرو ہوئی
شکرِ خدا بتولؑ سے میں سرخرو ہوئی

یہاں دوسرے مصرعے میں فدیۂ حسینؑ کہہ کر ماں کا بیٹے پر نثار ہونا قابلِ داد ہے۔ اور بیت میں خاندانِ رسالت کی مخصوص تہذیب کے تحت بہو کا ساس سے سرخرو ہونا کردار نگاری اور نفسیات نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔

اے میرے لال خوں بھری صورت پہ میں نثار ۔۔۔ اے میرے چاند اس تری غربت پہ میں نثار
اے میرے نوجواں تری ہمت پہ میں نثار ۔۔۔ اے میرے شیر تیری شجاعت پہ میں نثار
پھولے پھلے نہ، باغِ جہاں سے گزر گئے
تیرہ برس بھی ہونے نہ پائے کہ مر گئے

یہاں شروع کے چار مصرعوں میں ماں نے بیٹے کی جن جن صفات پر نثار ہونے کو کہا ہے ان کی مناسبت سے بیٹے کو مخاطب بھی کیا ہے۔ لال کے ساتھ خون بھری صورت، چاند کے ساتھ غربت، نوجواں کے ساتھ ہمت اور شیر کے ساتھ شجاعت کا استعمال قابلِ تعریف ہے۔

نعیم کے نہ صرف مراثی بلکہ قصائد، سلام اور دیگر اصناف میں بھی جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے ان کا جذبۂ زیارات۔ وہ اپنی زندگی میں دو مرتبہ زیارات سے شرف یاب ہو چکے تھے۔ پہلی مرتبہ زیارات سے واپسی پر جو انہوں نے مرثیہ کہا اس میں زیارات کی دوبارہ خواہش کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

مولا ذرا غلام کی حالت تو دیکھئے　　صدمے نہ کیا اٹھائے ہیں ہمت تو دیکھئے
روضے سے دور ہوں مری قسمت تو دیکھئے　　مجھ کو بھلا دیا، یہ شکایت تو دیکھئے

زائر ہوں آپ کا مرے مولا مدد کریں
منڈلا رہی ہیں سر پہ بلائیں جو دور کریں

ارمان ہے کہ پھر اسی روضے پہ جاتی ہیں　　اس نقرئی ضریح کا پایہ ہلاؤں میں
تفصیل وار پوری کہانی سناؤں میں　　ایک ایک داغ سینے کا اپنے دکھاؤں میں

نالے کروں حضور میں، فریاد و آہ ہو
روضے کا صحن پاک مری خیمہ گاہ ہو

چوں کہ نعیم خود کربلائے معلٰے کی زیارت کر چکے تھے اس لیے ایک جگہ مقطع میں سامعین کو بھی اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ ؎

تھا خیمۂ حسینؑ میں اک حشر آشکار　　روتے تھے اہل بیتؑ رسولؐ فلک وقار
اے نعیم دل کو نہیں ہے مرے قرار　　قاسمؑ کے بعد چھٹتے ہیں عباسؑ نامدار

کیا کیا الم تھے بادشہ مشرقین کو
اب کربلا میں جا کے دو پرسہ حسینؑ کو

دراصل نعیم کی طبع کے پورے جوہر تو قصیدے میں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن مرثیے میں بھی انھوں نے کافی دلچسپی لی ہے۔ ان کے مراثی میں سلاست بھی ہے روانی بھی۔ درد بھی ہے کرب بھی۔ جوش بھی ہے تڑپ بھی۔ اور لطف زبان بھی ہے زورِ بیان بھی۔

نعیم نے صرف اردو میں ہی مرثیے نہیں لکھے بلکہ وہ امروہہ کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہندی میں حسینی گیت بھی لکھے ہیں جن میں مدح بھی ہے اور رثائیت بھی۔ حالانکہ ایسے گیت مختصر مختصر ہیں لیکن ہم ان کو ہندی مرثیے سے ہی تعبیر کریں گے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ ؎

اے میرے کربل کے بسیّا
اب تو نگریا اپنی دکھا دے
لاج کا میری تو ہے رکھیّا
اب تو نگریا اپنی دکھا دے
زہرا جی جب حشر میں آ دیں
عرش کے نیچے بیت سنا دیں
تیرے ہی نام کی باجے بدھیّا
اب تو نگریا اپنی دکھا دے

نعیم کی طبیعت کو قصیدے سے خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے کافی وقت سہسوان میں گذارا لیکن امروہہ میں محافل کے موقع پر اکثر تشریف لے آتے تھے۔"حسین ڈے" امروہہ (۳ شعبان المعظم) کی محفل میں خاص طور سے شرکت کرتے تھے کیوں کہ اس محفلِ میلاد کے بانی نعیم کے عزیز دوست جو سید مجتبےٰ حسن تھے۔ ایک سال نعیم نے "حسین ڈے" محلہ مجا پوتہ میں مندرجہ ذیل قطعہ پڑھا ؎

عالمِ ہستی پہ ہیں کیا کیا نہ احسانِ حسینؑ — جا نہیں سکتا کبھی محروم مہمانِ حسینؑ
دیں مبارکباد ہم تم سب رسول اللہؐ کو — ہاں سجایا ہے مجاپوتہ میں ایوانِ حسینؑ

نعیم نے کافی تعداد میں نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی قصائد کہے ہیں۔ جن میں سے کچھ قصائد ان کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔ مندرجہ ذیل قصائد ان کے شاہکار ہیں۔

ع۔ کلمہ پڑھتا ہے ہر اک گبر و مسلماں تیرا
ع۔ محفل میں ہم بھی آج ذرا ہاؤ ہو کریں
ع۔ کبھی دعوے ہمارے تھے کہ ہیں کون و مکاں اپنے
ع۔ اوجِ منبر کو ملا تختِ سلیمانی کا

ع کنارے آ لگی اب کشتیِ عمرِ رواں میری

ع آثار جوشِ قلب کے اب پائے جاتے ہیں

ع ہم اپنی طبعِ موزوں کا عجب رکھتے ہیں پیمانہ

ع آقا ترے دربار گہر بار کے صدقے

ع السّلام اے شافعِ ہنگامِ محشر السّلام

ع سب سے پہلے آلِ احمد شکر کر اللہ کا

ع اوج پر کوکبِ بختِ رسا ہو جائے گا

ع ادب انگشت برلب ہے، ہو عرضِ مدّعا کیسے

نعیم کے مندرجہ ذیل فارسی قصائد بھی راقم کی نظر سے گزرے ہیں ؎

ع از ادب پیشِ بزرگاں لب کشودن مشکلست

ع بدل حُبِّ علیؑ و برزباں ذکرِ خدا دارم

ع ایں سرورِ بے حساب و بے شمار اے دل چراست

ع ز شادی طائرِ فکرم بدر حوصلہ دارد

ع اے کہ بابِ شہرِ علم حضرتِ حق شانِ تو

ع اے کہ نامِ پاکِ تو بسم اللہ ام الکتاب

نعیم کے اردو قصائد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں فنِ شعر میں نا آشنائے محض ہوں لیکن
سُنے ہیں اس چمن کے نغمہائے عندلیبانہ
وہ حیدرؑ جس کا گہوارہ بنا آغوشِ پیغمبرؐ
وہ حیدرؑ جس کی مادر کا ہے بیت اللہ زچہ خانہ

وہ حیدر جس کی خاکِ پا رہی سرمہ ملائک کا
ثبوتِ منزلت ٹھہرا رسولؐ اللہ کا شانہ
چہکتا ہوں کبھی گلشن میں گہہ صحرا نوردی ہے
نوائے عندلیبانہ کبھی نالے ہیں مستانہ
ولائے آلِ احمد کی شرابِ پاک پیتا ہوں
مرے ساقی کا حیدرؑ نام ہے کوثر ہے میخانہ

آقا ترے دربار گھر بار کے صدقے
دربار کے صدقے تری سرکار کے صدقے
نانا نے تجھے ناز سے کاندھے پہ چڑھایا
راکب کے میں قرباں ہوں رہوار کے صدقے
جبریل امیں لائے تمہیں عید کا جامہ
اس جامہ و عمامہ و دستار کے صدقے
عباسؑ علم کھولے ہوئے ساتھ گئے تھے
سردار کے قربان، علمدار کے صدقے
سر دے دیا سب گھر کو رہِ حق میں لٹایا
اُس ہمت و پابندیِ اقرار کے صدقے
عابد کو ترے ظالموں نے طوق پہنایا
اُس گردنِ مجروح کے بیمار کے صدقے

نعیم نے مذہبی قصائد کے علاوہ دیگر اہم شخصیتوں کی مدح میں بھی قصائد لکھے ہیں مثلاً قصیدہ تہنیتِ تاج پوشی حضور ملک معظم قیصرِ ہند شاہنشاہِ مملکتِ برطانیہ۔

جس کا مطلع ہے ؎

یہ کس کی آمد آمد ہے یہ کیوں جوشِ مسرت ہے
حب
یہ کیسی دھوم ہے ہر سمت کیوں سامانِ فرح ہے

نعیمؔ نے فارسی شعرا کے قصائد پر تضمینیں بھی کہی ہیں۔ مندرجہ ذیل تضمین بہت مقبول ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

بلبلِ سدرہ بسدرہ مست از بوئے علیؑ　　خازنِ جنت بہ جنت والہ کوئے علیؑ
ہر مقرب مبتلائے عشقِ گیسوئے علیؑ　　باسر ایمانِ مسلماں مصحفِ روئے علیؑ
سجدہ گاہِ ماست محرابِ دو ابروئے علیؑ

اسلامی شاعری کرنے والے شعراء میں جن لوگوں نے قصائد و مراثی لکھے ہیں انہوں نے سلام بھی کافی کہے ہیں۔ لیکن نعیمؔ کے ہاں قصائد کی تعداد زیادہ ہے سلام کم ہیں یا ممکن ہے کہ نعیمؔ کے سلام محفوظ نہ رہ سکے ہوں۔ بہرحال چند سلام راقم کی نظر سے گزرے ہیں جن کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مئے حُبِّ حسینی پی کے ہم سرشار بیٹھے ہیں
بظاہر بے خودی عارض ہے پر ہشیار بیٹھے ہیں

جیتے جی ہم سیر کرلیں گے ریاضِ خلد کی
کربلا ہوتے ہوئے اللہ کے گھر جائیں گے

بوترابی ہیں نہیں رکھتے ہیں ہم خوفِ صراط
نامِ حیدرؑ لے کے مثلِ بادِ صرصر جائیں گے

ماہِ عزا میں مجرئی افسانے اور ہیں
شمعوں کے سوز اور ہیں جلنے والے اور ہیں

مری آنکھوں میں ہر دم روضۂ شبیرؑ پھرتا ہے
وہ لقت میرے آگے صورتِ تصویر پھرتا ہے
نعیمِ خستہ کی کیا خاک عزت تھی نگاہوں میں
تصدق ہے شہِ دیں کا کہ با توقیر پھرتا ہے
مجرئی ہم کو نہ کچھ دینار و درہم چاہیے
دل کے بہلانے کو بس شبیرؑ کا غم چاہیے
عارضِ مومن کی زیبائش محرّم میں ہیں اشک
موسمِ گل میں کھلے پھولوں پہ شبنم چاہیے

نعیم کو تاریخ گوئی سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کی تاریخوں میں "عقیقِ جگری" مصنف ابوالحسن فرقتی اور "وسائلِ شریعہ" مصنف مولانا سید محمد صاحب قبلہ کی طباعت کی تاریخیں کافی مشہور رہیں۔

نعیم نے قومی نظمیں بھی کہی ہیں مثلاً مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے متعلق جب امروہہ میں جلسہ ہوا تو آپ نے ایک نظم ۱۲۵ اشعار پر مشتمل پڑھی جسے عوام نے بے حد پسند کیا۔ چند اشعار اس طرح ہیں ؎

ہمارے گھر خدا نے اب وہ تصویریں اتاری ہیں
انہیں دیکھا تو آیا یاد سورہ آلِ عمراں کا
بنایا درس گاہِ واعظانِ ملّتِ بیضا
نمونہ ہے یہ تبلیغ رسولِ جن و انساں کا
وہ نجمِ دینِ حق شمس الضحٰے کے ماہ الکتاب
رخِ انور ہمارے واسطے پارہ ہے قرآں کا

عجب مطلع لکھا تھا حضرتِ آتش نے یہ پہلے
حضورِ قلب ہے گویا تصور تھا انہیں یاں کا
خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو لیے سنبلستاں کا
عجب کیا جا ہے یہ دربارِ حکامِ شریعت ہے
سبق خواں فخر سے روح الامیں ہے اس دبستاں کا

نعیم کے دور میں امروہہ میں سادات کی ایک انجمن قومی مسائل کو سلجھانے اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے تشکیل دی گئی تھی جس کا نام تھا انجمن" سادات، امروہہ" اس انجمن کے بہت سے جلسوں میں نعیم نے قومی نظمیں پڑھی ہیں۔ ایک سال محلہ مجاپوتہ کے جلسے میں ایک ایسی ہی قومی نظم پڑھی جو بہت کامیاب ہوئی چند اشعار اس طرح ہیں ؎

ادب انگشت بر لب ہے ہو عرضِ مدعا کیسے
لرزتا ہے دلِ مضطر کروں اب التجا کیسے
مرض میں مبتلا ہو گر مسیحا ہو دوا کیسے
مرض تشخیص ہوتا ہی نہ ہو پھر ہو شفا کیسے
مرادِ دستِ طلب کیوں پھیلتا ہے قوم کے آگے
ہر اک در پر سناتا ہوں فقیرانہ صدا کیسے
الٰہی اب تو یہ مجموعہ سادات یکجا ہو
کھُلے عالم کہ امروہہ میں شیرازہ بندھا کیسے

شیعہ کالج لکھنؤ کے سلسلے میں بھی جب امروہہ میں اجلاس ہوا تو اس میں بھی آپ نے ایک نظم پڑھی اور جو طبع ہو کر تقسیم بھی ہوئی۔

نعیم کی کچھ رباعیات بھی ان کی باقیات میں ملتی ہیں اپنے فن سے متعلق ایک رباعی میں فرماتے ہیں کہ ؎

ہم کو نہ تو دعوائے سخن دانی ہے — اظہارِ تفاخر نہ رجز خوانی ہے
حسبِ معمول سب کی دیکھا دیکھی — گل زار رسالت میں گُل افشانی ہے

نعیم نے ائمہ ؑ کی شان میں قطعات بھی کافی کہے ہیں جن کو عموماً وہ محافل میں قصیدے سے قبل پڑھتے تھے۔ چند قطعات ملاحظہ ہوں ؎

کچھ عجب تفریح ہے واللہ میرے دل میں آج — پھول برساتے ہیں جبرائیل محفل میں آج
حضرتِ عیسیٰ فلک پر اور سرِ منبر نعیم — دے رہے ہیں تہنیت مل کر اسی منزل میں آج

دریا ہے جوش پر کرمِ کردگار کا — گل زار مرتضیٰ ؑ میں ہے موسم بہار کا
دو تہنیت حسین علیہ السلام کو — پیدا ہوا ہے شیر حسینی کچھار کا

نعرۂ تہنیت و نوحہ بسیار بھی ہے — دست بر سینہ بھی ہے زینتِ دربار بھی ہے
ہے مجاہوتہ میں انوارِ الٰہی کا نزول — جشنِ سرکار بھی ہے جشنِ علمدار بھی ہے

نہ واہ واہ نہ تحسینِ عام سے مطلب — نہ مجلسوں میں کسی اژدہام سے مطلب
نعیم لاتے ہیں گلدستۂ عقیدت ہم — ہمیں حسین علیہ السلام سے مطلب

نعیم کے ہاں مرثیہ۔ سلام۔ نوحہ۔ قصیدہ۔ نعت۔ نظم۔ قطعہ۔ اور رباعی وغیرہ تو ملتی ہیں لیکن غزل نہیں ملتی۔ ان سے لوگوں نے فرمائش کر کے غزل لکھوانی بھی چاہی تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ؎

مداحِ اہل بیت ہمیشہ سے ہیں نعیم
فرمائشوں سے آپ نہ تبدیل خو کریں

نعیم کے مراثی تو غیر مطبوعہ ہیں لیکن دیگر تصانیف کی تعداد کافی طویل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

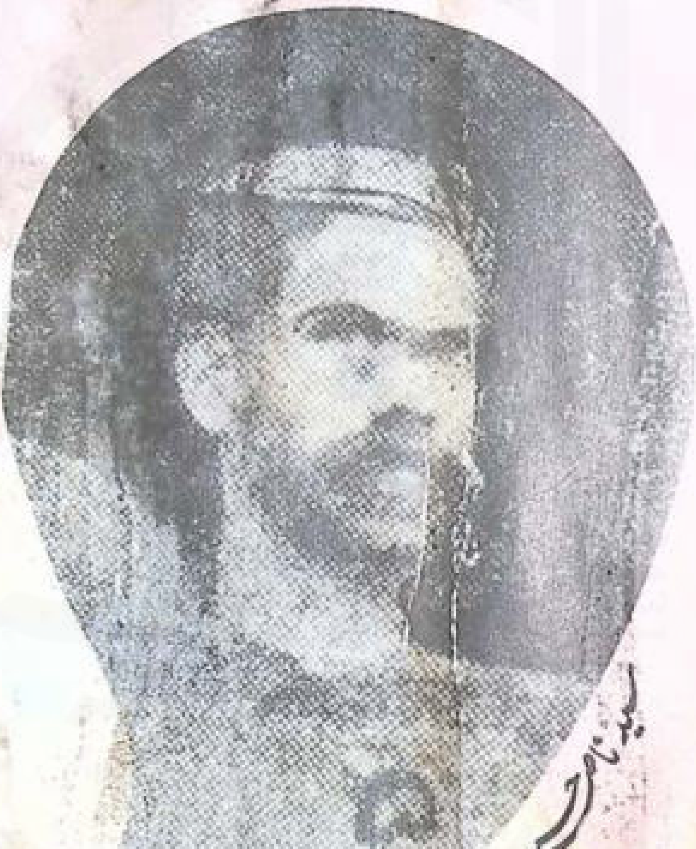
"استغاثہ" (اردو نظم محمدی پریس امروہہ) "تذکرۂ کامل" (اردو و فارسی نظم تیج پریس دہلی) "فسانۂ محشر" (اردو نظم جوہر پریس امروہہ) "فریادِ نعیم" (اردو فارسی نظم جوہر پریس مراد آباد) "لمعۃ النور" (اردو نظم اختر پریس امروہہ) "دربارِ اکبر" (اردو نظم افضل المطابع مراد آباد) "مہرِ امامت" (فارسی نظم مطبع ریاضی امروہہ) "قبالۂ جنت" (فارسی نظم مطبع ریاضی امروہہ) "آفتابِ ولایت" (فارسی نظم مطبع یوسفی دہلی) "فتح النعیم" (اردو حصہ اول و معہ ثانی (اردو نثر جوہر پریس امروہہ) "وسائل الشفاعۃ" (اردو و فارسی نظم مطبع ریاضی امروہہ) "ہدایت النواصب فی تحقیق المذاہب" (اردو نثر مطبع ریاضی امروہہ)

درحقیقت نعیم اپنے دور کے ممتاز شاعر و ادیب تھے اور انہوں نے پیشۂ وکالت کے علاوہ زیادہ تر وقت اسلامی شاعری کی خدمت میں گزارا۔ وہ امروہہ کی محافل کا وقار تھے۔ قومی جلسوں کی رونق تھے اور منبرِ رسولؐ کی زینت تھے۔

سید ناصر حسین یتیم

سید ناصر حسین یتیم کا سلسلہ نسب حضرت شاہ ولایت شرف الدین سے ملتا ہے۔ آپ کا تعلق سید عبدالمجید عرف مجاکی نسل سے ہے سید عبدالمجید کے بیٹے سید محمد صادق ہوئے اور سید محمد صادق کے پوتے سید محمد اسحاق ہوئے جو عہدِ روشن اختر محمد شاہ بادشاہ میں پانچ صدی ذات کے منصب پر ممتاز تھے۔ سید محمد اسحاق کے بیٹے سید محمد آیات ہوئے یہ یک صدو پنجاہی ذات کے منصب دار تھے۔ سید محمد آیات کے فرزند سید قمر الدین ہوئے جو عہدِ احمد شاہ بادشاہ میں یک صدی ذات کے منصب دار تھے سید قمر الدین کے پرپوتے سید باقر حسین ہوئے جو سید ناصر حسین یتیم کے والد تھے۔

سید ناصر حسین یتیم کی سنِ ولادت کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ سید لطف حسن خاں صاحب کے بیان کے مطابق یتیم کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہوئی اور انتقال تقریباً ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ اس طرح تقریباً ۱۸۶۶ء میں یتیم کی ولادت ہوئی۔ یتیم کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر نور المدارس



سید ناصر حسین یتیم (مرحوم)

میں ہے اور اس میں ۲۰۲ بند ہیں۔ مرثیہ کا مطلع ہے ؎

پھر آج خامۂ جادو رقم اٹھاتا ہوں　　جنودِ نظم کا موزوں علم اٹھاتا ہوں
نشانِ مدحتِ شاہِ امم اٹھاتا ہوں　　کہاں ہیں عرفی و جامی قلم اٹھاتا ہوں
کہو یہ نظم ثریا سے باج دے مجھ کو
دبیر چرخ کدھر ہے خراج دے مجھ کو

مرثیے کی ابتدا سے ہی یتیم کے تیوروں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ شاعر پختہ کار ہے اور اس فن میں مشاق ہے۔ چوتھا مصرع خاص طور سے داد طلب ہے۔ قلم اٹھانے کے بعد یتیم کا ارادہ کیا ہے اسے آگے چل کر اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بلند فکر ہوں اوجِ سخن دکھاتا ہوں　　کمالِ حسن سے طرزِ حسن دکھاتا ہوں
جمالِ شاہدِ گل پیرہن دکھاتا ہوں　　نجومِ چرخ کی میں انجمن دکھاتا ہوں
ملا عروج، نظر مہرِ بوتراب پہ ہے
کمند پھینکنے کا قصد آفتاب پہ ہے

یتیم اپنے کلام [illegible] نے ایک جگہ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں کہ ؎

زباں دہن میں کلام اپنا [illegible] ہے
اب آتے بلبلِ سدرہ نشیں کہاں پہ ہے

یتیم کا یہ کلام جس قلم اور طبع کا نتیجہ ہے اس کی مدح اس طرح کرتے ہیں ؎

صریرِ کلک سے نغمے ہزار پیدا ہیں　　چمن خجل ہیں وہ نقش و نگار پیدا ہیں
ہزاروں غنچے ہیں گل بے شمار پیدا ہیں　　نسیم صبح بھی ہالے وہ ہار پیدا ہیں
مرے چمن کی ہوائیں بلند رہتی ہیں
دکانیں عطر فروشوں کی بند رہتی ہیں

خدانے طبع ثریا وقار بخشی ہے　　ریاضِ فکر کو تازہ بہار بخشی ہے
کلام کو سندِ اعتبار بخشی ہے　　زباں نہیں یہ مجھے ذوالفقار بخشی ہے

فکرِ رسا۔ صریرِ کلک اور ریاضِ فکر کا ذکر کرنے کے بعد یتیم کربلا کی جانب رُخ کرتے ہیں تو انہیں صبح کی آمد کا منظر نظر آتا ہے ؎

فلک پہ جب سحرِ قتل آشکار ہوئی　　لہو یہ روتی شفق رشکِ لالہ زار ہوئی
ردائے لیلیٰ شب غم سے تار تار ہوئی　　نجوم چرخ کا بے کوچ یہ پکار ہوئی
وداعِ فوج کواکب سے ماہ ہونے لگا
ظہورِ خسروِ زریں کلاہ ہونے لگا

چوں کہ قتل کی صبح آشکار ہوئی ہے اس لیئے شاعر نے ردائے لیلیٰ شب کو غم سے تار تار ہونا کہا ہے اور اسی لیے شفق کا لہو رونا بھی استعمال کیا ہے تاکہ سامع کا ذہن اصل واقعے کی طرف سفر شروع کر سکے، اور جب سحر ہو گئی ؎

سپیدۂ سحری چرخ پر نمود ہوا　　زمانہ شیفتۂ واجب الوجود ہوا
افق پہ زیب دہ شرق کا ورود ہوا　　ستارے ڈوب گئے ماہ بے جنود ہوا
ضیائے تیرِ تاباں کہاں کہاں پہنچی
لیے ہوئے مغربیں کہکشاں پہنچی

ستارے ڈوبنے اور ماہ بے جنود ہونے کے بعد ؎

ہوئیں چمن میں ہم قمریاں فغاں کے لیے　　سحر کو سرو اٹھا با وضو اذاں کے لیئے
جو محوِ خواب تھی جوشِ شباب سے نرگس　　چلی نسیم تو جاگ اٹھی خواب سے نرگس

یہاں جو شعریت ہے وہ بے حد قابلِ داد ہے۔ قمریوں کا فغاں کے لیئے ہم ہونا۔ سحر کو رات کی شبنم سے وضو کے سرو کا اذان کے لیئے اٹھنا۔ نرگس کا رات میں محوِ خواب ہونا اور پھر صبح کو نسیم کے چلنے سے نرگس کی آنکھ کھل جانا۔

جدا ہے سب سے علم دارِ نوجواں کا حشم　　ہما کی طرح سے پھرتا ہے سر پہ سبز علم
یا اوج دیتا ہے بڑھ کر صدا شریکِ ہم　　ظفر نثار ہے، اقبال چومتا ہے قدم
یہ فتح کہتی ہے طبل و علم مبارک ہو
قدم قدم سرِ میداں حشم مبارک ہو

یتیم نے اسی مرثیے میں حضرتِ عباسؑ کی جنگ اور شہادت سے پہلے کچھ اور شہدا کا بھی مختصر ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ابو ثمامہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

زمیں کو دور تلک خوں سے لالہ فام کیا
ابو ثمامہ نے جرأت کو بس تمام کیا!

یا ایک جگہ جناب قاسمؑ کی رخصت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ؎

پئے نبرد جو شبرؑ کا لالہ فام چلا　　اندھیرا ہو گیا، گھر سے مہِ تمام چلا
غروب ہونے کو سوئے سپاہِ شام چلا　　چلی نسیم کہ دولہا یہ خوش خرام چلا
سواریٔ پسرِ مجتبیٰؑ چلی رن کو
پکارے بڑھ کے سلیماں ہوا چلی رن کو

اب اس کے بعد حضرتِ عباسؑ کی تیاری اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ؎

یہ سانحہ تھا کہ عباسؑ نے کمر باندھی　　مثالِ شیر، نظر سوئے فوجِ شر باندھی
جلی کی طرح سے شمشیرِ شعلہ ور باندھی　　فلک تھا دور میں جب جھوم کر سپر باندھی
جھکاتے سر شہِ والا کے سامنے آتے
جگر کو تھام کے آقا کے سامنے آتے

شیر کی طرح فوجِ شر کی جانب نظر باندھنا۔ سپر کا جھوم کر باندھنا اور اس وقت فلک کا دور میں ہونا نہ صرف رعایتِ لفظی و معنوی بلکہ محاکات کی بھی بہترین مثالیں ہیں۔

حضرتِ عباسؑ اس تیاری کے بعد امام سے اذنِ جہاد چاہتے ہیں لیکن امام اجازت نہیں دیتے جس پر حضرت عباسؑ اجازت کے لیئے کچھ دلائل پیش کرتے ہیں ؎

وصیتِ اسدِ کردگار میں نہ کروں — طلب حضور سے عز و وقار میں نہ کروں
سر اپنا قبلۂ دین پہ نثار میں نہ کروں — مقام ننگ ہے کہ کارزار میں نہ کروں

سر اپنا نذر نہ میں گر جناب کو دوں گا
جواب حشر میں کیا بوتراب کو دوں گا؟

یہاں شروع کے چار مصرعوں کی ردیف بے حد خوب صورت ہے جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ عزت۔ یہ وقار۔ یہ شرف۔ یہ موقع اور یہ مقام جب دوسرے حاصل کر چکے ہیں تو پھر میرے لیئے اجازت کیوں نہیں؟ میں ہی محروم کیوں رہوں؟ لیکن اگر یہی بات صاف صاف الفاظ میں کہی جاتی تو خاندانِ رسولؐ کے آداب و تہذیب کے خلاف تھی۔ اسی لیئے شاعر نے اسے نہایت فن کارانہ طریقے سے ادا کیا ہے۔

جب حضرتِ عباسؑ کو اذنِ جہاد مل گیا تو ان کی کیا کیفیت ہوئی اور بھائی کو بھائی سے بچھڑنے کا کتنا صدمہ ہوا ملاحظہ ہو ؎

سنا جو مژدۂ جاں بخش تن میں جان آئی — قدم کو چوم کے اٹھا وہ شہ کا شیدائی
وفورِ غم سے شہِ دیں پہ تیرگی چھائی — جگر تڑپ گیا چھوٹا جو بھائی سے بھائی

ہر ایک سمت بہ حسرت نگاہ کرنے لگے
کمر کو تھام کے شبیرؑ آہ کرنے لگے

اجازت لینے کے بعد حضرتِ عباسؑ کس شان سے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ؎

چڑھے فرس پہ، ندا دی ظفر نے بسم اللہ — محب ہوں شاد، عدو ہوں کہ جہاں میں تباہ
رہیں جلو میں ہمیشہ نہیب و شوکت و جاہ — ہو جلوہ گر ترے اقبال و عز و جاہ کا ماہ

پاؤں کا ذکر کرنے کے بعد یتیم اس طرح سراپا ختم کرتے ہیں ؎

بس اے قلم کہ ترا آج نام ہوتا ہے
قدم کو چوم سراپا تمام ہوتا ہے

عرب میں سپاہی کے لیے جنگ سے پہلے رجز پڑھنا ضروری ہوتا تھا۔ کربلا میں بھی یہی ہوا۔ حضرتِ عباسؑ نے جو رجز پڑھا۔ یتیم کی زبانی ملاحظہ ہو ؎

رجز زباں پہ فصیح و بلیغ جاری ہے — علیؑ کے طرزِ تکلم کی شان ساری ہے
کلام وہ کہ فصیحوں کی عقل عاری ہے — انہیں کے قول پہ شاہد کلامِ باری ہے
طلیق و ابلغ و شیریں مقال ہیں عباسؑ
یہ غل ہے مصحفِ ناطق کے لال ہیں عباسؑ

خبر نہیں کہ میں عباسِؑ ابنِ حیدرؑ ہوں — علیؑ کے گلشنِ شاداب کا گلِ تر ہوں
خدا علیم کہ شبیرؑ کا برادر ہوں — علم ملا ہے مجھے میں شبیہِ جعفرؑ ہوں
عیاں ہے صورتِ مہرِ مبیں نسب میرا
ہے فضلِ حق کہ ابوالفضل ہے لقب میرا

بتاؤ خانۂ کعبہ میں دی اذاں کس نے — مٹایا کفر کا آفاق سے نشاں کس نے
عیاں کی حکمتِ خلاقِ دو جہاں کس نے — نبیؐ کی جو سی ہے مثلِ طبِ زباں کس نے
شرف جہاں میں یہ دستِ خدا نے پایا ہے
کہ آفتاب کو مغرب سے کھینچ لایا ہے

حضرتِ عباسؑ رجز کے ساتھ ساتھ علم کی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں ؎

یہ وہ علم ہے کہ جعفرؑ اٹھا چکے ہیں اسے — وغا میں فاتحِ خیبرؑ اٹھا چکے ہیں اسے
بزرگ جتنے تھے اکثر اٹھا چکے ہیں اسے — بجز خدا کے پیمبرؐ اٹھا چکے ہیں اسے
یہ رتبہ بادشہِ مشرقین سے پایا
نشانِ جعفرِ ذیشان حسینؑ سے پایا

فرس پہ ہو اسدِ کردگار کا سایہ

رہے سوار پہ دُل دُل سوار کا سایہ

اس کے بعد یتیمؔ مرثیے کا رخ ساقی نامہ کی جانب اس طرح موڑ دیتے ہیں سہ

پلا دے جام جواہر نگار اے ساقی | چمن میں آئی ہے تازہ بہار اے ساقی
نظر میں پھرتی ہے تصویرِ یار اے ساقی | پھر آئی کان میں صوتِ ہزار اے ساقی

خموں کی خیر ہو بھر دے شراب شیشے میں

اتارنا ہے مجھے آفتاب شیشے میں

کدھر ہے ساقیِ مہوش بہم ہیں دیوانے | جنوں کا جوش ہے پیشِ نظر ہیں ویرانے
صراحیوں سے گلے مل رہے ہیں پیمانے | نکل پڑے کہیں بنت العنب ہوا کھانے

لگا تے تاک طلب گارِ جام بیٹھے ہیں

نظر لڑانے کو سب خاص و عام بیٹھے ہیں

ساقی نامے کے بعد یتیمؔ حضرتِ عباسؑ کا سراپا پیش کرتے ہیں جس میں ابرو۔ مژگاں۔ شانے۔ گلا۔ سینہ۔ کمر اور پاؤں وغیرہ کا ذکر بہت عمدہ طریقے سے نئی نئی تشبیہات و استعارات کے ساتھ کرتے ہیں سہ

گلا نہیں یہ صراحی شرابِ نور کی ہے | خدا گواہ ہے ضو اس میں صبح طور کی ہے
جناں کی بو ہے مہک بادۂ طہور کی ہے | صفائی اس میں سراپا جمالِ حور کی ہے

گلا جو رشک قمر ہے یہ مہر انور ہیں

غدیر خم کا جو ساقی ہے اس کے دلبر ہیں

ملا ہے صورتِ آئینہ جلوہ گر سینہ | علیؑ کے ماہ کا ہے غیرتِ قمر سینہ
خجل ہو آئینہ، شفاف اس قدر سینہ | برنگ صبح ہے صادق، وفا کا گھر سینہ

ہزار کعبے سے عز و شرف میں بہتر ہے

خلیلؑ کی وہ بنا، یہ بنائے حیدرؑ ہے

رجز پڑھنے کے بعد حضرتِ عباسؑ نے جو تیغ سنبھالی اس کی تعریف اور اس کے چلنے سے میدانِ کارزار کی جو حالت ہوئی وہ ملاحظہ ہو ؂

روش وہ تیغ کی مستانہ، پائمال ہول — کوئی تپاں تھا، کوئی نیم جاں، کوئی بسمل
وہ کشتے جن کا حساب کتاب تھا مشکل — مسافرانِ عدم کو کھلی ہوئی منزل

زمانہ دور میں تھا حشر تھا قیامت تھی
حساب سے ملک الموت کو نہ فرصت تھی

علیؑ کی جنگ ہے غازی کی کارزار نہیں — ملی کسی کو یہ شمشیر آب دار نہیں
ہزاروں یاد ہیں فقرے پئے ذوالفقار نہیں — یہی ہے دور تو پھر چرخ بے مدار نہیں

دکھا کے چال جگر پائمال کرتی ہے
گلے سے مل کے کسی کو حلال کرتی ہے

تلوار کی تعریف میں یتیم نے کہیں کہیں بڑا تغزل پیدا کر دیا ہے ؂

؏ وہ چال تیغ کی، بانکی ادا وہ مستانہ
؏ جو دیکھے قیس تو لیلیٰ کا ہو نہ دیوانہ
؏ بگاڑ سب سے مگر تھا قضا سے یارانہ

تلوار کا جو اصل مقصد ہے اس میں وہ تیغ کتنی کامیاب تھی اس بات کو وہ تیغ کی ہی زبانی بیان کرتے ہیں ؂

تڑپ کہیں تھی فزوں اس کی برقِ تاباں سے — برس برس کے یہ کہتی تھی ابرِ باراں سے
کدھر ہے باندھ لے دامن کو میرے داماں سے — پناہ مانگتے ہیں نوح میرے طوفاں سے

تیغ کی ضرب نے کس طرح میدانِ کربلا کا نقشہ بدل دیا ملاحظہ ہو ؂

وہ تیغ مانے جو ہے کو جسم آہن پوش — صدا یہ آتی تھی ہر ضرب سے بجوش بجوش
یہ دیتا جاتا تھا فتنہ صدا خموش خموش — خبر پہنچتی تھی فتح و ظفر کو گوش بگوش

جری کا ہاتھ ہے یا بوتراب کا پنجہ

فلک پہ کانپتا ہے آفتاب کا پنجہ

صرف تلوار کی ہی تعریف پر یتیم نے پورا زور نہیں دیا ہے بلکہ گھوڑے کا بھی کئی بندوں میں بڑی خوبی سے کیا ہے ملاحظہ ہو۔

فرس بھی نام خدا برق گام و خوش رفتار پھرے جو کاسے پہ حیراں ہو گنبد دوار
ہر ایک رگ سے عیاں شوخیاں ہزار ہزار فلک پہ ہو جو اشارا تو دوڑا کرے رہوار

اٹھاتے باگ تو گردوں کو بس دکھاتا ہو

وہ تیز رو کہ خیال اس کو تازیانہ ہو

اس کے بعد حضرت عباسؑ کا دریائے فرات تک پہنچنا۔ وہاں گھوڑے کو پانی میں ڈالنا۔ چلو میں پانی لے کر پھینکنا۔ مشک بھرنا۔ دریا سے باہر آنا اور خیمے کی جانب روانگی سب کچھ یتیم نے بیان کیا ہے۔ دریا سے باہر نکلنے کا ذکر ملاحظہ ہو۔

یہ شور تھا جو چلے شانِ بوترابی سے

قمر نکلتا ہے لو آج برجِ آبی سے

غرض کہ حضرت عباسؑ مشک میں پانی لے کر خیمے کی جانب روانہ ہوتے۔ دشمن کی فوج نے چاروں جانب سے گھیر لیا۔ بازو قلم ہوتے۔ علم ٹھنڈا ہوا۔ گھوڑے سے نیچے تشریف لائے اور اپنے آقا امام حسینؑ کو مدد کے لیے پکارا۔ ادھر امام خیمے سے روانہ ہوتے اور قتل گاہ تک پہنچے۔

قریب آئے تو دیکھی یہ حالتِ جانکاہ تڑپ رہا ہے زمیں پر علیؑ کا غیرتِ ماہ
پھرا رہے ہیں ادھر اور ادھر بس اپنی نگاہ جگر میں درد ہے، آنکھوں میں اشک لب پہ آہ

ہجومِ یاس بھی اندوہ بھی ملال بھی ہے

سکینہ رہ گئی پیاسی یہ انفعال بھی ہے

اس کے بعد امامِ عالی مقام کی اپنے علم دار سے گفتگو اور پھر امام کے زانو پر ہی روحِ مقدس کا پرواز کرنا بیان کیا ہے اور شہادت کے بعد بین جن میں خاص طور سے جناب سکینہ کا امام حسینؑ سے سوال کرنا بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ امام جواب میں فرماتے ہیں ؎

کہا یہ شاہ نے رو کر گزر گئے بی بی
تلاش جس کی ہے تم کو وہ مر گئے بی بی
نہ فوج باقی نہ عباسؑ پھر کے آئیں گے
اب اس علم کو قیامت میں پھر اٹھائیں گے
میں عاشق اس کا تھا اور وہ مرا فدائی تھا
سکینہ پیاسی کا سقہ تھا میرا بھائی تھا

اس کے بعد مقطع میں یتیم دعا گو ہیں کہ ؎

یتیم اب نہیں آگے ہے طاقتِ گفتار　　جگر دوات کا خوں ہے، قلم ہے سینہ فگار
جنابِ حضرتِ عباسؑ سے یہ کر اظہار　　نہیں ہے کچھ بھی محشر سے میرے دل کو قرار
پناہِ خاص میں اس تشنہ کام کو لینا
علم کے سائے میں مولا غلام کو لینا

غرض کہ یتیم کے مرثیے میں تمام اجزا اپنی پوری کامیابی کے ساتھ موجود ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یتیم کو ہر قسم کے مضامین بیان کرنے کی پوری قدرت حاصل تھی۔ اس مرثیے میں زورِ بیان بھی ہے۔ شوکتِ الفاظ بھی۔ خوب صورت تراکیب بھی ہیں۔ فصیح و بلیغ مصرعے بھی۔ انوکھی تشبیہات بھی۔ نادر استعارات بھی منظر نگاری بھی ہے اور جذبات نگاری بھی یتیم دراصل پوری طرح مرثیے کے شاعر تھے ایک تو انہوں نے خود یہ مزاج پایا تھا دوسرے ان کو شمیم جیسے استاد کی صحبت حاصل ہوئی۔ ان کا سارا کلام غیر مطبوعہ ہے جو اگر طبع ہو جائے تو بلند پایہ مرثیہ نگار شعرا کے مراثی کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

حافظ سید محمد اسرائیل طوبےؔ

حافظ سید محمد اسرائیل کا سلسلہ نسب سید محمد میر عدل سے ہو کر سید شرف الدین سے ملتا ہے۔ اس لئے آپ کا تعلق نقوی سادات سے ہے۔ آپ کے والد حافظ سید محمد اسمٰعیل حافظؔ خود اپنے عہد کے نامور شاعر و ادیب تھے اس طرح حافظ محمد اسرائیل کو شاعری اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔

آپ کے چھوٹے بھائی سید نیر حسین مرحوم کی اہلیہ کے بیان کے مطابق آپ کی عمر تقریباً ۸۵ سال ہوئی اور آپ کی وفات ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ اس طرح آپ کا سن ولادت ۱۸۶۷ء ہوا۔ سید محمد احمد مرحوم کے بیان کے مطابق بھی آپ کی عمر ۸۵ سال ہی ہوئی۔

چونکہ آپ کے والد شاعر و ادیب کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھے اس لیے آپ کی پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی اور نہ صرف اردو بلکہ عربی و فارسی کا بھی اچھا علم تھا اور حافظ قرآن بھی تھے۔ آپ کی ابتدائی عمر اپنے والد حافظ محمد اسمٰعیل کے ساتھ مٹیا برج کلکتہ میں گزری۔

حافظ محمد اسرائیل کی عمر کا کافی وقت ریاست رام پور میں بھی گزرا۔ رام پور سے آپ ایک بہت خوبصورت مزیج مبارک بھی اٹھا لائے تھے۔ آپ کے بارے میں مولوی سید بشیر حسن لکھتے ہیں کہ

دراصل اس مرثیے میں طوبیٰ نے جناب صغرا کا خواب بھی نظم کیا ہے اور اس خواب میں کربلا کے اہم واقعات بیان کیے ہیں مثلاً جناب صغرا اپنے بابا کو دیکھتی ہیں کہ

ہر اک طرف کو جستجو نگاہ کرتے ہیں
زمین ہلتی ہے مولا جب آہ کرتے ہیں

دہائی سنتا تھا زینبؑ کی کربلا کی شمر گلے پہ رکھ دیا پیاسے کے کھینچ کر خنجر
اِدھر تو خیمے سے نکلے حرم برہنہ سر اُدھر بدن سے جدا ہو گیا سرِ انور

گلوئے سبطِ نبیؐ سب کے سامنے کاٹا
سرِ حسینؑ کو زینبؑ کے سامنے کاٹا

جناب صغرا کا یہ وہ خواب تھا کہ جس سے ان کا دل دہل گیا۔ اچانک چونک اٹھیں۔ طوبیٰ کہتے ہیں کہ

یہ خواب دیکھ کے چونکی مریضِ غم اس آں پٹک کے سر کو پکاری کہ ہائے بابا جاں
تمہاری غربت و بے چارگی کے میں قرباں کسے خبر تھی کریں وہ دیکھیے گا شقی ہیں کجا

جہان سے نہ یہ بیٹی گزر گئی بابا
تمہاری لے کے بلا میں نہ مر گئی بابا

خواب سے بے دار ہونے کے بعد جناب صغرا نے اپنی نانی جناب اُمِ سلمیٰ کو یہ خواب سنایا اور پریشانی کا اظہار کیا۔ خواب سننے کے بعد جناب ام سلمیٰ نے اپنی نواسی جناب صغرا کو طرح طرح سے سمجھایا اور کہا کہ یہ صرف خواب ہے اسے حقیقت نہ سمجھو۔ تمہارے بابا اور سب گھر والے ٹھیک ہوں گے۔ ملاحظہ ہو:

یہ محض وہم ہے امر محال ہے بی بی
کڑھو نہ تم کہ یہ خواب و خیال ہے بی بی

جناب ام سلمیٰ نے اس طرح اپنی بیمار نواسی کو تو سمجھا کر تسلی دی لیکن خود اپنے

دل میں پریشان رہیں۔ طوبیٰ کہتے ہیں کہ ؎

کہا تو فاطمہ صغرا سے یہ بدرد و بکا — دل حزیں کو مگر ساتھ ہی ہوا کھٹکا
رسول رکھ گئے تھے جس میں ایک خاک شفا — وہ شیشہ جا کے جا کس سوگوار نے دیکھا
قلق نے دل میں جگہ لی قرار کے بدلے
بھرا تھا خون سے شیشہ غبار کے بدلے

یہ بیت کوئی قادر الکلام اور تجربہ کار شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔ شیشے میں غبار کے بدلے خون جس طرح پیدا ہوگیا۔ اسی طرح دل میں قرار کے بدلے قلق ہوگیا۔ یہاں انداز بیان کی داد نہیں دی جاسکتی یہ طبع آزمائی کا حصہ ہے۔

جناب اُم سلمیٰ نے جب شیشہ میں خون دیکھا تو ان کے دل پر کیا گزری طوبیٰ کہتے ہیں کہ

یہ رنگ دیکھ کے اشکوں نے کی فراوانی — چھپایا لاکھ مگر پر نہ غم کی طغیانی
کہا مریض نے کیوں خیریت تو ہے نانی — وہ آنسو پونچھ کے بولیں کہ کچھ نہیں جانی
کہ تھوڑی دیر بہت نہ مری جان دل کو شاد کرو
پدر کا دھیان بھلا دو خدا کو یاد کرو

جناب اُم سلمیٰ عمر رسیدہ ہیں جناب فاطمہ صغرا تو عمر ہیں اور پھر بیمار ہیں اس لیے جناب اُم سلمیٰ ایک دم کوئی ایسی گفتگو نہیں کرتیں کہ جس سے بیمار کے دل پر اچانک جھٹکا لگے جب کہ خود سب کچھ سمجھ چکی ہیں اس لئے حالات کا تقاضہ دیکھتے ہوئے صرف یہ کہتی ہیں کہ پدر کا دھیان بھلا دو خدا کو یاد کرو۔ لیکن اس جواب سے جناب صغرا کو تسلی نہیں ہوتی بلکہ ــــــ

یہ سن کے اور بھی گھبرائی وہ مریض حزیں — کہا یہ کیا، جو مری طرح تم بھی ہو غمگیں
تمہارے اشک بھی تو نانی جان تھمتے نہیں — سبب جو کچھ نہ چھپا اس کا ہے مرے دل کو یقیں
لبوں پر آہ ہے منہ آنسوؤں سے دھوتی ہو
بتاؤ کیا ہے؟ جو تم چھپکے چھپکے روتی ہو ــــ

جناب فاطمہ صغرا کے اصرار کے باوجود بھی جناب اُمّ سلمیٰ نے کچھ نہیں بتایا اور ہر طرح تسلی دی لیکن یہ راز پھر بھی ظاہر ہو ہی گیا۔

ہنوز انہوں نے نہ کچھ کی تھی درد کی گفتار ۔۔۔ کبوتر آ کے جو بیٹھا وہاں سرِ دیوار
پروں سے خون کی بوندیں ٹپکتی تھیں ہر بار ۔۔۔ عیاں تھا صاف کہ ہے یہ کسی کا ماتم دار

نہ یاد تھی اُسے کچھ اپنے آشیانے کی
خبر تھی دام کی اس کو نہ آب و دانے کی

طوبیٰ نے یہاں کبوتر کا حلیہ اور کیفیت جس طرح بیان کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ظاہر ہے کہ کبوتر کو اس طرح دیکھنے کے بعد جناب فاطمہ صغرا کو تشویش کس قدر بڑھ گئی ہوگی۔ اور کیا کیا بُرے خیال آتے ہوں گے دل میں ہر طرح کا وہم ہوا ہوگا۔ یہ تمام نفسیاتی کیفیات طوبیٰ نے بیان کی ہیں۔

جب جناب فاطمہ صغرا سے نہ رہا گیا تو کبوتر سے مخاطب ہو گئیں اور اس سے سوال کر لیا۔

نظر مریض کی اس پر پڑی جو آخر کار ۔۔۔ کہا پکار کے اے طائرِ ہُما کردار
قسم ہے تجھ کو سلیماں کی کچھ تو کر گفتار ۔۔۔ پدر کے خون کی بُو تجھ سے آتی ہے ہر بار

چہ آفت است کہ با شور و شین می آئے
مگر تو از سرِ کوئے حسینؑ می آئے

یہاں کبوتر کے لیے ہما کردار کہنا اور گفتگو کرنے کے لیے سلیمان کی قسم دینے سے طوبیٰ کے فن کا پتہ چلتا ہے۔ چوتھے مصرعے میں پدر کے خون کی بُو کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ جو بے حد دل خراش ہے۔ اس کے بعد پھر جناب صغرا اس کبوتر سے معلوم کرتی ہیں کہ

ملا ہو تجھ کو اگر میرا نامہ بر کہہ دے ۔۔۔ علیؑ کے لال کی پاتی ہو کچھ خبر کہہ دے
گئے ہیں کون سی جانب مرے پدر کہہ دے ۔۔۔ ادھر کب آئیں گے سلطانِ بحر و بر کہہ دے

بتا تو کون سا غم ہے جو یوں پھڑکتا ہے

ترے پروں سے یہ کس کا لہو ٹپکتا ہے

لیکن جب بیمار صغرا کی یہ فریاد کبوتر نے سنی تو اس سے بھی نہ رہا گیا اور وہ گویا ہوا ؎

مریض کی یہ کبوتر نے جب سنی فریاد | کہا میں کیا کہوں صغرا غضب کی ہے بیداد
حسینؑ قتل ہوئے اب حرم پہ ہے بیداد | گلے پہ چل گیا پیاسے کے خنجر فولاد

لہو نہیں، یہ نشانی میں لے کے آیا ہوں

ترے پدر کی نشانی میں لے کے آیا ہوں

نبیؐ کا نام ونشاں مٹ گیا مرے آگے | ستم سے خانۂ زہراؑ لٹ مرے آگے
ہوئے سب اہل حرم بے ردا مرے آگے | رسن میں ہاتھ بندھے زینبؑ کھا مرے آگے

فلک نے بھائی بہن کا عجیب حال کیا

کہ ان کو قید کیا ان کو پائمال کیا

الغرض کبوتر کی زبانی طوطے نے بڑے دردناک انداز میں واقعۂ کربلا بیان کیا ہے۔

اس کے بعد اس طرح مقطع میں اپنے لیے دعا کے بعد مرثیے کا اختتام ہوتا ہے ؎

یہ کہہ کے اُڑ گیا وہ طائر جہاں پیما | ادھر زمیں پہ غش کھا کے گر پڑی صغرا
تمام گھر میں بپا تھی قیامت کبریٰ | غش آگیا ہے نبیؐ کو خموش اے طوطا

دعا یہ کر کہ شہا عاقبت ہو پاک مری

شریکِ خاکِ شفا ہو یہ مشتِ خاک مری

طوطے کا ایک دوسرا مرثیہ سید امیر حسن نقوی نے راقم کو دیا ہے لیکن بوسیدہ حالت میں ہے۔ مطلع اس طرح ہے ؎

برچھیوں سے گیا جس دم علی اکبرؑ مارا | پڑ گیا غل گیا ہم شکلِ پیمبرؐ مارا
ہاتھ سر پیٹ کے کس نے یہ کہہ کر مارا | تجھ کو نیزہ نہیں مارا مجھے خنجر مارا

کس طرح اس کی جدائی ہو گوارا مجھ کو

اس جواں لال کے مرجانے نے مارا مجھ کو

ہر چند کہ طوطی کے صرف دو مرثیے راقم کو حاصل ہو سکے۔ لیکن ان سے طوطی کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے ان مراثی کے لب ولہجے میں بے حد درد و کرب ہے زبان میں غم و اندوہ ہے اور چند مواقع کی مکالمہ نگاری اور واقعہ نگاری نفسیات کو بہت قریب سے چھوتی ہے۔ دوسری جانب مصرعوں کی روانی اور الفاظ کی مناسبت بھی قابلِ داد ہے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔

سید اسد اللہ اسد

سید اسد اللہ اسد کا سلسلۂ نسب امام علی نقیؑ سے شروع ہوتا ہے اس لیے آپ کا تعلق نقوی ساداتِ امروہہ سے ہے جس کے مورثِ اعلےٰ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت تھے۔ ان کی اولاد میں سید ابدال محمد اپنے وقت کی ایک بے حد نمایاں شخصیت تھے جن کا ذکر سید رحیم بخش نے اس طرح کیا ہے کہ:

"پروانہ جاگیر مورخہ غزہ محرم ۱۱۳۰ھ جلوس محمد شاہ بادشاہ سے بخوبی ثابت ہے کہ سید ابدال محمد موصوف منصب دار داخلِ جلو قدیم تھے و نیز فہرست یادداشت مرتبہ عہدِ موصوف میں ان کو منصب دار جلو قدیم لکھا ہے یہ بڑے نام ور متقی و پرہیزگار عابد زاہد صاحبِ حوصلہ تھے ان کی معمرہ ایک مسجد اس محلے میں واقع ہے — اس مسجد میں ہمیشہ حفاظ وغیرہ مذہبِ شیعہ سے رہے ہیں۔ لیکن روز عاشورہ محرم کو قدیم سے سادات نیز شیوخ ساکنانِ محلہ واکثر اشخاص ساکنانِ دیگر محلات شہر مومنین مذہب شیعہ آکر اس مسجد کے سقف مکان شمال و جنوب رویہ پر نماز عاشورہ و زیارتِ عاشورہ جناب سید الشہدا مظلومِ کربلا علیہ التحیۃ والثنا پڑھتے ہیں (تواریخ واسطیہ صفحہ ۵۰۱-۵۰۷)

خلاقِ شش جہت کے پیمبر ہیں مصطفےٰ — اور راہِ مستقیم کے رہبر ہیں مصطفےٰ
مختارِ کارِ عرصۂ محشر ہیں مصطفےٰ — دریائے معرفت کے شناور ہیں مصطفےٰ

وصف ان کے ان کی آلِ مطہر کو چھپئے
اور اس کے بعد خالقِ اکبر سے پوچھئے

اس کے بعد میلادِ حضرتِ علیؑ کی جانب اس طرح گریز کرتے ہیں کرے

میلادِ مرتضےٰؑ کا سناتا ہوں اب میں حال
بعدِ رسولؐ جس کی جہاں میں نہیں مثال
اعزاز جس نے پایا ہے مشکل کشائی کا
ہے تاج جس کے فرق پہ حاجت روائی کا
کعبے میں آج خسروِ دیں کا ظہور ہے
استادِ جبرئیلِ امیں کا ظہور ہے
خوشبو مہک رہی ہے ہر اک سو گلاب کی
آمد ہے آج صلِّ علےٰ بوتراب کی
آفاق میں ولادتِ حیدرؑ کا جشن ہے
یعنی وصیِ ختمِ پیمبرؐ کا جشن ہے
مشکل کشا کنندۂ خیبر کا جشن ہے
ہاں اب ولیِ خالقِ اکبر کا جشن ہے
خورشیدِ آسماں طبقِ زرنگار لا
تارِ شعاع میں گوندھ کے انجم کے ہار لا
نذرِ رسولِ حق کو درِ شاہوار لا
اور سرمدی تقریبِ پروردگار لا

ان فضائل کے بیان کے بعد اس دن کی اہمیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

کعبہ ہے جائے مولدِ مولائے انس و جن　　شب ہے شبِ برات تو ہے یوم عید حسن

عشرت کے دور میں ہیں ہر اک خورد اور مسن　　پیدائش رسول کا دن ہے یہ من و عن

ہے شور بالعموم درود و سلام کا

آتا ہے وہ پدر ہو جو گیارہ امام کا

حضرت علیؑ کی ولادت کے بعد جب ان کو حضرت محمد مصطفےٰ نے اپنی آغوش میں لیا۔ اس محاکات کو کس کامیاب انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

وہ آکے ان کی گود میں مسرور ہو گئے

یکجا ہوتے تو نور، علے نور ہو گئے

اس کے بعد اسدؔ نے مرثیے کو حضرتِ علیؑ کے ایک معجزے کی جانب موڑ دیا ہے اور ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب کچھ لوگ حضرتِ علیؑ کے پاس ایک ایسا سوال اس غرض سے لے کر پہنچے کہ جس کا جواب نہ مل سکے۔ اس سلسلے کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو ؎

بے سود وہ گمان یہ کر کے بصد زیاں　　فوراً ہوئے شغال سوئے شیرِ حق رواں

ناحق ہوا جو مدِّ نظر حق کا امتحاں　　یوں جا کے ناریوں نے کیا نور سے بیاں

حق کے ولی وصیِ شہِ دوسرا ہیں آپ

عقدہ کشائے دہر ہیں معجز نما ہیں آپ

یہاں رعایتِ لفظی کا کس قدر فطری استعمال ہے کہ جو یقیناً قابلِ داد ہے۔ اس واقعے کے بعد اسدؔ مصائبِ امام حسینؑ بیان کرتے ہیں ؎

پانی پلاؤ ساقیِ کوثر کے لال کو

بہرِ خدا اماں دو محمدؐ کی آل کو

اس سے تھا کربلا میں زمانہ دبا ہوا
زنغے میں ظالموں کے وہی تھا گھرا ہوا

آخر میں مقطع پر اس طرح مرثیے کا اختتام ہوتا ہے ؎

بس اے اسد سمندِ قلم کی عناں کو تھام
بس ختم مرثیہ ہے فقط آگے والسلام

اسد کے دوسرے مرثیے کا اس طرح آغاز ہوتا ہے ؎

مدّاحِ ناصرانِ امامِ مبیں ہوں میں | شیدائے آلِ بادشہِ مرسلیں ہوں میں
گلزارِ احمدی کا سدا خوشہ چیں ہوں میں | یاں ہمصفیرِ بلبلِ سدرہ نشیں ہوں میں

حیرت فزا ہے اہلِ سخن کو بیاں مرا
معجز نما ہے خامہ طوبیٰ نشاں مرا

اس مرثیے میں ۱۲۱ بند ہیں چھرے میں اسد نے اپنا ذکر کیا ہے اس کے بعد حضرتِ مختار کے تفصیلی حالات بیان کیے ہیں۔ اور مرثیہ میں مختار نامے کو نظم کر کے اسد نے مرثیے کی تاریخ میں واقعی ایک اضافہ کیا ہے کیوں کہ اسد سے قبل راقم کی نگاہ سے کسی بھی مرثیہ نگار کا ایسا مرثیہ نہیں گذرا جس میں اس طرح مختار نامہ نظم ہوا ہو۔

اسد کا تیسرا مرثیہ جس کا مطلع ہے ؎

ع جنبش میں کیوں حجازِ عرب کی زمیں ہے آج

یہ بھی قابلِ توجہ ہے اور اسد کے ذہن کی موضوع کے سلسلے میں ایک جدت اور ندرت ہے۔ یہ مرثیہ اپنی نوعیت کا واحد ہے اور مرثیے کے سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اسد نے مزاراتِ مقدسہ (سعودی عرب) کے انہدام کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اور حکمرانِ وقت کے اس عمل پر سخت احتجاج کیا ہے۔ دنیا کے مختلف مزارات کا ذکر کیا ہے اور اس ظلم کو دنیا کا پہلا ظلم بتایا ہے ؎

مرقد کسی کے دہر میں ڈھاتے نہیں گئے
مُردے تہہِ مزار ستائے نہیں گئے

اس کے بعد واقعاتِ کربلا سے اس طرح ربط پیدا کر دیتے ہیں کہ ؎

مارا اگر یزید نے آلِ رسولؐ کو
ڈھایا ابنِ سعود نے قبرِ بتولؑ کو

جن ذواتِ مقدس کے مزارات کا انہدام ہوا ان کی عظمت بھی بیان کرتے ہیں ؎

ان بندگانِ خاص کے ڈھائے گئے مزار — ہیں جو رسولِ پاک کے اصحاب رشتہ دار
دن رات جن پہ ہوتی ہے رحمت تری نثار — جن کے سبب ہیں ارض و سماوات استوار

الفت ہے جن کی فرض یہ حق شناس ہیں
ظاہر ہیں عبد خاص ہیں گردوں اساس ہیں

اس کے بعد مزارات کے انہدام کا ہی ذکر کچھ ایسے مبکی انداز میں کرتے ہیں کہ مرثیے میں مصائب کا حصہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ مصائب کے بیان میں بھی یہ اسد کے قلم کی جدت ہے۔ مرثیہ کا مقطع اس طرح ہے ؎

بس اے اسد عنانِ قلم تھام بہرِ حق!
لرزاں ہیں اس بیان سے افلاک کے طبق

اسد کا چوتھا مرثیہ ؎

ع اب گلشنِ جہاں میں عجب انقلاب ہے۔

اس کا انداز اسد کے دیگر مراثی سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ حالاتِ زمانہ پر تبصرہ ہے فلکِ پیر سے خطاب ہے اور مناجات کا انداز ہے۔

اسد کا پانچواں مرثیہ ہے

؎ کیا سناؤں داستانِ حسرت و رنج و محن

یہ مرثیہ شخصی ہے اور اسد نے اپنے استاد مولوی سید اولاد حسن سلیم کی وفات پر کہا ہے۔ چہرے میں حیات و کائنات کا بیان بڑے فلسفیانہ انداز میں میں کیا ہے۔

مندمل زخمِ جگر ہونے پہ آتا ہے اگر
داغِ تازہ تاکتے ہیں گوشۂ قلب و جگر
ایک دھوکا ہے کھِلا فصلِ بہارِ زندگی
داغ دارِ دائمی ہے لالہ زارِ زندگی
تلخ کامی جس کا آخر ہو وہ لذت کیا کریں
غم لگا ہو جس کے پیچھے وہ مسرّت کیا کریں

اس کے بعد اصل موضوع کی جانب اس طرح گریز کرتے ہیں کہ ؎

جس کی طولِ عمر کا ہوتا ہے خواہاں اک جہاں ۔۔۔ یہ کبھی دیتی نہیں اس کو حیاتِ جاوداں
بات کل کی ہے اٹھا دنیا سے وہ والا مکاں ۔۔۔ ہے بجا گر اس کو کہئے سا کا مرثیہ کی جاں

مقتدا و پیشوائے مومناں ہجرت نمود
وا دریغا اے جہاں استاد ما رحلت نمود

باتواضع منکسر طینت بھی اور خوددار بھی
نغز گوئے خوب بھی فخرِ اولی الابصار بھی

اس کو فنِ شعر میں حق نے دیا تھا یہ کمال ۔۔۔ محو جس سے ہو گیا تھا میر و مرزا کا خیال
وہ سلاست وہ لطافت وہ تخیل وہ مقال ۔۔۔ لائے گا کوئی کہاں سے ہو گیا امرِ محال

سب ہیں شاعر یوں تو لیکن وہ سخنور اور تھا
وہ طبیعت اور ہی کچھ تھی وہ جوہر اور تھا

اسدؔ کے مندرجہ بالا مراثی کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسدؔ کے ہاں مضامین کی تلاش اور نیا پن ہے۔ مداح سرائی پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ محاکات کے وہ ماہر ہیں۔ تراکیب تراشنے کی بھی کامیاب کوشش ہے۔ اور منظر نگاری بھی کافی پرکشش ہے۔

اسدؔ کے مراثی کے علاوہ جو سلام راقم کی نظر سے گذرے ہیں ان میں مندرجہ ذیل شاہکار ہیں ؎

ع علی کا مرتبہ اللہ و پیغمبرؐ سمجھتے ہیں

ع محمدؐ نے شبِ معراج میں قدرت یہ حاصل کی

ع بقا سمجھیں فنا کو ہے یہ اے اہلِ دول مشکل

ع عجب عجب ہیں قرآں سے نکات ملے

ع میرِ کوثر جد ہے میرا خوبیٔ تقدیر سے

ع اقربا کے ہجر و غم کی غم گساری اور ہے

ع زمیں سے عرشِ اعظم تک ظہورِ نورِ قدرت ہے

ع لقب خدا سے محمدؐ کو لاجواب ملا

ع حضرتِ عباس جب رن کی اجازت لے گئے

ع آ کے جو بزمِ عزا میں چشم گریاں کر گئے

ع نبی کی آل کو جب بے حجاب لے کے چلے

اسدؔ کا مندرجہ ذیل مخمس بھی کافی مقبول ہے اور اس زمین میں بعد میں دوسرے شعراء نے بھی سلام کہے ہیں ؎

چشمِ حق بیں ہو عطا اہلِ نظر ایسا تو ہو　　راز قدرت منکشف ہوں باخبر ایسا تو ہو

تیرگی عصیاں کی مٹ جائے اثر ایسا تو ہو　　حبِ حیدرؔ دل میں ہو قلبِ بشر ایسا تو ہو

نورِ حق کی روشنی ہو جس میں گھر ایسا تو ہو

اسدؔ نے حضرتِ علیؑ کی مدح میں ایک ہفت بند بھی کہا ہے۔ جس کے ہر بند میں ۱۴ اشعار ہیں ؎

السّلام اے وارثِ ارثِ محمد مصطفیٰ
بابِ شہرِ علم ہو تم یا علیؑ مشکل کشا
السّلام اے خاص ہمدرسِ رسولِ ذوالجلال
درس گاہِ ایزدی کے مستندِ اہلِ کمال!
السّلام اے خانہ زادِ مالکِ یوم الحساب
افتخارِ ہر دو عالم یا علیؑ یا بوتراب

اسدؔ نے ۱۹۰۲ء میں ایک فریاد بھی کہی جس میں ۱۵۰ اشعار ہیں مطلع ہے ؎

اے خدائے دست گیرِ بے کساں فریاد ہے
کارساز و رہنمائے دو جہاں فریاد ہے

اسدؔ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی ہے اور اپنے استاد سلیمؔ امروہوی کی تاریخِ وفات فارسی میں کہی ہے جس میں ۷ اشعار ہیں ؎

ندائے ہاتفِ غیب آمدہ ز عرش اسدؔ
رسیدہ مولوی اولاد حسن بہشت یمن

۱۳۳۸ھ

اسدؔ کے اخلاف میں اس وقت ان کے پسر سید شجاع الحسن نقیؔ امروہے کے بزرگ ترین شعراء میں ہیں۔ ایک پسر سید ظہیر الحسن گذشتہ چند سال قبل انتقال کر گئے ایک پسر کا ۱۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ دو دختران تھیں۔ نقیؔ امروہوی اپنے گھر کی ادبی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ نقیؔ کے فرزند حسنین شجاع راہیؔ بھی کبھی کبھی شعر کہتے ہیں۔

مسمّاۃ سیّدہ مدینہ خاتون مدینہ

اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں خواتین نے بھی ادب میں حصہ لیا ہے غزل کہنے والی تو سیکڑوں مستورات گزری ہیں۔ لیکن غزل کے علاوہ اسلامی شاعری میں بھی خواتین کا خاص حصہ رہا ہے۔ سلام۔ نوحہ۔ مناجات۔ مناقب۔ فریاد۔ نعت اور منقبت بھی مستورات نے کافی کہی ہیں۔ البتہ مرثیہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے کہ جس سے خواتین کا تعلق کم رہا۔ مرثیہ خوانی میں تو خواتین نے بہت حصہ لیا ہے لیکن مرثیہ نگار بہت کم ہوئی ہیں۔ لکھنؤ کے وہ خاندان جہاں ۸۔ ۱۰ پشتوں سے مرثیہ نگاری جاری ہے وہ بھی اس اعتبار سے پیچھے ہیں۔

امروہہ میں خاندانِ یکتا کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کی پوتی بھی مرثیہ نگار ہوئیں۔ دادا یکتا، باپ شمیم۔ بھائی برجیس اور فہیم جیسے مرثیہ نگار تھے۔ تو پھر اس ماحول میں پلنے والی مسماۃ مدینہ خاتون مدینہ کیسے مرثیہ نگار نہ ہوتیں۔ شمیم کی آغوشِ تربیت میں پرورش پانے والی مدینہ کی ولادت ۱۸۶۸ء امروہہ میں ہوئی۔ باپ دادا سے علم و ادب ورثے میں ملا تھا تو ننھیال بھی علم قرآن و حدیث اور دینیات میں کچھ کم نہیں تھا۔ اس لیے اپنے ماموں حاجی سید مرتضےٰ حسین (دار العلوم نور المدارس امروہہ) سے قرآن۔ تاریخ اسلام اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف

شہید ہو کے بھی شیریں کے گھر پہنچ مہماں
حسینؑ سا بھی کوئی صاحب وفا نہ ہوا
غم حسینؑ کی تاثیر روز افزوں ہے
اگرچہ ظلم کو بیتے ہوئے زمانہ ہوا

مدیحہ کا ایک مرثیہ ان کے بھتیجے مولانا نسیم امروہوی کے پاس پاکستان میں ہے جس میں ۲۹ بند ہیں۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

جب آئے بنی فاطمہؑ زندانِ بلا میں

اس مرثیے میں مدیحہ نے امام حسینؑ کے واقعات جناب زینبؑ کی زبانی بیان کئے ہیں۔



سیّد ممتاز حسن کمالؔ

اولادِ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت میں میر غلام اسد اللہ خاں اپنے وقت کی ممتاز ترین شخصیت تھے۔ جو سید ممتاز حسن کمالؔ کے مورثِ اعلےٰ تھے۔ صاحبِ تاریخ اصغری، میر غلام اسد اللہ خاں کے لیے لکھتے ہیں کہ

"سید غلام اسد اللہ خاں بہادر عرف سید اسد اللہ جن کا میر کلو لقب زیادہ مشہور ہے۔ بڑے عالی ہمت اور صاحبِ فہم و فراست تھے۔ عہدِ عالمگیر ثانی میں بہ رفتہ رفتہ برسالہ محمد احمد خاں بموجب فرمان مورخہ ۶ سنہ جلوس بادشاہ ممدوح کے منصب پنج ہزاری ذات و پنج ہزار سوار تک سرفراز ہوئے۔ بھاؤ مرہٹے کی لڑائی میں بمقام پانی پت بہ ہمراہی نواب دوندے خاں دادِ شجاعت دے کر مجروح بھی ہوئے تھے ہر چند جملہ سردارانِ افاغنہ کے نزدیک معزز و معتمد تھے مگر نواب دوندے خاں کی سرکار کا مدار انہیں کی ذات پہ تھا" (صفحہ ۱۵۳)

سید مومن حسین صفیؔ نے قطعہ تاریخ وفات سید اسد اللہ خاں مندرجہ ذیل کہا ہے

رفت بہ بستانِ بہشت از جہاں　　میر غلام اسد اللہ خاں
ہاتف غیبی پئے تاریخ آں　　گفت زہے بلبلِ باغِ جناں

سید اسد اللہ کی اولاد میں انیسویں صدی میں امروہہ کے ایک جید عالم مولوی سید اعجاز حسن ہوتے۔ سید رحیم بخش ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"یہ عالم و فاضل و مولوی و حاجی حرمین و شریفین و زائر بعض عتبات عالیات ائمہ اطہار پاکیزہ نفس ... رئیس درباری ذی مقد... وجیہہ و جمیل و فہیم و عقیل ہیں و آنریری مجسٹریٹ ... بجناب سرکار دولت مدار ہیں ان کو مقدمات خفیہ میں ایک ماہ کی قید اور پچاس روپیہ کا جرمانہ کا اختیار حاصل ہے ـــــ ان کی تصنیف و تالیف سے مفاتیح المطالب فی خلافتہ علی ابن ابی طالب کتاب ضخیم و نہج الیقین فی اعلا کلمہ الدین رسالہ جسیم اور دیگر رسائل متفرقہ باقیات صالحات سے ہیں اور ان کے وا... محمد علی حسن اور دادا سید محمد علی بہت بڑے خیر و سخی و سیر چشم عالی ہمت ذی مقدرت نیک خصلت زاہد و ابرار عابد و پرہیزگار مرجع مومنین و سادات مجمع عمدہ صفات تھے"۔ (تواریخ واسطیہ صفحہ ۴۷۰-۴۷۱) مولوی سید اعجاز حسن کا انتقال ۱۳۲۰ھ میں ہوا۔

مولوی سید اعجاز حسن کے ہی لائق فرزند سید ممتاز حسن کمال ہوتے جن کے بارے میں صاحب تواریخ واسطیہ کا بیان ہے کہ "یہ ایف۔ اے پاس بی۔ اے کلاس ہیں۔ بعد تحصیل صرف و نحو و رسائل منطق و فلسفہ و بعض رسائل عقائد فقہ کی تحصیل انگریزی میں مصروف ہیں ذکاوت و فراست و صالحیت میں مصروف ہیں بین القران ممتاز و ہم چشموں میں سرفراز ہیں (صفحہ ۴۷۲)

ممتاز حسن کمال ۱۲ رجمادی الآخر ۱۲۸۷ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۸۷۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوتے۔ ابتدا میں سید ابرار حسین سے انگریزی اور خلیفہ فیروز علی و خلیفہ سید سعید حسین سے درسیات اردو و فارسی حاصل کیے ۱۸۸۶ء میں مڈ... امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۲ء میں ایف۔ اے اور ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ اور اس کے بعد نائب تحصیل دار ہوتے۔ اور ۱۸۹۶ء میں ضلع آگرہ میں چارج لیا۔ اس کے بعد کاس گنج۔ علی گنج اور جیلسر میں بھی



سید ممتاز حسین کمال (مرحوم)

اس کے بعد جنابِ فاطمہ زہرؑا کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے کچھ وصیتیں کیں ؎

بیٹی سے کہا بھائیوں سے رہیو خبردار　　ہیں ان کے ستانے کے لیے سیکڑوں غدار
بابا کو تو اعدا نے کیا بیکس و لاچار　　ہے خوف کہ سبطینِ پیمبرؐ پہ کریں وار
مُنہ ساتھ سے ان کے نہ کبھی موڑیو زینبؑ
ان کو تم اکیلا نہ کہیں چھوڑیو زینبؑ

ان وصیتوں کا اولاد پر کیا اثر پڑا وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

سامانِ سفر ماں کا جو اولاد نے دیکھا　　مایوسی کا رُخ ہر دلِ ناشاد نے دیکھا
سمجھے کہ یہ گھر موت کا جلاد نے دیکھا　　ہر بچہ کا مُنہ نالہ و فریاد نے دیکھا
مُنہ چوم کے ہر ایک کا چپ ہو گئیں زہرؑا
حجرے میں گئیں اور وہیں سو گئیں زہرؑا

اس کے بعد مصائب کے بند ہیں جن میں اہلِ خانہ کے مختصر بین ہیں اور بعدِ رسولؐ آلِ رسولؐ کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور مظالم کا بیان ہے۔ اس کے بعد مقطع پر مرثیہ کا اس طرح اختتام ہوتا ہے ؎

حیدرؑ کے وہ الفاظ کمالؔ آئیں کہاں سے
اردو میں تصاویرِ ملال آئیں کہاں سے

کمالؔ کے دوسرے مرثیہ کا مطلع ہے ؎

اے خدائے دو جہاں اے مالکِ یومِ نشور　　التجا لاتے ہیں تیرے بندے ہم تیرے حضور
غرق ہیں بحرِ معاصی میں ہم اے ربِ غفور　　سخت نادم ہیں ہم بخش دے تو سب قصور
ہم گناہوں کے سبب اپنے پریشاں حال ہیں
کہنے کو یوں تو ترے محبوب کی ہم آل ہیں

اس مرثیے کے شروع کے صرف ۱۴ بند حاصل ہو سکے باقی اگلے صفحات ضائع ہو گئے۔ مرثیہ کی ابتدا میں اصلاحی مضامین ہیں اس کے بعد امامِ عصر کے ظہور کی دعا اور ان کی مدح میں کچھ بند ہیں کہتے ہیں کہ

جب یہیں ظلم و ضلالت بہت بڑھ جائے گی　　تب ظہورِ حضرتِ قائم کی نوبت آئے گی
عدل سے معمور مخلوق آپ کو جب پائے گی　　جانتا ہے تو ہی جو جو رنگ دنیا لائے گی

حسرتِ دیدِ امامِ عصر دل میں رہ نہ جائے
جانِ محزوں جسم سے اللہ حافظ کہہ نہ جائے

کمالؔ کے فرزند محمد رضا صاحب رضا کا فرمانا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کمالؔ کے اور مراثی تھے جو کہیں پرانے کاغذات میں کھو گئے۔ مندرجہ بالا مراثی سے کمالؔ کے بیان کی سادگی اور زبان کی سلاست کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے مرثیہ گوئی کو خاص طور سے نہیں اپنایا وہ تو قصیدے کے شاعر تھے انہوں نے اپنی طبع کے جوہر خاص طور سے قصیدے میں دکھاتے ہیں۔ کمالؔ کے مندرجہ ذیل قصائد کافی مشہور ہیں کچھ قصائد ذو بحریں اور ذو قافیتین بھی ہیں کمالؔ نے ایک قصیدہ چار زبانوں میں بھی کہا ہے یعنی ایک مصرع اردو دوسرا فارسی تیسرا عربی اور چوتھا انگریزی میں۔

ع علیؑ کے در کا گدا کون بادشاہ نہیں

ع دل میں رکھ پنجتن پاک کی تصویریں پانچ

ع رضیہ زکیہ مطہر ہیں زہراؑ

ع خلق میں آمدِ خورشید سے رونق ہے کمالؔ

ع زہے شمیمِ شگوفۂ ترِ دماغ مجاں جس سے ہے معطر

ع مدحِ محبوبِ خدا میں کروں یارا کیا ہے

ع آمدِ فصلِ بہاری سے ہے سرسبز چمن

ع آرہا ہے ابر کے کاندھے پہ سامانِ بہار

کمالؔ کے مندرجہ ذیل سلام بھی راقم کی نظر سے گذرے ہیں ؎

ع جو راسخ علم ہیں ہیں وہ ہی من اور عن سمجھتے ہیں
ع پھر آگئی فصلِ اشک باری سحاب غم دل پہ چھا رہا ہے
ع شہ کے غم میں اشک آنکھوں سے رواں ہونے کو ہے
ع دل ان دنوں فرحت سے ہے بیگانہ ہمارا
ع جان و دل سبطِ پیمبرؐ پر فدا رکھتا ہوں میں
ع شہ کے ماتم میں سلامی غم کے دفتر کھول دے
ع گھر مرا ہے روضۂ حیدر کے در کے سامنے
ع ثنا کیا ہو سکے ہم سے سلامی تیغ حیدرؑ کی
ع کہرام ہوا مجرئی خیمے میں بکا سے

کمالؔ کے سلاموں کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

سوئے مسجد کیوں نہ اس کا در پیمبرؐ کھول دے
واسطے جس کی ولادت کے خدا گھر کھول دے

قبر میں غوطہ لگا کر پہنچوں کوثر پر کمالؔ
ناخدا گر عمر کی کشتی کا لنگر کھول دے

شعر لکھتے ہیں کمالؔ اس عمر میں کیا زور دار
از سرِ نو طبع تیری کیا جواں ہونے کو ہے

نہیں جو حسن و قبح شعر سے واقف وہ کیا جانیں
ہمارے شعر کی خوبی کو اہلِ فن سمجھتے ہیں!

کمالؔ کے ادبی سرمائے میں غزلیں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ راقم کی نظر

سے بھی کمالؔ کی ۲۰ - ۲۵ غزلیں گذری ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

دل کے زخموں کی دوا مرہم کافور نہیں
ہو سکے جس کا تدارک یہ وہ ناسور نہیں

مفت دل لے کے کسی کو کبھی واپس کر دیں
حُسن کے شہر میں اس بات کا دستور نہیں

مستحق جنّت و دوزخ کا نہ کیوں کر ہوں کمالؔ
اپنے افعال کا مختار ہوں مجبور نہیں

ہے تعجب اس غزل میں کیا کیا تو نے کمالؔ
پہلے تو شعروں میں تیرے صاف طرز میر تھی

شراب پینی ہے تجھ کو تو اے کمالؔ وہ پی
کہ جس کا کوثر و تسنیم تک خمار رہے

مندرجہ بالا اشعار سے کمالؔ کے نظریۂ فن۔ مزاج اور عقیدے کا اظہار ہوتا ہے۔

کمالؔ نے قطعات و رباعیات بھی کہیں۔ ملاحظہ ہوں ؂

داناؤں کو رشک ہے وہ دیوانہ ہوں
دیوانے فریفتہ ہیں وہ دانہ ہوں
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری
شمع رہ دین حق کا پروانہ ہوں

کچھ جانتے ہیں آپ کہ کون آج آیا
پیغمبر حق دین کا سرتاج آیا
لولاک لما شان میں آیا جس کی
محبوب خدا صاحب معراج آیا

کمالؔ نے اپنے والد مولوی سید اعجاز حسن کی وفات پر فارسی میں قطعہ تاریخ لکھا جس کا مقطع ہے ؂

از غم مولوی اعجاز حسن
پیر یارب شدہ ممتاز حسن

مندرجہ بالا اصنافِ سخن کے علاوہ کمالؔ نے طنز مزاح میں بھی گل کھلائے ہیں جس سے ان کی طبیعت کی شوخی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ ؎

ایسی ہوا چلی ہے زمانے میں ان دنوں
خاوندوں پر حکومت ازواج ہو گئی
شیخانی رو کے کہتی ہیں چھلنی ہوا جگر
جس دن سے ریش شیخ جی کی جھاج ہو گئی

غرض کہ کمالؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیے بھی کہے لیکن وہ مرثیے کو خاص طور سے نہیں اپنا سکے قصیدہ نگار کی حیثیت سے ان کا مقام زیادہ بلند ہے۔ کمالؔ کا انتقال ۲۴ اگست ۱۹۴۶ء کو امروہہ میں ہوا۔ اور عزا خانہ مسماۃ صغرا امروہہ میں دفن ہوئے۔

کمالؔ کے اخلاف میں خدا کے فضل سے اس وقت ان کے فرزند حاجی سید محمد رضا جن کی عمر ۸۰ سال کے قریب ہے بقید حیات ہیں اور اپنے خاندان کی شعری روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شعر بھی کہتے ہیں۔ اکثر امروہہ کی محافل میں قصائد پڑھتے ہیں۔ حاجی سید محمد رضا کی اولاد میں شعر و سخن کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا ایک فرزند سید حیدر رضا خاندانی اثاثے کی نگرانی کے علاوہ قومی خدمات میں مصروف رہتے ہیں دوسرے ڈاکٹر سید حسن مجتبےٰ پاکستان میں قومی خدمات کے ساتھ ساتھ حکومتِ پاکستان کے ایک اعلےٰ عہدے پر فائز ہیں۔

مولوی سید مجتبیٰ مجتبیٰ

سید حسین شرف الدین شاہ ولایت کی نسل میں سید محمد باقر ولد سید عبدالرحیم بھی ایک نمایاں منصب دار ہوئے ہیں۔ جنہوں نے محلہ بنگلہ میں ایک شاندار مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ سید محمد باقر کے پسر سید چھجو بھی منصب دار ہوئے جن کی مہر میں یہ شعر کندہ تھا

اں کہ از بر قسمت حق شاکر ست

سید چھجو بن محمد باقر ست

سید چھجو کے فرزند سید محمد تقی تھے جو ۲۵ جلوس اورنگ زیب میں بر رسالہ معتمد خاں صدی ذات کے منصب دار تھے۔ سید محمد تقی کے پوتے سید یاد علی ہوئے جن کے بارے میں صاحب "تاریخ اصغری" لکھتے ہیں کہ

"سید یاد علی موصوف خط نسخ بہت خوب اور جلد لکھتے تھے قرآن شریف بکثرت شوقیہ لکھے اور کتاب من لا یحضرہ استبصار و کافی کلینی وغیرہ کتابیں بہت پاکیزہ لکھیں۔ اور طلائی کام سے ان کو آراستہ کیا۔" (صفحہ ۴۴-۴۵)

سید یاد علی کے پوتے مولوی سید مصطفےٰ ہوئے جن کے بارے میں صاحب "تاریخ اصغری"

کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ایک جگہ مدح ملاحظہ ہو۔

بخشا کسے اللہ نے معراج کا پایا ۔۔۔ سو مُردوں کو عیسیٰ کی طرح کس نے جِلایا
پڑھتا نہ تھا اس خاک پہ کس شخص کا سایا ۔۔۔ جد کس کا ہے وہ سورۂ کوثر جسے آیا

کس زوج کو تجلّی صفتِ بدر عطا کی
دنیا میں کسے حق نے شبِ قدر عطا کی

آباد ہوئی کس کی رعایت سے رعایا ۔۔۔ کس شاہ نے دیندارون کی بستی کو بسایا
کس کے لیے الکمت لکم دینکم آیا ۔۔۔ اتممت علیکم کا صلہ کسے پایا

یکتا ہے جہاں کون ہے جرأت میں سخا میں
وصف ہے قرآن خدا کس کی ثنا میں

وہ کون ہے اللہ و نبی کا جو ہے پیارا ۔۔۔ جو عرش کی زینت ہے وہ ہے کس کی نتارا
ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارا ۔۔۔ اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا

اعلیٰ کسے فرمایا، علی کس کو کہا ہے
اللہ نے قرآن میں ولی کس کو کہا ہے

مندرجہ بالا بندوں میں مجتبیٰ نے جو قرآن اور احادیثِ رسول کی جانب اشارے کیے ہیں وہ ان کے عالم ہونے کی دلیل ہیں۔

ایک جگہ میدانِ کارزار میں امامِ عالی مقام کی آمد۔ دشمن کی فوجوں کی کثرت اور میدان جنگ کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

یا الٰہی حضرت جو بڑھے زور ترقی پر گھٹا ۔۔۔ تین جانب سے اٹھی شام کی گھنگھور گھٹا
خوف سے پیچھے قدم صورتِ زرباد ہٹا ۔۔۔ دشت کی گرد سے منہ نیّرِ اعظم کا اٹا

نعرہ زن فوجِ سیہ کار کے سب آ ہی گئے
شور کرتے ہوئے برسات کے بادل امڈ آئے

یہاں امام کے آگے بڑھنے سے زورِ تنِ شمر کا گھٹنا۔ شام کی گھٹا کا یمین جانب سے اُٹھنا۔ امامِ عالی مقام کے لیے نیرِ اعظم کا استعارا۔ دشت میں گرد کا اڑنا۔ فوجِ سیہ کار کی نعرہ زنی اور اس کی کثرت کی مناسبت سے برسات کے بادل کی تشبیہ ان کی قادر الکلامی کی مظہر ہیں۔ سیہ کاری کی مناسبت سے برسات کے بادل کی ط یت بھی قابلِ داد ہے۔ مجتبیٰ کا زیادہ تر کلام اس قسم کے شعری محاسن سے آراستہ ہے۔

امامؑ کے میدان میں پہنچنے کے بعد کی جو منظر کشی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

نعرہ زن شیر جو تھا گونج رہا تھا جنگل — مُنہ کے بل گرتا تھا کوئی تو کوئی پشت کے بل
ہر طرف جاتے تھے گھبرائے جو گھوڑے کوتل — منتشر فوج میں ہو جاتی تھی دونی ہلچل
مضطرب ہوکے اُدھر واں کے اِدھر آتے تھے
ٹھوکریں کھاتے تھے گر پڑتے تھے مر جاتے تھے

امام کی جنگ کرنے سے وہاں دشمن کی فوج کس طرح پسپا ہوئی اور میدانِ جنگ کا نقشہ کس طرح بدلا۔ کس قدر فنکارانہ انداز میں مجتبیٰ نے پیش کیا ہے ؎

گر کے میداں میں پڑے خاک پہ قاتل بسمل — کہیں تنہا کہیں بسمل کے مقابل بسمل
کوئی میداں میں، کوئی تھا لبِ ساحل بسمل — ہر طرف رن میں نظر آتے تھے بسمل بسمل
تھا یہ احوال جو ارباب جفا کار ن میں
صاف نقشہ نظر آتا تھا مسا کا رن میں

یہاں شعر ۲ کے چار مصرعوں میں قافیے اور ردیف کی تکرار سے مجتبیٰ نے ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے اور صوتی حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ امامؑ کی جنگ سے میدانِ کارزار میں کیا تہلکہ مچا ہوا تھا اور پورا ماحول کیا ہو گیا تھا۔ مجتبیٰ کہتے ہیں کہ ؎

تہلکے سے نہ اماں تھی نہ تلاطم سے مفر — زلزلے میں تھی زمیں کو بھی نہ تسکیں دم بھر
خیمے یوں جھکتے تھے ہر بار اِدھر اور اُدھر — سر دُھنے تُند ہوا میں کبھی جس طرح شجر

واں ہوا آتے ہوئے ڈر سے مڑی جاتی تھی
جس قدر خاک تھی مقتل کی اُڑی جاتی تھی

مجتبیٰ نے خیموں کو ہوا سے اِدھر اُدھر جھکنے میں جو شجر کے ہلنے سے تشبیہہ دی ہے وہ بڑی نادر اور اچھوتی ہے۔

مجتبیٰ نے سلام بھی کافی کہے ہیں اور ان کے سلاموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے نئی اور مشکل زمینوں کا انتخاب کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بھرتے تھے نصرت کا دم انصار اُٹھتے بیٹھتے
لیتے تھے نام شہِ ابرار اُٹھتے بیٹھتے
بیڑیوں کی ہائے وہ جھنکار اُٹھتے بیٹھتے
سہتے تھے دُکھ عابدِ بیمار اُٹھتے بیٹھتے

پھری سو بار اگر لب پہ تو جانِ حزیں اُلٹی
زباں سے بات جو مردوں نے کہہ دی پھر نہیں اُلٹی
جو آکر غیظ میں شیرِ خدا نے آستیں اُلٹی
فلک چکر میں آئے غل ہوا لو اب زمیں اُلٹی
جوان و طفل گو یکساں نہیں تھے اس گھرانے میں
پھر آخر کیوں علی اصغر کی شہ نے آستیں اُلٹی
مخالف مصحفِ ناطق کے تھے جو دشمنِ ایماں
وہی کرتے رہے تفسیرِ قرآں مبیں اُلٹی

مندرجہ بالا اشعار سے مجتبیٰ کے سلاموں کے معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے مجتبیٰ کے کافی قصیدے بھی سید شبیہ حسن کے پاس موجود ہیں۔ ایک شاہکار قصیدہ جس میں ۳۲ اشعار ہیں اس التزام کے ساتھ کہا گیا ہے کہ پہلے مصرعے میں نبیؐ کی مدح اور دوسرے مصرعے

میں علیؑ کی مدح کی گئی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

آج یہ کس مہِ نو کی نظر آئی تنویر
دامِ الفت میں ہوا طائرِ دل جس کا اسیر
کس سے تشبیہ دوں اس سے نہیں افضل کوئی
اس کی تمثیل ہی چاہوں تو نہیں مثل و نظیر
نورِ حق اس کو نہ جانوں تو خدا کا ڈر ہے
عینِ حق اس کو جو سمجھوں تو ہے خوفِ تکفیر
وہ نبیؐ جس کا زمانے میں نہیں مثل و نظیر
وہ علیؑ نفسِ نبیؐ جو بخدا و ندِ قدیر
وہ نبیؐ شہرۂ آفاق ہے جو خلقِ عظیم
وہ علیؑ جس کے ہیں الطاف و کرم عالم گیر
وہ نبیؐ عرشِ بریں پر جسے معراج ہوئی
وہ علیؑ عرش جسے دوشِ شہنشاہِ سریر
وہ نبیؐ منزلِ قرآن ہے جس کا دلِ پاک
وہ علیؑ مصحفِ حق کی ہے جو گویا تفسیر
وہ نبیؐ جس نے کہ جاری کیا دینِ اسلام
وہ علیؑ مظہرِ حق جس کی صدائے تکبیر
وہ نبیؐ عرش سے جس کے لیے قرآں آیا
وہ علیؑ جس کے لیے چرخ سے اُتری شمشیر
وہ نبیؐ جس کے ولی عہد ہوئے بارہ امام
وہ علیؑ جس شہِ ذی جاہ کے ہیں گیارہ وزیر

مجتبیٰ کے ایک قصیدے کا مطلع ہے ؎

خلق میں کعبۂ دیں، قبلۂ ایماں آیا
گویا اللہ کا بھیجا ہوا قرآں آیا

مجتبیٰ نے موت و حیات۔ دوستی و دشمنی۔ گلشن و صحرا۔ بہار و خزاں۔ عمر رفتہ اور انقلاب وغیرہ وغیرہ کے موضوع پر رباعیات کہی ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

پھولوں کی وہ خوش رنگ قبا ہی نہ رہی
دل کش وہ عنادل کی صدا ہی نہ رہی
غنچے کی چٹک اب ہے نہ سبزے کی مہک
پہلی سی چمن کی وہ ہوا ہی نہ رہی

ابنائے زمانہ سے، ہم آزردہ ہیں
بے مہریٔ گردوں سے دل افسردہ ہیں
اندوہ و الم کی یہ فراوانی ہے
کہنے کو تو جیتے ہیں مگر مردہ ہیں

باہم دگر الفت کی وہ راہیں نہ رہیں
احباب کی پہلی سی نگاہیں نہ رہیں
جو دوست تھے دشمن ہوتے بگڑی یہ ہوا
ہمدم تھیں جو ہر نفس، وہ آہیں نہ رہیں

کیا جلد شباب آتے ہی اب چلنے لگا
سوز و غم و اندوہ سے دل جلنے لگا
نشے میں جوانی کے پڑے تھے غافل
سوتے سے کھلی آنکھ تو دن ڈھلنے لگا

مجتبیٰ کی غزل گوئی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو ؎

اٹھنے والے ہیں جہاں سے کوئی دم بیٹھے ہیں
پاؤں لٹکائے ہوئے گور میں ہم بیٹھے ہیں

سائل دہلوی نے اس مطلعے کی بے حد داد دی اور کہا تھا امروہہ اب میں پھر آؤں گا کیا کہ یہاں مجتبیٰ جیسے شاعر موجود ہیں۔

الٰہی خیر ہو بگڑی ہوا زمانے کی
چلک رہی ہے بہت شاخ آشیانے کی

ہوں خانہ زادِ چین اور چمن سے ہوں محروم
خطا یہ میری ہے یا میرے آب و دانے کی

یکتاؔ ابھی کیا ہے طفلی کا زمانہ ہے
آنکھوں میں نہ سرمہ ہے نہ زلفوں میں شانہ ہے

اسی غزل کا ایک شعر بھائی یکتاؔ کے انتقال سے متاثر ہو کر کہا ؎

دل تیرِ حوادث کا ہر وقت نشانہ ہے
اب دن نہیں جینے کے مرنے کا زمانہ ہے

مجتبیٰؔ کی ایک غزل کا مطلع جو بہت مشہور ہے اس کے بارے میں ان کے فرزند کا بیان ہے کہ جب جگر مراد آبادی اور سائل دہلوی اپنی جوانی کے زمانے میں ایک مرتبہ امروہہ آئے اور وہ مطلع سنا تو کافی دیر اس میں محو رہے وہ مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

نہ گُل گورِ غریباں پر نہ شمعوں کا اجالا ہے
نہ کوئی ہنسنے والا ہے نہ کوئی رونے والا ہے

مجتبیٰؔ نے کچھ قطعاتِ تاریخ بھی کہے جن میں سب سے مشہور وہ ہے جو انہوں نے اپنے استاد مولوی سید اولاد حسن سلیم کی وفات پر کہا ہے۔ غرض کہ مجتبیٰؔ کا ہر صنفِ سخن میں کافی دخل تھا۔

ان کی اولاد میں خدا کے فضل سے ان کے ایک پسر سید شبیب حسن اس وقت بقیدِ حیات ہیں ایک پسر سید حبیب حسن کا انتقال ہو چکا ہے ان کی اولاد میں کوئی شاعر نہیں ہوا۔ البتہ سید شبیب حسن مجالس (نثاری) پڑھتے ہیں۔ جن میں مجتبیٰؔ اور یکتاؔ کا زیادہ تر کلام ہوتا ہے۔ سید حبیب حسن بھی نثار تھے۔ سید شبیب حسن کے ایک پسر خلیل مجتبیٰؔ ہیں اور سید حبیب حسن کے دو پسر سید خورشید مصطفےٰ و سید خورشید مرتضےٰ پاکستان میں ہیں۔

منشی حیدر بخش حیدر

حیدر کا تعلق محلہ کٹرہ سید غلام علی امروہہ کے ایک شیخ خاندان سے تھا۔ والد کا نام رحیم بخش تھا۔ حیدر کی ولادت تقریباً ۱۸۷۳ء میں اور انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا۔

ابتدائی عمر سے ہی سید زیرک حسین رضی کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ جس سے علمی اور ادبی شعور جاگ اٹھا۔ شاعری شروع کی اور جواد حسین شمیم کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔

غزل۔ قصیدہ۔ سلام۔ قطعہ۔ رباعی اور مرثیے میں طبع آزمائی کی۔ اردو اور فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ امروہہ کے ماحول کے سبب چہار بیت بھی کافی کہیں۔ حیدر کا قد لمبا اور جسم فربہ تھا۔ شعر فی البدیہہ کہنے میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے۔

حیدر نے کافی تعداد میں مراثی کہے لیکن اولادِ نرینہ سے محروم تھے اس لئے ورثہ میں کوئی ایسا نہ تھا جو حیدر کے بستے کی حفاظت کرتا۔ اس لئے تمام کلام اور خصوصاً مراثی ضائع ہو گئے۔

حیدر کے ایک مرثیے کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو۔ یہ مرثیہ بڑی شکستہ حالت میں سید علی اکبر مرحوم سے حاصل ہو سکا ہے۔

جب داخلِ وطن حرمِ مصطفےٰ ہوئے — زینبؑ سے پوچھا سب نے کہ شبیرؑ کیا ہوئے
وہ بولی کربلا میں بہن سے جدا ہوئے — امت پہ تین روز کے پیاسے فدا ہوئے
صغریٰ سے شرمسار میں ہونے کو آئی ہوں
بھائی کو ماں کی قبر پہ رونے کو آئی ہوں

آگے بیان کس سے ہو یہ ماجرائے غم — اٹھتے شرر ہیں آہ سے سینے میں دم بدم
طاقت نہیں ہے دل کو جو کیجئے اسے رقم — لازم ہے اب تو روک لے حیدر یہاں قلم
مشتاق کیوں جہاں نہ ہو میرے کلام کا
مداح ہوں حسینؑ علیہ السلام کا

حیدر نے غزلیں بھی کافی کہی ہیں جو اس دور کے رسائل مثلاً "معراج الکلام" وغیرہ میں شائع ہوتی تھیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں میونسپل بورڈ امروہہ کی جانب سے ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کے گلدستے میں حیدر کی بھی غزل ملتی ہے۔ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

خزاں جب آئے گی برباد سارا بوستاں ہوگا
نہ شاخِ آشیاں ہوگی نہ باقی آشیاں ہوگا
بگولہ بن کے میری خاک کو دن رات گردش ہے
ستم اس سے زیادہ اور کیا اے آسماں ہوگا
کروگے قتل ناحق تو صدا رگ رگ سے آئے گی
فلک پر خونِ عاشق کا شفق بن کر عیاں ہوگا
کہاں جائے گا بچ کر وہ مرے پیکِ تصور سے
اسے ہم ڈھونڈ ہی لائیں گے پوشیدہ جہاں ہوگا

ہم اپنی آہِ سوزاں کا دکھائیں گے اثر حیدر
کریں گے جس گھڑی نالہ تہ و بالا جہاں ہوگا

(رپورٹ مشاعرہ امروہہ ۱۹۳۰ء صفحہ ۳)

حیدر، شاعر کے علاوہ خوشنویس بھی بہت اچھے تھے۔ راقم نے کئی جگہ حیدر کی خوشنویسی کے نمونے دیکھے ہیں۔ اس کے علاوہ سامانِ آرائش کی تیاری میں بھی ماہر تھے۔ ۹ محرم الحرام کو کٹرہ غلام علی سے برآمد ہونے والے جلوس میں جو آرائش ہے وہ حیدر کی ہی ایجاد ہے۔ اس فن میں ان کے کئی شاگرد بھی ہوئے۔

مسماۃ عسکری خاتون عسکریؔ

عسکریؔ کی ولادت تقریباً ۱۸۷۳ء میں محلہ کشکول کے ایک معزز نقوی سادات کے گھرانے میں ہوئی۔ اور ان کا تعلق اولادِ شرف الدین شاہ ولایت سے ہے۔ والد کا نام سید ظہور حسین تھا۔ تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں ۱۹۵۳ء میں آپ کا انتقال بریلی میں ہوا۔

عسکریؔ کی شادی محلہ دربار کلاں امروہہ کی ایک معزز شخصیت سید نادر حسین مرحوم سے ہوئی تھی۔ پسران میں سید ناہر حسین اور سید عامر حسن ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور کراچی میں آباد ہوئے۔

عسکری بے حد نیک، پابندِ صوم و صلوٰۃ اور عقیدت مند خاتون تھیں۔ ائمہ سے عقیدت کے سبب ہی انھوں نے شاعری کا آغاز کیا تھا اور صرف مدحِ اہلِ بیت تک ہی شاعری کو محدود رکھا۔ انھوں نے مناجاتیں اور نوحے خاص طور پر کہے۔ خود ذاکرہ تھیں اور مرثیہ خوانی سے بھی خاص لگاؤ تھا اس لئے چند مختصر مراثی بھی کہے جو انھوں نے اکثر مجالس میں بھی پڑھے۔ دو مرثیے راقم کی نظر سے بھی گذرے ہیں جن میں دس اور تیرہ بند ہیں۔ ہر بند میں بیت کی تکرار ہے۔ مطلعے ملاحظہ ہوں۔

کس طرح قائم رہا اپنی جگہ عرشِ بریں — کیوں تنزل ہو گیا پیدا نہ بر روئے زمیں
اس طرح تنہا لڑے لاکھوں سے سلطانِ حزیں — آخرش گھوڑے سے آہستہ اتر آئے وہیں

کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبر کا نواسہ ہائے ہائے

کربلا میں کام جو تم ابنِ حیدرؑ کر گئے — حشر تک چرچا رہے گا وہ مہم سر کر گئے
جسمِ اقدس پر جو کھا کر نیزہ و خنجر گئے — خوں سے اپنے رتبۂ اسلام برتر کر گئے

ہاں بنی ہاشم کی تم نے شان پر گھر دے دیا
دین کے حامی نے ایمان پر سر دے دیا

چند بند اور ملاحظہ ہوں۔

آئی ہو تعریف جس کی جابجا قرآن میں — بے ادب امت ہوئی کس طرح اس کی شان میں
خویش و یاور اس کے سب مارے گئے میدان میں — ظہر تک لاشے اٹھانا کس کے تھا امکان میں

کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبرؐ کا نواسہ ہائے ہائے

جس کو کاندھے پر چڑھاتے تھے نبیؐ توقیر سے — پرورش پائی تھی جس نے فاطمہؑ کے شیر سے
اس کے ہاتھوں پر چھدا حلقومِ اصغرؑ تیر سے — کیا کہا دل نے ذرا پوچھے کوئی شبیرؑ سے

کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبرؐ کا نواسہ ہائے ہائے

بیڑیاں اور طوق پہنائے نحیف و زار کو — مع حرم کے لے چلے قیدی بنا بیمار کو
سر شہیدوں کے دیئے نیزوں پہ ہر سردار کو — عسکری مت کر رقم اب حالتِ دربار کو

کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبرؐ کا نواسہ ہائے ہائے

عسکری کا ایک مجموعہ "سفینۂ نجات" پاکستان سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

سید مجاہد حسین جوہر

جوہر کے مورثِ اعلیٰ سید محمد اشرف دانشمند تھے آپ کے والد کا نام نثار حسین تھا۔ آپ کی ولادت تقریباً ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء امروہہ میں ہوئی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں کلکٹری بدایوں میں ملازمت کی اس کے بعد جوہر پریس مرادآباد میں قائم کیا اور اگست ۱۹۱۰ء سے "اتحادِ اسلام" کے نام سے رسالہ جاری کیا جسے پھر اہلِ امروہہ کے اصرار پر امروہہ منتقل کر دیا گیا اس رسالے کے ذریعے جوہر نے اتحاد بین المسلمین کی تبلیغ کی اور قومی مسائل پر گراں قدر اداریے لکھے۔ اس کے بعد اسے ہفت روزہ اخبار کی شکل صرف "اتحاد" کے نام سے دے دی۔ اور عرصے تک اخبار نکالتے رہے۔

جوہر کے ۳ عقد ہوئے ابتدائی دو ازواج لاولد رہیں تیسری اہلیہ سے دو پسر سید محامد حسین اور سید مشاہد حسین ہوئے۔ سید محامد حسین اپنے والد کی حیات میں ہی انتقال کر گئے سید محامد حسین کے پسر سید خورشید حیدر ہوئے انہوں نے بھی عالم جوانی میں انتقال کیا۔ جوہر کے دوسرے پسر سید مشاہد حسین نے بھی جوانی میں انتقال کیا۔ مشاہد حسین کے ایک دختر ہوئیں جن کا عقد سید عطا حیدر ساکن بیگم سرائے امروہہ سے ہوا۔



سید مجاہد حسین جوہر

جوہر کا انتقال تقریباً ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء کو امروہہ میں ہوا۔ وہ نہ صرف ایک شاعر و ادیب تھے۔ بلکہ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت بلند ہے۔ صحافی ہونے کے سبب اصلاح معاشرت کی بھی آپ نے کئی کتابیں لکھیں دوسری طرف پریس قائم ہونے کے سبب ایک پبلشر کی حیثیت سے بھی ادب کی خدمت کرتے رہے۔

امروہہ کے کئی بزرگوں کا بیان ہے کہ جوہر نے مراثی بھی لکھے تھے۔ لیکن جوہر کے دونوں ... کے جوانی میں انتقال کے سبب کوئی ان کی نگرانی نہ کرسکا اور اب جوہر کے ادبی سرمائے میں صرف وہ حصہ باقی ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکا تھا۔ جن میں "مسدس جوہر" اور "میوۂ شیریں" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ "مسدس جوہر" حقیقتاً انسان اور زندگی کا ایک مرثیہ ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

فاتو تعجب ... آیا آخر وطن سے نکلے | جس طرح دم کسی کا گھٹ کر بدن سے نکلے
بادِ خزاں کے ہاتھوں اپنے چمن سے نکلے | یاروں نے غل مچایا جوہر عدن سے نکلے

سارے عزیز چھوٹے ... دیار چھوٹے
بچپن کے دوست چھوٹے پیسے کے یار چھوٹے

اس مسدس میں ۱۱۹ بند ہیں۔ نجمی۔ سائل۔ وفی۔ بیتاج۔ ... اور صریر وغیرہ نے تاریخیں کہیں۔

"میوۂ شیریں" جوہر کی ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں پردہ کے موضوع پر دلچسپ بحث ہے۔ بہار کے نوجوان نقاد سید حسن عباس اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مصنف اسلامی طرزِ حیات کا دلدادہ ہے اس نے اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولیں اسلامی فضا میں پروان چڑھا اور اسلام سے اس قدر متاثر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جا بجا اسلامی طرزِ حیات کے نمونوں کو مثال کی شکل میں پیش کیا ہے ـــــ ادبی حیثیت سے یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔" (ماہنامہ "پاسبان" اپریل ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۹ چندوسی گڑھ)

جوہر نے رباعیاں بھی کہی ہیں ملاحظہ ہوں ؎

اسلام کو کھوتا ہے فسادِ اسلام　　تخریب کا باعث ہے عنادِ اسلام

دو باتیں پیمبر نے سکھائیں جوہر　　توحید خدا و اتحادِ اسلام

ہاں طفلی و پیری و جوانی کیا ہے　　ہے خواب کا حال زندگانی کیا ہے

ہاں علم و ہنر سے آبرو ہے جوہر　　بے علم کی عمر جاودانی کیا ہے

جوہر نے غزلیں تو بہت کم لکھی ہیں البتہ نظموں کی تعداد کافی ہے۔ کئی نظمیں اس میں شاہکار ہیں مثلاً "شہدائے مسلم یونیورسٹی"۔ "تعلیم دو" "تعلیم دو" اور ایک قومی خمسہ وغیرہ۔ جوہر کی ایک وطنی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں سے

یارب تو پھر بسادے اجڑا چمن ہمارا
رشکِ ریاضِ جنت پھر ہو وطن ہمارا
اک دن وہ تھا کہ اس میں ہر گل تھا اک شگوفہ
گویا تھا باغِ رضواں بیت الحزن ہمارا
اسلام کے طریقے کچھ ایسے بھا گئے تھے
سب لوگ سیکھتے تھے چال و چلن ہمارا
غفلت نے اپنی آخر ایسی ہوا بدل دی
تقدیر کی طرح سے بگڑا چلن ہمارا
افسوس خود مسلماں آپس میں لڑ رہے ہیں
کیا ہو گیا وہ یارب خلقِ حسن ہمارا
جوہر ہمیں خدا سے امید ہے کہ اک دن
چمکائیں گے ستارا پھر پنجتن ہمارا

(ماہنامہ اتحادِ اسلام امروہہ اگست ۱۹۱۰ء صفحہ ۳)

سید اصغر حسن طالب

مشہور صوفی بزرگ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت کی نسل سے تعلق ہونے کے سبب طالب کا تعلق نقوی سادات سے ہے۔ طالب کے اجداد میں میر اسد اللہ خاں بہادر بڑے نام ور اور ممتاز بزرگ ہوئے ہیں۔ طالب کے والد سید مظہر حسن اپنے دور کے کامیاب وکیل تھے۔

اصغر حسن طالب کی ولادت ۱۹ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ مطابق اپریل ۱۸۷۶ء امروہہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق مکتب میں حاصل کی اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں ہائی اسکول امروہہ گورنمنٹ اسکول سے پاس کیا اور لکھنؤ چلے گئے وہاں انٹرنس پاس کیا اور ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا ساتھ ہی ساتھ منشی اور منشی عالم کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۲ء تک دفتر ڈپٹی کمشنر بہادر لکھنؤ میں ملازمت کی اور وہیں سے جوڈیشیل اسسٹنٹ کے عہدے سے پنشن پائی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد امروہہ تشریف لے آئے یہیں عمر کا آخری حصہ گزارا اور ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا۔

اصغر حسین طالب کے دو بھائی اور تھے۔ میجر ڈاکٹر اظہر حسن اور اطہر حسن۔ ڈاکٹر

اطہر حسین کے پوتے ڈاکٹر منظر عباس نقوی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہیں۔ اطہر حسن کی اولاد پاکستان ہجرت کر گئی اور طالب کے ایک پر سبط حسنین ہوتے جولا ولد۔

طالب کو اپنے دورِ ملازمت میں ملازمین کے مسائل سے خاص دلچسپی تھی انہوں نے ایک طویل نظم (مسدس) کلرکس ایسوسی ایشن کہی تھی جو ۲۵ / دسمبر ۲۹ء ۔۔۔ ہونے والے ایک اجلاس میں پڑھی تھی یہ نظم شائع بھی ہوئی تھی اس میں روز بروز بڑھتی گرانی اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کا ذکر کیا ہے۔ لکھنؤ کے قیام کے سبب طالب کو مولانا صفی لکھنوی کی صحبت حاصل کرنے کا موقع ملا اس لیئے آپ نے شاعری میں ان کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا صفی کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ ؎

کھینچتے ہیں یوں وہ تصویرِ خیالی نظم میں
شاعری کے فن میں گویا مانی و بہزاد ہیں
خوش کلام ایسے ہیں وہ سننے کو ہو جاتے ہیں ا
گوش ان ۔۔۔ گی جو گنگ مادر زاد ہیں
۔۔۔ فن پر ہو بھلا ان کو عبور
طالبا آخر تو استادوں کے وہ استاد ہیں

طالب کو دینی معاملات اور قومی تحریکات سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ وہ جب تک لکھنؤ رہے قومی جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ انجمن وظیفہ سادات و مومنین کے بھی سرگرم ممبر تھے۔ اس کے اجلاس میں بھی شرکت کرتے تھے۔

طالب کی مرثیہ نگاری کا ذکر یوں تو اکثر بزرگوں کی زبانی سنا ہے۔ ڈاکٹر امام مرتضٰے نے اپنے مضمون "طالب امروہوی کی مثنوی خورشید پیکر" میں بھی اس طرح ذکر کیا ہے۔ "طالب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی اور عمر کے آخر زمانے میں مرثیے بھی کہے مگر افسوس کہ ان کا تمام غیر مطبوعہ کلام تلف ہو گیا۔" (ندائے عوام مظفر پور بہار



سید اصغر حسن طالب (مرحوم)

بنامِ خداوندِ روزِ ازل!
کہ جس کو نہیں ہے منام واجل
وہ فانی نہیں حی و قیوم ہے
بظاہر وہ نظروں سے معدوم ہے
وہ لاریب ہے بے شریک و سہیم
سمیع و بصیر و قدیر و علیم

مناجات کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدایا میں بے کس تو رب کریم
گنہگار ہوں تو غفور الرحیم
گناہوں سے اپنے میں ہوں شرمسار
ترے عفو و بخشش کا امیدوار

مناجات کے بعد نعت کے کچھ اشعار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا حق نے پیدا محمدؐ کا نور
نہ تھا جب زمیں آسماں کا ظہور
ستارے تھے روشن نہ تھا آفتاب
کہ پیدا کیے اس سے بارہ حجاب
کیا ظاہر اس طرح پھر سربسر
کہ نامِ محمدؐ لکھا عرش پر
محمدؐ جو ہیں باعثِ ہست و بود
ہزاروں سلام اور ان پر درود

نعت کے بعد منقبت علیؑ کا بیان کرتے ہیں ؎

الٰہی قلم کو مرے نور دے

کہ قرطاس پر جلوۂ طور دے

علیؑ سا نہیں کوئی بعدِ نبیؐ

بہ حکمِ خدا ہے نبیؐ کا وصی

علیؑ کا نہ سمجھا کوئی مرتبا

خدا اور رسولِ خداؐ کے سوا

اس کے بعد حضرت آدمؑ سے حضرتِ ابرٰہیمؑ تک کا ذکر کیا ہے۔

لکھنؤ میں مرثیہ نہیں پڑھا۔ برجیس کی سب سے زیادہ قدر اہل حیدرآباد نے کی اور وہ بھی دکن کو بھگا دلسے متاثر تھے۔ انھوں نے امروہہ کے علاوہ شاید سب سے زیادہ مرثیے حیدرآباد ہی میں پڑھے ہوں گے۔ اہل دکن کے ذوقِ سماعت کی تعریف انھوں نے مندرجہ ذیل رباعی میں کی ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

سرور پہ فدا ہوں اہل دیں ایسے ہوں — مجلس میں ہو نور مہ جبیں ایسے ہوں
کیوں اہل دکن سے ہم نہ خوش ہوں برجیس — خود کانِ سخن ہیں سامعیں ایسے ہوں

برجیس نے نہ صرف حیدرآباد کی مجالس میں اپنے مراثی پڑھے ہیں بلکہ وہاں انکے مراثی شائع بھی ہوئے ہیں۔ نسیم امروہوی کی کمسنی تھی کہ سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا، جب ہوش سنبھالا تو والد کا کلام منتشر ہو چکا تھا اس کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ راقم الحروف نے بڑی تلاش کے بعد امروہہ اور حیدرآباد سے برجیس کے سات مراثی حاصل کئے ہیں جب کہ تمام مورخین نے برجیس کے مراثی کی تعداد کم سے کم ١٤ لکھی ہے۔ راقم جن مراثی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے ان کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں۔

نوید گلشنِ فردوس ہے ولائے علیؑ — بہشت و کوثر و تسنیم ہے عطائے علیؑ
جو کردگار کی مرضی وہی رضائے علیؑ — خدا کی حمد ہے نام خدا ثنائے علیؑ

یہ ذکر بندگی بے نیاز ہے واللہ
بشر کو ان کا وظیفہ نماز ہے واللہ

اس مرثیے میں ١١٦ بند ہیں اور سید محبوب حسین خاں نے سید حسن رضا خاں رضا کے بستے سے راقم کو دیا ہے۔ معرکتہ الآرا مرثیہ ہے۔ برجیس نے اس میں اپنی طبع کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ دوسرے مرثیے کا مطلع اس طرح ہے۔

نہر پہ جب لبِ حیدرؑ صفدر آیا — دیکھا بہتے ہوئے پانی کو تو دل بھر آیا
شیر کی طرح سے دریا میں فرس در آیا — خضر بولے لبِ ساقیِ کوثر آیا

نہر پر جا کے بھی پانی نہ پیا غازیؑ نے — سلامی ۱۱

چھلک کے مشکیزے کو پرِ آب کیا غازی نے

یہ مرثیہ ہلال نقوی نے کراچی میں کسی اہلِ امروہہ سے حاصل کر کے دیا ہے۔ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے۔ جنگ، رجز، تلوار وغیرہ کا بیان بہت عمدہ ہے۔ برجیس کے تیسرے مرثیہ کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

عباسؑ علیؑ یوسفِ بازارِ وفا ہیں — حضرت کے ولی، داعیِ تعلیم ولا ہیں
دریائے عطا ہیں، خضرِ راہِ رضا ہیں — فرزند پیمبرؐ کی سپر، سیفِ خدا ہیں

اس بحرِ سخاوت کا یہی پاٹ رہے گا
اس سیف کے قبضے میں صدا گھاٹ رہے گا

یہ مرثیہ منشی ضمیر الحسن دانشمند کے بستے سے ان کی اہلیہ نے راقم کو عنایت فرمایا تھا۔ برجیس کا چوتھا مرثیہ مطبوعہ ہے جو حیدرآباد دکن سے حاصل ہوا ہے۔ "ہلالِ محرم" موسوم بہ اسمِ تاریخی "شمشیرِ ماتم" ۱۳۳۱ھ سالِ اشاعت ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۶ء، شائع کردہ کتب خانہ حیدری چھتہ بازار حیدرآباد میں شامل ہے۔ مرتب شیخ ابو القاسم حسام ہیں۔ مطلع اس طرح ہے۔

صد شکر کہ مداح ہوں میں آلِ نبیؐ کا — بھولے سے بھی واصف نہ ہوا اور کسی کا
قائل ہوں جو شبیرؑ کی عالی نسبی کا — دم بھرتا ہوں میں عشقِ حسینؑ ابنِ علیؑ کا

رکھتا نہیں میں کام کسی اہلِ جہاں سے
میں آلِ محمدؐ پہ فدا ہوں دل و جاں سے

یہ مرثیہ جناب زینبؑ کے حال کا ہے۔ برجیس کا پانچواں مرثیہ امروہہ کے مشہور مرثیہ خواں سید کاظم حسین (عرف کھلو) نے راقم کو عنایت فرمایا ہے، اس مرثیے میں ۴۳ بند ہیں اور بقلم حیدر بخش حیدر (شاگردِ تمیم) ہے۔ تاریخ تحریر ۶ دسمبر ۱۹۰۸ء ہے۔ مطلع

مندرجہ ذیل ہے:

جب فوج کو بھگا دیا شاہِ انام نے ۔۔۔ تلوار کو نیام میں رکھا امام نے
بولے کہ ۔۔۔ ۔۔۔ اعدا آئیں سامنے ۔۔۔ تو آپ تیغ روک لی اس تشنہ کام نے

یہ شدتِ عطش ہے کہ حالت تغیر ہے
اک جام دو کوئی کہ مسافر اخیر ہے

برجیس کا چھٹا مرثیہ سید ابنِ حیدر رشید مرحوم گھیر کرم علی خاں امروہہ کے بستے سے حاصل ہوا ہے۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

بلبلِ گلشنِ اعجاز بیانی ہوں میں ۔۔۔ صیقلِ آئینۂ حسنِ معانی ہوں میں
ہند میں بلبلِ شیراز کا ثانی ہوں میں ۔۔۔ محوِ گلگشت ریاضِ ہمہ دانی ہوں میں

کیوں نہ ہر شعر مرا فرد ہو رنگینی میں
دل پہ گل کھائے ہیں اس باغ کی گل چینی میں

برجیس کا ساتواں مرثیہ جو راقم کو حاصل ہوا ہے وہ منشی ضمیر الحسن نقوی کی اہلیہ مرحومہ نے عنایت کیا تھا۔ شروع کے ۴ صفحات نہیں ہیں لیکن ان کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیے میں ۱۰۹ بند ہوں گے۔ شروع کے ۱۶ بند نہیں ہیں باقی ۹۳ بند موجود ہیں۔ یہ مرثیہ، برجیس کی زندگی کا آخری مرثیہ ہے اور برجیس کی ہی تحریر میں ہے۔ مرثیے کے آخر میں لکھا ہے "مصنف و محررہ ماہِ شوال ۱۳۳۰ھ ہجری در بلدۂ حیدر آباد دکن بقلم برجیس"۔ ۲۸ شوال ۱۳۳۰ھ کو برجیس کی وفات ہو گئی۔ مرثیہ کا مطلع نہیں مل سکا۔ مقطع اس طرح ہے۔

اب کہیں بازوئے سلطانِ مدینہ فریاد ۔۔۔ بہر برجیس یہ غم اور یہ قرینہ فریاد
یہ مصیبت، یہ تلاطم میں سفینہ فریاد ۔۔۔ سخت آفت میں ہوں سقائے سکینہ فریاد

جلد اس قیدِ غم و رنج سے آزاد کرو
شاہ کی پیاس کا صدقہ مری امداد کرو

اس مرثیے پر شمیم کی اصلاح لگی ہے جسے دیکھنے کے بعد شمیمؔ کی قادر الکلامی اور استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔

برجیسؔ کا آٹھواں مرثیہ سید طیب حسین ستّو امروہہ سے حاصل ہوا۔ مطلع ۱۴ بند ہیں تحریر سید توقیر حسین نقوی کی ہے۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

اسیر ہو کے جو مختار قید سے چھوٹے　　سُنا کہ عابدؑ بیمار قید سے چھوٹے
جفائیں سہہ کے دل افگار قید سے چھوٹے　　مصیبتوں کے گرفتار قید سے چھوٹے

نبیؐ کے شہر میں دم بھر کسی کو چین نہیں
وہ کس کا گھر ہے جہاں ماتم حسینؑ نہیں

برجیسؔ کے نویں اور دسویں مرثیے کے مطلع مندرجہ ذیل ہیں۔ یہ مراثی محبوب حسن خاں امروہہ کے پاس ہیں۔

ع۔ مژدہ گلشن جنت ہے ولائے حیدر

ع۔ یا خدا زیست میں فردوس کا گلزار ملا

برجیسؔ نے اپنے مراثی کے مقطعوں میں یا تو اپنی شاعری پر تبصرہ کیا ہے یا پھر زیارات کی دعا کی ہے۔ چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

چلد برجیسؔ دل افگار بس اب روک قلم　　حال عباسؑ علمدار کیا خوب رقم
اس تری نظم سے راضی ہوئے سلطان امم　　اب یہ کر عرض کہ اے قبلۂ ارباب کرم

روح بے چین ہے راحت کی جگہ مل جائے
روضۂ پاک میں تربت کی جگہ مل جائے

مایوس پھر گئی وہ کنیز شہ ھدیٰ　　چاہا نہ اہل بیت نے احسان غیر کا
آخر ہوا وہ ظلم کہ جس پر ہے یہ بکا　　زہرہؑ کا گھر تباہ ہوا وا محمداؐ

برجیسؔ خاک اڑا ترے آقا گذر گئے

زہرا کا گھر اجڑ گیا شبیرؑ مر گئے

جلد برجیسِ دلِ افگار یہ کر حق سے دُعا
واسطہ قاسمِ نوشاہ کا اے ربِّ علیٰ
قیدِ اندوہ و غم و رنج سے کر مجھ کو رہا
ایک میں بے کس و تنہا ہوں، ہجومِ اعدا

اس ہجومِ غم و ہم میں کوئی غمخوار نہیں
کوئی بے کس کا سوا تیرے مددگار نہیں

میانِ بزم ہے رقت کا جوش اے برجیس
امامِ عصر ہیں محوِ خروش اے برجیس
نہ اب حواس ہیں سالم نہ ہوش اے برجیس
یہ ذکر ہو نہیں سکتا خموش اے برجیس

غرض بیانِ غمِ اہلبیتؑ آساں نیست
حکایتست کہ آخر الیشرح پایاں نیست

ایک مرثیے میں برجیس اپنے فن، اپنی شاعری، مدح خوانی اور اپنے قلب کی کیفیت بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ۔

جس کو کہتے ہیں شفق وہ گلِ تر اس کا ہے
گلِ خورشید جو پُر ضو ہے وہ زر اس کا ہے
میوۂ گلشنِ فردوس ثمر اس کا ہے
عرشِ اعلیٰ سے جو اعلیٰ ہے وہ گھر اس کا ہے

اسی گلشن میں محمدؐ کا پتہ ملتا ہے
اسی گلزار میں ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے

برجیس نے اپنے مراثی میں جنگ کا بیان خاص طور سے کیا ہے جس میں جنگ کی تیاری جنگ کی ابتدا اور میدانِ جنگ کا منظر نہایت دل چسپ اور فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ جنگ کا آغاز اور منظر ملاحظہ ہو۔

مشک بھر کے جو چلا نہر سے شید اے امام
بھڑ پڑے جنگ فراہم ہوا سب لشکرِ شام
پھر دغا کرنے لگا فدیۂ سلطانِ انام
پھر چمکنے لگی بجلی کی طرح رن میں حسام

پھر سرِ نحس لعینوں کے جدا ہونے لگے

پھر شقی تیغِ شرر دم سے فنا ہونے لگے

اُف رے ہیبت کہ سبھی فوجِ جفا مخفی تھی | اک فقط فوج ہی کیا خلقِ خدا مخفی تھی
فرطِ ہیبت سے حبابوں میں ہوا مخفی تھی | اور چرندوں کا تو کیا ذکر قضا مخفی تھی

وقتِ آمد کوئی دہشت سے سبکدوش نہ تھا
موت کیسی ملک الملکوت کو بھی ہوش نہ تھا

پھل کو تلوار تو پھولوں کو سپر ڈھونڈتی تھی | تیغیں تھیں میان میں پر فوجِ عمر ڈھونڈتی تھی
دم بدم عمرِ رواں راہ گذر ڈھونڈتی تھی | مردمِ چشم کو آنکھوں میں نظر ڈھونڈتی تھی

کون وہ فردِ بشر تھا جو ذرا سا نہ رہا
اپنی صورت کا بھی انساں بنا سا نہ رہا

دفعتاً دھک سے جگر ہو گئے۔ افسر کانپے | سب ترائی کے جواں خوف سے تھر تھر کانپے
طیر گو مائلِ پرواز ہوئے پَر کانپے | ہمہمہ سن کے کچھاروں میں غضنفر کانپے

غل اٹھا ضیغمِ ضرغامِ صمد گونجتا ہے
دشت میں شیرِ الٰہی کا اسد گونجتا ہے

کہیں جلاد طپاں اور کہیں بسمل قاتل | کہیں خونخوار جو بیدم، کہیں گھائل قاتل
ہر طرف غل ادھر آ پیار کے قابل قاتل | کہیں ہے ہے، کہیں اُف اُف، کہیں قاتل قاتل

شور تھا دل تری فرقت میں جلے۔ ملتی جا
ہم بھی مرتے ہیں ذرا ٹھہر کے گلے۔ ملتی جا

حق نے فرمایا اب اپنا بھی کوئی وار تو روک | ہم نے تنور دکے مکار تو دو چار تو روک
اپنی شمشیر پہ یہ برقِ شرربار تو روک | بزدلوں ڈھال پہ شیروں کی بھی تلوار تو روک

او لعیں دیکھ کہ ظہر زا اسد اللہ یہ ہے
سامنے ہے ہت جھٹ بھی کہیں شانِ ید اللہ یہ ہے

شیر چلایا کہ او فوج کے سردار نہ بھاگ   ہر طرف شور ہے مالک کے نمک خوار نہ بھاگ
حاکمِ شام سے خونخوار کی تلوار نہ بھاگ   اب ترا وقت قریب آگیا فرار نہ بھاگ
شیر کا خون تو پانی پہ بہا لے۔ تھم جا
مشک تو چھین لے او بھاگنے والے۔ تھم جا

اُدھر خدنگ، اِدھر تیغِ شعلہ بار چلی   سپاہِ شام پہ اڑ اڑ کے بار بار چلی
لچک کے ناز سے جس دم وہ گلعذار چلی   پکارنے لگے موذی کہ ہم کو مار چلی
ریاضِ دہر سے دوزخ کی سمت ریلتی ہے
مثالِ موت یہ ناگن سروں پہ کھیلتی ہے

مثالِ کوہ فرس سے گرا جو وہ سفاک   اٹھی زمین سے تعظیم ہر زہ گرد کو خاک
ذرا سنبھل کے جو بیٹھا وہ ظ[illegible]   کلیل کرنے لگا اس کا توسنِ چالاک
بھڑک کے [illegible] نے سے طویلہ تڑا کے بھاگ گیا
شقی کی پشت پہ پشتک لگا کے بھاگ گیا

مرثیے میں جنگ کا بیان جب تک مکمل اور پوری طرح سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ تلوار کی تعریف کا بیان نہ ہو۔ طرح طرح سے شعرا نے تلوار کی تعریف کی ہے۔ اسے محبوب سے زیادہ خوب صورت، بجلی سے زیادہ تیز اور آفتاب سے زیادہ چمکدار بتایا ہے وہ دور بھی وہی تھا جب مبالغہ آرائی شعری محاسن میں شمار ہوتی تھی۔ آج کی قدریں مختلف ہیں، لہٰذا ہمیں شاعر کا عہد سامنے رکھ کر ہی اس کے کلام کا جائزہ لینا چاہیے۔ تلوار کی تعریف میں رحتیں کے بھی چند بند ملاحظہ ہوں۔

اپنی تلوار کا اک وار بشر روک تو لیں   جو بڑے گرم ہوں وہ پانی شرر روک تو لیں
سُور اس برق کو بالائے سپر روک تو لیں   گرچہ جبریل فرشتہ ہی پر روک تو لیں
اس کے پرتو سے بھی عالم پہ خطر چھایا ہے

یہ پری تیغ ید اللہ کی ہم سایہ ہے

جب کسی خود پہ بیٹھی تو جبیں تک پہنچی — دفعتاً چیں بہ جبیں قلبِ حزیں تک پہنچی
قلب الٹتے ہوئے رہوار کی زیں تک پہنچی — زیں کی نزہت کو مٹاتے ہی زمیں تک پہنچی
دم میں ساتوں طبقے ہل گئے وہ سیر ہوئی
گرچہ ماہی کے قریں پہنچی مگر خیر ہوئی

وہ حسینوں کی ادا اور وہ غنچہ دہنی — وہ نظر تیرِ ستم یا کوئی برچھی کی انی
تیغ تو مائلِ جور رنگ، جبری پنجتنی — سیف، سیفی ہے تو سیافِ کرامت کا دھنی
شیر شمشیرِ خدا برق شرر بار ہے یہ
سیف کی سیف ہے، تلوار کی تلوار ہے یہ

وہ نازکی، وہ ادائیں، وہ بانکپن اس کا — وہ شوخیاں، وہ شرارت بھرا چلن اس کا
وہ سرخ رنگ، وہ نکھرا ہوا بدن اس کا — نظر جھکائے جو خود دیکھ لے دلہن اس کا
عجیب حسن حسنِ کبریا نے بخشا ہے
علیؑ نے خود اسے اپنی بغل میں رکھا ہے

اس نے غصہ میں نظر بھر کے جدھر دیکھ لیا — آنکھ دکھلاتے ہی لاکھوں نے سقر دیکھ لیا
دل کو سینے میں اگر ایک نظر دیکھ لیا — دل یہ چلّایا ارے موت نے گھر دیکھ لیا
دم میں یہ خانۂ ویراں میں در آئی ہوگی
صاف کہتی ہے صفائی کہ صفائی ہوگی

مثالِ شاہِ نجف، غیظ میں بھری تھی حسام — لہو میں ڈوب کے بھی زہر سے بھری تھی حسام
علیؑ کو چرخ سے اتری تھی وہ کھری تھی حسام — دلہن تھی ناز میں، پرواز میں پری تھی حسام
عیاں ہے سب پہ یہی صاف اس کے قبضے سے
کوئی نکال تو لے قاف اس کے قبضے سے

کبھی کسی کے بدن میں سمائی جاں کی طرح	کسی کے منھ سے وہ نکلی کبھی فغاں کی طرح
اُبھر کے چلتی تھی معشوقِ نوجواں کی طرح	وہ شوخ رنگ، وہ پتلی کمر، وہ بانکی طرح
دلہن تھی یا کوئی معشوقِ لاجواب تھی وہ
مزہ تو یہ ہے کہ گھونگٹ میں بے حجاب تھی وہ

وفا شعار بھی ہے اور باوقار بھی ہے	خدا کی شان کہ طاؤس بھی ہے مار بھی ہے
یہ شعلہ بار بھی ہے، تیغ آبدار بھی ہے	گلے میں ہار بھی ہے اور گلے کا ہار بھی ہے
زمیں پہ پاؤں نہیں رکھتی اور چلتی ہے
شجر نہیں ہے مگر کھیت میں ہی پھلتی ہے

مرثیے میں جنگ، تلوار اور رجز، یہ تین اجزا ر وہ ہیں جن کا ایک دوسرے سے بہت قریبی تعلق ہے۔ اسی وجہ سے مرجیسیں کے ہاں مرائی میں رجز کا حصہ بھی کافی ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہم جو بگڑے تو یہ بن گلشنِ لالہ ہو گا	تیغ سے تختۂ عالم پہ اُجالا ہو گا
کفر ڈھل جائے گا، د... دبالا ہو گا	فوج میں پھر کوئی دستہ نہ رسالا ہو گا
ظلم و ظلمت نے شکست آج وہ پائی ہوگی
یک قلم صفحۂ ہستی سے صفائی ہوگی

تیغ چمکا کے جو ہم فوج پہ برہم ہوں گے	سب یہ لشکر کے جواں برہم و درہم ہوں گے
نہ تو زخموں پہ دوا اور نہ مرہم ہوں گے	یہ پرے کھیت سے اُٹھ جائیں گے پر ہم ہوں گے
داغِ حسرت، جگرِ فوج میں کھلتا ہو گا
حیدری شیر ترائی میں نہلتا ہو گا

صفوں میں آکے کہا صفدر و دلیر ہیں ہم	یہ ٹھیک پیاس ہے پر زندگی سے سیر ہیں ہم
پکارتے ہیں زبردست تم سے زیر ہیں ہم	جہاں میں بیشۂ شیر خدا کے شیر ہیں ہم

ہمارا مشکل کشا کون کائنات میں ہے

بتا دُزدِ یداللہ کس کے ہاتھ میں ہے

عدوئے نحس کا ہم منھ بگاڑ دیتے ہیں
پہاڑ میں بھی علم اپنا گاڑ دیتے ہیں

ہر ایک ظلم کی بستی اُجاڑ دیتے ہیں
جہاں سے کفر کی بُنیاد اکھاڑ دیتے ہیں

یہ تیغ وہ ہے کہ دیوؤں کے گھر اُجاڑے ہیں

یہ ہاتھ وہ ہیں کہ قلعوں کے در اکھاڑے ہیں

ساقی نامہ بھی کسی دور میں اردو مرثیے کا جزو بن گیا تھا اور شعراء نے ادھر خاص طور سے توجہ کی تھی۔ برجیس کے یہاں بھی ساقی نامہ ملتا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہاں مرے ساقی ہوش کوئی ساغر دینا
فاقہ مستوں کو مے طاہر و اطہر دینا

ہم کو صہبائے رسالت کا معطر دینا
ساقیا بادۂ تسنیم کا جوہر دینا

مے کی خوشبو صفتِ بوئے کباب اڑ جائے

الفتِ ساقیٔ کوثر کی شراب اڑ جائے

جس سے ایمان کا زنگ دل سے نکھر جائے وہ مے
جس کے چھینٹوں سے مرا داغِ جگر جائے وہ مے

شیشۂ دل میں پری بن کے اتر جائے وہ مے
جس کے ہر دور کی جنت میں خبر جائے وہ مے

جس کے پینے سے الم دور ہوں، آرام ملے

خلد میں ساقیٔ کوثر سے ہمیں جام ملے

بہار آئی ہے ہاں ساقیا شراب پلا
حساب کا نہیں کچھ خوف بے حساب پلا

ہوا میں آ لیے برجیس آفتاب پلا
مے ولائے جنابِ ابو ترابؑ پلا

دفورِ رشک سے شامی کباب ہو ساقی

حریفِ مست کی مٹی خراب ہو ساقی

مرثیہ جس کی ابتدا صرف رثائیت سے ہوئی تھی لیکن آہستہ آہستہ رزم و بزم اور

مدح و ثنا بھی اس میں شامل ہو گئی تو شعراء نے اپنے تخئیل کی پرواز کا مظاہرہ کیا۔ رزم کا میدان اور بزم کے جلوے نگاہوں کے سامنے پیش کر دیے۔ مدح و ثنا میں اپنے قلب کی اصل کیفیت اور سچی عقیدت کو الفاظ کی شکل دیدی۔ برجیس کو مدح کہنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ حضرت عباسؑ کی مدح میں چند بند ملاحظہ ہوں۔

یہ رشکِ قمر، آئینۂ روئے وفا ہے — سقائے حرم خضرِ بیابانِ ولا ہے
اِس شیر کو زورِ اسد اللہ ملا ہے — پھر کچھ قد و قامت تو علیؑ سے بھی سوا ہے
ایسا بھی زبردست کوئی شیر نہیں ہے
عباسؑ کے تو نام میں بھی زیر نہیں ہے

اس نام کے حرفوں میں بھی اک راز نہاں ہے — ہاں عین، علمداری لشکر کا نشاں ہے
بے کا یہ بیاں ہے کہ بہادر ہے جواں ہے — دل میں الفِ الفتِ سلطانِ جہاں ہے
ایماں کی طرح الفتِ شہ دل میں بھری ہے
پر سین سے سقائے سکینہ یہ جری ہے

حضرت علیؑ کی مدح بھی ملاحظہ ہو۔

نویدِ گلشنِ جنت ولائے حیدرؑ ہے — گدا کو شاہ کریں یہ عطائے حیدرؑ ہے
رضائے خالقِ یکتا رضائے حیدرؑ ہے — ثنائے حضرتِ باری، ثنائے حیدرؑ ہے
علیؑ کی مدح نہیں یہ خدا کی طاعت ہے
بشر کے واسطے ذکرِ علیؑ عبادت ہے

زہے شرف کہ فضائل کی انتہا ہی نہیں — نبیؐ کے بعد یہ اوج اور کو ملا ہی نہیں
جو منکر آپ کا ہے قابلِ خدا ہی نہیں — بجز علیؑ کوئی ہمنام کبریا ہی نہیں
زہے وقار کہ کیا اوج و احتشام ملا
نشاں رسولؐ سے پایا، خدا سے نام ملا

علیؑ کی مدح کے بعد برجیس علیؑ و نبیؐ دو نو ں کی مدح ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔

وہ شیخِ دیں ہیں تو روشن ضمیر ہیں حیدرؑ
نبیؐ ہیں شاہِ دو عالم، وزیر ہیں حیدرؑ
نبیؐ معینِ جہاں، دستگیر ہیں حیدرؑ
نبیؐ امیر، جنابِ امیر ہیں حیدرؑ

یہی رسولؐ کے نفسِ نفیس ہیں گویا
نبیؐ ہیں تن تو یہ راس الرئیس ہیں گویا

رسولؐ راہِ خدا ہیں تو راہ بر حیدرؑ
وہ آفتابِ کرامات ہیں، قمر حیدرؑ
رسولؐ اگر جسدِ شرع ہیں تو سر حیدرؑ
نبیؐ مدینۂ علمِ خدا ہیں، در حیدرؑ

رسولِ پاکؐ ہیں بدر الدجیٰ تو ضو ہیں علیؑ
نبیؐ ہیں شیشۂ حق اگر تو لَو ہیں علیؑ

رسولؐ آئینۂ حق ہیں، حق نما ہیں علیؑ
وہ خاص [illegible]ت رب، حجتِ خدا ہیں علیؑ
جو مصطفےٰ ہیں محمدؐ تو مرتضیٰ ہیں علیؑ
رسولِ پاکؐ ہیں والشمس، والضحیٰ ہیں علیؑ

رسولؐ خاتمِ دوراں ہیں اور نگیں حیدرؑ
رسولِ پاکؐ ہیں یٰسیں تو ہیں مبیں حیدرؑ

عہدِ میر انیس سے آج تک بہت سے شعراء نے اپنا تعارف، اپنے بزرگوں کا ذکر اور اپنی شاعری پر تبصرہ بھی مراثی میں پیش کیا ہے برجیس کے ہاں بھی ایسے کچھ بند ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

سخن شناس ہوں، ذی فہم ہوں، ذہین ہوں میں
خدا کی شان کہ مداحِ شاہِ دیں ہوں میں
جہاں میں ذاکرِ سلطانِ مومنیں ہوں میں
شمیم کے چمنستاں کا خوشہ چیں ہوں میں

مرے ریاض میں ہے گلشنِ نعیم کا رنگ
پکارتی ہے یہ خوشبو کہ ہے شمیم کا رنگ

اسی چمن کی ہوا سے میں باغ باغ ہوا
اسی کی بو سے معطر ہر اک دماغ ہوا

نگلوں کے سامنے گل طور کا چراغ ہوا مرے وقار پہ مہتاب کو بھی داغ ہوا

نظر ملائے قمر کب یہ اس کو یارا ہے

جہاں میں اوج پہ برجیس کا ستارا ہے

برجیس کے ہاں مکالمہ نگاری، منظر نگاری، واقعہ نگاری اور نفسیات نگاری بھی کافی پر تاثیر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مقصد کو پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ حضرت عباسؑ کی زبانی فرماتے ہیں کہ۔

تن کے نعرہ کیا تو جولشکر کے وہ زہرے نہ رہے اے عمر دیکھ تو وہ گھاٹ کے پہرے نہ رہے

بدحواسی میں نشانوں پہ پھریرے نہ رہے دل کو ٹھہرا کے دلاور بھی تو ٹھہرے نہ رہے

بخت الٹا تری قسمت میں برائی آئی

بے خبر شیر کے قبضے میں ترائی آئی

جنابِ قاسمؑ کی شہادت کے بعد ان کی بیوہ کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی اور کس طرح بین کئے، ملاحظہ ہو۔

اپنا سر پیٹ کے چلائی دلہن لاش کے پاس میرے ناشاد بنے اب میں رکھوں کس کی آس

میری تقدیر سے یہ بیاہ نہ آیا تمھیں راس ہے غضب خوں میں شرابور ہے شادی کا لباس

سب کہیں گے سببِ رنج والم ہے یہ دلہن

لٹ گیا باغِ حسنؑ سبز قدم ہے یہ دلہن

جنابِ عباسؑ کی شہادت کے بعد جنابِ سکینہؑ کے بین بھی برجیس نے بڑے دلخراش انداز میں بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ۔

سن کے یہ دخترِ سرورؑ نے کہا ہائے چچا مجھ سے منھ موڑ گئے ہائے چچا، ہائے چچا

ہو گئے وقتِ مصیبت میں جدا، ہائے چچا کیوں ہوئے اپنی بھتیجی سے خفا، ہائے چچا

کیا وہاں رہ گئے ہو میرے رلانے کے لئے

ننگے سر نہر پہ آئی ہوں منانے کے لئے

کربلا کی وہ بھیانک رات کہ جب خاندانِ رسولؐ، دینِ رسولؐ کو بچانے کیلئے قربانیاں پیش کر چکا تھا۔ مخدراتِ عصمت لٹنے کے بعد جلے ہوئے خیموں میں کم سن بچوں کو سنبھالے ہوئے تھیں اس رات کا ذکر برجیس اس طرح کرتے ہیں کہ۔

وہ دشتِ ظلم، وہ تنہائی، وہ اندھیری رات
وہ فکرِ و یاس، وہ پیاروں کے داغ، وہ سادات

علیؑ کی روح حفاظت کو یا خدا کی ذات
بہن سے زینبؑ دلگیر نے کہی یہ بات

حرم میں آپ ہیں بے کسوں کی نصرت کو
میں گردِ خیمہ پھروں رات بھر حفاظت کو

اس مختصر سی عمر میں برجیس اردو مرثیے کو جو کچھ بھی دے گئے وہ بہت ہے۔ یہی سب محفوظ رہ کر منظرِ عام پر آتا تو یقیناً ان کو تاریخ مرثیہ نگاری میں اہم مقام ملتا لیکن ان کی عمر نے وفا نہیں کی اور وہ شاعر جس سے سرزمینِ امروہہ کو نہ جانے کتنی امیدیں وابستہ تھیں پیوندِ خاک ہو گیا۔

برجیس کے ادبی سرمائے میں مراثی کے علاوہ سلام، نوحے، قصائد، قطعات، نعتیں اور رباعیات بھی ملتی ہیں۔ راقم الحروف کو برجیس کے تقریباً ۲۰ سلام امروہہ کے مختلف بستوں سے حاصل ہو سکے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یا درِ سبطِ نبیؐ کیا ہی دلاور نکلے
گو بہتر تھے پہ لاکھوں سے بھی بہتر نکلے

غربت عون و محمد پہ ملک رونے لگے
وہ جنازے جو بھرے گھر سے برابر نکلے

مرے جوہر کی گویا آبرو ہے قدردانوں سے
سخن کے جوہری، جوہر کو چن لیتے ہیں کانوں سے

مری ہر بیت سن کر لامکاں پر لے گئے قدسی
زمینِ شعر اونچی ہو گئی تو آسمانوں سے

فقیرو ... ہے — فقط ایک حیدرؑ کا در چاہیے
لکھیں ... وثنا — قلم کو فرشتے کا پر چاہیے
عریضہ تو ... لکھوالیا — مگر اب کوئی نامہ بر چاہیے

خلق میں جس کو ... سہارا مل جائے گا — اس کو راہِ حق کا سیدھا راستہ مل جائے گا
نامِ احمدؐ لے کے مانگا گرچہ کوئی مدعا — رحمتِ معبود نے فوراً کہا مل جائے گا
حشر میں برجیسؔ ذاکر کی ہی ہوگی شناخت — نامۂ اعمال کی جا مرثیہ مل جائے گا

ہوائے کربلا میں ہند سے بیزار بیٹھے ہیں — خدا پر دے تو ہم پرواز کو تیار بیٹھے ہیں
شبِ معراج کہتے تھے فرشتے کون آتا ہے — کہ موسٰیؑ بھی کسی کے طالبِ دیدار بیٹھے ہیں

لٹ گئی فاطمہ زہراؑ کی کمائی کیسی — واہ رے دشتِ بلا تیری بن آئی کیسی
کیوں بھلا خلق نہ تشبیہ کرے زہراؑ کی — آسیہؑ مائی میں کی ناصیہ سائی کیسی
عالمِ یاس میں کہتے تھے یہ رو ... ابدؑ — مر کے اب قید سے چھوٹیں گے رہائی کیسی

برجیسؔ کے سلاموں میں بھی ان کے مراثی کی طرح بڑی روانی اور برجستگی ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف ہے اور مضامین بہت واضح ہیں۔ برجیسؔ کے تقریباً ۱۰-۱۲ نوحے بھی راقم کو حاصل ہو سکے ہیں جو بڑے پُر تاثیر ہیں۔ برجیسؔ نے نعت و منقبت کے بھی چند یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زبانِ خدا اور دہن ہے محمدؐ — نثارِ محمدؐ، فدائے محمدؐ
زمانے سے پہلے خدا ہی خدا تھا — خدائی ہوئی جب کہ آئے محمدؐ
فرشتوں کی آنکھیں یہ بتلا رہی ہیں — وہ ٹھٹکے وہ ٹھہرے وہ آئے محمدؐ

گئے عرش پر تو فرشتے پکارے — وہ [illegible] محمدؐ
تماشہ تو دیکھو کہ دوزخ کی آتش — لگائے د[illegible] ئے محمدؐ
فرشتوں میں غل ہے یہ چرخِ بریں پر — وہ آئے محمد [illegible] ئے محمدؐ
زہے اوجِ برجیس اللہ اکبر — ہماری زباں او[illegible] ئے محمدؐ

(ماہنامہ "مجاہد" لکھنؤ)

برجیس نے رباعیات اور قطعات کافی تعداد میں کہے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔

کیا چیز ہیں ہم خاک کا تن، خاک کے ہاتھ — عزت ہے مگر صاحبِ لولاک کے ہاتھ
پانچ انگلیاں کہتی ہیں سمجھ لے برجیس! — روزی ہے تری پنجتنِ پاک کے ہاتھ

حضرت کے ہر اول کو تفاخر بھی ہوا — مشہور شجاعت میں تہور بھی ہوا
اللہ رے شبیرؑ کی بخشش برجیس — یاں آتے ہی حُرمت بھی ملی، حُر بھی ہوا

کج رو ہے نہ کوئی کج ادا ہے برجیس — خم ہے نہ ضعیفی سے دوتا ہے برجیس
کیونکر نہ کرے اس کی بزرگی کا لحاظ — پیری کے سلام کو جھکا ہے برجیس

برجیس نے جتنی کم عمر میں جتنا کلام کہا ہے اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ اور جن شعراء نے اتنا کہا ہوگا ان کے ہاں یہ پختگی ملنی مشکل ہے۔ اس لئے ہر آنے والا مرثیہ کا طالب علم یہی ملال کرے گا کہ کاش برجیس کی عمر کا ستارہ اتنی جلدی نہ ڈوبتا۔ کسی بھی باپ کی زندگی میں نوجوان بیٹے کی موت کتنی دردناک اور کرب انگیز ہوتی ہے اس کو وہی دل اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جن پر یہ مصیبت گذری ہو۔ نوجوان فرزند، جو لائق ہو، باپ کی آنکھوں کا تارہ ہو اور آسمانِ ادب کا برجیس ہو تو پھر شمیم امروہوی کا ہی قلب بتا سکتا ہے کہ کیا گذرے گی۔ برجیس کی وفات پر شمیم امروہوی نے ایک نظم فارسی میں کہی تھی۔ چند

اشعار ملاحظہ ہوں۔

پنہاں شدہ آں نور کہ سبحانِ سخن بود
جانِ زماں شمعِ شبستانِ سخن بود

صد حیف کہ بر جبیں زدار غبار رفتہ
در باغِ جہاں زیبِ گلستانِ سخن بود

شیرازۂ اوراقِ مضامیں شدہ برہم
واللہ کہ او مطلعِ دیوانِ سخن بود

معراجِ زحق یافتہ بر طورِ فصاحت
در اہلِ زباں موسیٰ عمرانِ سخن بود

طبعش صفت چشمۂ کوثر بہ روانی
شد آبروئے گوہرِ عمّانِ سخن بود

آموخت زفیضش کلمہ حسنِ معانی
جاں آمدہ در نظم کہ جانانِ سخن بود

در مدحتِ اولادِ نبی عمر بسر کرد
ایں ذاکرِ کامل فقط ایمانِ سخن بود

مانند نظامی و ظہیری و ظہوری
سلطانِ سخن، شانِ سخن، جانِ سخن بود

سید انیس حسن ہلالؔ

ہندوستان کے مشہور صوفی بزرگ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت کی اولاد میں ہونے کا شرف آپ کو حاصل ہے اسی رشتے سے آپ کا تعلق نقوی سادات سے ہے۔

سید انیس حسن ہلالؔ کے مورثِ اعلیٰ سید ابدال محمد تھے۔ جو محلہ دربارِ شاہِ ولایت (دلکڑہ) امروہہ کے ساکن تھے جہاں انہوں نے ایک شاندار مسجد ۱۱۴۱ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ نہایت متقی اور پرہیزگار ہونے کے سبب اسی مسجد میں مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ آپ نے گذرنے والے مسافروں کے لیے جملہ آرام و آسائش کے انتظامات کرادیتے تھے۔

سید ابدال محمد کا ذکر صاحبِ تاریخ اصغری نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"سید ابدال محمد منصب دار شاہی تھے۔ نواب دوندے خاں کے عہد میں بڑی عزت اور توقیر پائی۔ نواب ممدوح ان کو اپنا پیر کہتے تھے۔ سید موصوف نے ایک مسجد تعمیر کی اور کنواں بنایا اور شاہ عبدالرسول کا مقبرہ جن کو دہلی سے اپنے ہمراہ لاتے تھے مسجد مذکور کے احاطے میں بنوایا جس کا برج بہت خوبصورت ہے۔ تعلقاتِ دنیاوی کو ترک کرکے اسی مسجد کے ایک مکان میں گوشہ نشینی اختیار کی اور چالیس برس

عبادتِ الٰہی میں مصروف رہے۔ قرآن شریف حفظ تھا" (تاریخِ اصغری از اصغر حسین صفحہ ۱۷)
سید ابدال محمد ... و فاضل سید امیر حسن امیر
ہوتے۔ جن کے بعد اس ... سے ایسے ایسے چراغ روشن ہوتے جن کی
روشنی دور دور تک پہنچی۔ امیر حسن امیر کو "تاریخِ اصغری" نے بڑے سلیم الطبع شاعر اور
مورخ لکھا ہے۔ امیر حسن کی تصانیف میں "روضۃ الشہدا" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ
بہت مشہور ہے جس میں نثر کا منثور اور نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ ان کی تاریخِ وفات یکم جون
۱۹۱۰ء ہے۔ امیر کے فرزند سید نصیر حسن نصیر ہوتے۔ جو بڑے با اثر اور اہلِ علم تھے۔
امروہہ میونسپل بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ صاحب "تواریخ واسطیہ" ان کے بارے میں لکھتے
ہیں کہ

"یہ عربی خواں و فارسی داں خوش خط و ضع دار نیک کردار ہیں سلامتی ذہن و ذکاوت
و حسن طلاقت و نکوئی خصلت میں نام دار ہیں" (تواریخ واسطیہ از سید رحیم بخش صفحہ ۵۱۲)
نصیر حسن نصیر کے فرزند شفیق حسن ایلیا کی ڈائری کے مطابق ۱۹ ماہ صفر ۱۳۴۱ھ مطابق
۲۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء نصیر حسن نصیر کا انتقال ۶۹ سال کی عمر میں ہوا جس کی تاریخ امروہہ کے مشہور شاعر
علی تمکین تمکین نے مندرجہ ذیل کہی۔ جس میں نصیر حسن نصیر کے فرزندان سید نفیس حسن نفیس،
سید انیس حسن ہلال۔ سید وحید حسن وحید اور سید شفیق حسن ایلیا کا ذکر کیا ہے ؎

وحیدِ عصر تھے اخلاق و حلم میں مرحوم ۔۔۔ شفیقِ اہلِ ولا حامیانِ دینِ انیس
برنگِ گل تھے وہ ہر دل عزیز خندہ جبیں ۔۔۔ غمِ حسینؑ میں پڑھتے تھے کیا کتابِ سلیس
گذارے عمر کے کس لطف سے انہتر سال ۔۔۔ جوان و پیر و مسن کے بحسنِ خلق جلیس
بحدِ زیست میانہ روی کی چال چلے ۔۔۔ امیر کے تھے پسر پر تہ نہا مزاج رئیس

براتے سال یہ ہاتف نے دی صدا تمکیںؔ
بنا نصیر حسن کو جناں میں قصرِ نفیس

۱۳۴۱ھ

نصیر حسن نصیر کے دوسرے فرزند انیس حسن ہوتے۔ انیس حسن کو ان کے دادا امیر حسن امیرؔ اور والد نصیر حسن ... حسن کے باقی تین بھائی نفیس حسن نفیسؔ۔ وحید حسن گڈا اور شفیق حسن ... اس طرح پورے گھر کا شعری ماحول تھا۔

کتبِ تواریخ میں انیس حسن کی سن ولادت نہیں ملتی۔ البتہ ان کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں رئیس امروہوی لکھتے ہیں کہ "مجھلے تایا سید انیس حسن انیسؔ مرحوم تھے ان کا انتقال ۶ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ بروز دوشنبہ امروہے میں ہوا"۔ (معراجِ نفس رسول صفوی مطبوعہ پاکستان)

پروفیسر مختار حسین نقوی مرحوم کے بیان کے مطابق انیس حسن کا انتقال ۵۰ سال سے بھی کم عمر میں ہوا۔ انہوں نے تقریباً ۴۸ سال عمر پائی اس حساب سے انیس حسن کا سالِ ولادت تقریباً ۱۲۹۴ھ ہوا۔

انیس حسن کا تخلص ان کے بھتیجے رئیس امروہوی نے انیسؔ لکھا ہے لیکن انہوں نے اپنے زیادہ تر کلام میں ہلالؔ تخلص کا استعمال کیا ہے۔ ہلالؔ کی شاعری کے جہاں تک آغاز کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ جب پورا گھر شاعروں کا تھا تو اس ماحول میں پرورش، تعلیم اور تربیت پانے کے اثرات کم عمری سے ہی قائم ہونے شروع ہو گئے ہوں گے۔

ہلالؔ بہت نیک متقی اور پرہیز گار قسم کے انسان تھے۔ دنیا داری سے بے نیاز اور دنیاوی مال و دولت کی خواہش سے دور تھے۔ قناعت ان کا شیوہ اور توکل ان کا ایمان تھا۔ محبتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ میں سرشار رہتے تھے۔

ہلالؔ کا زیادہ تر کلام ضائع ہو گیا جس کی ایک وجہ تو یہ کہ ہلالؔ نے عمر بہت کم پائی دوسری وجہ یہ کہ دونوں فرزند سید رضا حیدر (جو محکمہ پولیس میں ملازم تھے) اور سید امیر حیدر کمال امروہوی (مشہور فلمی ہدایت کار) زیادہ تر امروہہ سے باہر رہے جس

کے نتیجے میں آبائی مکان میں بیاضیں بند رہنے کے سبب نمی اور دیمک کی نذر ہوگئیں۔ اور اس طرح زیادہ تر کلام تلف ہوگیا۔

ہلالؔ کے سلسلے میں بزرگ اہلِ محلہ کا بیان ہے کہ انہوں نے مرثیہ وسلام۔ نعت ومنقبت اور قطعہ ونوحہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہلالؔ کی شاعری میں غزل کے آثار نہیں ملتے لیکن اندازہ ہے کہ انہوں نے نوجوانی میں غزل ضرور کہی ہوگی۔ کیوں کہ ان کے دادا امیر حسن امیرؔ ہر صنفِ سخن پر قدرت رکھتے تھے اور ان کی غزلیں بھی موجود ہیں۔

ہلالؔ کے جو مراثی ضائع ہونے سے بچ گئے اور دیگر مرثیہ خوان حضرات کے بستوں سے حاصل ہوسکے جو یقیناً غیر مطبوعہ ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے راقم اس سلسلے میں ان کے پوتے شمیم رضا کے تعاون کا بھی شکر گزار ہے۔

ع دیکھ کر چاند محرم کا نمایاں زینبؑ۔ بند ۲۱

(بقلم سید انیس حسن تحریر ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ)

ع جس دم ادا نمازِ سحر کی امام نے۔ بند ۲۰

(بقلم سید منور حسین تحریر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

ع جب پیاس کی شدت ہوئی بے حد شہِ دیں پر۔ بند ۴۳

(بقلم سید انیس حسن ہلالؔ تحریر ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ)

ع جب سیدِ مظلوم اکیلے رہے رن میں۔ بند ۳۷

(بقلم سید انیس حسن ہلالؔ)

ہلالؔ چوں کہ خود اپنے وقت کے ایک اچھے مرثیہ خوان (سوز خوان) تھے اس لیے زیادہ امکان یہی ہے کہ انہوں نے جو اور مراثی کہے ہوں گے وہ بھی مجالس میں سوزخوانی کے طور پر پڑھنے والے ہوں گے۔ مندرجہ بالا مراثی بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان سے ہلالؔ کے فکر وفن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ واقعہ نگاری۔ جذبات نگاری جنظرنگاری

اور مکالمہ نگاری میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں زور ہے۔ روانی ہے اور الفاظ کی مضبوط بندش ہے۔

محرم کا چاند دیکھنے کے بعد جناب زینبؑ ایک بہن ہونے کے ناطے امام حسینؑ دیگر عزیزوں کے لیے کیا کیا دعائیں مانگتی ہیں اور اس وقت ان کے جذبات کیا ہیں ہلالؔ کتنے متاثر کن انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

میرے بھائی کو کبھی ہو نہ کوئی رنج و محن　　بچے جیتے رہیں سرسبز رہے یہ گلشن
لے کے سب کنبے کو ہمراہ چلیں سوئے وطن　　شاد و آباد ہمیشہ رہیں سلطانِ زمن
شور ہو خلق میں شبیرؑ کی یکتائی کا
نام قائم رہے دنیا میں مرے بھائی کا

اب دوسری جانب محرم کا چاند دیکھ کر بھائی کا بیان بھی ہلالؔ کی زبانی ملاحظہ ہو ؎

اس طرف تو یہ دعا کرتی تھی بنتِ حیدرؑ　　اس طرف دیکھتے تھے چاند شہ جن و بشر
التجا کرتے تھے اللہ سے یہ رو رو کر　　راہ میں تیری شہادت ہو مری اے داور
میرے زہراؑ کو نصیب ایسی سعادت ہووے
قتلِ شبیرؑ سے امت کی شفاعت ہووے
صبر اور شکر کی یہ دولتِ نایاب ملے!
بدلے پانی کے مجھے خنجرِ بے آب ملے
صابر ایسا ہو جو پیاسا ہو تو ایسا ہووے
ایسے نانا کا نواسہ ہو تو ایسا ہووے
دھیان بیٹے کا نہ بیٹی کا نہ ہمشیر کا ہو
ذکر تہلیل کا تسبیح کا تکبیر کا ہو

ہلالؔ نے اپنا پہلا مرثیہ کسی پرانے استاد شاعر کے مطلع پر کہا ہے اسی لیے

اس کے مقطع میں کہتے ہیں کہ ؎

سخن ، یہ اسی احقرِ ناشاد کا ہے
مرثیہ میرا ہے مطلع کسی استاد کا ہے

ہلالؔ کا دوسرا مرثیہ جس کا مطلع ہے ؎

ع جس دم ادا نمازِ سحر کی امام نے

اس مرثیے میں ہلالؔ نے امام حسینؑ سے جناب زینبؑ کے مکالمے نظم کئے ہیں اور آخر میں امام کی شہادت نظم کی ہے۔

جناب زینبؑ فرماتی ہیں ؎

بھیا خبر جو کوچ کی اپنے سناتے ہو!
زینبؑ کو کس کے آسرے پہ چھوڑے جاتے ہو

امام حسینؑ جواب دیتے ہیں ؎

صبر کرو صبر اے بہن
ہوگا وہی جو چاہے گا معبود ذوالمنن

ہلالؔ کا تیسرا مرثیہ جس کا مطلع ہے ؎

ع جب پیاس کی شدت ہوتی بے حد شہِ دیں پر

اس میں ہلالؔ نے امام حسینؑ کا وہ خطبہ نظم کیا ہے جو امام عالی مقام نے فوجِ یزید کے سامنے دیا اور ظلم و جور سے باز رہنے کو کہا ؎

حالت پہ مری چھوڑ دو مجھ تشنہ دہن کو
گر راہ تمہاری ہو تو پھر جاؤں وطن کو
کیوں دریئے آزار مرے ہوتے ہو یارو
دنیا کے عوض دین کو کیوں کھوتے ہو یارو

یہ مرثیہ ۱۳۲۵ھ کی تحریر ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس سے کتنی سال پہلے کی تصنیف ہو۔ یعنی تقریباً ۸۰ سال قبل کا بلالؔ کا یہ انداز ہے جس میں بلالؔ نے 'یارو' کا استعمال کیا ہے جو آج کے جدید مرثیہ نگار اپنا رہے ہیں۔ ورنہ اس دور میں عموماً عزادارو۔ اہلِ عزا اور مومنو کا استعمال ہوتا تھا۔ دراصل بلالؔ ایک نیا ذہن رکھتے تھے۔ اور یہاں غیر شعوری طور پر ان کے ہاں اسلوبِ جدید کی جھلک پیدا ہو گئی ہے۔

امامِ عالی مقام فوجِ یزید سے حجت تمام کر کے اپنے خیمے کی جانب واپس آتے ہیں ؎

یہ کہہ کے چلے جانبِ خیمہ شہِ والا — تھا پیاس کی شدت سے کلیجہ تہ و بالا
سنبھلا نہ گیا آپ کو ہر چند سنبھالا — بے ساختہ نکلا دہنِ خشک سے نالا

پہنچی جو صدا بھائی کی گھبرا گئیں زینبؑ
فوراً درِ خیمہ کے قریب آگئیں زینبؑ

اس کے بعد ایک مومنہ کا امام حسین [illegible] زینبؑ کی زیارت کے اشتیاق میں کربلا پہنچنا زیارت کرنا اور امام کا اس کے سر [illegible] نا نظم کیا ہے۔ اس کے بعد امام میدانِ کارزار کی جانب روانہ ہوتے وقت فرماتے ہیں کہ ؎

لو جاتے ہیں بس اب تمہیں اللہ کو سونپا
گھر فاطمہ زہراؑ کا ید اللہ کو سونپا

لیکن وہ مومنہ امام کی روانگی سے پہلے مخاطب ہو کر اپنا تعارف اس طرح کراتی ہے

ع وہ بولی میں کیا عرض کروں اے شہِ ابرار
ع اک قافلے کے ساتھ یہاں آئی ہے لونڈی
ع میرا بنی ہاشم کے محلے میں مکاں ہے

اور زینبؑ خاتون جو ہے دخترِ زہراؑ
کھیلی ہوں لڑکپن میں میں ساتھ اسی کے ہمیشہ
آتا ہے مرا احمدؐ و حیدرؑ کی نشانی
شبیرؑ ہے نام اور ہے زہراؑ کا وہ جانی

اس وقت مگر اس کی بڑی ہے مجھے حیرت
آقا ہے مرے آپ مشابہ ہیں نہایت
ہے فرق بس اتنا کہ جواں ہیں مرے حضرت
اور آپ کی اس وقت ضعیفی کی ہے حالت

ہے پشت بھی خم آپ کی اور زرد جبیں ہے
لیکن لب و لہجہ میں تو کچھ فرق نہیں ہے
یہ دشت کہاں اور کجا سیدِ والا
اللہ رکھے ان کو مدینے میں ہمیشہ
آرام سے یثرب میں وہ شاہِ دو جہاں ہو
خالق کرے ہرگز نہ صحیح میرا گماں ہو
طرز آپ کا اب ہوش مرے کھوتا ہے بی بی
تم پر مجھے زینبؑ کا گماں ہوتا ہے بی بی

مومنہ کی یہ گفتگو سن کر جب امام سے ضبط نہ ہو سکا تو مخاطب ہوتے ہیں

اے مومنہ زینبؑ یہی آوارہ وطن ہے
شبیرؑ ہوں میں اور یہی میری بہن ہے
ہم کون ہیں افسوس نہیں جانتے ہم کو
اب دوست بھی اپنے نہیں پہچانتے ہم کو

اس کے بعد مومنہ سے سب کی شہادت کا بیان کیا اور اس طرح مقطع پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے ۔

حالِ حرمِ شاہ بلالؔ اب نہ بیاں کر
کافی ہوا مجلس کا ملالؔ اب نہ بیاں کر

بلالؔ کے چوتھے مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

جب سیدِ مظلوم اکیلے رہے رن میں وہ زخم لگے جسمِ شہنشاہِ زمن میں
طاقت نہ رہی فرطِ جراحت سے بدن میں لکنت تھی زباں خشک تھی کانٹے تھے دہن میں
تھا درد کمر بھائی دلاور کے الم میں
اور ضعفِ بصر تھا علی اکبرؑ کے الم میں

اس مرثیے میں بھی بلالؔ نے ایک مومنہ کی روایت بیان کی ہے۔
ایک بیت ملاحظہ ہو امام حسینؑ فرماتے ہیں ؎

مرجاؤں تو آکر تنِ صد پاش پہ رونا
جی کھول کے پھر بھائی کی تم لاش پہ رونا

یہ مرثیہ بھی بلالؔ کی مکالمہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔
مومنہ جنابِ زینب سے مخاطب ہے کہ ؎

کیا غم ہے جو یوں ہاتھ کلیجے پہ دھرا ہے
کہتے تو یہ ماتھے پہ لہو کس کا ملا ہے

جنابِ زینبؑ جواب میں فرماتی ہیں کہ ؎

پالا تھا جنہیں وہ بھی سفر کر گئے بی بی
ماتھے پہ لہو جن کا ہے وہ مر گئے بی بی

امام حسینؑ کی میدان میں جانے کے لئے خیمے سے رخصت سے پہلے ہی مرثیہ کا اختتام ہو جاتا ہے۔
اب آگے بلالؔ ان کی مصیبت نہ بیاں کر
شبیرؑ کی ہمشیر سے رخصت نہ بیاں کر

ہلال کے ان مراثی میں جو مرثیہ… مر اس سے کوئی بھی اہلِ نظر انکار نہیں کرسکتا۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرثیے کا مزاج… ہوتے تھے۔ مرثیہ ان کے خمیر میں داخل تھا اور یقیناً انہوں نے کافی مرثیے بھی کہے ہوں… جو وقت کے ہاتھوں تلف ہوگئے۔

ہلال کے اخلاف میں بڑے فرزند سید رضا حیدر مرحوم اور ان کی اولاد کو شعر وسخن سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ البتہ چھوٹے فرزند سید امیر حیدر کمال امروہوی نہ صرف علم دوست ہیں بلکہ صاحبِ قلم بھی ہیں جس کے سبب ہندوپاک میں فلمی صنعت میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ کمال امروہوی کے پسران میں شاندار کمال کا بھی فلمی صنعت سے تعلق ہے اور چھوٹے پسر تاجدار امروہوی ڈرامہ اور افسانے میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں امید ہے آگے چل کر ایک بڑے قلم کار بنیں گے۔ کمال امروہوی کی دختر رخسار کمال کو ضرور اپنے بزرگوں سے شاعری ورثے میں ملی ہے اور شاعری کے میدان میں رخسار کی یہ پانچویں پشت ہے۔

سید اظفر حسین منتظرؔ

منتظرؔ کا سلسلۂ نسب سید میر محمد عدل سے ہو کر حضرت شرف الدین شاہ ولایتؒ سے ملتا ہے۔ منتظرؔ کے والد سید اختر حسین اخترؔ عمدہ خوشنویس اور اچھے شاعر تھے۔ منتظرؔ کی ولادت ۱۸۶۷ء میں امروہہ میں ہوئی اور ۲۱ مارچ ۱۹۵۰ء کو انتقال ہوا۔ منتظرؔ کا قیام حویلی اعظم خاں جامع مسجد دہلی میں کافی عرصہ رہا اور وہاں انھوں نے نہ صرف شاعری بلکہ خوشنویسی میں بھی شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ بھوپال اور جوناگڈھ کی ریاست سے بھی منسلک رہے اور نوابین کے دربار میں عزت حاصل کی۔ دہلی کے قیام کے دوران دیوان سنگھ مفتون کے اخبار "ریاست" سے بھی وابستہ رہے۔

منتظرؔ کے اُستاد ان کے ماموں سید لائق حسین قویؔ تھے جس کا ذکر منتظرؔ نے اس طرح کیا ہے۔

فیضِ قویؔ سے زود رس پایا کلام نے
دنیا میں منتظرؔ کا ہے ڈنکا بجا ہوا

رے شا

شباب، مصور حسن نجم، محمد رجا، ۲۱، نظرا نکار نہیں کرسکتا۔

آفاق زمانی، احسان ... پیارے منور، بیگم نواب جوناگڑھ وغیرہ

تھے۔

منتظر کے ایک پسر سید اشہر حسین ہوئے جو پاکستان ہجرت کر گئے تھے وہیں انتقال ہوا۔ منتظر کی اکثر غزلیات اس دور کے رسائل "معیار سخن" اور "سوز و ساز" میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کا قلمی ... ان کے عزیز ... محمد رضا صاحب کے پاس موجود ہے۔ جس میں تقریباً ۱۲۵ غزلیات، دس قصائد، پانچ سلام، چند قطعات و رباعیات اور مناجاتوں کے علاوہ ایک قدیم رنگ کا مرثیہ ہے جو منتظر کی اپنی تحریر میں ہے اور انہوں نے اسے مرثیہ لکھا ہے۔ مطلع ہے

پانی کے لئے ہیں ما... سکینہ ہے شور حرم میں

روتے ہیں اسے دیکھ کے سرداد مدینہ ہے شور حرم میں

یہ مرثیہ مسدس کی ہیئت میں نہیں ہے۔ اردو مرثیہ کے ابتدائی دور میں جس رنگ میں مرثیے لکھے گئے اس مرثیہ کا وہی انداز ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عباسؑ علی لیتے ہیں سرتیں اجازت اور ہوتے ہیں رخصت

ماتم ہے بپا پیٹتے ہیں سب سر و سینہ ہے شور حرم میں

کٹ کر جو گرے ہاتھ تو مضطر ہوئے عباسؑ، جیتے سے ہوئی یاس

مشکیزے پہ تیر آ کے لگا چھن گیا سینہ ہے شور حرم میں

خیمے میں علم آیا ہے اک حشر بپا ہے، فریاد و بکا ہے

بے ہوش ہیں زینبؑ کہیں غافل ہیں سکینہ ہے شور حرم میں



سید اظفر حسین منتظر

ے گئے اس مرثیہ

ار ملاحظہ ہوں۔

لیتے ہیں مرثیہ کی اجازت او

ے پیا چھٹے ہیں

آ مفط

...جن میں اُستادانہ پختگی ہے۔

چند اشعار...

کربلا میں کاش بن جائے مرا ... سر
... ہو خاکِ شفا بھی، دامنِ شبیرؑ بھی

یہی اسمائے اعظم منتظرؑ کے دل پہ کندہ ہیں
کہ جو تھے نوحؑ کی کشتی میں انگشتِ سلیمانؑ میں

علیؑ آقا، علیؑ مولا، علیؑ مونس، علیؑ ہمدم
علیؑ شوکت، علیؑ صولت، علیؑ ہمت، علیؑ جرأت
علیؑ ظاہر، علیؑ باطن، علیؑ مضمر، علیؑ مظہر
علیؑ ناطق، علیؑ صامت، علیؑ قرآں، علیؑ ...ورت

بقدرِ حوصلہ ملتا ہے ...
وہ موتی بن کے نکل...

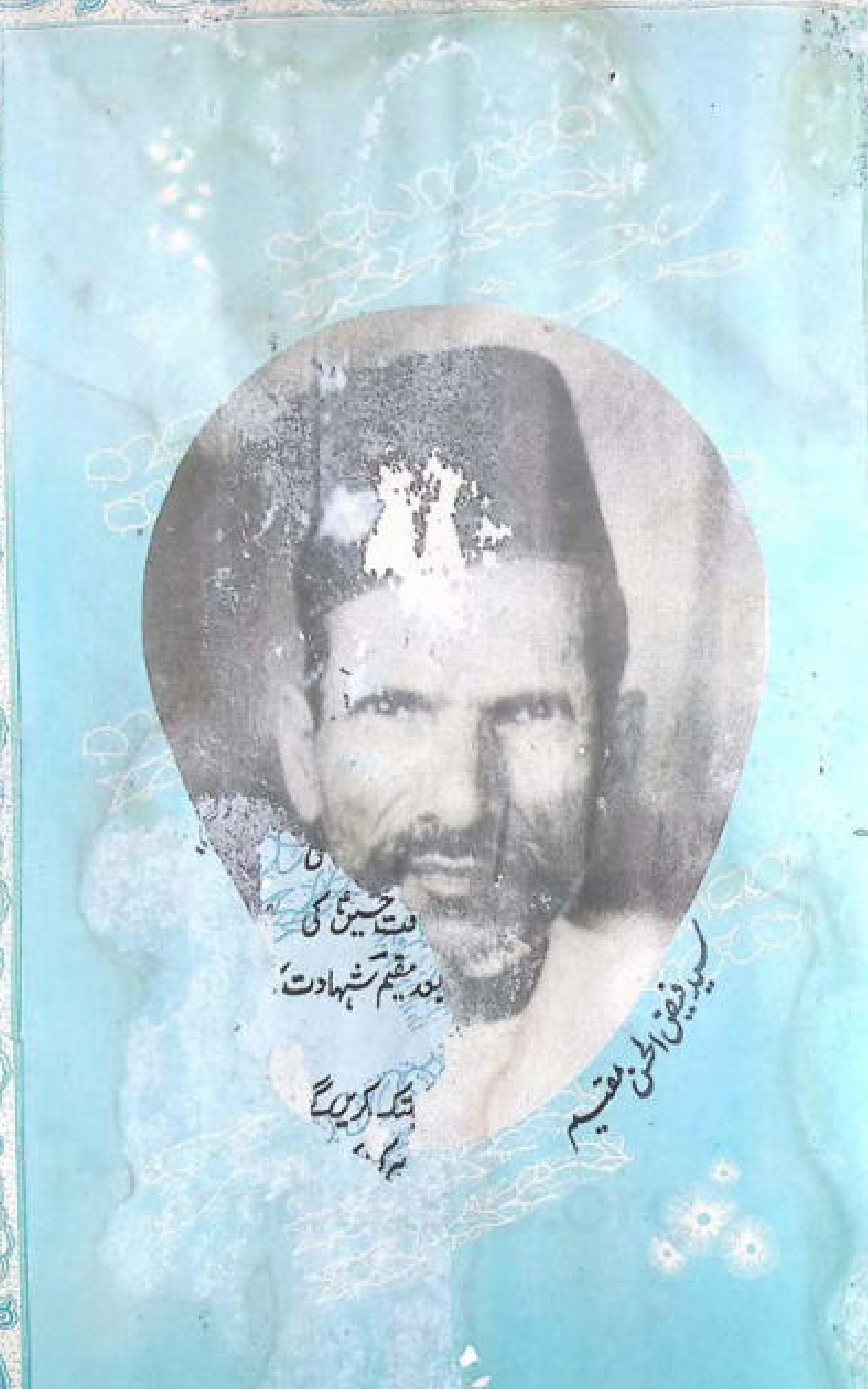
کاندھا بدل بدل گئے سب ... !
کتنا میں دوستوں کے لئے بارِ دوش تھا

سید فیض الحسن مقیمؔ

مقیمؔ کا تعلق حضرت شاہ ولایت شرف الدینؒ کی نسل سے ہے ان کے والد کا نام سید فدا حسین تھا۔ مقیمؔ کی ولادت ۱۸۷۷ء میں امروہہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد مکتب میں درس حاصل کیا اس کے بعد محکمۂ بندوبست میں ملازمت اختیار کی اور نقشہ نو[illegible] میں مہارت حاصل کی۔ دوران ملازمت دہلی، کرنال، میرٹھ، سہارنپور، بجنور، بجے پور، رتلام [illegible] سر وغیرہ رہے۔

مقیمؔ کو آغازِ [illegible] ی سے شوق تھا۔ میر منور علی دہلوی سے حدیث خوانی سیکھی اور [illegible] درجہ رکھتے تھے۔ امروہہ میں ان کی ذاکری کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ انداز [illegible] اور اس رنگ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مقیمؔ کے فرزند سید امیر حسن [illegible] میں [illegible] حقیقی جانشین ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ اس وقت ان کے بھی مخصوص رنگ میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔

مقیمؔ کے دوسرے فرزند ہندوستان اور پاکستان کے مشہور فلم ڈائریکٹر و پروڈیوسر نجم نقوی مرحوم تھے جن کی اولاد پاکستان میں ہے۔ امیر حسن صاحب کے فرزند منظور نقی اور


ت حسینؑ کی
بعد مقیم شہادت
سید فیض الحسن مقیم

دائم ہے مقیمؔ زیارت حسینؑ کی
ہر شب کو پائیں خواب میں رویت حسینؑ کی

مقیمؔ نے ایک مرثیہ بشکل مخمس بھی کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

ع۔ حسینؑ ابنِ علیؑ کا لشکر جو ٹھہرا کربل رسید ہو کر

مقیمؔ کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

حیدرؑ کا پسر خلد کا مختار بنا — کونین میں امت کا مددگار بنا
سر اپنا رہِ حق میں فدا کر کے حسینؑ — جن و ملک و دانش کا سردار بنا

مقیمؔ کی وفات ۲ جون ۱۹۵۶ء کو امروہہ میں ہوئی۔

سید اتقی حسن یکتا

سید اتقی حسن یکتا کے اسلاف کا ذکر ان کے بھائی مجتبیٰ کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ مولوی سید مصطفیٰ کے لائق فرزند اور مولوی سید مجتبیٰ کے بھائی سید اتقی حسن یکتا ہوئے۔ ان کے بارے میں صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" کا بیان ہے کہ "بسنِ دوازدہ سال کے نہایت بے باکی و بے تکلفی و عمدہ طریقے سے نثر خوانی کرتے ہیں۔ ان کی نثر خوانی ہر شخص کی پسندِ خاطر ہے۔ یہ شاگرد میر فدا علی نثر خوان لکھنوی کے ہیں۔" (صفحہ ۱۷۴)

یکتا کی ولادت ایسے گھر اور ایسے ماحول میں ہوئی کہ جہاں علم و ادب کا چرچا تھا ایک طرف ان کے والد مولوی اور طبیب تھے تو دوسری طرف بڑے بھائی سید مجتبیٰ مولوی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے علاوہ محلّے میں سید نبی بخش فلسفی جیسے استاد شاعر اور تمکین جیسے مرثیہ نگار موجود تھے اسی ماحول کا یکتا پر بھرپور اثر پڑا۔

یکتا کی ولادت کے بارے میں یکتا کے بھتیجے سید شبیب حسن ۱۲۹۸ھ بتاتے ہیں۔ لیکن یکتا کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی اور ہلال نقوی کے "مرثیہ عظیم" میں بیان کے مطابق ۱۹۲۶ء میں وفات ہوئی۔ راقم کو سید شبیب حسن نے بھی ۱۳۴۴ھ بتائی ہے۔ اس

حساب سے یکتاؔ کی عمر بہت کم ہوئی۔ اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق یکتاؔ کو اردو اور فارسی کی اچھی استعداد تھی ویسے ہائی اسکول بھی پاس کیا تھا۔ مولوی سید اولاد حسن تسنیمؔ کے شاگرد تھے شاعری کے علاوہ یکتاؔ کو قومی معاملات سے بھی دل چسپی تھی خصوصاً قوم کا تعلیمی مسئلہ۔ وہ امام المدارس اسکول (جواب انٹر کالج ہے) کے مینیجر بھی کئی سال رہے اور بڑی محنت و دل چسپی سے یہ خدمت انجام دی۔ جسے امام المدارس کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔

یکتاؔ کے کلام میں مرثیہ۔ سلام۔ قصیدہ۔ قطعہ رباعی اور غزل کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ سلاموں اور قصائد کے منتخب اشعار امروہہ میں مختلف لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ لیکن مراثی کا مکمل ذخیرہ کراچی (پاکستان) میں سید علی امام نقوی کے پاس موجود ہے جب راقم نے پاکستان کا ادبی دورہ ۱۹۸۲ء میں انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان کی دعوت پر کیا تھا تو سید علی امام نقوی نے یکتاؔ کے تقریباً ۲۰-۲۵ مراثی دکھائے تھے۔ چند مطلعے مندرجہ ذیل ہیں ؎

ع باغِ جہاں میں آمدِ فصلِ بہار ہے — بند ۲۱

ع گلشنِ نظم میں پھر تازہ بہار آئی ہے — بند ۲۲

ع کعبے کو شرف کس کی ولادت سے ملا ہے — بند ۴۱

ع عندلیبِ چمنِ نطق زباں ہے میری — بند ۴۶

ع تکمیلِ دیں میں کس کی ولادت کا حصہ ہے — بند ۳۸

ع آج اللہ و پیمبرؐ کی خوشی کا دن ہے — بند ۴۶

ع مالکِ مملکتِ عز و شرف ہیں حیدرؑ — بند ۸۱

ع مژدہ اے بادہ کشو ساقیِ کوثر آئے — بند ۲۰

ع خزاں کا جہاں سے عمل اٹھ گیا — بند ۲۰

ع جب آفتاب پردۂ شب میں نہاں ہوا — بند ۲۸

ع بہارِ باغِ سخن بے خزاں چمن ہے مرا — بند ۲۵

ع نازِ پروردۂ اللہ و پیمبر ہے حسینؑ — بند ۳۶

ع جب شہرِ علم کا در سوم عیاں ہوا — بند ۲۶

ع چاند طالع ہوا جو شعباں کا — بند ۱۳

ع اے ارضِ طوس ہمسرِ عرشِ علیٰ ہے تو — بند ۳۹

ع بندوں پہ فرضِ بندگیٔ بے نیاز ہے — بند ۲۱

ع کس کا لقب امامِ زماں ہے جہان میں — بند ۲۰

ع یارب دُرِ سخن کو عطا آب و تاب دے — بند ۵۲

ع حجت کا اختتام جو منظورِ رب ہوا — بند ۱۴

ع فرزندِ نوجواں کو بھی جب رو چکے حسینؑ — بند ۴۰

ع اے زباں اے نطقِ گویائی دکھا — بند ۱۴

یکتا کے بڑے بھائی مولوی سید مجتبیٰ عرف چاند بھی شاعر تھے لیکن سید علی امام نقوی اور سید شبیب حسن نقوی (پسر مولوی سید مجتبیٰ) کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا مراثی میں کافی حصہ مولوی سید مجتبیٰ کا بھی شامل ہے کیوں کہ یہ دونوں بھائی یا تو مشترک مرثیہ کہتے تھے یا یکتا کے نامکمل مرثیے کو مجتبیٰ مکمل کر دیتے تھے راقم نے پروفیسر مختار حسین نقوی سے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ لیکن اس طرح کا سارا کلام یکتا کے ہی نام سے منسوب ہوتا تھا۔ البتہ یکتا کی وفات چونکہ پہلے ہوئی اس لیے ان کی وفات کے بعد کا مجتبیٰ کا کلام مجتبیٰ کے ہی نام سے منسوب رہا۔

بہرحال مندرجہ بالا مراثی جن میں کم سے کم ۱۴ بند اور زیادہ سے زیادہ ۱۵۸ بند ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یکتا طویل مرثیہ نہیں کہتے تھے بلکہ زیادہ تر انہوں نے اختصار سے ہی کام لیا ہے اور اپنی بات کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے کلام میں جامعیت آگئی ہے۔ ایک جگہ مقطع میں وہ خود اپنے اس نظریہ کا اظہار اس طرح کرتے

ہیں کہ ؎

؏ یکتاؔ خموش طول نہ دے اختصار کر

یکتاؔ کے بھتیجے سید شبیب حسن نے مندرجہ بالا مراثی کے علاوہ یکتاؔ کا مندرجہ ذیل مرثیہ راقم کو مرحمت فرمایا ہے ؎

عالم الغیب پہ مخفی نہیں روشن ہے یہ بات | درپئے شورش و ایذا ہیں منافق ہی رات
سب ہیں یہ طینت و بد باطن و بد خو بد ذات | دشمنِ دین خدا مفسد و مذموم صفات

فتنہ و شر نہ بپا ہو کہیں اس جانب سے
بغض رکھتے ہیں علیؑ ابن ابی طالب سے

یکتاؔ کے مندرجہ بالا مراثی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس میں نعت۔ مدحِ ائمہؑ۔ معجزاتِ ائمہؑ۔ رخصت۔ رجز۔ جنگ۔ شہادت اور بین سب کچھ نہ صرف ملتا ہے بلکہ اس کا معیار بھی بلند ہے۔ مدح ملاحظہ ہو ؎

سب سلاطینِ زمانہ ہیں سلامی جن کے | ہیں سدا زیرِ نگیں خسرو نامی جن کے
اہلِ افلاک ہیں خدام دوامی جن کے | کیوں نہ ہوں جب کہ ملائکہ ہیں حامی جن کے

نام سے میرے جما دینِ نبیؐ کا سکہ
کشورِ دہر میں رائج ہے علیؑ کا سکہ

مالکِ تختِ ولایت ہیں ازل سے حیدرؑ | بعدِ اللہ و نبیؐ کون ہے ان کا ہمسر
حجت اللہ، ید اللہ، ولیِ داور | جا کے یثرب میں بتائید خدا کے رتبہ تر

منزلت منصبِ ہارون کی دوں گا ان کو
جانشین اپنا مقرر میں کروں گا ان کو

یکتاؔ نے مدح میں مختلف صنعتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ذو قافیتین میں کہتے ہیں کہ ؎

خورشید مبیں، ماہِ درخشانِ امامت   تزئینِ زمیں، زیبِ ایوانِ امامت

سر دفتر دیں، مطلعِ دیوانِ امامت   منہاجِ یقیں، صبحِ شبستانِ امامت

قرآں کا امیں، صاحبِ تفسیر یہی ہے

خالق کا امیں، کاتبِ تقدیر یہی ہے

یہاں شروع کے ہم مصرعوں میں تو دو دو قافیے استعمال کئے ہیں لیکن بیت میں تین قافیے استعمال کئے ہیں۔ اس سے ان کی زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؑ کے معجزات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

اوجِ آدم کا نہ کیوں اوجِ ملک تک پہنچے

بو ترابؑ اپنی جگہ ہاتھ فلک تک پہنچے

ناگہاں آ گیا اک ابرِ کرم ہاتھوں پر

رکھ دیا آپ نے بالائے زمیں خوش ہو کر

تھا درِ فیض کھلا، باز تھا بابِ رحمت

آ گیا دوسرا ہاتھوں پہ سحابِ رحمت

یکتاؔ نے ایک مرثیے میں واقعۂ خمِ غدیر بھی نظم کیا ہے۔ جس میں واقعہ نگاری میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسولؐ کی جانب بھی بڑے لطیف اشارے کیے ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

تاخیر اب روا نہیں تعجیل کیجئے   ما انزل الیک کی تعمیل کیجئے

ابلاغِ حق مرشدِ جبریل کیجئے   ہاں اے رسولؐ دین کی تکمیل کیجئے

نائب کرو علیؑ کو مناسب عمل یہ ہے

ارشادِ کردگار کا بس ما حصل یہ ہے

ہو گا نہ انصرام جو اس کا ابھی ابھی   تکمیل کی نہ تم نے رسالت کی یا نبیؐ

کیا ہے اگر ہزار مخالف ہوں مدعی جس کا ہے کام حافظ و ناصر بھی ہو وہی

دستِ خدائے ما و دامانِ پیمبرؐ است
دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

یہاں قرآنی آیات کو جس طرح منظوم کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ دوسرے بند میں فارسی بیت لگا کر بند کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔

یکتاؔ نے کئی مراثی میں ساقی نامہ بھی شامل کیا ہے جس میں کچھ نئی تشبیہات اور مخصوص منظر کشی کی ہے ملاحظہ ہو ؎

ہاں ساقیا یہ وقت ہے مے کی سبیل کا دم بھر کے نہ دور مٹے بے عدیل کا
عالم ہر ایک جام میں ہو سلسبیل کا بحرِ کرم ہے جوش پہ ربِ جلیل کا
بھٹی پہ بادہ خوار ہمیشہ ڈٹے رہیں
چلتی رہے شراب سدا جھگڑے رہیں

یہاں جھگڑے کے قافیے نے ایک خاص منظر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یکتاؔ کیسی شراب کے خواہش مند ہیں اس کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں ؎

وہ پاک و صاف طیب و طاہر شراب ہو کعبے میں جس کا بیٹھ کے پینا ثواب ہو
وہ پھول بہشت میں جو انتخاب ہو قدرت کے میکدے میں جو بے حجاب ہو
آئے کمی نہ کیف میں نشہ بڑھا رہے
جس طرح برشگال میں دریا چڑھا رہے

وہ مے ہمیں پلا ابدی جو حیات دے وہ مے پلا جو رنج و الم سے نجات دے
وہ مے پلا کر جوش میں شکر کو مات دے وہ مے پلا جو لذتِ صوم و صلوٰۃ دے
مسرور ہو کے بندگیِ کبریا کروں
جھک کر اٹھوں تو شکر کا سجدہ ادا کروں

شراب کے لیے مندرجہ بالا صفات اور تشبیہات نہایت مناسب۔ موزوں۔ دلکش اور پُرتاثیر ہیں۔

غرض کہ مرثیے سے یکتاؔ کو ایک خاص مناسبت بھی کیوں کہ ان کے اس مزاج کی مخصوص تربیت ہوئی تھی ۱۲ سال کی عمر سے بھی قبل انہوں نے اپنے لیے منبر کا انتخاب کرلیا تھا۔ میر فدا علی لکھنوی کی شاگردی نے ان کے اس ذوق کو اور بھی جلا بخشی۔ یکتاؔ کی اگر عمر وفا کرتی تو یقیناً وہ مرثیے کی اور بھی خدمت کرتے۔

یکتاؔ نے سلام بھی لکھے ہیں۔ مندرجہ ذیل سلام یکتاؔ کے شاہکار ہیں ؎

اے قلم پاسِ ادب ہو کے تم اچھی طرح
مدحِ پاکِ سرورِ دیں کر رقم اچھی طرح

ہوا نا ساز ہے آباد گھر لاکھوں بگڑتے ہیں
خزاں کا دور ہے پھولے پھلے گلشن اُجڑتے ہیں

یہ گُل تھا گلشنِ آفاق میں رنگِ چمن بگڑا
اُلٹ کر آستیں جب اکبرِؑ گل پیرہن بگڑا

گیسوئے شہ کی ثنا دشوار ہو کر رہ گئی
مجرئی طبعِ رسا بیکار ہو کر رہ گئی

یکتاؔ کا سب سے مشہور سلام مندرجہ ذیل ہے جو آج بھی جگہ جگہ پڑھا جاتا ہے ؎

ماہِ زہراؑ پہ گھٹا ظلم کی چھائی کیسی
ہو گئی سامنے سب گھر کی صفائی کیسی

اس سلام کا مقطع بھی ملاحظہ ہو جو اپنی جگہ لاجواب ہے ؎

زو حشمِ فقرِ سلیماں کی فقیری یکتاؔ
ہفت اقلیم کی شاہی ہے گدائی کیسی

یکتاؔ نے یوں تو مذہبی قصائد بھی کافی کہے ہیں لیکن ان کے بھتیجے سید شبیب حسن کا بیان ہے کہ انہوں نے جارج پنجم کی شان میں دلی دربار میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس پر انہیں طلائی تمغہ بطور انعام ملا تھا۔

یکتاؔ نے قطعات و رباعیات بھی کافی تعداد میں کہے ہیں ایک رباعی ملاحظہ ہو جس میں تخلص سے کتنا فائدہ اٹھایا ہے

شہرہ تری بخشش کا ہے دیں داروں میں
اک دھوم ہے رحمت کی سیہ کاروں میں
ہے وحدہٗ لاشریک تو اے غفار
یکتاؔ ہے یہ بندہ بھی گنہ گاروں میں

یکتاؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن کم۔ اک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مزار پہ بھی نہ آئے وہ فاتحہ پڑھنے
لحد میں ہم نے قیامت کا انتظار کیا
پھنسا ہے دام محبت میں اس طرح دل یکتاؔ
کہ جس نے طائرِ سدرہ کو بھی شکار کیا

یکتاؔ دراصل فطری شاعر تھے۔ زود گو تھے۔ خوش فکر و خوش طبع تھے اور مرثیے کے مخصوص مزاج کے مالک تھے۔ ان کی ان صلاحیتوں کو نکھارنے میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید مجتبیٰ کا بھی ہاتھ تھا۔

یکتاؔ کے اخلاف میں ان کے ایک پسر سید منتجب حسن منتجبؔ و بزمیؔ جو شاعر تھے۔ لیکن مرثیہ نہیں کہا راقم کی نظر سے سلام گزرے ہیں۔ سید منتجب حسن کی اولاد سید مصطفیٰ اعجاز اور سید اقبال کمال پاکستان میں ہیں۔

یکتاؔ کی سن وفات مولوی مجتبیٰ نے "خلد ملک التقیٰ" کہی۔

سیّد تبارک حسین ذاکر

سید تبارک حسین ذاکر کا تعلق امروہہ کی نقوی سادات سے ہے جو سید شرف الدینؒ کی اولاد ہے۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۱ء میں امروہہ میں ہوئی اور ۲۱ مئی ۱۹۵۷ء کو انتقال ہوا گھریلو تعلیم حاصل کی ابتداء سے ہی مرثیہ خوانی سے شوق تھا اسی شوق نے آگے چل کر مرثیہ گو بھی بنا دیا۔ لیکن مرثیہ نگاری کا مقصد صرف حصولِ ثواب تھا۔ شاعری صرف مدحِ اہلبیت تک محدود تھی۔ ذاکر کے اکلوتے پسر نا فضل امروہوی لکھنؤ تھے وہ ادبی سرمائے کی حفاظت نہیں کر سکے۔ ذاکر کا پورا بستہ حسینیہ دربار شاہ ولایت میں رکھوا دیا تھا دہاں نمی کے سبب ضائع ہو گیا۔ عرصہ ہوا راقم نے حکیم حسن رضا مرحوم کی اہلیہ کے بستے میں ذاکر کا ایک مرثیہ منتشر حالت میں دیکھا تھا جس میں مطلع بھی تھا۔ راقم نے اپنی کم سنی میں ذاکر کی زبانی مرثیے سنے بھی ہیں۔ آپ کا دوسرا مرثیہ سید منور حسین کے بستے سے حاصل ہوا ہے۔ ۲۴۷ بند ہیں۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے

ع یہ پہنچا جو کربلا میں حسینؑ فلک جناب

سید شفیق حسن ایلیا

مولوی سید شفیق حسن ایلیا کے اسلاف کا ذکر ان کے بڑے بھائی سید انیس حسن ہلال کے باب میں ہو چکا ہے ـــــ آپ کے بارے میں سید اعجاز حسین جارچوی انجمن "وظیفۂ سادات و مومنین کے سلور جوبلی نمبر میں لکھتے ہیں کہ۔

"جناب مولوی سید شفیق حسن صاحب ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین حسین شاہ ولایت امروہہ کے خلف اکبر سید علی صاحب قاضی القضاۃ امروہہ کی اولاد میں ہیں۔ سلطان محمد تغلق کے زمانۂ حکومت میں اس خاندان کو بہت عروج حاصل ہوا اور اس خاندان کے افراد مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ آپ کو قدرت نے ذہن رسا اور طبع سلیم کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ بسلسلۂ تالیف و تصنیف، موصوف عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں سے مدد لیتے ہیں۔ موصوف امور قومی و مذہبی میں بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں انجمن امامیہ امروہہ میں قائم کی تھی جو عرصہ تک قومی و مذہبی خدمات انجام دیتی رہی۔ اور رجب ۱۳۵۴ھ میں آپ نے انجمن "تنظیم المومنین" قائم کی ہے۔ جو مغربی طرز کی تعلیم نسواں کے بالکل



علامہ شفیق حسن ایلیا

ملانہ ہے۔ آپ ۱۹۳۶ء سے انجمن وظیفہ سادات کے ممبر ہیں۔ (صفحہ ۱۳۲)

ایلیا اپنی ولادت کے بارے میں ڈائری میں لکھتے ہیں کہ میری ولادت یکم شوال ۱۳۰۲ھ (عید الفطر کے دن) بعد نماز صبح مطابق ۱۴ جولائی ۱۸۸۵ء کو ہوئی۔

ایلیا نے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے دادا سید امیر حسن امیرؔ اور والد سید نصیر حسن نصیرؔ سے حاصل کی، اس کے علاوہ شہر کے مشہور عالم مولوی سید اولاد حسن سلیمؔ سے بھی درس حاصل کیا آپ شاعری میں بھی سلیمؔ کے ہی شاگرد تھے۔ جوانی سے ہی قومی معاملات سے دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے قومی خدمات میں پیش پیش رہتے تھے آپ انجمن تحفظ عزاداری رجسٹرڈ امروہہ کے بھی ناظم رہے ہیں۔

ایلیا کے بارے میں اُن کے [illegible] لکھتے ہیں کہ وہ ایک رقیق القلب نرم خو، درد مند اور شریف النفس انسان تھے، اُن کی پوری زندگی حصولِ علم اور طلبِ عرفان کی راہ میں مسلسل مجاہدے کی حیثیت رکھتی تھی۔ صبح سے شام تک لکھنے پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ امّاں مرحومہ کو یہ طرزِ زندگی پسند نہ تھا اور اسی لئے وہ کبھی کبھی اُن سے اُلجھ جاتی تھیں۔ امّاں کی خواہش تھی کہ وہ حصولِ معاش میں غرق ہو جائیں اور قلم و کاغذ کو طاق میں رکھ دیں۔ کیونکہ شاعر یا مصنف بن کر کوئی شخص آسودہ حال زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ امّاں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے خوش حال مادی زندگی کی طلب گار تھیں۔ بابا مرحوم ان کی ضرورتوں کو سمجھتے ضرور تھے اور حتی الامکان ان کا دل رکھنے کی کوشش بھی کرتے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی علمی مصروفیات ترک کر کے پورا وقت طلبِ معاش میں لگا دیں۔ مرحوم کے مزاج میں استغنا اور قناعت بدرجۂ کمال تھی، ان کی کوشش تھی کہ وہ دُنیا سے کم سے کم طلب کریں اور دُنیا کو اس کی طلب سے کہیں زیادہ عطا کریں۔ ادب۔ شعر۔ تاریخ۔ ہیئت۔ الٰہیات۔ مذہب اور روحانیت ان کے پسندیدہ موضوع تھے —— ان کی سیرت کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ شہرت سے قطعاً بے نیاز تھے جیسے دوسروں کے لئے نہیں

صرف اپنے لئے لکھتے ہوں۔ اگرچہ انھیں تمام اوصافِ سخن پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن انھوں نے مشاعروں میں شریک ہونے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ البتہ مذہبی محفلوں اور مجلسوں میں وہ ضرور شرکت کرتے اور اپنا نعت و منقبت کا کلام سُناتے۔ ہماری سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ اُن کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ (معراجِ نقشِ رسولؐ۔ صہ ۳۳-۳۴)

ایلیا کی وفات کے بارے میں اُن کی یادداشت میں جون ایلیا لکھتے ہیں کہ۔

"آخر کار ہوا آج سرانجامِ سخن
جس نے لکھی تھیں یہ سطریں وہ قلم ٹوٹ گیا

آج ۸ جنوری ۱۹۵۶ء [illegible] شب ساڑھے نو بجے بابا نے جلیل القدر علامہ الشہیر استاد الشعرا سید شفیق حسن [illegible] انتقال فرمایا۔ انا للہ [illegible]

ایلیا کے اخلاف میں چار لائق فرزند رئیس امروہوی۔ سید محمد تقی۔ سید محمد عباس اور جون ایلیا ہیں۔ یہ چاروں بھائی پاکستان میں خوب امروہہ کا نام روشن کر رہے ہیں۔ دختر صرف ایک شاہ زناں نجفی ہیں جو اپنے شوہر ڈاکٹر سید محمد شجاعت کے ساتھ ہندوستان میں مقیم ہیں۔

جیسا کہ رئیس امروہوی نے لکھا ہے کہ ایلیا کو ہر صنفِ سخن پر مکمل عبور حاصل تھا وہ غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ منقبت۔ نعت۔ سلام۔ نوحہ۔ قطعہ۔ رباعی اور مرثیہ کہتے تھے لیکن چونکہ شہرت سے ہمیشہ دور رہے اس لئے نہ کبھی مشاعروں میں شرکت کی اور نہ کلام کی طباعت پر توجہ دی۔ جتنی تصانیف منظرِ عام پر آئیں وہ سب نثر میں ہیں۔ وہ صرف امروہہ کی محافل میں قصائد پڑھتے تھے اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کا مطالعہ بہت عمیق تھا۔

رئیس امروہوی اور جون ایلیا کے بیانوں کے مطابق ایلیا نے مرثیے بھی کہے ہیں لیکن وہ اُن کے دیگر ادبی سرمایے کے ساتھ ضائع ہو گئے۔ اُن کی مرثیہ نگاری کی تصدیق امروہہ کے چند بزرگوں سے بھی راقم کو ہوئی ہے۔ ہلال نقوی نے "مرثیہ عظیم" کے مقدمہ میں ایلیا

کی مرثیہ نگاری کا بھی ذکر کیا ہے۔ منیب حسن مرحوم کے پاس ایلیا کا ایک مرثیہ تھا جس کا مطلع ہے۔

ع محرم کی تقدیر خوش قسمت وخوش اقبالی

ان کا اصل تخلص شفیق تھا لیکن کبھی کبھی ایلیا اور اختر بھی تخلص استعمال کرتے تھے۔ ویسے انھیں شہرت ایلیا سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ اُن کی تصانیف میں "حقیقت المسیح"۔ "اصل الاصول" "رئیس العالمین" "آثار الشہداء" "شہید ازل" "الصدق" "صاحب زماں" "عالم برزخ" "تصدیق المعراج" "تحقیق السراج" اور "معراج نفسِ رسول" وغیرہ راقم الحروف کی نظر سے بھی گذری ہیں۔ ویسے ان کی تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے۔

"معراج نفسِ رسولؐ" ایلیا کی شعری مجموعہ ہے جس میں ایک مسدس ہے۔ اس مسدس میں ۱۵۶ بند ہیں۔ جن میں حمد باری تعالیٰ، نعتِ محمدؐ، منقبتِ علیؑ و فاطمہؑ، ساقی نامہ اور معراج کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ مسدس کے علاوہ اس مجموعہ میں ۶۲ مدحیہ قطعات بھی ہیں۔ مسدس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

قدرت کا امتحان ہے معراجِ مصطفےٰؐ | اوجِ بشر کی شان ہے معراجِ مصطفےٰؐ
اک سیر لامکان ہے معراجِ مصطفےٰؐ | رحمت کا اک نشان ہے معراجِ مصطفےٰؐ

درسِ عمل عروجِ رسولِ خداؐ کا ہے
انساں کے واسطے یہ سبق ارتقا کا ہے

حضرت علیؑ کی مدح میں دو بند ملاحظہ ہوں۔

رتبہ نبیؐ کے فیض سے کیا کیا عطا ہوا | اللہ رے قدر و منزلت و شانِ مرتضیٰؑ
اُن کو براق ان کے لئے دوشِ مصطفےٰؐ | معراج شب وہاں تو یہاں دن میں ارتقاء

وہ نورِ حق رسولِ زمین و زمن ہوئے
یہ شانِ کردگار ہوئے، بُت شکن ہوئے

وا ہر نصیریوں کے خدائی انھوں نے کی
کیا طیِ ارض سیر ہوائی انھوں نے کی
یوسف کی قیدِ غم سے رہائی انھوں نے کی
روح الامیں کی عقدہ کشائی انھوں نے کی
مانے ہوئے کمال کو اربابِ نقل ہیں
جبریلؑ عقلِ کُل ہیں یہ استادِ عقل ہیں

ایک جگہ اور حضرت علیؑ کی اہمیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

حیدرؑ نہ تھے تو کوئی نہ شاہد نبیؐ کا تھا
بعثت کو انتظار شہودِ وصی کا تھا
احمدؐ کو اشتیاق لقائے علیؑ کا تھا
اسلام خواستگارِ کرم اس ولی کا تھا
قرآن منتظر تھا لسانِ اللہ کا
کعبے کو شوقِ دید تھا شانِ اللہ کا

نبیؐ کا علیؑ سے تعلق، دونوں کی ایک دوسرے سے قربت اور فضائل مختلف تشبیہات کے سہارے بیان کیے ہیں۔

چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہیں مصطفےٰ جو پھول تو اس کی مہک علیؑ
وہ دُرِّ شاہوارِ ہدایت، جھلک علیؑ
حضرتؐ ہیں آفتابِ نبوت، چمک علیؑ
یہ حُسنِ حُسنِ شاہدِ قدرت، نمک علیؑ
احمدؐ ہیں باکمال تو حیدرؑ کمال ہیں
وہ رُخ ہیں اور یہ خالِ رُخِ بے مثال ہیں

کوثر ملا نبیؐ کو تو حیدرؑ کو سلسبیل
احمدؐ وحی سے، یہ ہوئے الہام سے جلیل
شاگرد ہیں نبیؐ کے علیؑ ان کے جبرئیلؑ
محبوبِ رب جو دعوئ حق ہیں تو یہ دلیل
ہے علمِ غیب احمدِ مرسل کے سہم میں
یہ وارثِ رسولِ خدا علم و فہم میں

آگے چل کر معراج کا حال بیان کرتے ہیں کہ۔

سدرہ پہ جلوہ گر جو ہوئے رب البشر
بولے زبانِ حال سے جبریلِ نامور
حد ہے یہی غلام کی یا شاہِ بحر و بر
آگے کروں صعود تو جل جائیں بال و پر
عاجز یہاں رفاقتِ شہ سے غلام ہے
نفسِ نبیؐ کی سیر کا اب یہ مقام ہے

مقامِ سدرہ کی شرح بھی ملاحظہ ہو۔

جو حدِ کائنات ہے سدرہ وہی تو ہے
ہے جس کے پاس جنتِ ماویٰ وہی تو ہے
کرتے بیاں کی منزلِ اعلیٰ وہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو مسجدِ اقصیٰ وہی تو ہے
روح القدس سے بھی سبقت شاہ لے گئے
سدرہ سے ہاتھوں ہاتھ ید اللہ لے گئے

اردو مرثیہ ایک ایسے دور سے بھی گذرا ہے کہ جب اس میں ساقی نامے کی بہت اہمیت تھی اور شعراء کی اس پر خاص توجہ تھی۔ ایلیا کے ہاں بھی ایسے کئی بند ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

ساقی محلِ کیف ہے یہ اور مقام مے
قاضی نے خود کیا ہے یہاں اہتمامِ مے
زاہد کے منہ سے آج سنیں گے پیامِ مے
کرنا ہے ہم کو شیخ کے آگے کلامِ مے
خود محتسب پہ رنگ چڑھے تب کمال ہے
واعظ کہے بجوش کہ پینا حلال ہے

ہے یہ سوال در پہ سخی کے فقیر کا
صدقہ ملے رسولؐ بشیر و نذیر کا
سائل ہے یہ غلام جنابِ امیرؑ کا
طالب ہے آج بادۂ خمِ غدیر کا
نشہ سے جس کے اپنا دماغ آسماں پہ ہو
پی کر علیؑ، علیؑ کا وظیفہ زباں پہ ہو

معراج پر چلنے کا منظر پھر اس طرح کھینچتے ہیں۔

وہ لامکاں کو مالکِ کون و مکاں چلے　　　سمتِ حجاب، قدسِ رسولِ زماں چلے
عاجز ہے خلق تحیل بھی جہاں پر وہاں چلے　　　کوئی یہاں یہ کہہ نہیں سکتا کہاں چلے

رُخ جانب دنیٰ ہے رسولِ انام کا
مد نظر طواف ہے دارالسلام کا

دراصل ایلیا نے اس مسدس میں شروع سے آخر تک قرآنی آیات اور احادیث رسولؐ سے فائدہ اُٹھایا ہے اور جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ مع دلیل ہے۔ اسی لئے ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

مجذوب کی وہ بڑ ہے کہ جس کی سند نہیں
دعویٰ بلا دلیل قبولِ خرد نہیں

ایلیا کے ۶۲ قطعات تو ان کے مجموعے میں شامل ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ قطعات و رُباعیات راقم الحروف کو حاصل ہوئی ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

وہ متقی ہیں جو حق کو قبول کرتے ہیں　　　خدا کی حمد، ثنائے رسولؐ کرتے ہیں
ہے ان کا ورد حسنؑ اور حسینؑ کی مدحت　　　ہمیشہ مدحِ علیؑ و بتولؑ کرتے ہیں

تھیں حور و ملائک سے بھی اعلیٰ زینبؑ　　　ہر وصف میں تھیں ثانیٔ زہراؑ زینبؑ
پیدا جو ہوئیں یہ تو کہا ہاتف نے　　　خالق نے رکھا نام ہے ان کا زینبؑ

آج شیعوں کے مقدر کا ستارہ چمکا　　　خوف کیا حشر کی بخشش کا سہارا چمکا
مجھ کو آتی ہے صدا عرشِ علیٰ سے پیہم　　　گھر میں اللہ کے اسلام کا تارا چمکا

اس کا رتبہ نہ کیوں جلی ہو جائے	نام جس شاہ کا علیؑ ہو جائے
کیوں نہ اس کو نبیؐ کا نفس کہیں	جو خدا کی طرح ولی ہو جائے

اللہ اللہ! شانِ احمد دہسہ	زہے طرزِ بیانِ احمد دہسہ
دہلی و لکھنؤ کا ہے اوسط	معتدل ہے زبانِ احمد دہسہ

ایلکیا کے مندرجہ ذیل قصائد بھی راقم السطور کو حاصل ہو سکے ہیں۔

ع۔ وہ بندے ہو کہ ہمنام جنابِ کبریا تم ہو۔

ع۔ کُل کا مختار ہو مولائے انام ایسا ہو۔

ع۔ رسولؐ شافعِ محشر ہیں کبریا کی قسم۔

ع۔ اللہ یہ جلال، یہ توقیر فاطمہؑ

ع۔ قرآن کی ہے رونق تو قیر و شانِ زہراؑ

ع۔ خدا کا دین، نورِ احمد مختار سے چمکا۔

ع۔ جو نور خانہ ہے حیدرؑ کا وہ قبلہ ہو گیا۔

ع۔ عورتوں میں وہ شرف ہے فاطمہؑ کے واسطے۔

ع۔ خلق میں پہلے حبیبِ حضرتِ داور بنے۔

درحقیقت ایلکیا نہ صرف ادیب و شاعر تھے بلکہ وہ مبلغِ دین بھی تھے اور مفکرِ اسلام بھی۔ اسی لئے ان کی شاعری میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے ان کے یہاں ایک طرف خطیبانہ انداز ہے تو دوسری طرف عالمانہ طرز ہے ۔ انھیں سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن، احادیث، تفسیر، تاریخ، سائنس، فلسفہ اور منطق پر پوری نظر ہو۔

سیّد خلیق حسین فہیم

میراں سید محمد صادق نسلِ شاہ ولایت میں بڑی نامور شخصیت ہوئے ہیں جو منصب دارِ شاہی تھے ان کے بارے میں صاحبِ "تواریخ واسطیہ" رکھتے ہیں کہ "میراں سید محمد صادق ممدوح نے ملحق و ملزق اپنی عمارت مذکورہ کے ایک سرائے جانبِ غرب و دوسری سرائے جانب جنوب خاد ہائے رعایا اہلِ حرفہ یعنی بڑھئی و لوہار و درزی و منہیار و حجام و بقال و دیگر اقوام ہنود وغیرہ سے آباد کیئے اور بازار جانبِ شرق عمارت مذکورہ سے تا حدِ بازارِ کلاں سید محمود آباد کیا۔" (صفحہ ۵۲۲)

سید محمد صادق کے پسر سید فتح مراد عہدِ نورالدین جہاں گیر بادشاہ میں کسی مہم سلطانی میں بڑی شجاعت و دلیری سے کام آئے سید فتح مراد کے پسر میراں سید اعظم عہدِ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ میں کسی مہم شاہی میں بڑی دلیری و شجاعت و کارِ نمایاں ادا کر کے کام آئے۔ سید اعظم کے پسر سید محمد مراد ہوئے یہ بھی منصب دار تھے۔ سید محمد مراد کے پوتے سید غلام علی ہوئے جو عہدِ عالم گیر ثانی بادشاہ میں پانچ صدی ذات پچاس سوار کے منصب پر سرفراز تھے۔ سید غلام علی کے پوتے



سید علی حسن فہیم

سید ا[illegible] ہوئے [illegible] نے سید خلیق حسن فہیم تھے۔ فہیم کے والد کا نام سید غلام قاسم تھا۔

فہیم کے تین بھائی اور تھے۔ سید ابن الحسن، سید شفیق حسن اور سید غلام احمد۔ فہیم کے علاوہ غلام احمد بھی شاعر تھے جنہوں نے دیوان ذوق کو بھی ترتیب دیا ہے۔ ان کی شاعری صرف محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح تک محدود تھی ان کی مناجات و مناقب کا مجموعہ "پنجتنی پھول" کے نام سے بہت مقبول ہے۔

فہیم کے بھانجے سید وجاہت حسین عابدی کے بیان کے مطابق فہیم کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۱ سال تھی اس طرح فہیم کا سنِ ولادت ۱۸۸۷ء تھا۔ فہیم کی علمی استعداد اچھی تھی۔ نیک۔ متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ مزاج میں بہت سادگی تھی۔

فہیم کے مندرجہ ذیل مراثی ان کے نواسے سید نسیم حیدر (قاضی زادہ) کے پاس موجود ہیں جنہیں دیکھنے کا راقم کو بھی اتفاق ہوا

مطلع

صاحبِ سلسلۂ صبر و رضا ہے زینبؑ — زینتِ مسندِ اخلاق و وفا ہے زینبؑ
نورِ عینینِ [illegible] عقدہ کشا ہے زینبؑ — معدنِ حسرت و اندوہ و بلا ہے زینبؑ
قرۃ العین علیؑ فاطمہؑ کی دختر ہے
کیوں نہ مظلوم ہو مظلوم کی یہ خواہر ہے

اس مرثیے میں ۱۴۲ بند ہیں جن میں جنابِ زینبؑ کی مدح۔ ان کی ولادت کا ذکر جنابِ زینبؑ اور جنابِ فاطمہؑ زہرا کی مماثلت و موازنہ اور دونوں کے مصائب کا ذکر ہے۔ فہیم کا دوسرا مرثیہ ہے

مطلع

بحرِ جہاں میں زندگی سب کی حباب ہے | رونا ہر اک ۔۔۔ کے غم میں ثواب ہے
اجر اس کا عاقبت کے لیئے بے حساب ہے | جائز یہ صدمہ والم و اضطراب ہے

صدمہ نبیؐ کا سیدِ والا سے پوچھئے
غم باپ کی جدائی کا صغرا سے پوچھئے

اس مرثیے میں ۲۱ بند ہیں اس میں حضرتِ محمد مصطفےؐ کی وفات کے بعد جناب فاطمہؑ زہرا کی غم والم کی کیفیت ۔ رات دن گریہ وزاری کرنا ۔ اس کے بعد علالت ۔ خواب میں رسولؐ اللہ کو دیکھنا ۔ بچوں اور شوہر سے وصیت ۔ وفات ۔ تجہیز وتکفین اور آخر میں جنّت البقیع میں مزارات کے انہدام کا ذکر کیا ہے ۔ فہیم کے تیسرے مرثیے کا مطلع ہے ۔

مطلع

دُنیا میں خزاں کب نہیں ڈستی ہے چمن کو | شادی پہ سدا فوق رہا رنج ومحن کو
محتاج سلاطیں رہے اک تارِ کفن کو | کچھ یہ ہی پسند آیا ہے اس چرخِ کہن کو

خوش دیکھا جسے گھیر لیا اُن کے غم نے
توڑا نہیں کب شیشۂ دل سنگِ الم نے

فہیم کا یہ مرثیہ کافی طویل ہے اور اس میں ۱۵۹ بند ہیں اس مرثیے میں فہیم نے مختار نامہ نظم کیا ہے اور اس کا عنوان ہے "یہ مختار نامہ ہے ." جس سے ۱۳۶۷ھ برآمد ہوتے ہیں یعنی یہ تقریباً ۴۰ سال پہلے کی تخلیق ہے ۔ فہیم امروہہ کے وہ تیسرے مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے مختار نامہ مرثیے میں نظم کیا ہے ۔ کیوں کہ اس سے پہلے سید جواد حسین شمیم اور سید اسد اللہ اسد نے بھی مرثیے میں مختار نامہ نظم کیا ہے ۔ فہیم خود اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ

مختار نامہ لکھا ہے ہر اک فہیم نے
اوجؔ ودبیرؔ وانسؔ وانیسؔ وشمیمؔ نے

اس مرثیے کے مطلع سے فہیم نے بحر بھی بدل دی ہے

ع ساقی کہاں ہے جام مئے خوش گوار دے

فہیم کے مندرجہ بالا مراثی گھوڑے اور تلوار کی تعریف سے تو خالی ہیں لیکن مدح۔ مصائب۔ ساقی نامہ اور جنگ کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہیں یاد دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کے فلسفے کی بھی ہلکی سی جھلک موجود ہے۔

ایک جگہ جنابِ زینبؑ کی مدح ملاحظہ ہو ؎

خلق میں حضرتِ زینبؑ کا بڑا رتبہ ہے مرتبہ خالقِ اکبر نے عجب بخشا ہے
نہ کوئی مثل ہے ان کا نہ کوئی ہمتا ہے ثانیٔ حضرتِ زہراؑ جو کہوں زیبا ہے
فاطمہؑ ہیں جو رسولِ عربی کی بیٹی
یہ بھی تو فضلِ خدا سے ہیں علیؑ کی بیٹی

فہیم نے ایک موقع پر جنابِ زینبؑ کی ولادت کے واقعات بھی بیان کئے ہیں ایک بند ملاحظہ ہو ؎

گھر میں حیدرؑ کے یہ دختر ہوئی جس دم پیدا سن کے سلمان سے خبر آئے رسولِ دوسرا
اپنی آغوش میں حضرت نے نواسی کو لیا پیار کرتے رہے تا دیر اُسے شاہِ ہدیٰ
پھر ہوئی شدتِ غم اشکوں سے منہ دھونے لگے
چوم کر شانے رسولِ دوسرا رونے لگے

جنابِ زینبؑ کے شانے چومنے کے بعد جب رسولؐ خدا نے گریہ شروع کیا تو سب نے اس کا سبب معلوم کیا اور کہا کہ آخر آج اس خوشی کے موقع پر گریہ کیوں؟

حضرت نے فرمایا کہ ؎

پوچھ کر اشک کو فرمانے لگے خیر بشرؐ جو کہ میں جانتا ہوں اس کی نہیں کو خبر
صدمے پر صدمہ اٹھائے گی یہ تیری دختر اس کے انجام پہ یہ چاک ہے قلبِ مضطر

سوچ کر حال یہ آنکھوں سے رواں آنسو ہیں
جو کہ رسی میں بندھیں گے یہ وہی بازو ہیں

کہہ نہیں سکتا ہوں جو جو یہ ستم دیکھے گی   دکھ پہ دکھ اور الم پر یہ الم دیکھے گی
علی اکبرؑ کا نکلتے ہوئے دم دیکھے گی   سر شبیرؑ کو نیزے پہ علم دیکھے گی
سب تماشے کو بہم خلق خدا ہوئے گی
اور نہ سر پہ تری دختر کے ردا ہوئے گی

رسولِ مقبول نے اپنی نواسی کے لیئے جو کچھ فرما دیا تھا وہی سب کچھ ہوا۔ تمام زندگی اسی طرح گزری۔ بقولِ فہیم ؎

سب سے پہلے وہ رسولِ دوسرا کو روئیں   بعد اس واقعے کے خیر نسا کو روئیں
پھر بصد افسوس، شہ عقدہ کشا کو روئیں   بعد اس کے حسنِ سبز قبا کو روئیں
پھر تو رونے سے نہ فرصت ملی چشم تر کو
روئیں شبیرؑ کو، شبیرؑ کے سارے گھر کو

فہیم نے جناب زینبؑ اور جنابِ فاطمۃ زہراؑ کے مصائب کا موازنہ بھی کیا ہے ؎

روئیں خاتونِ قیامت تو پیمبرؐ کے لیئے   یہ مگر روئیں ہیں اک دن میں بہتر کیلئے
کبھی اصغرؑ کے لیئے اور کبھی اکبرؑ کیلئے   کبھی قاسمؑ کے لیئے اور کبھی عونؑ کیلئے
ہنگامِ دم باپ کا خاتونِ زمن کے آگے
سر قلم یاں ہوا، بھائی کا بہن کے آگے

اور آخر کار ؎

سوئیں تربت میں وہ مُنہ اشکوں سے دھوتے دھوتے
کٹ گئی عمر تمام آپ کی روتے روتے

عزیزوں کو رونے کے علاوہ خود جنابِ زینبؑ پر کیا کیا گزری۔ کیسے کیسے

ستم اور تکالیف اٹھانی پڑیں۔ اس کا بیان بھی فہیم اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

پر غضب ہے نہ کیا کوفیوں نے اس کا لحاظ | لائے جس شان سے ان کو ہے بیاں اس کا محال
ہاتے سر پر جو نہ چادر تھی، پریشاں تھے بال | خون شبیر سے پیشانی پُر نور تھی لال

رحم دل ایک نہ تھا، آہ جفا کاروں میں
ایسی حالت سے پھرایا انہیں بازاروں میں

فہیم کا جو مرثیہ جنابِ فاطمہ زہراؑ کے حال کا ہے اس میں باپ کی وفات کے بعد بیٹی کی گریہ وزاری کی شدت۔ آہ و بکا کا عالم اور دنیا سے بے زاری کی کیفیت نظم کی ہے۔ جب اہلِ شہر حضرت علیؑ سے کہتے ہیں کہ جنابِ فاطمہؑ کے گریہ نے سب کو بہت متاثر کر رکھا ہے انہیں آپ تسلّی دیں اور کہیں کہ اگر دن کو گریہ کرتی ہیں تو رات کو سو جایا کریں۔ حضرتِ علیؑ نے یہ پیغام جنابِ فاطمہؑ کو سنایا تو آپ نے فرمایا ؎

بے سایہ ہو پدر سے مرا سر، نہ روؤں میں | دنیا سے اٹھیں شافعِ محشر، نہ روؤں میں
جائیں جہاں سے دینِ کے سرور، نہ روؤں میں | لوگو بتاؤ باپ کو کیوں کر نہ روؤں میں

اشکوں سے اپنے منہ کو بھگوتا نہیں ہے وہ
کیا جس کا کوئی مرتا ہے، روتا نہیں ہے وہ؟

اس کے بعد فرماتی ہیں کہ ؎

کہیے کہ غم میں باپ کے بے جاں ہے فاطمہؑ
دنیا میں چند روز کی مہماں ہے فاطمہؑ

اس کے بعد فہیم نے جنابِ فاطمہؑ زہرا کا رسولِ اکرم کو خواب میں دیکھنا۔ خواب میں ان سے گفتگو اور پھر حضرتِ علیؑ اور بچوں سے وصیتیں نظم کی ہیں جو مکالمہ نگاری کی کامیاب مثالیں ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

حاضر ہوں خدمتِ شہِ عالی جناب
دیکھا ہے یا علیؑ ابھی بابا کو خواب میں
فرماتے ہیں یہ مجھ سے شہنشاہِ دوسرا
جنت سے تیرے لینے کو آیا ہوں فاطمہؑ
دل میں خیالِ عقد جو ہو شاہِ نیک نام
اِن بچوں کا بھی دھیان رہے اے فلک مقام
ساماں فراق کا ہے اجل کا نزول ہے
یہ اور ایک خدمتِ بنتِ بتولؑ ہے

اس کے بعد وفاتِ جناب فاطمہؑ اور سب کے بین نظم کیے ہیں۔ آخر میں مقطع میں فہیم اپنے لیے اس طرح دعاگو ہیں کہ ؎

بس ختم کر فہیم غم و درد کا بیاں — مجلس میں کافی ہو چکا اب گریۂ فغاں
کر یہ دعا بہ خدمتِ مخدومۂ جہاں — افکار دل سے دُور ہوں غم سے ملے اماں
چھوٹ جاؤں قیدِ غم سے یہ مطلب حصول ہو
یہ مرثیہ اس ہیچ مداں کا قبول ہو

فہیم نے جس مرثیے میں مختارنامے کو نظم کیا ہے اس کے چہرے میں زندگی کی بے ثباتی۔ دنیا کی ناپائیداری اور ظلم کے بُرے انجام پر روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں کہ ؎

جو رکھتے تھے نخوت سے سدا تاج سروں پر — انجام میں دیکھے گئے وہ ٹھوکروں میں سر
عریاں رہے تن آیا کفن تک نہ میسّر — بے گور محل والے نظر آتے ہیں اکثر
جو سرکش دنیا تھے وہ قبروں میں نہیں ہیں
سر اُن کے کہیں پھینکے گئے جسم کہیں ہیں

اس کے بعد اصل موضوع کی جانب اس طرح گریز کرتے ہیں کہ ؎

مختار [illegible] جب قید سے چھوٹا — یکبارگی ہونے لگا یثرب کو روانہ
طے کر کے سفر خدمتِ سجادؑ میں پہنچا — عابدؑ کو بھی زینبؑ کو بھی شہ کا دیا پُرسہ
قدموں پہ گرا شہ کے اجازت طلبی میں
روتا رہا تا دیر غمِ سبطِ نبیؐ میں

اس کے بعد وہ واقعہ نظم کیا ہے کہ جب ایک دن حضرتِ علیؑ مع اپنے اصحاب کہیں سے گزر رہے تھے۔ راہ میں دو بچے مختار اور حبیب ابنِ مظاہر ملے۔ حضرت علیؑ نے دونوں زانوؤں پر بٹھا کر اپنے اصحاب سے فرمایا کہ ؎

مختار ہے اک ان میں ہے اک ابنِ مظاہر — اک طالبِ خونِ شہدا، ایک ہے ناصر
جب معرکۂ کرب و بلا ہوئے گا ظاہر — ہوگا یہ مدد کو مرے فرزند کی حاضر
اعدا کو یہ سر جنگ کے دکھلائے گا رن میں
تیغ و طبر و تیر و سناں کھائے گا رن میں

مختار جب رہائی کے بعد سلطنتِ کوفہ کے مالک ہوئے اس وقت کا ذکر فہیم آس طرح کرتے ہیں کہ ؎

دیتے ہیں خبر اس طرح راویٔ نکوکار — مختار ہوئے سلطنتِ کوفہ کے مختار
اعدا کی گرفتاری پہ کامل ہوئے تیار — پکڑے ہوئے آنے لگے ملعون ستم گار
چُن چُن کے ہر اک ظالمِ بے درد کو مارا
ابنِ انس و خولیِ نامرد کو مارا

حضرت مختار کے دربار میں جب قاتلانِ شہدائے کربلا حاضر ہوتے اور ایک ایک سے اس کے جرم پر سوالات ہوتے اور سزائیں تجویز ہوتیں اس موقع کی مکالمہ نگاری بڑی نفسیاتی ہے۔ حضرتِ علی اصغرؑ کو تیرِ ستم سے شہید کرنے والا حرملہ جب پیش ہوا اس موقع پر حضرت مختار اس سے مخاطب ہوئے ؎

معصوم پہ جلاد تجھے رحم نہ آیا   کرتا رہا فریاد تجھے رحم نہ آیا
کیوں باغی بیداد تجھے رحم نہ آیا   تیرے بھی تھی اولاد تجھے رحم نہ آیا

ایک ہی فنِ جنگ میں تو فرد تھا ظالم
قاسم سے لڑا ہوتا اگر مرد تھا ظالم

مسلم کے جگر بندوں سے خود مَر تُو دغا کی   کیوں عون و محمد سے ستم گر نہ وغا کی
عباسؑ سے اکبرؑ سے لشکر نہ وغا کی   موجود تھے میداں میں بہتّر نہ وغا کی

ان میں نہ کسی مرد پہ بے پیر چلایا
بے جرم و خطا بچے پہ کیوں تیر چلایا

مختار پکارے تری نخوت وہ کہاں ہے   انعام میں پائی تھی جو دولت وہ کہاں ہے
کیوں غیظ و غضب کبر و رعونت وہ کہاں ہے   ظالم یہ بتا ظلم کی عادت وہ کہاں ہے

موجود ہے کچھ دل میں ابھی بے کی خواہش
میں دوں تجھے، باقی ہے کسی شے کی خواہش

اس مرثیے کی کچھ بیتیں تو بہت زیادہ برجستہ، رواں دواں اور بے ساختہ ہیں۔

اس تیغ سے اُس باغی بیداد کو ماروں
مالک کا پسر ہوں تو ابنِ زیاد کو ماروں
سچ کس طرح قولِ شہِ ذی جاہ نہ ہوتا
شیطان تھا کیوں راندۂ درگاہ نہ ہوتا
سو لاکھ کے لشکر کو وہ لائے تو ستم گر
میداں میں مرے سامنے آئے تو ستم گر
پیادوں میں ہو تو یا ہو سواروں میں کرو قتل
تو لاکھ چھپے تجھ کو ہزاروں میں کروں قتل

مجبورِ ستم گر نے صف آرا کیا لشکر
تا دیر جف کار سنوارا کیا لشکر

مرثیے کے اختتام پر مقطع کی بیت میں نہیمؔ کہتے ہیں کہ ؎

مضموں یہ طبیعت کو تھا مرغوب لکھا ہے
سب اہلِ سخن کہتے ہیں کیا خوب لکھا ہے

نہیمؔ کے مندرجہ بالا تین مراثی کے علاوہ بھی فہیمؔ نے چند مراثی اور کہے ہیں جوان کے ورثار کے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن راقم کی نظر سے نہیں گزرے اور تمام مراثی غیر مطبوعہ ہیں۔

نہیمؔ نے سلام بھی کافی کہے ہیں۔ جن میں سے کل ۲۸ سلام زیورِ طبع سے آراستہ ہوسکے ہیں اور "کلامِ فہیمؔ" کے عنوان سے حسینی کتاب گھر محلہ پچدرہ امروہہ سے شائع ہوتے ہیں۔ جن پر روشن علی چشتی نظامی نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے

"مجھے قوی امید ہے کہ فہیمؔ صاحب کا کلام اہلِ ایمان کے قلوب کو عشقِ محمدؐ وآلِ محمدؐ سے منور کرے گا اور نوعِ انسانی کو روحانی سکون حاصل کرنے میں یہ مجموعہ معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ"

سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم ریاضِ فاطمہؑ میں چہچہاتے ہی رہے
عندلیبانِ چمن سب خار کھاتے ہی رہے

اصغرؑ ناداں کو تھی ایسی شہادت کی خوشی
تیر شہ کھینچا کیے وہ مسکراتے ہی رہے

قبریاں داغِ غمِ شہ سے منور ہوگئی
شمع تربت پر مرے احباب لاتے ہی رہے

صغرا یہ رو کے کہتی تھی ...
... فریاد ہے
میں دیکھتی ہوں خواب پریشاں سے

بلوے میں کھولے ہائے نبی زادیوں کے سر
کہنے میں شام میں تھے مسلماں بنے ہوئے

چالیس روز لاش رہے اس کی بے کفن
لاتا تھا پیرہن جسے رضواں بنے ہوئے

پنجتن کے عشق میں دیں کا پتہ مل جائے گا
گھر سے اہلِ بیتؑ کے تم کو خدا مل جائے گا

جب اٹھے دستِ دعا باب اجابت کھل گیا
رحمتِ حق نے صدا دی، بیٹھو جا مل جائے گا

آنسو غمِ حسینؑ سے پائیں گے آبرو!
پوچھیں گے اہلِ حشر یہ موتی کہاں کے ہیں

ہے وصفِ پنجتن میں حلاوت عجب فہیم
لطفِ سخن کے ساتھ نئے بھی زباں کے ہیں

جب آ گیا خلفِ بوتراب پانی میں
اٹھا یہ شور کہ ہے آفتاب پانی میں

فہیم کا ایک مندرجہ ذیل سلام بے حد مقبول ہے اور ادھر میں جگہ جگہ پڑھا جاتا ہے ؂

ساقیِ کوثر جو کوثر کے کنارے جائیں گے
حیدری مے خوار ہی پہلے پکارے جائیں گے

فہیم نے ایک سلام ۱۴۲ اشعار پر مشتمل کہا جس میں تمام شہدائے کربلا

اسمائے گرامی نظر ' مجبور سنم ... نے رُباعیاں بھی کہی ہیں ایک رُباعی ملاحظہ ہو ؎

بچپن نہ رہا ، نہ جوانی نہ رہی ہم یوں مٹے پیری کی کہانی نہ رہی
یہ لوٹ پلٹ دیکھا زمانے کا فہیم دریا تو وہی ہے پر روانی نہ رہی

فہیم نے چند قصائد بھی کہے ہیں جو اکثر امروہہ کی محافل میں انہوں نے خود پڑھے ہیں ۔ ایک قصیدہ بہت مشہور ہے جس کا مطلع ہے ؎

ع جس سے دیں قائم ہوا وہ مقتدیٰ پیدا ہوا

فہیم کی مشقِ سخن مذہبی شاعری تک ہی محدود رہی ۔ وہ گوشہ نشین قسم کے انسان تھے ۔ شہرت و مقبولیت سے انہیں دل چسپی نہیں تھی جو کچھ کہتے اس کا مقصد حصولِ ثواب ہوتا تھا ۔ ان کے نہ صرف مراثی قابلِ توجہ بلکہ ان کے بہت سے سلام بھی ناقابلِ فراموش ہیں ۔

فہیم کے ورثا میں ان کے پسر سید عطا حیدر ہیں جو سرکاری ملازم ہیں لیکن شعر و سخن سے ان کو خاص دل چسپی نہیں ہے ۔

آہ دنیا میں برپا کیا سانحہ



مولوی سید نسیم حسن ہلال

اترپردیش

صفحہ ۲۸۳) ۱۳۶۴ھ مطابق جو

ہلالؔ کی وفات ۵۳ سال کی عمر میں ۲۵ رجب ۱۳۶۴ھ مطابق ... ۱۹۴۵ء کو ہوئی۔

ہلالؔ نے ابتدا میں اپنے بھائی کمالؔ اور پھر مولوی سید اولاد حسن تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔

ہلالؔ کی تصانیف میں "الصلوٰۃ" "زبردست خلافت" "ازالۃ الغرور من اہل نائی" ... "دیدۂ عبرت" "پال کے گیہر تا جس کا صدف" "نشر در" "تائید اسلام" طبع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ "ذوالخشتین ذوالقرآن" غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں امام حسینؑ کی ولادت سے اہلِ حرم کی مدینے کو واپسی تک قرآن سے ثابت کی ہے۔

ہلالؔ کے اخلاف میں چار پسر محمد علی جعفر اور مولوی محمد ابوطالب تو امروہہ رہتے ہیں۔ عبدالمطلب کم سنی میں انتقال کر گئے اور محمد ہاشم پاکستان میں ہیں۔ مولوی محمد ابوطالب سید المدارس امروہہ کے پرنسپل اور مسجد سجادیہ کے پیش امام ہیں۔ ان کے تین پسر اسد علی۔ علی بن ابوطالب اور محمد علی ہیں۔ محمد ہاشم کے دو پسر اعجاز حیدر اور نسیم حیدر ہیں۔

ہلالؔ کے شاگردوں کا بھی امروہہ میں ایک بڑا حلقہ تھا ان کے مخصوص شاگرد رئیسؔ۔ جوشؔ۔ یکتاؔ۔ شفیقؔ۔ سعیدؔ۔ قائمؔ۔ فلکؔ۔ خادمؔ اور وفاؔ ہیں۔ ہلالؔ کی وفات پر ان کے شاگرد سید بن کاظم فلکؔ امروہوی نے مرثیہ کہا مقطع مندرجہ ذیل ہے ؎

فلکؔ ستاتی ہے بقیۂ ہستی جہان کی سختیاں سہہ ہے
زمیں کی گردش نہ پوچھو یاں تو ہلالؔ کو بھی گہن لگے ہے

ہلالؔ نے غزل۔ قصیدہ۔ سلام اور مرثیہ کہا ہے۔ کربلا کے موضوع پر آخری عمر میں مرثیہ کہا جو رامپور کے قیام کے سبب ... اسکلا اللہ نجم الملت مولانا سید نجم الحسن اعلی اللہ مقامہ ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین ... مقام سید محمد عبدالمطلب (پسر ہلالؔ) کی وفات اور قوم کے حال میں جو مراثی لکھے ہیں وہ ... مولوی سید ابوطالب کے پاس موجود ہیں مراثی کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں ؎

ع کیا سناؤں آہ دنیا میں ہوا کیا سانحہ

ع آہ یہ خون [illegible] غم کا سر پہ اپنے آسماں

ع مطلب اے نور [illegible] چشم و راحت جانِ پدر

ع کیا کہیں ہم کو [illegible] ہے یہ سن لو ہماری داستاں

اپنے فرزند عبدا[illegible]طلب کے حال میں جو مرثیہ کہا اس کا عنوان "غم رعنا" رکھا جس سے ۱۳۶۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

بچپنا دیکھا ترا تیری جوانی دیکھ لی — خوش ادائی دیکھ لی اور خوش بیانی دیکھ لی
ہم نے دو دن کی تری بس زندگانی دیکھ لی — دیکھ لی ہم نے قضائے ناگہانی دیکھ لی
واقعی اولاد کا غم سب غموں میں فرد ہے
تو نہیں دنیا میں لیکن دل میں تیرا درد ہے

ایک مرثیے میں زندگی کی حقیقت اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

خاک ہے دنیا حقیقت میں نہیں اس کو ثبات — ہیچ ہے عاقل کی نظروں میں یہ ساری کائنات
راہ میں پڑتی ہیں اک انساں پہ کیا کیا مشکلات — مل نہیں سکتی کسی کو موت سے ہرگز نجات
بارِ غم سے کون ہے وہ خم جس کی یاں گردن نہیں
دین والوں کے لیے دنیائے دوں مسکن نہیں

مولانا ناصر الملت کے حال کا مرثیہ ہلال نے ۲۵ رجب ۱۳۶۱ھ کو امروہہ کی ایک مجلس میں بھی پڑھا تھا۔

ہلال کے قصائد کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب عشق نہ ہو دل میں کیا جینے میں جینا ہے
مے سے اگر خالی بیکار وہ مینا ہے

ا... ـــــ کا ہر گز نہ جنوں ـــــ سمجھو

یہ ... ق الفت میں پہلا ہی تو زینہ ہے

ہو رہا ہے نفس کا کس کے خدا سے سوال دیکھ
سو رہا ہے کون بستر پہ آنکھیں کھول دیکھ

بعد عرشِ پاک کے کعبہ بنا جس کا صدف
ہے نبی کے ہاتھ پر موتی وہی انمول دیکھ

مصحفِ ناطق ہے ہاتھوں پر رسول اللہ کے
قرأتِ قرآن اور طفلی میں یوں جھول دیکھ

منزلت دوشِ رسول اللہ پر کس کو ملی
ہو گیا بالا خدا کے گھر میں کس کا بول دیکھ

کٹ چکے حزبِ یداللہ سے پرِ روح الامیں
ہو رہا ہے جنگ کا میدان ڈانواڈول دیکھ

ہیں صبر و شکر نازاں اس موردِ الم پر
سو سو ہیں کربلائیں جس کے قدم قدم پر

تھم تھم کے کر رہا ہے طے اپنی سخت منزل
دیتے ہیں خار بوسے بیمار کے قدم پر

اقرارِ عجز خود ہی سر ٹیک کر کیا ہے
ہر ثنا جو رکھا ہم نے کبھی قلم پر

بلال کے ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

فوجِ اعدا ظلم دکھلاتی رہی
پیاس سے اصغر کو ترساتی رہی

آگے دنیا نہیں یہ دیکھا جا [illegible]

جس قدر آتی رہی جاتی رہی

شرم کیوں تجھ کو نہ آئی اے فرات

سامنے پیاسوں کے اتراتی رہی

کچھ مجھے بھی دیجئے یا شاہِ دیں

ملک جنت آپ کی ذاتی رہی

حبِ حیدرؑ دل میں اپنے لے ہلالؔ

راستہ جنت کا بتلاتی رہی

ہلالؔ نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہیں ہیں ایک مطلع ملاحظہ ہو ۔

زلف کا جب خیال آتا ہے

سانپ سا دل پہ لوٹ جاتا ہے

ہلالؔ کی عمر صرف ۵۳ سال ہوئی اس کے باوجود انہوں نے خود کافی کہا اور بہت سے شعرا کی رہنمائی بھی کی ۔ ان کی عمر کچھ اور وفا کرتی تو وہ یقیناً اپنی اصل منزل حاصل کر لیتے ۔

ہلالؔ کی قبر نوبشاہ امروہہ میں ہے ۔

سید سبطین احمد سبطینؔ

سید سبطین احمد کا سلسلۂ نسب سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے اس لئے ان کا تعلق ساداتِ نقوی سے ہے۔ سبطینؔ کے مورثِ اعلیٰ سید محمد تقی بھی بڑے نامور ہوئے ہیں۔ ان کی نسل میں حاجی مقبول احمد اور حافظ سبط احمد بڑے علم دوست گذرے ہیں۔

حافظ سید سبط احمد کے فرزند سید سبطین احمد سبطینؔ ہوئے۔ سبطینؔ کی ولادت امروہہ میں تقریباً ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ ایک طرف گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا، بزرگوں سے خوشنویسی اور مرثیہ خوانی کی روایت جاری تھی تو دوسری طرف آسودہ حالات تھے فکرِ معاش سے بےنیازی نے اور بھی مواقع دیے کہ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی بڑھ سکے۔ خوش گلوئی کی نعمت قدرت کی جانب سے ملی تھی۔ ابتدائے عمر ہی سے سوز خوانی کا آغاز کیا۔ اس مشق نے شاعری کی جانب بھی راغب کر دیا۔ پہلے سلام۔ قطعات اور قصائد کہے۔ آہستہ آہستہ وقت بھی آیا کہ مرثیہ کہنے کا ارادہ کیا۔

راقم نے جب کراچی کے ادبی دورے کے درمیان سید سلطان احمد و سید عرفان احمد

نبیرگان سبطین سے رابطہ قائم کیا تو سبطین کی چند بیاضیں بخطِ سبطین دیکھنے کا موقع ملا جن میں تقریباً ۲۰ نعتیں، ۲۲ قصائد، ۲۴ سلام، ۲۷ قطعات، ۶۵ رباعیات اور ۶ مراثی وغیرہ تھے۔ مراثی کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں۔

ع۔ پروردگار لائقِ حمد و ثنا ہے تو

ع۔ باعثِ خلقتِ کونین ہے ذاتِ احمدؐ

ع۔ جب کربلا میں گلشنِ زہراؑ قلم ہوا

ع۔ جب اہلِ بیت قیدِ ستم سے رہا ہوئے

ع۔ سوئے کوفہ ہے مدینے سے سفر مسلم کا

ع۔ خنجر سے جب قلم سرِ شہِ دیں کا گلا ہوا

سبطین نے مندرجہ بالا مراثی میں حمدِ خدائے تعالیٰ، نعتِ رسولؐ، مدحِ ائمہؑ و مدحِ شہدائے کربلا اور مصائبِ اہلِ بیت کا ذکر کیا ہے ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہم رشتۂ مشیتِ ربِ قدیر ہیں — مثلِ رسولِ پاک، بشیر و نذیر ہیں
اللہ کے ولی ہیں، نبیؐ کے وزیر ہیں — مولائے مومنین، جنابِ امیر ہیں

ہر نظمِ کائنات خدا ان کے ہاتھ ہے
یہ حق کے ساتھ ساتھ ہیں حق انکے ساتھ ہے

سبطین کے چند سلام امروہہ میں بے حد مقبول ہیں اور اب بھی جگہ جگہ ماہِ محرم میں پڑھے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

علیؑ ساسل گیا آقا مقدر ہو تو ایسا ہو
سرِ منبر بنا مولا جو رہبر ہو تو ایسا ہو

پچھاڑا مرحب و عنتر کو دو ٹکڑے کیا اژدر
جو صفدر ہو تو ایسا ہو جو حیدرؑ ہو تو ایسا ہو

بہتّر یاورانِ شاہِ دیں لاکھوں پہ بھاری تھے
دلیرانہ کہا، وفاداروں کا لشکر ہو تو ایسا ہو
ہمیشہ کے رہے ہر جنگ میں سینہ سپر حیدرؑ
فدائی ہو تو ایسا ہو، برادر ہو تو ایسا ہو
سخن کو دیکھئے سبطین کے وہ دلکشی مولا
ہر اک مومن پکار اٹھے سخنور ہو تو ایسا ہو

ولی بھی ہے، وصی بھی بالیقیں ... بھی ہے اور یوں بھی
علیؑ مرتضیٰ ہادیٔ دیں یوں بھی ہے اور یوں بھی
فضیلت میں بھی یہ افضل، قرابت میں بھی یہ اوّل
ولیِ حق، نبیؐ کا جانشیں یوں بھی ہے اور یوں بھی

سبطین نے نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی چند سلام کہے ہیں اور کافی نعتیں بھی کہی ہیں ایک نعت جو صنعتِ ردّ العجز علی الصدر میں ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مدحت شہِ ذیشاں کی رفعت ہے ثنا خواں کی
رفعت ہے ثنا خواں کی مدحت شہِ ذیشاں کی
آیات میں قرآں کی ممدوحِ خدا احمدؐ
ممدوحِ خدا احمدؐ آیات میں قرآں کی
مجھ بے سر و ساماں کی للہ خبر لیجے
... مجھ بے سر و ساماں کی

سبطین کے مندرجہ ذیل قصائد ان کے شاہکار ہیں۔

۱۔ والیٔ مولائے ہر انس ان علی

ع ۔ ام الانساں حضرتِ حوّا عزیز

ع ۔ السلام اے جانشین سرورِ دنیا و دیں

ع ۔ السلام اے یادگارِ حضرتِ خیر الوریٰ

ع ۔ ذکر آل کے زینتِ قرآں ہوئے

ع ۔ چمن آج جنت کا منظر بنا ہے

سبطین کے مندرجہ بالا قصائد تمام اجزا کے ساتھ ہیں اور ان میں ۱سے سو تک اشعار ہیں۔

دو رباعیات بھی ملاحظہ ہوں۔

آیاتِ خدا کی ترجمانی اور میں
قرآن و حدیث کے معانی اور میں
سبطین ہے یہ فیضِ رسول الثقلین
ممدوحِ خدا کی مدح خوانی اور میں

اللہ کے گھر کے بت گرائے کس نے
سکے اسلام کے جمائے کس نے
دنیا میں بہت طبلِ فتوحات بجے
ڈنکے توحید کے بجائے کس نے

سبطین کے دو قریبی عزیز مولوی سید مجتبیٰ عرف چاند اور سید اتقی حسن یکتا بھی شاعر ہوئے ہیں۔ سبطین نے اس سلسلے میں بھی ایک قطعہ کہا ہے۔

چاند کی طرح سے چمکتا ہے
مثلِ گل بزم میں مہکتا ہے
مدحتِ اہلِ بیت میں سبطین
مجتبیٰ کا کلام یکتا ہے

سیّد شفا احمد ایم

سید حسین شرف الدین شاہ ولایت واسطی کی نسل میں سید غلام اسد اللہ خاں عرف میر کلو اپنے عہد کی نامور شخصیت ہوئے ہیں۔ میر اسد اللہ کے سات فرزند زوجۂ ثانیہ مسماۃ تاج النساء بیگم بنت سید غلام حیدر دہلوی سے ہوئے۔ سب اعلےٰ منصب دار تھے۔ چوتھے فرزند سید فتح علی تھے جن کے بارے میں صاحبِ "تواریخِ واسطیہ" کا بیان ہے کہ:

"سید فتح علی عزلت گزینی وخانہ نشینی کے عادی، وضع وقطع سادی سب سے آزادی، نیکو کاروں سے اتحاد رکھتے تھے ان کے بیٹے سید عظیم علی بڑے مدبر و منتظم دور اندیش کیش تھے انہوں نے مکانات رفیع الشان بنوائے مگر چھتہ ان کی تعمیرات میں جو سڑک کو پاٹ کر تعمیر ہوا ہے دور دور مشہور و معروف ہے خطوط کا واضح پتہ اس پر موقوف ہے قرآن شریف ایک روز میں تلاوت کر لیتے تھے مجالس محرم وار بعین و نو چندی کرتے تھے۔" (صفحہ ۴۵۲)

سید عظیم علی ... اولاد عظیم علی والے کہلاتے۔ سید عظیم علی کے پوتے

ن کا ... ... ہاشمی کے ہفت بند کا نمونہ ہے نہایت نیک متقی پرہیز
اور فہیم و عقیل انسان تھے انہوں نے عالم جوانی میں انتقال کیا۔ ایک پسر ...
سید رضا احمد کو چھوڑا۔ سید رضا احمد کے ہی فرزند سید شفا احمد ادیم ہیں۔
ادیم کی ولادت ۲۶ رجب المرجب ۱۳۱۱ھ مطابق ۳ فروری
شنبہ ہوئی۔ زمانۂ طفلی میں ہی سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی
رواج کے مطابق گھر پر ہی ہوئی اس کے بعد ہائی اسکول کی سند حاصل
مطالعے کے سبب اردو کے علاوہ فارسی عربی اور ہندی زبان ...
رکھتے تھے۔ حافظِ قرآن بھی تھے۔
کسبِ معاش کے لیئے اوائل عمر میں ہی گھر چھوڑنا پڑا ...
دہرہ دون میں ملازمت کی بعدہ ملٹری انجینئرنگ سر... میں ٹکنیکی
پر شہر پشاور میں تقرر ہوا وہاں سے میران شاہ تبادلہ ہوا۔ کچھ
چھاؤنی میں سب ڈویزنل آفیسر مقرر ہوتے جہاں ...
دوسری جنگِ عظیم کے دوران فیروزپور سے ...
آزادی سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت سے مستعفی ...
ادیم کا قلمی نام ابوالرفاقہ ... ...
کہنہ مشق نثار بھی تھے اور ... میں ... ...
شاگرد تھے۔
ادیم کی دو شادیاں ہوئیں۔ زوجہ ... ...
۸ جون ۱۹۲۸ء کو مونسہ خاتون دختر ...



میں آپ کے

مطابق ۵ صفر

تحریری وصیت کے

حسین شاہ بخار

جہاں تک

انہوں نے اپنے

اسی لیے انہوں نے

فرماتے ہیں کہ

عرض اب خدمت احتسا

مجھ کو اہل فن

ادجم کی نہ جز و

تق

زادِ ارم" "نی شعلِ نور" اور "خاتونِ قیامت" وغیرہ شائع ہوتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے برزخ کو "ہاں جہنم"۔ "جاہلیت کی موت"۔ "جہاد فی اللہ"۔ "ہل من ناصر"۔ "خونِ ناحق"۔ "مجالس الصادقین"۔ "اہل البیت"۔ "جامع الانوار"۔ "نور الایقان"۔ "تعلیم اسلام برائے اطفال و مبتدیان"۔ "محسنِ اعظم" اور "مدیح اولیا" وغیر نثر۔ شعری مجموعے۔ مراثی۔ نوحہ۔ سلام مسدس اور قصائد پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ "الرسول" قلمی موجود ہے۔

کراچی میں ادیم کے ہم خیال و معتقدین حضرات کا ایک وسیع حلقہ تھا اور آپ نے ایک ادارہ حزب الطالبین قائم کیا تھا۔

ادیم کا پہلا مرثیہ جو منظرِ عام پر آیا وہ "مشعلِ نور" کے عنوان سے لاہور سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ جس میں ۲۱۲ بند ہیں۔ اس مرثیے میں عقل اور فلسفے سے بکاالحسینؑ پر وجوب جنت کا ناقابلِ رد ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ معرفت کے بعد گریہ کرنے کی کیا اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ ادیم کے ہم مراثی ان کی تصنیف "مجالس الصادقین" میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ادیم نے اپنے دیگر مراثی کے بند اپنی مجالس میں شامل کیے ہیں ان کے مراثی کے دو مجموعے "خونِ ناحق" اور "محسنِ اعظم" شائع ہوئے ہیں انہوں نے تقریباً ۱۸ مرثیے تصنیف کیے ہیں چند مراثی کے مطلعے اس طرح ہیں۔ مطلع ؎

اے حسینؑ ابنِ علیؑ دوشِ پیمبرؐ کے مکیں تو ہی لاریب ہے انگشترِ خاتم کا نگیں
تیری ڈیوڑھی پہ ملک ٹیکتے ہیں اپنی جبیں تیری الفت سے منور ہے فلک تا بہ زمیں

دل میں جس شخص کے الفتِ شہِ ذی شان پیدا ہو جائے
اس پہ خلاقِ ازل آپ ہی شیدا ہو جائے

وہ طالبِ رخصت ہے شہِ دیں سے علمدار   شبیرؑ کا بچپن سے سدا جس پہ رہا پیار
گھر بھر کا محافظ بھی ہے اور سب کا ہی غمخوار   اس شیر سے مرعوب ہیں سب لشکرِ اشرار

بچپن سے وہ شبیرؑ کی گودی میں پلا ہے
جب تیس برس کا ہوا مرنے کو چلا ہے

اس مرثیے میں ۲۶ بند ہیں حضرت عباسؑ کا امام حسینؑ سے اذن لینا اور اہلِ حرم سے رخصت بیان کی ہے۔

مطلع

فرزند کا ماتم بھی زمانے میں غضب ہے   نشتر کی طرح چبھتا ہے دل میں وہ تعب ہے
ہر قلب کے دنیا میں تڑپنے کا سبب ہے   گر دل کو کسی کے نہ تڑپ ہو تو عجب ہے

نزع میں کوئی باپ نہ فرزند کو دیکھے
بسمل سا تڑپتا نہ جگر بند کو دیکھے

اس مرثیے میں ۸۱ بند ہیں۔ جن میں اولاد کی محبت۔ غم کی اہمیت اور حضرت علیؑ کی مدح کے علاوہ اذنِ جنگ۔ رخصت۔ رجز اور شہادت کا بیان کیا ہے۔

مطلع

اے صاحبو! اولاد بھی کیا نعمتِ رب ہے   سچ ہے کہ یہی زینتِ دنیا کا سبب ہے
اولاد سے محبوب زیادہ کوئی کب ہے   بچوں سے نہ الفت ہو کسی کو تو عجب ہے

بچے پہ تو ہر شخص ترس کھاتا ہے یارو
حیوان کے بچے پہ بھی رحم آتا ہے یارو

اس مرثیے میں ۷۰ بند ہیں پہلے بچپن کے موضوع پر چند بند ہیں پھر حضرتِ علی اصغرؑ کا ذکر ہے۔ میدان میں جانا۔ شہادت اور بین نظم کیئے ہیں۔

مطلع

یکبار بلی شب ٹوٹ پڑے ظالم و بدخواہ   پھر کون سا حربہ تھا کہ ان پر نہ چلا آہ

جو بچ کے چلے سوئے خیمہ یہ کہنے لگے واہ   جرأت سے تو واقف دنیا نے تو دیکھا؟

"دکھلا چکے ہم فوج پہ شمشیر کا جلوہ

اب دیکھیے مظلومِ شبیرؑ کا جلوہ"

یہ ایک مختصر مرثیہ ہے اور اس میں صرف ۱۲ بند ہیں جن میں جنابِ عون و محمد کی شہادت اور جنابِ زینبؑ کے بین نظم کیے ہیں۔

یوں تو ادیم کے تمام مراثی میں ان کے مخصوص نقطۂ نظر اور فکری نہج کا عکس نظر آتا ہے لیکن ان کا پہلا مرثیہ "مشعلِ نور" ان کے خیالات و نظریات کی خاص طور سے وضاحت کرتا ہے۔ اس مرثیے میں کیفیاتِ نفسِ انسان اور تجزیۂ نفس کو عام فہم الفاظ میں تمثیلات کے ساتھ نظم کیا ہے۔ راہِ معرفت کے راہی کے لیے منزلِ معرفت کی نشان دہی کی گئی ہے اور ثابت کیا ہے کہ غمِ حسینؑ کو اپنا لینے سے وہ نور ملتا ہے جو اسی زندگی میں حیاتِ ابدی کا خالق ہے۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید۔ رسولؐ و اہلِ بیت کی تعلیمات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں مصائب اور اس کے بعد کچھ دعائیں کی ہیں۔ ادیم کہتے ہیں ؎

یہ عطائے شہ والا ہے رہے دھیان حضور

نام اس مرثیے کا اس لیے ہے "مشعلِ نور"

ادیم کے مراثی میں نہ جنگ کا بیان ہے۔ نہ تلوار اور گھوڑے کی تعریف ہے نہ بہار کا ذکر ہے اور نہ ساقی نامہ ہے۔ بلکہ صرف واقعۂ کربلا اور شہدائے کربلا کی مدح ہے اور تمام مراثی پر جو چیز سب سے زیادہ چھائی ہوئی نظر آتی ہے وہ ہے فلسفۂ شہادت امام حسینؑ یوں تو اردو کے قدیم مراثی میں بھی فلسفۂ شہادت کی ہلکی سی جھلک مل جائے گی۔ شاد عظیم آبادی کے ہاں یہ رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے۔

بیسویں صدی کے شعراء نے بھی ادھر کافی توجہ دی ہے لیکن جس طرح ادیبؔ نے مراثی پر یہ رنگ چھایا ہوا ہے اس کی مثال کسی دوسرے کے ہاں نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے ادیبؔ کو ایک انفرادیت حاصل ہے اور ایسا لگتا ہے کہ انہوں یہ مراثی اس مقصد کو سامنے رکھ کر کہے ہیں۔ امام حسینؑ کی مدح ملاحظہ ہو؎

اے حسینؑ ابنِ علیؑ میں تری الفت کے نثار — اے خدائی کے ولی تیری محبت کے نثار
تیری اولاد کے قرباں تری عترت کے نثار — تیری مظلومی کے صدقے تری غربت کے نثار

بحر و بر سارے تری پیاس پہ قرباں مولا!
تجھ پہ صدقے ہوں دو عالم کے سلیماں مولا

واقعی شہ نے بڑا خلق پہ احسان کیا — کام کچھ اس نے فزوں از حدِ امکاں کیا
بھانجوں بیٹوں بھتیجوں کو جو قربان کیا — شرک زائل کیا روشن دلِ ایمان کیا

مقصدِ فدیۂ حق آہ نہ سمجھا ہم نے
کشتیٔ نفس کو افسوس ڈبویا ہم نے

ایک جگہ وہ فلسفۂ غم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ؎

مٹ جاتا ہے جذبات کا سب جوش الم سے — غفلت میں بھی آجاتا ہے کچھ ہوش الم سے
ہوتا ہے گناہوں سے سبکدوش الم سے — شیطان بھی ہو جاتا ہے روپوش الم سے

جذبات ہی دنیا میں گناہوں کا سبب ہیں
جذبات کے مصلح جو ہیں وہ رنج و تعب ہیں

دراصل ادیبؔ نفس کی پاکیزگی پر بہت زور دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نفس پوری طرح پاک ہو تب ہی معرفتِ حقیقی حاصل ہو سکے گی اور ان کی راتے میں اس معرفت کے بعد ہی گریہ کرنا مناسب ہے حالانکہ نفس کی پاکیزگی بہت مشکل کام ہے اور اس راہ میں اکثر قدم بہک جاتے ہیں۔ نفس کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ؎

ی عادات سنو اور نفس کا احوال سنو — کیا ہے دنیا کے دنی کیا ہے یہ جنجال سنو

خ کی فطرت سنو اللہ کے اقوال سنو — بس چمک اٹھے گا ہر ذرۂ عشقِ غال سنو

نفس کے مکر کی ہاں علتِ غائی کیا ہے

لاشعوری کے یہ پردوں میں چھپا بیٹھا ہے

اس کے بعد نفس کی فطرت کی اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ

فطرتِ نفس ہے جس سے کہ اُلفت ہوگی — نقل اس کی ہی کروں بس یہی چاہت ہوگی

جو پسند اس کو نہ ہو اس سے بھی نفرت ہوگی — اور محبوب کی مرغوب ہر عادت ہوگی

یہی قرآن نے بتلائی محبت کی شناخت

آئیۂ فاتبعونی میں ہے الفت کی شناخت

ادیمؔ صرف یہ نہیں چاہتے کہ انسان واقعہ کربلا سنے اور اس پر آنسو بہائے بلکہ ان کی خواہش ہے کہ انسان اس واقعہ پر غور و فکر سے کام لے اور اسے سمجھے۔ وہ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

اب تو غور کرو سوچو کہ یہ سب کیا ہے — ایک مدت ہوئی رونے کا سبب کیا ہے

ہو گیا قتل جو فرزندِ نبیؐ تب کیا ہے — کیوں نبیؐ بھیجے ہیں اللہ نے مطلب کیا ہے

کیوں یہ ہر سال عزا اس کی بپا ہوتی ہے

کس لیے شاہ پہ مخلوقِ خدا روتی ہے

کس لیے ہو گئے انصارِ حسینی قرباں — کس لیے خوش ہوئی مرنے سے بچے کی کوئی ماں

علی اکبرؑ کا لٹا باغِ جوانی جو وہاں — آہ ہم شکلِ نبیؐ کھا گیا سینے پہ سناں

دے گئے ماں کو یہ کیوں داغِ نہانی افسوس

کیوں ملی خاک میں اکبرؑ کی جوانی افسوس

کس لیئے کوفے میں تشہیر ہوئی آلِ رسولؐ کس لیئے قید میں جانا گیا زینبؑ نے قبول
ننگے سر کس لیئے دربار میں تھی بنتِ بتولؑ خاندانِ نبوی کیوں کیا دنیا میں ملول

کس لیئے بنت علیؑ یوں پھری بازاروں میں
سر کھلے کیوں گئی حکام کے درباروں میں

ان تمام سوالات کا جواب ادیم کے ہاں اسوقت مل جاتا ہے جب کہ امام حسینؑ
علی اصغرؑ کے جھولے کے پاس جا کر ان سے مخاطب ہوتے ہیں کہ ؎

اُمّت کو گناہوں سے بچانے ہیں چلتے
میدان میں تم خوں میں نہانے نہیں چلتے

کیوں کہ امام حسینؑ نے یہ قربانی اس لیئے پیش کی تھی کہ خدا کا دین باقی رہے
اور اُمت تک پہنچ سکے تاکہ اُمت بھی گناہوں سے بچ سکے اسی وجہ سے یہ قربانی
قابلِ قدر ہے فرماتے ہیں کہ ؎

یہ تو ہے نعمتِ ربّ دوسرا قدر کرو
دیکھو! ضائع نہ ہو خونِ شہدا قدر کرو

ادیم کے مراثی میں اصلاح کی بھی پُرخلوص کوشش ہے ایک جگہ کہتے ہیں کہ ؎

بتا گئے تھے ہمیں جیسے صاحبِ معراج کہ اہلِ علم کے ہیں اہلبیتؑ سر کے تاج
جو ان سے لیتے علومِ کتابِ حق تو آج ہر ایک علم میں غیروں کے ہوتے کیوں محتاج

ہمیں سے اہلِ زمیں بھیک مانگتے ہوتے
ضیا پئے رہِ تاریک مانگتے ہوتے

مختلف عبادات کو جس طرح انسان نے صرف رسم و رواج کی شکل دے دی
ہے ادیم نے اس پر بھی تنقید کی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح غمِ حسینؑ منانے سے
قبل نفس پاک ہونا چاہیئے اسی طرح نماز و روزہ وغیرہ کو ادا کرنے سے پہلے حصولِ

[illegible] الت سنو اور نفس [illegible]

وند [illegible] [illegible] رری ہے

[illegible] فا [illegible]

[illegible] ںایں کچھ شہدا کی مختصر رخصت اور رجز بھی ملتا ہے مثلاً ایک موقع پر جناب [illegible] ابر کی زبانی فرماتے ہیں کہ ؎

دعویٰ ہے تمہارا اگر مسلمان ہو سارے   کہتے ہو نبیؐ تم بھی تو، نانا کو ہمارے

آیا ہے یہ ہم شکلِ نبیؐ پاس تمہارے   تصویر پیمبرؐ کے کرو خوب نظارے

امیدِ نجات ہے جو رسولِ مدنیؐ سے

کس طرح سے پیش آتے ہو ہم شکلِ نبیؐ سے

ادیم کے مراثی میں مصائب کا حصہ بھی کافی پُرتاثیر ہے۔ چند مواقع کی منظر کشی بڑے دردناک انداز میں کی ہے مثلاً جناب عون و محمد کی شہادت کے موقع پر فرماتے ہیں کہ ؎

حضرتؑ سے عرض کی علی اکبر نے دوڑ کر   مارے گئے حضور پھوپی جان کے پسر

رنگ اڑ گیا حسینؑ کا سنتے ہی یہ خبر   فرمایا ہائے لٹ گیا بے کس بہن کا گھر

ہم رہ گئے بڑھاپے میں آنسو بہانے کو

عباسؑ آؤ بچوں کے لاشے اٹھانے کو

ادیم کا جو مخصوص نقطۂ نظر ہے اور جس بات پر انہوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے اس سے ان کے مراثی کا مقطع بھی خالی نہیں ہے۔ وہ اپنے لیے بھی دعا گو ہیں کہ ؎

بی بی یہ ادیم آپ کی الفت کا ہے طالب

اس پر کوئی جذبہ کوئی خواہش نہ ہو غالب

مراثی کے علاوہ ادیم نے قصائد، سلام، رباعیات، قطعات، مناجات اور نوحے بھی کہے ہیں۔ لیکن وہ غزل سے ہمیشہ دور رہے۔ ان کے ادبی سرمایے میں تیس غیر مطبوعہ قصائد اور کچھ رباعیات ان کے پسر سید علی صادق نقوی کے پاس محفوظ ہیں۔ رباعی ملاحظہ ہو ؎

نانا کو روتی ۔۔۔ ماں کا جنازہ دیکھا ۔۔۔ بابا کا برچھے ۔۔۔ کیا زینبؑ نے غم دیکھا
زینبؑ کی غرضِ حیات روتے ہی کٹی ۔۔۔ عاشور کو کیا کہو ۔۔۔ کیا

ایمان کی جان دین کی شوکت ہے بتولؑ ۔۔۔ اسلام کی شان بابِ جنت ہے بتولؑ
اولاد میں ہیں جس کی گیارہ معصوم ۔۔۔ کیوں کر نہ کہوں مادرِ عصمت ہے بتولؑ

ادیم کی ایک منقبت مولائے کائنات کی مدح میں ان کی شاہکار ہے جس میں ۲۱ بند ہیں اور ہر بند میں ۸ مصرعے ہیں۔ ایک بند میں نبیؐ و علیؑ کا ذکر ملاحظہ ہو ؎

وہ باعثِ خلقت ہوئے ۔۔۔ یہ حامیٔ وحدت ہوئے
خالق کی وہ رحمت ہوئے ۔۔۔ منعم کی یہ نعمت ہوئے
وہ کفر پر زحمت ہوئے ۔۔۔ یہ شرک پر آفت ہوئے
وہ ماحیٔ بدعت ہوئے ۔۔۔ یہ قاتلِ کل مشرکیں

ادیم کے سلاموں کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے مومنو! عزائے حسینی بپا کرو!
اسلام پر یہ سخت مصیبت کی رات ہے
اصحاب کہہ رہے ہیں کہ اے سبطِ کے لال
مولا یہی تو درسِ مودت کی رات ہے
پروانے ہوں گے شمعِ حرم پر نثار کل
دینِ رسولؐ پاک کی نصرت کی رات ہے

حق نے فرمایا شبِ ہجرت فرشتو دیکھ لو!
جان یوں بھائی فدا کرتے ہیں بھائی کے لیے
ہاتھ رسّی میں بندھے تھے سر پہ چادر تک نہ تھی
کیا بہن کرتی کفن کی فکر بھائی کے لیے

ہو جو اوصافِ الٰہیہ کا مظہر خلق میں
اس کی پیدائش کو بھی اللہ کا گھر چاہیے
چار دیواری میں شہرِ علم حق محصور ہے
اس میں جانے کو ضروری ہے کوئی در چاہیے

ادیبؔ نے قصائد، قصیدے کے تمام اجزا کے ساتھ کہے ہیں۔ ان میں تشبیب گریز، مدح اور خاتمہ (دعائیہ) وغیرہ ہے۔ تشبیب میں موسمِ بہار یا فلسفۂ زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ زبان میں زور ہے اور بیان میں روانی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مقصدِ تطہیر و عرفاں فاطمہؑ
جانِ عصمت روحِ قرآں فاطمہؑ
بضعۃ منی سے یہ ثابت ہوا
ہے نبیؐ کی جسم اور جاں فاطمہؑ

وہ مشرک ہیں جو سمجھے ہیں الہ العالمیں چودہ
مگر سچ ہے کہ ہیں عرشِ الٰہی کے مکیں چودہ
وہ آیا آج خلقت میں کہ جو ہے رحمتِ کامل
بس اب تو ہو گئے پورے خدا کے نازنیں چودہ
زمیں کیوں کر نہ ہو نازاں مقابل عرشِ اعظم کے
کہ اس پر ہو گئے انوارِ ربّ العالمیں چودہ

اس طرح ادیبؔ نے قصائد میں بھی اپنی طبع کے خوب خوب جوہر دکھاتے ہیں اور مرثیے کو تو ایک بالکل نئی راہ دی ہے انہوں نے ایک مخصوص نظریے کے تحت مراثی کہے ہیں اسی وجہ سے ان کا رنگ ممتاز ہے۔ اور ان کے مراثی کی شاعرانہ حیثیت سے زیادہ فکری حیثیت ہے ان کے ہاں دوسرے شعراء کی طرح مرثیہ کا مقصد صرف

رثائیت نہیں ہے بلکہ معرفت کو اولیت حاصل ہے اس کے بعد ہی وہ رثائیت کے قائل ہیں۔ نفس کی طہارت کے بغیر وہ کسی عمل کو قابل قبول نہیں مانتے کربلا کا المیہ ان کی نگاہ میں بنی نوع انسان اور خصوصاً امتِ نبیؐ پر احسان ہے۔ درحقیقت وہ اپنے انداز اور اپنے رنگ کے موجد ہیں۔ انہوں نے اردو مرثیے کو ایک نئی راہ دی ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" کراچی کے چند گمنام مرثیہ نگار شعرأ کا ذکر کیا ہے ادیبؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ادیبؔ نقوی کے مرثیوں میں جو بات خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہے وہ ان کا عمیق مطالعہ ہے عربی فارسی اور انگریزی ادب اور فلسفے کو انہوں نے تنقیدی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے انہوں نے بے تکلف عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی کے الفاظ اور جملے مرثیوں میں استعمال کئے ہیں"۔ (صفحہ ۴۹۴)

(معراج الکلام - نومبر ۱۹۲۴ء صہ ۱۲-۱۳)

گویاؔ کی چند غزلیں اور بھی اس دور کے رسائل اور مشاعروں کی رپورٹس وغیرہ بھی ملتی ہیں۔ مثلاً گلدستۂ ادب ۴-۱۹۳۰ء یا ماہنامہ شاعر وغیرہ۔

تم میں ہے یہ حُسن کہ وعدے کا نہ ایفا کرنا
ہم میں یہ عیب جو کہنا اُسے پورا کرنا
بس یہ دو شغل ہیں ہمارے محبت کے لئے
کبھی تیرا، کبھی تقدیر کا شکوہ کرنا
اے جنوں اس کو غرض کیا ہے جو صحرا میں رہے
جس کے ہاتھوں میں ہے گلزار کو صحرا کرنا
دیکھ گویاؔ نہ زباں کھول جفائیں سہہ کر
مسلکِ عشق میں جائز نہیں شکوہ کرنا

(ماہنامہ شاعر امروہہ جون ۱۹۲۸ء صہ ۲۱)

گویاؔ نے "معراج الکلام" کی ادارت کا فریضہ [illegible] انجام دیا۔ ان کا دیوان "رشحاتِ تخیل" کے نام سے ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوا تھا لیکن اب کہیں نہیں ملتا۔ گویاؔ کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

لو عقل سے کام جو عاقل ہو کچھ ۔۔۔ شاگرد بنو اس کے جو کامل ہو کچھ
خدمت کرو سلطانِ سخن کی گویاؔ ۔۔۔ جس سے کہ سخن کا لطف حاصل ہو کچھ

سیّد علی احسان۔ احسؔان

سید علی احسان۔ احسؔان کا تعلق اولادِ شاہ ولایتؒ میں ہونیکے سبب نقوی سادات سے ہے۔ احسؔان کے والد کا نام سید علی مستحسن سکتہ تھا۔ آپ کے بارے میں رئیس امروہوی لکھتے ہیں کہ

"سید علی احسان نقوی امروہوی امروہہ کے ایک معروف خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے ہمیشہ نامور اور سربرآوردہ رہا ہے۔ آپ کے والد ماجد سید علی مستحسن صاحب مرحوم امروہہ کے امرائے کبار میں تھے۔ موصوف نے اپنی تمام عمر امیرانہ رکھ رکھاؤ اور رئیسانہ چوچلوں کے ساتھ بسر کی۔ سید علی مستحسن مرحوم رئیس کے لقب سے مشہور تھے اور سچ مچ وہ رئیس تھے۔ ان کا طرزِ معاشرت، حرم سرا کی سجاوٹ، دیوان خانے کی شان و شوکت، چمن منزل کے پائیں باغ کی بہار، ان کے امیرانہ مشاغل اور ان کا مذاق طبیعت، سب کچھ ان کی ریاست کا لازمہ اور امارت کا ضمیمہ تھا۔ احباب کا ایک مخصوص جلسہ تھا جس کے اراکین سید علی مستحسن مرحوم، میرے دادا سید نصیر حسن مرحوم، دادا سید غنی حسن مرحوم، حکیم راحت علی خاں مرحوم المتخلص بہ حاذق بڑے حاجی سید

سعادت الدّ ... ہاں ... ذخفا اور پیا

مرحوم شاعر بھی ... خلص سکتہ تھا۔ مرحوم کو فرزدقِ ہند حضرت ...
دمغفور سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔" (شمیع عرفان ص ۸-۹)

احسان کی ولادت ۱۵ جنوری ۱۸۹۹ء کو امروہہ کے ایک شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ والد سے ورثہ میں صرف شاعری ملی اور خاندان کے رئیسانہ ماحول کے عادی ہونے کے بجائے زندگی محنت و مشقت میں گذاری، وہ جد و جہد کے قائل تھے کبھی کسی کی امداد و اعانت کے طالب نہیں ہوئے، محنت ہی ان کی زندگی کا شعار تھا۔

ہلال نقوی نے "مرثیہ عظیم" کے مقدمہ میں احسان کی مرثیہ نگاری کا ذکر کیا ہے جس کی تصدیق احسان کے مخصوص شاگرد نقوش نقوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے نقوش کا کہنا ہے کہ احسان نے آخر عمر میں مرثیہ بھی کہا ہے لیکن یاد ... کوشش کے راقم کو مرثیہ حاصل نہیں ہو سکا۔ احسان ایک قادر الکلام شاعر تھے انھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مذہبی شاعری کے بھی کئی مجموعے ... کعبہ" اور "شمیع عرفان" وغیرہ ہیں۔ ان مجموعوں میں نہ صرف ائمہ ... ہ ... ملتے ہیں بلکہ حضرت ابوذر غفاری، حضرت سلمان ... لوان رہنمائے حضرت مالک اشتر۔ اور حضرت بلال وغیرہ کے بارے میں بھی ... ہیں۔

چند بند ملاحظہ ہوں۔

وہ علیؑ جس نے کبھی میداں سے منھ موڑا نہیں
وہ علیؑ جس نے کسی کا ... توڑا نہیں
وہ علیؑ جس نے کہ رشتہ کفر سے جوڑا نہیں
وہ علیؑ جس نے رہِ حق کو کبھی چھوڑا نہیں
وہ علیؑ جو روحِ عاداتِ نبیؐ بن کر رہا
وہ علیؑ جو جانِ غزواتِ نبیؐ بن کر رہا



"سید علی احسان

شاعرانہ طبیعت،

ا سید

دوی

...ب کا ... ا الادریہ

...رزوقی ہند حضرت...

...صہ ۸-۹)

...ر ہے کے ایک...

...ر ان کے ا...

...ا یا...

ش تھی
... تھا تنگ ... دا کلپتے ... زبان خاموش تھی
بحرِ طوفاں ... نہ تھا
ناخدا لیکن کسو ... گھبراتا نہ تھا
ہر طرف تھی کفر و ظلمت کی گھٹا چھائی ہوئی ... تن انسانیت میں روح گھبرائی ہوئی
سیم و زر کیواسطے آنکھیں تھیں للچائی ہوئی ... شریعت فاسق و فاجر سے شرمائی ہوئی
دور دورہ تھا یزیدیت کا گیا اسلام تھا
اک فقط شبیرؑ کے دم سے خدا کا نام تھا
ایک اور جگہ کہتے ہیں۔
کعبے سے آفتاب امامت کا ہے ظہور ... آنکھوں کے سامنے ہے تجلی برقِ طور
ذروں میں تابشیں ہیں ستاروں میں موج نور ... ساقی کے فیضِ عام سے عالم کو ہے سُرور
جلوؤں سے کائنات کا نقشہ بدل گیا
میلادِ حیدری سے زمانہ سنبھل گیا
حضرت عباسؑ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ۔
اے جری اے مردِ مو...ں اے علمدارِ امام ... جانِ حیدرؑ قوتِ بازوئے شاہِ تشنہ کام
شانِ حمزہ، زورِ جعفر، ہیبت خیرالانام ... السلام اے حضرتِ عباسؑ غازی السلام
جوہرِ شمشیرِ عریاں، ضیغمِ دشتِ وغا
فخرِ موجوداتِ عالم نازشِ کرب و بلا
جوش میں ... ہر بار ہونٹوں کو چبا کر رہ گیا ... ہر نظر کے ساتھ اک محشر اٹھا کر رہ گیا
آتشِ غیظ و غضب دل میں دبا کر رہ گیا ... الغرض جذبات کی دنیا پہ چھا کر رہ گیا
ہر نفس پر احترامِ حضرتِ شبیرؑ تھا

کیا وفاداری کی جیتی جاگتی تصویر تھے

حضرت سلمانِ فارسی کے بارے میں احسان کہتے ہیں کہ۔

بگڑا جس وقت مدائن کی حکومت کا نظام حکمِ خالق سے اٹھی اسکی طرف چشمِ امام
یا علی کہہ کے چلا آلِ محمدؐ کا غلام ہر قدم پر تھی عیاں سطوتِ شانِ اسلام
ساز و سامان نہ لشکر نہ عماری پہنچی
یوں مسلمان گورنر کی سواری پہنچی

جناب مالکِ اشتر کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ۔

جنگِ صفین کے سردار ترا کیا کہنا حوصلہ دہ رزم پیکار ترا کیا کہنا
تابعِ حیدرِ کرارؑ ترا کیا کہنا پیروِ احمدِ مختار ترا کیا کہنا
عمر کی تونے بسر تیغوں کی جھنکاروں میں
کود پڑتا تھا دہکتے ہوئے انگاروں میں

سیدآلِ نبی وفا

وفاؔ کا تعلق بھی امروہہ کی نقوی سادات سے ہے آپ کے والد سید آل علی محلہ کٹرہ سید غلام علی کے ساکن تھے جہاں اردو کے کئی قدیم شعراء ہو چکے ہیں۔ وفاؔ کی ولادت ۱۹۰۸ء میں امروہہ میں ہوئی۔ گھریلو تعلیم کے بعد لاہور سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد محکمۂ صحت میں ویکسینیٹر ہو گئے اور مراد آباد۔ حسن پور۔ کندرکی وغیرہ میں تقرر رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد باقی عمر امروہہ گذاری۔ ۱۹۸۱ء کے آغاز میں انتقال ہوا۔

وفاؔ کو تمام عمر شاعری سے بہت زیادہ لگاؤ رہا۔ لیکن اپنے ایک پسر حیدر رضا کے انتقال کے بعد ۱۹۵۱ء سے شاعری سے دلچسپی کم ہو گئی تھی بلکہ قریب قریب ترک کر دی تھی لیکن پھر بھی وفاؔ نے بہت کچھ کہا اور ایک دیوان "گلدستۂ وفا" کے نام سے مرتب کیا لیکن وہ شائع نہ ہو سکا۔ راقم کی نظر سے یہ قلمی دیوان گذرا ہے۔ اسمیں قصائد۔ غزلیں۔ رباعیات۔ قطعات۔ مخمس اور مسدس ہیں۔ اس کے علاوہ وفاؔ نے مراثی کا بھی ایک مجموعہ جس میں ۵ مراثی تھے ترتیب دیا تھا۔ یہ مختصر مراثی تقریباً ۲۰۔۲۵ بندوں پر مشتمل تھے۔ وفاؔ کے پسر کا بیان ہے کہ یہ مراثی ضائع ہو گئے۔ سید مظفر حسین نقوی لکچرار

ت ام ہ

ہد والوں نے

اسلام باقی ہے

نبی زادو پ کیا آفتیں آئیں

ابھی اس کی شہادت ہو دیا رِ شام باقی ہے

اٹھا کر گود میں اصغر کو فرمایا یہ مولا نے

شہادت پانے والوں میں تمہارا نام باقی ہے

وفا نام ہی شہیدانِ وفا کے تام لیوا ہیں

کرم سے ہی شہیدانِ وفا کا نام باقی ہے

ایک رباعی میں وفا اس طرح دعا گو ہیں۔

اب کرب و بلا میرا ابھی کا شانہ ہو ۔۔۔ قسمت ہے جو اس شمع کا پروانہ ہو

مر جائے وفا کرب و بلا میں جا کر ۔۔۔ مٹی رہی اس خاک کا اک دانہ ہو

وفا کے ورثہ میں تین پسران جعفر رضا، باقر رضا اور تقی رضا ہیں۔

سیّد منیب حسن حسن

امروہہ کی نقوی سادات سے ... منیب حسن کا تعلق ... پہنچنے والا
معشوق حسین تھا۔ اولادِ سید شرف الدینؒ میں ہونے کے ... خاندان میں بھی ہمیشہ
سے علمی ذوق پایا جاتا ہے۔ حسن نے اسی ... زندگی کا طویل
ہندوستان میں گزارنے کے بعد ... کراچی ...
ہلال نقوی نے منیب حسن کے سلسلے میں ایک توضیح پر راقم ... مطلع
... "منیب امروہوی بھائی سید محمد سبطین نقوی (سابق ... یونیورسٹی دھنداں
امروہہ) کے ماموں تھے۔ ۸۰ برس سے زیادہ عمر پائی۔ ۱۹۸۱ء میں انتقال ہوا ...
نے مجھے ۱۹۷۹ء میں اپنے جو مرثیے دیئے تھے وہ یہ ہیں۔

مع۔ عمل کی اک کتاب ہیں حسینؑ کی تصویریں ۳۵ بند۔ در حال امام حسینؑ
مع۔ کاتبِ تقدیر نے قسمت میں غم لکھا میری ۳۸ بند ... قاسمؑ
مع۔ کربلا فکر کی تجلّی ہے۔ ۴۱ بند۔ در حال حضرت ...

(مکتوب ہلال نقوی بنام عظیم امروہوی مو...



اب کرب

مرجائے وفا کرب

وفا کے ورثہ

منیب الرحمن

ا

او

منیب حسن [illegible] سید محمد، سید علی عباس وغیرہ پاکستان میں مقیم ہیں۔
قلمی نو [illegible] ۱۹۰۳ء میں امروہہ میں ولادت ہوئی۔
[illegible] کے مکان میں ایک مکتب [illegible] حلیف آل نبی مصطفے سے ابتدائی تعلیم
حاصل کی اس کے بعد امام المدارس میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی
اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۱ء سے محکمۂ جنگلات میں ملازمت اختیار کی اسکے بعد
دوسری جنگِ عظیم کے دوران فوج میں ملازمت شروع کی۔ ملازمت کے دوران ہی عراق اور
ایران کا سفر کیا اور زیارت مقاماتِ مقدسہ سے شرفیاب ہوئے۔ جسکے چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہاں وہ بھتیجا حسینؑ کا جس سے تھا عیاں — روحِ رواں حسینؑ کی اور بیوہ ماں کی جاں
نوعمر تھا حسین تھا [illegible]م تھا جواں — ایسے دلیر ایسے جری ہوتے ہیں کہاں
بوٹا سا قد تھا شانِ شہِ ذوالفقار تھی
لڑکا تو تھا پہ آرزوئے کارزار تھی

حضرت قاسمؑ کا رجز۔

کم بخت جانے کہ حسنؑ کا میں نخل ہوں — بہرِ نبرد آیا ہوں گو خورد سال ہوں
قہرِ خدا ہوں اور غضبِ ذوالجلال ہوں — فنِ جنگ کے دکھانے میں میں باکمال ہوں
ہاں او لعین تیغ ذرا کھینچ کر تو دیکھ
نامی جو پہلوان ہو اسے بھیج کر تو دیکھ

بھائی کی یاد آئی تو روئے امامِ پاک — چلائے بھائی بھائی بہ آوازِ دردناک
دیکھو تو بھائی میرا کلیجہ ہے چاک چاک — بھائی بغیر بھائی کی اس زندگی پہ خاک
عالم تھا بے کسی کا بھتیجا تھا سامنے
اور تھے امامِ وقت، نتیجہ تھا سامنے

سید شبّ[illegible] احسن نقی

آپ کے اسلاف کا ذکر آپ کے والد ماجد سید اسد اللہ اسعدؔ کے باب میں آچکا ہے آپ اپنا تعارف ایک مرثیے کے مقطع میں اس طرح کراتے ہیں کہ ؎

اے نقی بیٹا ہوں میں سید اسد اللہ کا | پھول اک شاخ علی احمد کا مرجھایا ہوا
باپ شاعر، تو حکیم عابد علی دادا مرا | مجھ کو جو کچھ ہے میسر ہے وہ ورثے میں ملا
دیں سے رغبت دل کو دنیا کی طلب سے بے نیاز
تیرے اس انعام پر صد سجدہ اے کارساز

نقی کی ولادت ۱۹۰۳ء میں اپنے آبائی وطن امروہہ میں ہوئی۔ علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق ہونے کے سبب گھر میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ باپ شاعر تھے اس لیے شاعری ورثے میں ملی اور بہت کم عمری سے اس کا آغاز ہوا۔ درس و تدریس سے مزاج کو لگاؤ تھا اس لیے پیشہ معلمی اختیار کیا اور امروہہ میونسپل بورڈ کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور اب گوشہ نشینی کی زندگی اپنی ضعیفی اور علالت کے سبب امروہہ میں گزار رہے ہیں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد امروہہ میونسپل بورڈ کے



سید شجاع الحسن نقوی

تیرِ ستم جو حلق پہ اصغر کے چل گیا
بچے کا مسکراتے ہوئے دم نکل گیا
سکتے میں شاہ رہ گئے اور دل اچھل گیا
منہ پر ملا جو خون تو نقشہ بدل گیا

کیا کرتے فرق و تحت رجب اس کو جا ملی
لی اپنی راہ جو لبِ کوثر سے جا ملی

چرخ تو نے ڈھائے ہیں کیا کیا زمانے پر ستم
ہاں نہیں جمنے دیئے تو نے پہاڑوں کے قدم
غرق ہے بحرِ تلاطم میں سمندر دم بدم
ہے عجب چکر کہ ہر شے پر اثر ہے بیش و کم

منہ چھپائے چشمۂ حیواں ہے کیا اندھیر ہے
تیری گردش قسمتِ ہستی کا گویا پھیر ہے

ع سامنے آنکھوں کے ماں کی ہے جواں بیٹے کی لاش

ع احتشام اے نوجواں مرگ شہید لالہ فام

ان مراثی میں تیسرا مرثیہ سب سے طویل ہے جس کے چہرے میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر، امروہہ کے مشاہیر کا ذکر اور نامور طبیب حکیم میر احمد (اچھو) کے حالات اور وفات کا ذکر کرنے کے بعد امام حسینؑ اور کربلا کے واقعات بیان کئے ہیں۔ چوتھا مرثیہ جواں مرگ سید احترام علی پسر سید برہان علی مرحوم محلہ کٹکوئی امروہہ کے انتقال پر کہا ہے جو مجموعہ "چمن" مرتبہ ابوالحسن نقوی میں شائع ہوا ہے۔ پانچواں مرثیہ بھی شخصی ہے جو سید احتشام حسین پسر سید انعام حسین کے نجفِ ہند میں انتقال پر کہا گیا ہے اور مجموعہ "سوزِ غم" مرتبہ سید اسلام حسین و سید انتظام حسین میں شامل ہے۔ چھٹا مرثیہ مولوی سید محمد مسلم کندرکوی (والد مولوی سید محمد سالم صاحب) کی وفات پر کہا تھا جو نقی کے استاد بھی تھے۔ یہ مرثیہ چالیسویں کی مجلس میں رام پور میں پڑھا اور سامعین نے بہت پسند کیا۔ نقی کے پاس سے یہ مرثیہ کھو گیا۔

آپ کے مراثی میں دنیا کی بے ثباتی۔ چرخِ پیر کے مظالم اور علم و عمل پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ چرخِ پیر سے مخاطب ہیں ؎

لفظِ بے معنی ہے تیرے سامنے لفظِ قوی　　رنگ بیکے تیرے مقابل ہے کوئی ایسا جری
لرزہ براندام ہیں لیل و نہارِ زندگی　　انقلاباتِ زمانہ حد ہے کچھ اس ظلم کی

اب ترا ظلم و ستم ناقابلِ برداشت ہے
اک قیامت تونے ڈھا رکھی ہے کری بات ہے

اپنے اسلاف اور جدِ امجد کا مرثیے کے پیرائے میں اس طرح ذکر کرتے ہیں ؎

آہ وہ سید حسین شرفِ دیں ذی احتشام　　صاحبِ کشف و کرامت مرجعِ ہر خاص و عام
زندۂ جاوید اربابِ صفا کے پیش امام　　خلق کے حاجت روا والا گہر عالی مقام

نیش زن عقرب تقاضائے طبیعت کے خلاف
کر رہا ہے کس خطا جوئی سے روضے کا طواف

وہ علی احمد کہ فرزندِ بزرگ و ہوشیار　　فیض احمد وہ کہ اسمِ بامسمیٰ نام دار
وہ ولی احمد کہ خوش خلقی میں یاروں کے یار　　سید اسرار احمد وہ قوی و شہسوار

سب کے سب شائستگی کی بولتی تصویر تھے
ذی حشم والا مراتب صاحبِ جاگیر تھے

اپنے اسلاف اور ساداتِ امروہہ کے تعارف کے بعد امروہہ کے مشاہیر کا ذکر کرتے ہیں۔ چند شعرا کا ذکر ملاحظہ ہو ؎

وہ کہ جوادِ شمیمِ بوستانِ شاعری　　زلفِ مشکیں سے تھی جن کی شاعری کی دوستی
کوئی یکتا تھا تو اپنے وقت کا کوئی نوری　　کوئی تھا میر سعادت درس آموز تقی

تھے اپنے سامنے دنیا کے کانوں تک ادب
یاد آیا ہے کہ ہم اک عزیز کیا تھے کیا ہیں اب

حکیم میر احمد کی زندگی اور موت کے اثرات اس طرح بیان کیے ہیں ؎

سید مشبّر نذر مشبّر

امروہہ کے قدیم ترین شعرا میں سید علی نذر نظر اپنے دور کے ممتاز شاعر ہوئے ہیں۔ علی نذر کے فرزند جعفر نذر جعفری بھی شاعر ہوئے ہیں۔ علی نذر کی ہی نسل میں سید نثار حسین ہوئے جو دربار شاہ ابوالحسن کی سکونت ترک کر کے دربار کلاں پہونچے اور وہیں مستقل آباد ہو گئے۔ یہاں ان کے خسر سید شمس علی خاں رہتے تھے۔ نثار حسین کے پوتے سید شبّر نذر ہوئے۔

سید شبّر نذر کے چار پسر ہوئے۔ رئیس نذر۔ عابد نذر۔ صفدر نذر اور مشبّر نذر۔ یہ چاروں بھائی امروہہ میں بے حد مشہور اور ممتاز تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ آرٹ کے شعبے سے وابستہ تھے اور امروہہ میں اس فن کو انھوں نے کافی ترقی دی تھی۔ عابد نذر مرحوم کے امروہہ میں سینکڑوں شاگرد تھے ان تمام بھائیوں میں مشبّر نذر مرحوم کو شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔

مشبّر کی وفات ۱۹۷۸ء میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ہوئی اس طرح ان کی ولادت تقریباً ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ مشبّر ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے

تھے۔ مشبتر کے ہم فرزند ہوئے۔ قائم نذر۔ صائم نذر۔ مبشر رضا اور حسنین رضا۔ ان میں حسنین رضا کراچی میں "انجمنِ ساداتِ امروہہ" کے سرگرم رکن ہیں۔ اور قومی خدمات سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

مشبتر کی مرثیہ نگاری کا ذکر سید تقی الحسن اپنی تصنیف "شخصیات" میں اس طرح کرتے ہیں کہ

"مشبتر نذر صاحب مرحوم کو شاعری سے کبھی لگاؤ تھا آپ نے حضرت علی اکبرؑ پر ایک مرثیہ لکھا تھا اور سالِ گذشتہ مجھے سنایا تھا۔ بہت خوب مرثیہ ہے"۔ (ص ۱۹۷)

۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں راقم الحروف نے جب پاکستان کے ادبی دورے کئے تو مشبتر کے مراثی کی معلومات کی لیکن کوئی مرثیہ حاصل نہیں ہو سکا۔ کچھ حضرات نے وعدے بھی فرمائے تھے لیکن ان کی بھی تکمیل نہیں ہو سکی۔ اس لئے نمونۂ کلام پیش کرنے سے راقم الحروف قاصر ہے۔

سید مطاہر حسین مومن

شاہ ولایت شرف الدین قدس سرہ العزیز کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا سید امیر علی صاحب بزرگ طاب ثراہ قاضی القضاۃ الہند کی نسل سے مومن کا تعلق ہے۔ آپ کی ولادت رجب ۱۳۲۳ھ کو امروہہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اسکے بعد میونسپل بورڈ کے اسکول میں تعلیم پائی علوم عربیہ دفارسیہ کے شوق میں شرف المدارس امروہہ میں داخل ہوئے اور مولوی حاجی مرتضیٰ حسین کی شاگردی خاص سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد منصبیہ عربی کالج میرٹھ میں مولوی عالم الہ آباد کا کورس پڑھا۔ اس کے علاوہ مولانا سید محمد امروہوی اور مولانا سید سبط نبی (نوگانواں) کے فیضان صحبت سے بھی سرفراز ہوئے کافی عرصہ مشن ہائی اسکول دہرہ دون میں ہیڈ مولوی رہے اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول امروہہ میں بھی عربک و پرشین ٹیچر رہے۔ اس کے بعد دربار ہائی اسکول جھالاوہ اسٹیٹ میں ہیڈ مولوی رہے۔

مومن قومی اور مذہبی معاملات میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے امروہہ کی مختلف انجمنوں کے نہ صرف سرگرم ممبر رہے بلکہ عہدوں پر بھی فائز رہے۔ انجمن خلیفہ سادات ... کی بنیاد ... آپ ہی نے ڈالی۔ ... شائع ہوئے۔

تھے۔ مشتبر کے ۴ فرزند ہوئے۔ قاسم نذر، صاصم نذر، مبشر رضا اور
حسنین رضا کراچی میں "انجمن سادات امروہہ" کے سرگرم رکن
رہے۔ جو ... رکھتے ہ



سید [illegible] حسین [illegible]

ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو امام چہارم کی نذرانہ میں ہے۔

پھر جوش میں آئے مرے جذبات مودت
اللہ نے توفیق دیے اجرِ رسالت

اول ہوں کہ آخر ہوں کہ اوسط ہوں غرض سب
ہیں اپنے لئے رہبر و ہادیٔ شریعت

یاد آئے ہیں اس موقع پہ ہادیٔ چہارم
اس ماہ میں کہتے ہیں ہوئی انکی ولادت

پیدائشِ حضرت کی خوشی کیوں نہ ہو لیکن
افسوس کہ توام ہے یہاں غم بہ مسرت

وہ صابر و شاکر وہ گرفتارِ مصیبت
حاصل ہے جسے حضرتِ ایوبؑ پہ رفعت

جو کام کیا آپ نے بعدِ شہِ مظلوم
ہوگا نہ کسی سے وہ کبھی تا بہ قیامت

خالق سے دعا کرتا ہے مومنؔ بھی دن رات
مجھ کو بھی ہو اس شاہ کے روضہ کی زیارت

(ماہنامہ الجواد بنارس۔ نومبر ۱۹۶۱ء ص ۳)

مومنؔ نے آخری عمر میں قصائد اور سلام کے علاوہ مراثی بھی پاکستان کے قیام کے دوران کہے جس کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ۔

انس تھا مومنؔ کو اس درجہ غمِ شبیرؑ سے
مرثیے کچھ قبر میں ہمراہ لکھ کر لے گئے

راقم نے پاکستان میں مومنؔ کے مراثی حاصل کرنے چاہے لیکن ناکامی ہوئی۔ امروہہ کے قیام کے دوران مومنؔ نے جو سلام کہے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ ہو ویران کیوں باغِ جہاں آہستہ آہستہ
گئے سب سوئے عدم کیا کیا جواں آہستہ آہستہ

غمِ شہ میں ہوئے آنسو رواں آہستہ آہستہ
ابھی یہ طفل ہیں ہوں گے جواں آہستہ آہستہ

کہا اکبرؑ نے حضرتؑ سے جگر میں درد ہے بابا
نکالیں آپ سینے سے سناں آہستہ آہستہ

چرخ پہ ماہِ محرم پھر نمایاں ہوگیا
آہ تازہ پھر غمِ شاہِ شہیداں ہوگیا

کیسی زہریلی ہوا رن میں چلی عاشور کو
گلشنِ زہرا آلِ نبی جنگل میں ویراں ہوگیا

جس کی مادر کا جنازہ پردۂ شب میں اٹھا — حیف اس بی بی کا سر بلوے میں عریاں ہو گیا
وہ بھی دن ہوگا کبھی یا رب کہیں گے مومنین — آج مومن زائرِ شاہِ شہیداں ہو گیا

شہ کے غم نے جب دلِ مصطفےٰ کے ٹکڑے کر دیئے — اشکہائے چشم نے گوہر کے ٹکڑے کر دیئے
دیکھئے کیا رنگ لائے طفل ہو کے یہ جواں — جس نے فرشِ مہد پر اژدر کے ٹکڑے کر دیئے
وہ نبی کیوں کر نہ ہو فخرِ رسولانِ سلف — جس نے انگلی سے مہِ انور کے ٹکڑے کر دیئے
کہتے تھے شہ پارہ پارہ کیوں نہ ہو میرا جگر — آہ نیزے سے دلِ اکبرؑ کے ٹکڑے کر دیئے

سال نو ماہِ محرم ابتدا کا چاند ہے — شاہ پر لیکن غموں کی انتہا کا چاند ہے
جب ذرا چمکی کٹے فی النار لاکھوں اشقیاء — ذوالفقارِ حیدری گویا قضا کا چاند ہے
مرقدِ عباسؑ پر لکھا ہے کلکِ نور سے — یہ وہ منزل ہے نہاں جس میں وفا کا چاند ہے
شام کے لشکر پہ کیوں بادل نہ چھائیں خوف کے — جب سرِ میداں عیاں شیرِ خداؑ کا چاند ہے
کیوں ستائے مجھ کو تاریکی لحد میں کام کیا — قلب میں روشن غمِ آلِ عبا کا چاند ہے

رنگ دے دل عشقِ علیؑ میں پاک بازانہ بنے — جیب و دامن جو پھٹے جنت کا پروانہ بنے
جس میں ہے کس کا ادارہ گھر کے مالک کی خوشی — اس کا گھر کعبہ بنے چاہے زچہ خانہ بنے
اشک جو نکلے غمِ شبیرؑ میں ایسا تو ہو — فاطمہ زہراؑ کی جو تسبیح کا دانہ بنے
ہو گئے یکتا زمانے صبر میں اصحابِ حسینؑ — اس طرح شمعِ امامت کے وہ پروانہ بنے

... ملاحظہ ہوں جو امام ... حضرت ...

سید حسن رضا خاں رضا

تقوی سادات امروہہ کے مورث اعلیٰ سید محمد اشرف ... دانش مند ہوئے ہیں جو صاحبِ عظمت و وقار اور عالم جید تھے۔ ان کی نسل سے ہی سید حسن رضا خاں رضا کا تعلق ہے۔ آپ کے والد حاجی سید فیاض حسن خاں تھے۔ سید ابن حسن اور سید شان رضا کے بیان کے مطابق آپ کے دادا سید محمد محسن خاں مرحوم کا امروہہ کی ذی علم و قومی وجاہت کی ہستیوں میں شمار ہوتا تھا انگریزی دورِ حکومت میں حکام میں بہت اثر و رسوخ حاصل تھا۔ سید محمد محسن خاں وائسرائے کے درباریوں میں شامل تھے زمانۂ غدر میں اپنے حسنِ ... کرنے کیلئے ... حکومتِ وقت سے خان خطاب حاصل کیا نواب کلب علی خاں والیِ ریاست عالیہ رامپور کے تعاون سے ضلع مرادآباد کے نظم و نسق کو انتشار سے بچایا۔" (آہ سید حسن رضا خاں صفحہ ۴)

آپ کے نانا سید علی حسن خاں تھے۔ جنہوں نے ... صرف کرکے امام بارہ اکبر علی خاں دانش مندان امروہہ کی تعمیر کرائی اور ان کی دعوت پر انیس لکھنوی مرثیہ پڑھنے امروہہ تشریف لائے۔ رضا کی ولادت اپنے والد کی شادی کے ... سال بعد ہوئی۔ جب آپ کے والد حاجی سید فیاض حسن خاں مع آپ کی والدہ دو۔ار زیارات عالیہ سے مشرف ہو کر مشہد مقدس

وہ شہ میں اٹھا حیف



یحییٰ رضا خاں رضاکار (مرحوم)

اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ آپ نے فنِ تحت اللفظ خوانی میں اپنے برادرِ عم اور داماد سید محبوب حسن خاں کو مکمل تربیت دی جو صحیح معنیٰ میں آپ کے جانشین ہیں اور اس فن میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں ایک پسر سید علی رضا خاں اور ۲ دختران ہوئیں۔ آپ مولوی انوار الحسن جہاں گیر آبادی اور مولوی سید محمد عباد قبلہ کلیم سے کبھی کبھی مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔

آپ کی وفات ۱۹۷۰ء مطابق ۱۳۹۰ھ امروہہ میں ہوئی اور عزا خانہ اکبر علی خاں میں دفن ہوئے۔ انتقال پر یوں تو بہت سے شعرا نے قطعات تاریخ کہے لیکن خاص طور سے مولانا سید محمد عباد کلیم۔ مولانا سید محمد محسن محسنؔ۔ سید مشرف حسین اثرؔ۔ سید خادم حسین خادمؔ اور سید تبرک حسین تبرک قابلِ ذکر ہیں۔

رضاؔ نے ائمۂ طاہرین کی مدح کے علاوہ کسی کے لیے کبھی قلم نہیں اٹھایا صرف مرثیے۔ سلام۔ قصائد اور نوحے کہے۔ سید محبوب حسن خاں کے بیان کے مطابق رضاؔ نے صرف تین مرثیے کہے۔ ایک مرثیہ جس میں ۹۳ بند ہیں راقم کو بھی عطا فرمایا۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

اے قلم جوہرِ شمشیرِ زباں دکھلا دے   اے زباں حسنِ معانی و بیاں دکھلا دے
اے بیاں ولولۂ طبعِ رواں دکھلا دے   جنگ اکبر کے امامِ دو جہاں دکھلا دے
پہلواں فوج کے رُوباہ نظر آ جائیں
رن میں لڑتے اسد اللہ نظر آ جائیں

سید محبوب حسن خاں کے پاس رضاؔ کا جو دوسرا مرثیہ ہے اس میں ۱۵۰ بند ہیں۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

خدا کے نور کی تنویر ہے کلام مرا   جہاں میں خلد کی جاگیر ہے کلام مرا
ثنائے شاہ کی تفسیر ہے کلام مرا   ضیائے مجلسِ شبیر ہے کلام مرا
سمائے آنکھ میں کیا اس کی طور کا جلوہ
کہ لفظ لفظ میں ہو حس کے نور کا جلوہ

مقطع اس طرح ہے ؂

قلم کو روک رضا اب نہیں ہے تابِ رقم دعا کرو یہ خدا سے بہ دیدۂ پُر نم
الٰہی تجھ کو غریبیٔ شاہِ دیں کی قسم حصول ہو مرے دل کا بھی مدعا اہم

ضریحِ پاک شہِ مشرقین پر پہنچوں
میں زندگی میں مزارِ حسینؑ پر پہنچوں

رضا کے تیسرے مرثیے کے بارے میں سید محبوب حسن خاں کا بیان ہے کہ وہ مرثیہ کہیں تلف ہو گیا اس مرثیے کی یہ خصوصیت تھی کہ چہرے میں رضا نے اپنے دور کے مشاہیر امروہہ کا ذکر کیا تھا۔ چند بند محبوب حسن خاں کو یاد ہیں ایک بند ملاحظہ ہو ؂

ہیں مولوی محمد نبی جو دانش مند علومِ مرتضوی سے ہیں خوب بہرہ مند
ستارہ عزت و اقبال کا ہو ان کے بلند الٰہی ان کو نہ پہنچے کسی طرح کا گزند

صفاتِ مرتضوی سب انہوں نے پائی ہیں
جنابِ یوسفِ حسنؑ کے چھوٹے بھائی ہیں

ایک جگہ مولوی سید محمد عبادت قبلہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؂

جنابِ قبلہ و کعبہ ہیں بزم کی رونق
محمد اور عبادت کے اسم سے مشتق

دراصل رضا کے ذوقِ تحت اللفظ خوانی نے ہی ان کو مرثیہ نگار بنا دیا تھا ایک جگہ فرماتے ہیں ؂

مجھے جو حال ہے ہو گیا آمدِ عباسؑ رقم نہ تو کچھ زورِ بیاں ہے، نہ ہے کچھ زورِ قلم
نہ مرے پاس مضامیں ہیں نہ الفاظ اہم عقل میری جو ہے ناقص، تو مرا فہم ہے کم

دانی کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

ورنہ دُرِ جو مضامیں سے تہی دست ہوں میں | ہے مددگار جو ممدوحِ زبردست ہوں میں

مانا کہ علم میں ہر چند بہت پست ہوں میں | بادۂ مدحِ علمدار سے سرمست ہوں میں

لکھوں آمد تو مدد میری کریں گے آ کر

منہ کو میرے دُرِ مضموں سے بھریں گے آ کر

رضاؔ نے حضرتِ عباسؑ کی آمد کا نقشہ بھی بہت خوب کھینچا ہے کہتے ہیں کہ؎

آمدِ شیر سے ہے دشت میں ایسی ہلچل | فوج کی ساری صفیں ہو گئیں کل بے کل

ہر طرف دشت میں چھائے تھے جو افواج کے دَل | ڈر کے وہ بھاگ گئے ہو گیا خالی جنگل

لب پہ ہر اک کے یہی تھا کہ دلیر آتا ہے

ارے بھاگو! اسد اللہ کا شیر آتا ہے

رضاؔ کا تاریخِ اسلام اور احادیث کا بھی مطالعہ اچھا تھا ان کے کلام سے جگہ جگہ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے وہ بے حد عقیدت مند انسان تھے اس لئے انہوں نے پوری لگن اور توجہ سے مدح سرائی کی ہے۔ مولائے کائنات کی مدح ملاحظہ ہو؎

جس کو کاندھے پہ محمدؐ نے چڑھایا وہ علیؑ | ہل اتیٰ شان میں جس شیر کی آیا وہ علیؑ

اپنا نائب جسے احمدؐ نے بنایا وہ علیؑ | جس علیؑ نے کہ فرشتوں کو پڑھایا وہ علیؑ

کس جری کے لئے شمشیرِ شرربار اُتری

کب کسی کے لئے یوں چرخ سے تلوار اُتری

خلق میں قاتلِ کفار کوئی اور بھی ہے | قاسم الجنۃ والنار کوئی اور بھی ہے

سارے عالم میں علمدار کوئی اور بھی ہے۔ | جز علیؑ حیدرِ کرار کوئی اور بھی ہے

جو کہ دیں دار ہیں وہ راہ نما کہتے ہیں

کچھ بشر ایسے ہیں جو ان کو خدا کہتے ہیں

کیا شرف ہے کہ ہوئی یادِ خدا یادِ علیؑ | جو کہ ہے حکمِ خدا، ہے وہی ارشادِ علیؑ

انبیا سارے ہوئے طالبِ امدادِ علیؑ   مشکلیں ہوتی ہیں حل، جب کہ پڑھو نادِ علیؑ

نام خالق نے خود اپنا دیا، نام ایسا ہو

جو محمدؐ کا ہو نائب، وہ امام ایسا ہو

رضاؔ نے اپنے مراثی میں مرثیے کے تمام ہی اجزا کو نظم کیا ہے۔ ایک موقع پر حضرت عباسؑ کا رجز ملاحظہ ہو ؎

میں ہوں اس شیر کا فرزند جو تھا حق کا ولی   جس بہادر کی شجاعت ہے زمانے پہ جلی

جس کی تلوار شجاعانِ عرب پاپہ ہے چلی   نام جس شیر کا مشہور ہے دنیا میں علیؑ

وہ علی جس نے کہ جنات کے سر کاٹے ہیں

جس کی شمشیر نے جبریل کے پر کاٹے ہیں

وہ علیؑ مرحب و عنتر کو پچھاڑا جس نے   وہ علیؑ رن میں علم دین کا گاڑا جس نے

وہ علی کفر کی بستی کو اُجاڑا جس نے   اُنگلیوں سے درِ خیبر کو اکھاڑا جس نے

عمرؔ کو قتل کیا کفر کا گھر صاف کیا

شہرۂ دینِ خدا، تا فلک آفاق کیا

سارے لشکر کی صفیں زیر و زبر کر دوں گا   اس ترائی کو ابھی خون سے تر کر دوں گا

اپنی اس جان کا مطلق مجھے وسواس نہیں   دشت کو خوں سے نہ بھر دوں تو میں عباسؑ نہیں

رجز کے بعد حضرت عباسؑ نے فوج یزیدی کو اُس کے ظلم و ستم کے بارے میں سمجھانا چاہا۔ اور فرمایا ؎

میرے آقا ہیں حسینؑ اور میں ہوں اُن کا غلام

باقی ہے جن کے سبب خلق میں دینِ اسلام

میری شہزادی سکینہ کی ہے حالت تغیر   علی اصغرؑ بھی سسکتا ہے جو ہے سب سے صغیر

پانی لینے دو مجھے بس نہ کرو اب تاخیر   کم نہ ہو جائے گا اک مشک سے یہ آبِ کثیر

بچے معصوم ہیں، اور بر سر پیکار نہیں

ہم خطاوار ہیں گر، وہ تو خطاوار نہیں

تلوار کی تعریف میں اکثر شعراء نے اپنی طبع کے خوب خوب جوہر دکھاتے ہیں رضا کے یہاں بھی تلوار کی تعریف ملتی ہے ملاحظہ ہو

دو کیا ڈھال کو جس دم کہ سپر سے گزری | کر چکی دو جو سپر کو، تو وہ سر سے گزری
سر کو دو کر چکی تو قلب و جگر سے گزری | کاٹ کر قلب و جگر بند کمر سے گزری

آفتِ جان بھی ہے جنگ میں بھونچال بھی ہے

جان دشمن سے بچانے کے لئے ڈھال بھی ہے

گر کے سر دھڑ سے سوئے نارِ سقر جاتے ہیں

اس کے سائے سے فرشتے بھی تو گھبراتے ہیں

خون پی لیتی ہے اور رہتا ہے منہ صاف اسکا

منصفی کرتی ہے مشہور ہے انصاف اسکا

اسکا پھل کھاتے ہی کفار موئے جاتے ہیں

ضرب ایسی ہے کہ دو چار ہوئے جاتے ہیں

رضا کے مراثی میں بعض جگہ منظر نگاری اور مکالمہ نگاری بھی بہت کامیاب نظر آتی ہے مثلاً ایک موقع ایسا ہے کہ حضرت عباسؑ نہر پر پہنچے تو دریا کے گھاٹ اور جنگ کے میدان کا منظر کس طرح بدل گیا ہے

چھوڑ کر بھاگ گئے گھاٹ کو جب ظلم شعار | نہر میں ڈالا بہادر نے فرس کو اک بار
تن کے گھوڑے پہ پکارا یہ علیؑ کا دلدار | کس طرف چھپ گیا تو دیکھ لے شمر مکار

تو نے نرمی سے مری بات نہ مانی ظالم

دیکھ ! میں لیتا ہوں اس نہر سے پانی ظالم

یہاں بیت میں جو فطری انداز۔ روانی۔ برجستگی اور منظر کشی ہے اس کی داد دیئے بغیر کوئی بھی صاحب نظر نہیں رہ سکتا۔

گھوڑے کی تعریف کے سلسلے میں اکثر مرثیہ نگاروں نے نئے نئے پہلو تلاش کئے ہیں اور تغزل سے بھی کام لیا ہے۔ گھوڑے کا سراپا اور کردار پیش کیا ہے۔ رضا نے بھی گھوڑے کی تعریف کی ہے ملاحظہ ہو ؂

کیا لکھوں اس فرس تیز قدم کا احوال　　آگے بڑھ جاتی ہوا اُس سے یہ کیا اس کی چال
انکھڑیاں ایسی ہیں پیاری کہ ہو شرمندہ غزال　　کھوئے ہیں حوروں نے گیسو نہیں گردن پہ یال
اڑتا ہے مثل پرند اور پر و بال نہیں
چار چاند اس کے ہیں قسموں میں لگے نعل نہیں

تیز رو تیز قدم تیز نظر برق شیم　　رنگ سوسن کا نہ میلا ہو جو رکھے یہ قدم
ہو کڑی باگ تو کٹ منہ سے اگل دے اک دم　　ڈھانپے اسوار کو گردن کرے جب اپنی خم
با وفا ہے کہ وفادار کا یہ گھوڑا ہے
شہ بے کس کے علمدار کا یہ گھوڑا ہے

رضا نے چند مقامات پر حضرت عباسؑ کے مکالمے نظم کئے ہیں جو نہایت برجستہ اور بے ساختہ ہیں۔ روانی کی بہترین مثال ہیں۔ فوج یزید کے سپاہی سے مخاطب ہیں ؂

کیا ڈراتا ہے عبث شیر ژیاں کو ظالم
کھینچ لوں گا ابھی گدی سے زباں کو ظالم
اور جو باقی ہوں فن ان کو بھی دکھلاتا جا
میری تلوار کے پھل کو بھی ذرا کھاتا جا
سب ہیں ہو جائے گا بدنام پلٹ آ ظالم
مشک جو وہ ہے یہ چھین لے گے جا ظالم

اور ابن سعد لعیں ضرب اسے کہتے ہیں

ایک کے ہو گئے دو ضرب اسے کہتے ہیں

مرثیے میں ساقی نامے کے اضافے نے بھی شعرا کے لیے ایک نیا راستہ کھول دیا تھا بہت سے شعرا نے اس جانب خاص طور سے توجہ کی ہے۔ رضا کے مراثی میں بھی اس قسم کے چند بند ملتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو سے

ہے کدھر ساقیٔ گل روئے گلنار پلا　　دل ہے بے چین بس اب کر نہ ذرا بار پلا
چھپ کے پینے کا نہیں ہوں سرِ دربار پلا　　جامِ حُبِّ خلفِ حیدرِ کرار پلا
پیتے ہی دور سب اعمال کی زشتی ہو جائے
دوزخی گر اسے پی لے تو بہشتی ہو جائے

رضا نے نیزہ بازی اور تیغ زنی کے فن کو تو نہیں سیکھا تھا لیکن جنگ نظم کی ہے جس میں حرف مطالعے سے مدد لی ہے۔ کہتے ہیں کہ سے

لے کے پر کان پکڑ کر جو اُچھالا اس کو　　کر دیا شیر نے اک دم تہ و بالا اس کو
موت نے بڑھ کے کیا اپنا نوالا اس کو　　تیغِ عباسؑ نے گرتے ہی سنبھالا اس کو
ہاتھ مارا جو بلندی سے تو تھرا کے گرا
نصف دھڑ اس طرف، اور نصف اُدھر جا کے گرا

جنگ کرتے کرتے جب حضرتِ عباسؑ تھک گئے اور فوج یزید نے چاروں جانب سے گھیر لیا تو رضا کہتے ہیں کہ سے

شانے کٹنے سے بہت ہو گئے عباسؑ نڈھال　　ڈگمگانے لگے گھوڑے پہ ہوا غیر جو حال
پہلے تیروں سے بدن ہو چکا تھا سب پامال　　گر پڑا گھوڑے سے تو وہ اسد اللہ کا لال
گھوڑے سے گر کے پکارے شہِ والا آؤ
یہ غلام آپ پہ صدقے ہوا آقا آؤ

حضرتِ عباسؑ کی شہادت کے بعد مرثیے کے مصائب میں بَین کا حصہ بہت پُر تاثیر ہے امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ ؎

ہاتھ تن سے ہی جدا خوب یہ سقائی کی
بھائی غربت میں کمر توڑ گئے بھائی کی
بھائی کو چھوڑ گئے ٹھوکریں کھانے کیلئے
اور بہن کو صفِ ماتم کے بچھانے کیلئے

مراثی کے آخر میں رضا نے اپنے لیئے دعا کی ہے ؎

شورِ گریہ ہے بس اب روک قضا خشِ قلم | کر دعا حضرت عباسؑ سے با دیدۂ نم
بحرِ اندوہ میں ڈوبا ہوں میں اے بحرِ کرم | آپ کو آپ کی شہزادی سکینہ کی قسم
بحرِ اندوہ و مصیبت سے نکالو مجھ کو
اپنے روضے پہ بس اب جلد بلالو مجھ کو

دراصل رضا کی پوری زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ تحت اللفظ خوانی تھا۔ مدحِ اہلِ بیتؑ میں وہ غرق رہتے تھے۔ غمِ حسینؑ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اسی لیئے ایک موقع پر کہتے ہیں کہ ؎

انہیں کی مدح وظیفہ ہے صبح و شام مرا | انہیں کی مدح سے روشن ہوا ہے نام مرا
انہیں کی مدح سے مقبول ہے کلام مرا | انہیں کی مدح سے منبر بنا مقام مرا
انہیں کی مدح سے حاصل یہ مجھ کو عزت ہے
کہ دیکھ لو سرِ منبر یہ مجھ کو عظمت ہے

رضا نے مراثی کے علاوہ قصیدے اور سلام بھی کافی کہے ہیں۔ مجالس میں تو رضا زیادہ تر مراثیِ شمیم پڑھتے تھے لیکن مراثی سے پہلے اپنے سلام پڑھتے تھے۔ سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جا کر فلک پر بزم میں اپنی
مضامیں جو مرے منھ سے پر منبر نکلتے ہیں

آج پھر جوہر دکھا تیغ زباں اچھی طرح
جنگ کا بن جائے مجلس میں سماں اچھی طرح

جنگِ عباسِ علیؑ کا اس طرح مذکور ہو
ہر طرف بہہ جائیں خوں کی ندیاں اچھی طرح

جو لکھی ہے مدح تو نے اے رضا اس کا صلہ
دیں گے تجھ کو بازوئے شاہِ زماں اچھی طرح

جہاں میں عالمِ علم پیمبرؐ ایسے ہوتے ہیں
جہاں دیکھے کہ شہرِ علم کے در ایسے ہوتے ہیں

احد میں بدر میں صفین میں خیبر میں خندق میں
علیؑ نے کر دیا ثابت دلاور ایسے ہوتے ہیں

علیؑ سوتے جو بستر پر نبیؐ کے یہ کہا حق نے
فرشتو دیکھو جا کر برادر ایسے ہوتے ہیں

کیا جس دم علیؑ نے مہد میں دو کلشہ اژدر
صدا آئی لبِ قدرت سے حیدرؑ ایسے ہوتے ہیں

رضاؔ یہ آرزو دل میں ہے اک دم کربلا پہنچوں
کہیں سب یہ مقدر کے سکندر ایسے ہوتے ہیں

رضا نے فارسی کلام بھی کافی کہا ہے جو امروہہ میں سید محبوب حسن خاں کے پاس موجود ہے۔ اکثر حضرات کے انتقال پر بھی رضا نے قطعاتِ تاریخ کہے ہیں۔ سید غنی حسن مرحوم محلہ دربارِ شاہ ولایت امروہہ کے انتقال پر جو تاریخ کہی وہ بہت مشہور ہے۔ سید غنی حسن

حوم کے گھر میں عزاخانہ بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ ؎

تھے ذاکرِ حسینؑ اسی کا سبب یہ ہے
کہ گلشنِ ارم ہے مکانِ غنی حسن

تیری اسلام نوازی کے میں ہو جاؤں فدا　　قابلِ فخر ہے عالم کے لئے نام ترا
ہر جگہ جنگ میں رہتا تھا ترا یہ نقشہ　　یعنی تنہا تو ہزاروں میں ہزاروں سے لڑا

دیں کا ڈنکا تو بجاتا رہا تلواروں میں
دی اذاں تو نے صدا تیغ کی جھنکاروں میں

ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں کہ۔

کس طرح ہو فرسِ شاہ کی تیزی کا بیاں　　ایک لمحے میں یہاں، دوسرے لمحے میں وہاں
کبھی آندھی، کبھی صرصر، کبھی برق لرزاں　　پا سکے گرد کو کیا جس کی نہ اندازہ کا گماں

ہر میداں وہ روانی وہ اشارے اُس کے
رشک ہو برق کو دیکھے جو طرارے اُس کے

ایک بند تلوار کی تعریف میں ملاحظہ ہو۔

کاٹ تلوار کی ایسی کہ نہ تھی جس سے پناہ　　فرقِ مرحب کا ہے شاہد پہ جبریل گواہ
بھاگنے کی بھی نہ پائی کہیں اشرار نے راہ　　آگیا زد پہ تو دو ہو کے گرا ہر گمراہ

شب معمول تو تُو نار کے سر کاٹ دیئے
اور [illegible] بات [illegible] کے سر کاٹ دیئے

معراجِ رسولؐ سے متعلق واصف [illegible] نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تیرا اللہ رے یہ جاہ و حشم آج کی رات　　عرشِ اعظم [illegible] ہے، ترے [illegible] قدم آج کی رات
سارے سکانِ فلک کہتے تھے [illegible] ہر سو　　یاں سے گذرے ہیں محمدؐ کے قدم آج کی رات
عرش سے فرش تلک دھوم مچی [illegible] واصف　　وجد میں جھومتے ہیں لوح و قلم آج کی رات
بارشِ نور تھی افلاک و زمیں پر واصف　　نور ہی نور تھا ہر نقش قدم آج کی رات

منقبتی قطعات بھی واصف نے کافی تعداد میں کہے ہیں۔

ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

زرِ یزداں کا ہوا خوب ستارا پیدا　　جیسے تاریکیٔ زنداں میں ہو جلوہ پیدا
کیوں نہ روشن ہوں زمانے کی فضائیں واصفؔ　　آج اللہ کے گھر میں ہوا لڑکا پیدا

واصفؔ نے ابتدائی عمر میں رومانی شاعری، غزل اور قطعات کی شکل میں کافی کی ہے جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

آراستہ جو بزمِ خیالات ہو گئی　　اُن سے تصورات میں کچھ بات ہو گئی
اس طرح ہو گیا دلِ بے تاب پُرسکوں　　آنکھیں جو بند کیں تو ملاقات ہو گئی

زندگی کی حقیقت۔ اس کی ناپائیداری اور اس کے عناصر کا ذکر اکثر شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ واصفؔ نے اس موضوع پر بھی اپنی غزلوں میں قلم اُٹھایا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کیا کہیں تنگیٔ زندانِ عناصر واصفؔ
سانس بھی جا کے پلٹ آتی ہے باہر کی طرف

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی کی ایک غزل کسی زمانے میں بہت مشہور تھی جس کا مطلع

کب مرے دل کا داغ جلتا ہے
گو ہر شب چراغ جلتا ہے

واصفؔ نے بھی اس زمین میں غزل کہی۔ اثرؔ لکھنوی کو بھیجی انھوں نے بہت پسند کیا جس کا مطلع ہے۔

ہر نفس دل کا داغ جلتا ہے
آندھیوں میں چراغ جلتا ہے

... ما فخر ہے عالم کے لئے نام ترا ...

مولوی سید قائم رضا نسیم

سید محمد اشرف دانشمند کا سلسلۂ نسب امام محمد تقیؑ سے ملتا ہے امروہہ کی

علمی اورادبی زندگی میں اولادِ اشرف کا ہر دور میں خاص حصہ رہا ہے۔ مولوی

عبرت۔ حاجی مولوی مرتضیٰ حسین۔ ... مولوی نجم الحسن ... بیا نواہ

... پہ ... ہوگئے کر اہر گمراہ

جواد حسین شمیم۔ مولوی یوسف حسن ... محترم ... کارنامے دیئے

اس خاندان میں پیدا ہوئے ... برکات ...

وہ برجیس کے فرزند۔ شمیم کے پوتے ... یہ چند اشعار

حقیقی جانشین اور یادگار آپ ہیں۔ انھیں ... ری اور خصوصاً مدح اہلبیت

ورثے میں ملی ہے۔ اردو مرثیے کی ترقی میں یہ خاندان امروہہ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

اسی علمی اور ادبی ماحول میں ۲۷ رجب ۱۳۲۶ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۹۰۸ء

دوشنبہ بوقت اذانِ صبح امروہہ میں نسیم کی ولادت ہوئی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ بچہ اردو

مرثیے کے چمن کے لئے نسیم سحری ثابت ہوگا۔

کمسنی میں سب سے پہلے والد کا سایۂ شفقت ا...

زر یزداں کا ہوا خوب ستارا پیدا

کہ ... روشن ... [illegible]



جعفر علی خاں اثر ... [illegible]

کب ... دل کا ... [illegible]

گوہر شب چراغ

[illegible]

سید قاسم زماں نسیم

...

بسیط لغت ...

پر کلام اقبال کی شرح لکھی

اور خیرپور میں قیام رہتا ہے۔ رامپور کے قیام کے دوران ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں مرحوم والیٔ رامپور سے بھی بسلسلۂ شعر و سخن خاص قرب رہا۔

آپ کی شعر گوئی کا آغاز صفر ۱۳۳۶ھ مطابق نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوا جب کہ آپ کی عمر صرف ۱۱ سال تھی۔ ابتدا میں قائمؔ بعد میں نسیمؔ تخلص اختیار کیا۔ پہلے مرثیے کے وقت آپ کا سن ۱۸ تھا۔ آپ نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا البتہ اپنے ادبیات عربی کے استاد مولوی سید انوار الحسن جہانگیر آبادی (مقیم امروہہ) کو اپنا ہر ہر شعر سناتے تھے اور ان کے اعتراضات کی روشنی میں جب تک ردوبدل کرتے تھے، جب تک مولانا مطمئن نہ ہو جائیں۔ البتہ خواندگی میں سید ناصر حسین یتیمؔ سے تربیت لی۔

آپ شاعری میں خود تو کسی کے شاگرد نہ ہوئے البتہ آپ کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ عصرِ حاضر میں ہند و پاک میں مولانا کی بہ نسبت کسی شاعر کے مرثیہ نگار شاگرد نہیں ہیں۔ مخصوص شاگردوں کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

ڈاکٹر منظورؔ رائے پوری۔ عاشقؔ کیرانوی۔ حکیم محمد اشرف خاں اشرفؔ۔ اطہرؔ جعفری۔ فیضؔ بھرتپوری۔ میر رضی تیرؔ۔ بدرؔ الہ آبادی۔ حسن علی سرفرازؔ۔ عروجؔ بجنوری۔ اصغرؔ بھیرسری۔ جمیلؔ نقوی۔ زائرؔ امروہوی۔ یاورؔ اعظمی۔ ہلالؔ نقوی۔ سالکؔ نقوی۔ ساحرؔ لکھنوی۔ قسیمؔ امروہوی۔ خمارؔ فاروقی۔ وزیرؔ جعفری۔ تاثیرؔ نقوی۔ شادؔ لکھنوی۔ خیالؔ لکھنوی۔ یونسؔ ملیح آبادی۔ شہیدؔ بدایونی۔ ناطقؔ بدایونی۔ ندیمؔ بدایونی۔ ضمیرؔ لکھنوی۔ اخترؔ لکھنوی۔ مولانا ابو القاسم۔ قیصرؔ امروہوی (مرحوم)۔ سبطینؔ امروہوی (مرحوم)۔ متوجدؔ سرسوی۔ بشیرؔ درانی۔ خنداںؔ لکھنوی۔ قمرؔ بدایونی۔ راہیؔ جہانگیر آبادی۔ ارشادؔ دہلوی۔ شاہدؔ نقوی۔ مسعودؔ نقوی۔ عاصیؔ امروہوی۔ صابرؔ تھاریاوی اور راقم الحروف وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے دو عقد ہوئے۔ پہلی شریکِ حیات سے ایک پسر تولد ہو کر کم سن فوت ہو گیا۔ دوسری شریکِ حیات سے ۲ دو دختران اور چار پسران ہوئے ایک دختر کم سن

فوت ہوئی۔ دوسری دختر کا عقد سید پی۔ بی حسن سے ہوا۔ پسران میں شمیم حیدر، نسیم حیدر، قسیم حیدر اور وسیم حیدر ہیں۔ چاروں پسر لائق اور سعید ہیں لیکن شاعری ورثہ میں صرف قسیم حیدر تسیم کو ملی ہے۔ جن سے مستقبل میں بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

مولانا کی شخصیت کے بارے میں رئیس امروہوی لکھتے ہیں کہ

"ان کے مزاج و کردار میں برصغیر کی مسلم تہذیب کے اعلیٰ اقدار اتنے حسن کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں کہ بعض دفعہ ان کے ملاقاتی سحر زدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا جادو، ان کی تقریر کی دل نشینی، ان کے تبسم کی لطافت اور ان کے حیا آمیز شریفانہ اطوار۔ یہ سب ان کے وجود کا اس طرح احاطہ کر لیتے ہیں جیسے سورج کے گرد نورانی ہالہ۔"

(مراثی نسیم۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱)

حقیقت یہ ہے کہ وہ پاکیزہ نفس، نیک باطن، پر خلوص، با اخلاق، با مروت اور مجسم شرافت ہیں۔ ان کی کشادہ پیشانی پر اعلیٰ ظرفی کے آثار۔ اور ان کے سینے میں انسانیت نواز دل موجود ہے۔ برابر والوں سے گفتگو میں عالمانہ شان اور چھوٹوں کے ساتھ ان کا شفقت و محبت کا انداز منفرد ہے۔

۱۹۲۳ء یعنی ۱۵ سال کی عمر سے آپ کی مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔ پہلے مرثیے کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

تجھ میں اے باغِ وطن اب گلِ خوش رنگ نہیں
کس روش پر گل و بلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں
طنطنے ہیں وہی ماضی کے وہ اورنگ نہیں
آنکھ وا ہوتے ہی بیکد رجد مرا اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے

یہ پہلا مرثیہ سننے کے لئے امروہہ میں ایک تاریخی مجلس کا انعقاد ۱۷ نومبر ۱۹۲۳ء بمطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ بروز اتوار ہوا۔ یہ مجلس عزاخانہ نور الحسن امروہہ میں ہوئی جس میں نہ صرف عام سامعین کی بھاری تعداد تھی بلکہ اس وقت کے تمام علماء، شعراء اور مقتدر حضرات موجود تھے۔ اس وقت آپ کا تخلص قائم تھا جیسا کہ مقطع میں کہا ہے۔

اس عطا کا سن تصنیف یہ لکھا قائم
آفریں خوب ہے، یہ مرثیہ پہلا قائم
۱۹۲۳ء

مجلس کے اختتام پر نواب سید باقر علی خاں نسیم جانشین (جو اس مجلس میں شرکت کے لئے خاص طور سے امروہہ آئے تھے)۔ اٹھے اور سامعین سے مخاطب ہوئے کہ حضرات! میرے پاس استاد محترم فرزدقِ ہند شمیم امروہوی مرحوم کی ایک امانت ہے، جسے آج ادا کرنا چاہتا ہوں اور وہ امانت ہے، تخلص نسیم۔ جو میں نے آج تک صرف اس لئے اختیار کیا تھا تاکہ کوئی اور نہ رکھ سکے۔ یہ تخلص استاد مرحوم (شمیم امروہوی) کے حقیقی جانشین پر ہی زیب دے گا لہٰذا آج سے قائم رضا، قائم کے بجائے نسیم ہیں۔ اس کے بعد دستار باندھی اور اس دن سے نواب باقر علی خاں نے اپنا تخلص فہیم اختیار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اردو مرثیہ کو اس وقت بڑھ کر سنبھالا جب آپ کی شدید ضرورت تھی۔ قدیم۔ عارف۔ مدفیع۔ مزدوج وغیرہ سے اگر ایک طرف لکھنؤ خالی ہوتا جا رہا تھا تو دوسری طرف شمیم۔ برجیس۔ صفی۔ سرتاج۔ ضیا وغیرہ سے امروہہ خالی ہو گیا تھا، شاد کے بعد عظیم آباد میں خاموشی تھی۔ اس طرح اردو مرثیے کے لئے ایک نازک دور آ گیا تھا۔ مرثیے کی آواز پر امروہہ سے آپ لبیک کہہ کر اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیائے مرثیہ پر چھا گئے۔ ۱۹۱۸ء میں جوش ملیح آبادی نے ایک مسدس ضرور کہا تھا لیکن اس میں بہت کچھ ہونے کے باوجود وہ مرثیے کی اصل جدید رہ...

اس طرح نسیم امروہوی کی پہلی آواز کے بعد ہی اس قافلے میں جوش ملیح آبادی، آلِ رضا، جمیل مظہری اور نجم آفندی وغیرہ شامل ہوتے چلے گئے۔ جدید مرثیے میں اولیت کے سلسلے میں پاکستانی نقاد کریم بخش خالد لکھتے ہیں کہ:

"میں اپنے مطالعے اور مشاہدے کے پیشِ نظر بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ سب سے پہلا مرثیہ جو مرثیے کے قدیم تخیل سے ہٹا ہوا ہے ۱۹۲۳ء میں منظرِ عام پر آیا اور اس کے مصنف نسیم امروہوی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاحی مضامین مرزا دبیر، فرزدقِ ہند شمیم امروہوی اور شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے اپنے مرثیوں میں نظم کئے تھے مگر رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کی تاسی میں عزم و عمل کی قوتوں کو بیدار کرنا اور اسلافِ اخیار کے جہد و جہاد کی یاد سے خود میں ویسے عمل کی لگن پیدا کرنا، جو جدید مرثیے کی روح ہے۔ سب سے اول نسیم امروہوی کے زیرِ نظر مرثیے میں نظر آتی ہے۔ پورے ۷ سال کے بعد ۱۹۳۰ء میں جمیل مظہری نے، ۱۹۳۹ء میں سید آلِ رضا نے اور ۱۹۴۱ء میں جوش ملیح آبادی نے قدیم طرزِ مرثیہ گوئی سے ہٹ کر مرثیے کہے۔"

(ماہنامہ "اظہار" کراچی اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۱۶)

مندرجہ بالا مرثیے کے بعد مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے بھی "نفسِ مطمئن" میں آپ کو جدید مرثیہ کا سربراہ کہا ہے۔ نسیم امروہوی کے ذریعہ اردو مرثیے کے اس نئے موڑ کے بارے میں مقدمہ نگار "داناصرہ" لکھتے ہیں کہ:

جنابِ نسیم امروہوی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے سابقہ دور کے مرثیوں کی نقالی پسند نہیں فرمائی بلکہ مرثیہ گوئی کے لئے ایک نیا راستہ نکالا۔"

(داناصرہ ص ۵)

غرض کہ ۱۹۲۳ء سے نسیم امروہوی کے ہاتھوں اس طرح جدید مرثیے کا آغاز ہوا اور آپ کی عظمت صرف یہی نہیں ہے کہ آپ نے اردو مرثیے کو ایک نئی راہ دی، یا اور نئی زندگی بخشی

بلکہ سنہ ۱۹۲۳ء سے جدید مرثیے میں جتنا اضافہ ہوا ہے اور ادبی سرمایہ جمع ہوا ہے اس میں زیادہ تر نسیم امروہوی اور ان کے شاگردوں کا نمایاں حصہ ہے۔ اس طرح بالواسطہ اور بلاواسطہ جدید مرثیے میں نسیم امروہوی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس بات سے قطع نظر اگر ہم تعداد کے اعتبار سے دیکھیں تو بھی آپ کا ہی پلہ بھاری رہے گا کیونکہ آپ کے ہم عصر شعراء میں کسی نے بھی ۲۵۔ ۳۰ سے زیادہ مراثی نہیں کہے جب کہ آپ اب تک تقریباً ۲۰۰ مراثی کہہ چکے ہیں اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے شعراء میں آپ نے سب سے زیادہ مراثی کہے ہیں۔

یہ تو نسیم امروہوی کے پہلے مرثیے اور ابتدائی رجحان کا ذکر تھا لیکن اگر ہم ان کی پوری مرثیہ نگاری کا جائزہ لیں تو تنگیٔ صفحات ہمیں اجازت نہیں دے گی اس کے لئے تو ایک الگ کتاب کئی جلدوں پر مشتمل ہو جائے گی۔ لہٰذا اس موقع پر چند نمونوں پر اکتفا کی جائے گی۔

نسیم امروہوی نے اب تک جتنے مراثی کہے ہیں ان میں کچھ "مراثیٔ نسیم" جلد اول اور جلد دوم میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ۸۔ ۱۰ مراثی ایک ایک، دو دو کرکے شائع ہوئے ہیں باقی سب غیر مطبوعہ ہیں، اس طرح غیر مطبوعہ حصہ، مطبوعہ سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ بہرحال مطبوعہ مراثی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے، جو قدیم مراثی کی خصوصیت رہا ہے مثلاً منظر نگاری کی شاندار مثالیں قدیم مرثیہ میں موجود ہیں۔ ذرا صبح کا منظر نسیم امروہوی کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

نقاب رخ سے جو حور سحر اٹھانے لگی ۔۔۔ خزاں کی تیغ کے کشتوں میں جان آنے لگی
کرامتِ دمِ عیسیٰ صبا دکھانے لگی ۔۔۔ شگوفے کھلنے لگے، صبح رنگ لانے لگی

ہوا سنکنے لگی، ڈالیاں لچکنے لگیں
چمن مہکنے لگا، بلبلیں چہکنے لگیں

وہ پھول اوس کے بھیگے نجوم جبیں پہ نثار   وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی جانفزا رفتار
بہار کی وہ جوانی وہ پتیوں کا نکھار   وہ بلبلیں رُخِ گل پر رکھے ہوئے منقار
یہ وصل کے جو مناظر نظر پہ چڑھنے لگے
چٹک چٹک کے شگوفے درود پڑھنے لگے

رُخ سے آنچل جو ہٹانے لگی سلمائے سحر   اخترِ سعد نے چوما رُخِ زیبائے سحر
شکلِ خورشید میں ابھری جو تمنائے سحر   چشمِ کونین ہوئی محوِ تماشائے سحر
چھوڑ کر اہلِ زمیں بسترِ خواب اٹھنے لگے
آنکھیں ملتے ہوئے دریا میں حباب اٹھنے لگے (۱)

۳۔ نسیم امروہوی کی مکالمہ نگاری بھی ملاحظہ ہو۔

سُن کے یہ رہ جو گیا سر کو جھکا کر ضرغام   حُر کی جانب متوجہ ہوئے آقائے انام
ڈال دیں آنکھوں میں آنکھیں جو بہ اندازِ امام   ہم سخن حُر سے ہوا غیب بطورِ الہام
لبِ توفیق نے جتنے بھی سوالات کئے
منقلب ان کے جوابوں نے خیالات کئے

شاہ، زہرہؑ کے پسر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں   نفسِ احمدؐ کے جگر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں
وارثِ خیرِ بشر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں   نیک دل، پاک نظر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں
تیرے حاکم میں یہ اوصاف ہیں؟ بولا کہ نہیں
جس سے قلب و نظر صاف ہیں؟ بولا کہ نہیں

شہ نے روزہ کوئی چھوڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں   منہ کبھی سجدے سے موڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں
دل کسی شخص کا توڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں   خونِ حرمت کا نچوڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں
تیرے حاکم میں ہیں یہ عیب؟ کہا بیشک ہیں
اور بھی عیب ہیں لاریب؟ کہا بیشک ہیں

ایک موقع پر نسیم انصارِ حسینؑ کا کردار صرف ایک بند میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ۔

چیدہ و حق شناس و حق آگاہ و حق گذار ذی علم و ذی فضیلت و ذی جاہ و ذی وقار
جانباز، سرفروش، عمل کوش، جاں نثار باعزم، باشعور، جواں مرد، مرد کار
تصویر تھے جلالتِ بدر و حنین کی
انصار کے بھیس میں تھی شجاعت حسینؑ کی

امام عالی مقام کا صبر بھی ملاحظہ ہو۔

پسر کے داغ کی دنیا میں کچھ دوا ہی نہیں اس امتحاں میں کسی کا قدم جما ہی نہیں
مگر حسینؑ سا صابر کوئی ہوا ہی نہیں سکون و صبر و تحمل کی انتہا ہی نہیں
خوشی سے دل پہ یہ جبر اختیار کرتے ہیں
جوان بیٹے کو حق پر نثار کرتے ہیں

یہیں سے دیکھ رہی ہے یہ فطرتِ غمگیں کہ جیسے طالب اذنِ دفاع ہے وہ حسیں
زبانِ حال سے فرماتے ہیں یہ سرورِ دیں پھوپی کا اذن ہو بیٹا تو ہم کو عذر نہیں
نہ دھوپ چھاؤں میں گھر سے کبھی نکالا ہے
تمہیں تو جوگ کما کر انھوں نے پالا ہے

اردو مرثیے کا ایک دور ایسا بھی تھا جب ساقی نامے کی اہمیت بہت زیادہ تھی نسیم امروہوی [illegible] تو نامہ بڑی خوب صورتی اور کامیابی کیساتھ نظم کیا گیا [illegible]

ساقی وہ مے [illegible] [illegible] پلا [illegible] [illegible] بھی [illegible] لہ زار ہو
مصرع مرا بہشت کے پھولوں کا ہار ہو [illegible] تو نہ آنکھوں میں خمار ہو
وہ مے پلا دے جو ازلی میکدہ [illegible] ہے

بدذوق بھی پئے تو کہے ہاں مزے کی ہے

عرفاں کے نور سے جو چمکتی ہے وہ شراب
تطہیر جس کے رخ سے ٹپکتی ہے وہ شراب

مومن کے جامِ دل میں چھلکتی ہے وہ شراب
جو غیر کے گلے میں اٹکتی ہے وہ شراب

ہاں بادۂ غدیر مجھے پے بہ پے پلا
جو بے لبسی میں شیخ بھی پی لے وہ مے پلا

وہ مے کہ جس کی موج کے جلوے جلی جلی
باغِ ولا کی جس سے معطر کلی کلی

ہُو حق کے بدلے رند کہے جب ولی ولی
مینا بھی غُل مچائے کہ قُل قُل، علیؑ علیؑ

لکھوں وہ حال جام کا منھ چوم چوم کے
خود مصطفٰیؐ درود پڑھیں جھوم جھوم کے

ساقی! حریصِ کوثر دھوبی نہیں ہوں میں
زاہد کی طرح مکر کا پُتلا نہیں ہوں میں

کافی ہو ایک جام وہ پیاسا نہیں ہوں میں
مجلس بھی میرے ساتھ ہے تنہا نہیں ہوں میں

ساقی تجھے قسم ہے رسولِ قدیر کی
رکھ دے سبیل بادۂ خُمِ غدیر کی

سراپا نگاری میں شعراء اکثر قصیدے کے شکوہ اور غزل کی رنگینی سے قریب آجاتے ہیں، نسیم امروہوی اس فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ان حسینوں کے وہ غمزوں سے اشاراتِ حسیں
ماہ رو، عنبرہ مُو، غالیہ مُو، زہرہ جبیں

پیکرِ حسن و نزاکت، نمکین و [illegible]
[illegible] میں ممکن ہی نہیں

[illegible]

[illegible] سبب ظہارِ حقیقت کے لئے

وہ لبِ حور کہ غنچوں کی نزاکت صدقے
زلف و عارض پہ شبِ روزِ ملاحت صدقے

[illegible] مژگاں پہ فرشتوں کی نجابت صدقے
وہ قیامت قد و قامت کہ اقامت صدقے

یہ ادا صورتِ دلکش کی غضب ڈھاتی ہے
جیسی ہم چاہتے ہیں ویسی ہی بن جاتی ہے

ایک موقع پر حضرت علی اکبرؑ کا سراپا اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ۔

وہ روئے پاک تجلّی میں طور کی صورت — وہ خال و خط کہ رسولِ غیور کی صورت
شہود و غیب میں بالکل حضورؐ کی صورت — کہاں ہے دیکھئے قرآن نور کی صورت
عمل وسیلے سے ان کے قبول ہوتے ہیں
کہ ایسی شکل کے انساں رسولؐ ہوتے ہیں

وہ لوحِ عرشِ عبادت جبینِ آئینہ رو — نشانِ سجدۂ رب لا الٰہ الا ھو
وہ گوشِ پاک کی لو تک جڑے ہوئے گیسو — قریب آیتِ واللیل ہے اذا سمعو
سرِ صحیفۂ رُخ خط خوش نمط دیکھو
شبابِ احمدِ مرسلؐ کے دستخط دیکھو

حضرت قاسمؑ کی رخصت نسیم امروہوی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

پردہ اٹھا کے در سے جو نکلا وہ گلعذار — حاضر تھا آستانِ مبارک پہ راہوار
عباسؑ نے رکاب کو تھاما بصد وقار — بازو پکڑ کے خود شہِ دیں نے کیا سوار
رو کر پکاریں زینبِ ناچار الوداع
سونپا خدا کو اے مرے جرّار الوداع

مجرے کو خم ہوا جو یہ سنکر وہ نورِ عین — فرطِ الم سے رہ گئے دل تھام کر حسینؑ
گھوڑے کی باگ [illegible] مالِ شہِ حنین — رن کو چلے اٹھا کے وہ سینہ بہ زیب و زین
اس آن بان سے سوئے لشکر رواں ہوئے
غل تھا کہ لو علیؑ ولی پھر جواں ہوئے

تھا ہو بہو شباب [illegible] بدلا فتی کا رنگ — ہیبت سے جس کے اڑنے لگا اشقیا کا رنگ

ملبوسِ سبز میں حسنِ مجتبیٰ کا رنگ　　چہرے پہ غیظ میں شہِ گلگوں قبا کا رنگ

رُخ کو نگاہِ چہرے نے جلوہ بنا دیا

اِس سورہ برات نے دولہا بنا دیا

رخصت کے بعد میدانِ جنگ میں بہادر کی آمد کا ذکر نسیم امروہوی کے یہاں بڑی آب و تاب اور جاہ و جلال سے کیا گیا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کی آمد بیان کرتے ہیں۔

جھپٹ کے شیر کی صورت جری اِدھر سے چلا　　دبک کے شام کا ہر پہلوان اُدھر سے چلا

جلال سر کو جھکائے جلو میں ڈر سے چلا　　علیؑ کا شیر محمدؐ کے کر و فر سے چلا

زمیں پکاری کہ گردوں وقار آتے ہیں

براق پر شہ دلدل سوار آتے ہیں

یہ دبدبہ ہے کہ گردوں ہے سر جھکائے ہوئے　　یہ وسوسہ ہے کہ سورج ہے منہ پھلائے ہوئے

علی کا شیر جو ہے آستیں چڑھائے ہوئے　　فلک کھڑا ہے زمیں کے سرے دبائے ہوئے

یہی ہے شور کہ چرخِ بریں کی خیر نہیں

ابو تراب سنبھالو زمیں کی خیر نہیں

گھوڑے کی تعریف میں اکثر شعرا نے طبیعت کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ نسیم امروہوی نے اس موضوع کو بھی کئی جگہ اپنایا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

فرس جو حور تو سر شمعِ طور، کلغی لَو　　ایال کرنوں کا جھرمٹ کہ مو بمو پُر ضو

وہ نرم چال وہ چنچل بل وہ جست وہ تگ و دو　　جبیں پہ چاند ہے روشن تو زیرِ سُم مہِ نو

بڑھا تو نعل کا جلوہ نظر پہ چڑھنے لگے

خود آفتاب دعائے ہلال پڑھنے لگے

وہ رن کے شوق میں شبل پر ندا اڑ کے چلا　　ہوا بھی رک گئی تھک کر سمند اڑ کے چلا

دھبے پری میں پری سے دو چند اڑ کے چلا　　خود اپنے مرغِ نظر سے بلند اڑ کے چلا

ہو میں جیسے روانی ہو یو ں رواں شہ ہے
وفا کے خون سے جو رنگ ہے تازیانہ ہے

نسیم امروہوی نے اپنے مراثی میں جنگ بہت کم بیان کی ہے۔ رجز کا تعلق چونکہ جنگ سے ہے اس لئے رجز بھی زیادہ نہیں ہے لیکن یہ حصے چاہے کم ہوں لیکن تاثیر میں کسی طرح کی کمی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

تم کیا ہو جانتے ہیں عدو کو بڑے بڑے ۔۔۔ لیے ہزار معرکے جھیلے کڑے کڑے
کی سیر عرش، فرش نبیؐ پر پڑے پڑے ۔۔۔ پھینکا اکھاڑ کر در خیبر کھڑے کھڑے
قائم تھے آپ مرضیٔ رب جلیل پر
سر عرش پر تھا، پاؤں پر جبرئیل پر

گیتی ہو گرد برد جو ہم انتقام لیں ۔۔۔ بھاگے سپاہ۔ تیغ غضب سے جو کام لیں
نعرہ کریں تو شیر کلیجہ کو تھام لیں ۔۔۔ پھر شام تک نہ قوم ٹھہرنے کا نام لیں
غصے میں بھر کے ہاتھ جو ڈالیں حسام پر
دن بھی نہ ڈھلنے پائے کہ قبضہ ہو شام پر

جو وہ ہو کچھ تو کھینچ لو تیغیں ہنر دکھاؤ ۔۔۔ دامن سمیٹو آؤ بڑھو۔ آستین چڑھاؤ
گھوڑے بڑھاؤ جم کے لڑو، بیڑیاں جماؤ ۔۔۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جب تو نظر ملاؤ
پہچانتے ہیں ہم تمہیں جیسے دلیر ہو
رن میں قدم جمیں تو یہ جانو کہ شیر ہو

نسیم امروہوی کے مراثی میں مدح کا حصہ بھی نہ صرف یہ کہ کافی ہے بلکہ بہت خوب اور عمدہ ہے اور ائمہ کی مدح کے علاوہ نعت رسول، مدح شہدائے کربلا اور مدح اسیران کربلا بھی ہے۔ نعت رسولؐ ملاحظہ ہو۔

صبح ازل ہے خندۂ گریبانِ مصطفےٰ ۔۔۔ شام الست، گوشۂ دامانِ مصطفےٰ

عرشِ عُلا ، منارۂ ایوانِ مصطفیٰ عِلمِ خدا ، چراغِ شبستانِ مصطفیٰ

معراج ، منزلت کی حدِ ناتمام ہے
قوسین تو حضور کا ادنیٰ مقام ہے

کاف اور نون مطلعِ تابانِ منقبت لولاک حسنِ مطلعِ دیوانِ منقبت
ق لو اُبلی، قصیدۂ ذیشانِ منقبت قرآں زبانِ حق سے غزل خوانِ منقبت

حیراں جو شن کے سورۂ کوثر عقول ہیں
تین آیتیں مثلثِ نعتِ رسولؐ ہیں

اوّل تو جسم کا نہیں سایہ یہ معجزہ پھر بے پڑھے جہاں کو پڑھایا یہ معجزہ
پھر ایک شہرِ علم بسایا یہ معجزہ حیدرؑ سا در پھر اس میں بنایا یہ معجزہ

قرآں ملا تو معجزہ لب کھولنے لگا
محبوب کے نعت میں خدا بولنے لگا

قرآنِ پاک ان کی فصاحت کا معجزہ خندق کی فتح، فکر و فراست کا معجزہ
زورِ علیؑ انھیں کی شجاعت کا معجزہ بیٹی بتولؑ سی یہ رسالت کا معجزہ

دختر کے دلبروں سے جو نسلِ نبیؐ چلی
دختر کشی کی رسم بخس پر چھری چلی

غل تھا کہ اِنَّہٗ قمرٌ فی کمالِہٖ الشمس بھی تو اقتبست عن جمالِہٖ
دنیا مہک رہی ہے بطیبِ خصالِہٖ آئے رسولؐ صلِّ علیہِ وآلِہٖ

پتھر جہاں تھے اب دہیں وحدت کے پھول ہیں
یہ انقلاب کیوں نہ ہو آخر رسولؐ ہیں

معراجِ رسولؐ کا واقعہ بھی کئی مرثیہ نگار شعراء نے نظم کیا ہے۔ نسیم امروہوی نے بھی اس موضوع کو اپنے مراثی میں جگہ دی ہے۔ براقِ رسولؐ کا ذکر اور رفتار ملاحظہ ہو۔

وہ نور کی رفتار، طبیعت کی روانی — جانے میں سر چرخ مری مرثیہ خوانی
پھر جا کے پلٹ آنے میں وہ یوسفِ ثانی — یعقوب کی بینائی، زلیخا کی جوانی

جانا وہ نمازِ اسد اللہ کی صورت
پھرنا وہ نصیبِ حُرِ ذی جاہ کی صورت

معراج کے علاوہ حیاتِ رسولؐ کے کئی اہم واقعات بھی نسیم امروہوی نے بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابوطالبؑ کے فضائل، جناب خدیجہ کی مدح، جناب فاطمۃ زہرہ اور جناب زینبؑ کی مدح اور ائمہؑ کے فضائل بھی بیان کئے ہیں۔ ابوطالبؑ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ۔

شریکِ دعوتِ اسلام ہیں ابوطالبؑ — نبیؐ کو حق کا اک انعام ہیں ابوطالبؑ
حریمِ وحی میں الہام ہیں ابوطالبؑ — حرم کے عزم کا احرام ہیں ابوطالبؑ

یہ چمن کے لائیں جو غنچہ وہ پھول ہو جائے
پھر ان کے گھر میں پلے اور رسول ہو جائے

نظر چرا گئی دنیا مگر ابوطالبؑ — کسے تھے نصرتِ حق پر کمر ابوطالبؑ
ہزار تیغیں تھیں اور اک سپر ابوطالبؑ — رکھے تھے اپنی ہتھیلی پہ سر ابوطالبؑ

لگن جو ان کو نہ ہوتی چراغ گل ہوتا
نبیؐ کا فاتحہ، قرآن کا بھی قل ہوتا

طورِ سینا سے نہ وہ کعبے کے در سے نکلا
چل کے دینِ نبوی ان کے ہی گھر سے نکلا

عین معبود بھی اک نورِ نظر ان کا ہے — جو نصیری کا خدا ہے وہ پسر ان کا ہے

سب دلیلوں پہ دلیل ایک مگر غالب ہے
کُل ایمان تو اک جزدِ ابوطالبؑ ہے

جنابِ خدیجہ کے بارے میں اُستوِ مراثی میں بہت کم مواد ملتا ہے نسیم امروہوی نے آپ کا ذکر کئی جگہ کیا ہے ایک بند ملاحظہ ہو۔

آگئیں گھر میں یہ احمدؐ کے تو ہر کام چلا   مال سے ان کے بڑی شان سے اسلام چلا
…لہ دینِ محمدؐ کا بہ آرام چلا   فرش سے حمد چلی، عرش سے پیغام چلا
خشتِ زر سے ہیں یہ اسلام کے معماروں میں
سب مسلمان ہیں بی بی کے نمک خواروں میں

دو بند جنابِ فاطمہؑ زہرہ کی مدح میں بھی ملاحظہ ہوں۔

…ن بہ ر ناز ہ سیادت ہیں فاطمہؑ   سرمایۂ فروغ امامت ہیں فاطمہؑ
ختم الرسل کا اجرِ رسالت ہیں فاطمہؑ   قرآن ہے رسول تو آیت ہیں فاطمہؑ
بی بی پہ ہے طہارت و عصمت کا خاتمہ
بابا وہ ہے کہ جس پہ نبوت کا خاتمہ

مریم بھی ان سے کم ہیں مسیحا سے پوچھ لو   آدھا بھی مرتبہ نہیں سارا سے پوچھ لو
اپنوں کا ذکر کیا ہے یہ اعدا سے پوچھ لو   جاؤ مباہلے میں نصارا سے پوچھ لو
زہرہؑ سی عورتیں ہیں نہ حیدرؑ سے مرد ہیں
ختم الرسل کے بعد یہ زوجین فرد ہیں

نسیم امروہوی کی مدح گوئی کے سلسلے میں آخری نمونے کے طور پر جنابِ زینبؑ کی مدح ملاحظہ ہو۔

شریکِ صبرِ شہِ مشرقین ہیں زینبؑ   کہ عینِ فاطمہؑ و نورِ عین ہیں زینبؑ
دلِ محمدؐ و حیدرؑ کا چین ہیں زینبؑ   خدا کی راہ میں بالکل حسینؑ ہیں زینبؑ
حسینؑ، مردِ رہِ انقلاب ہیں گویا
یہ عورتوں میں عمل کی کتاب ہیں گویا

حسینؑ، صبر کا آغاز ہیں تو یہ انجام ۔۔۔ حسینؑ، دینِ نبیؐ کی بقا ہیں اور یہ دوام
حسینؑ امام، یہ تکمیلِ مدعائے امام ۔۔۔ حسینؑ فاتحِ کرب و بلا یہ فاتحِ شام

انھوں نے قصرِ رعونت جلا کے خاک کیا
یزیدیت کا کلیجہ انھوں نے چاک کیا

یہ بھائی وہ ہے کہ جانا بہن کو جاں کی طرح
یہ وہ بہن ہے جو بھائی کو روئی ماں کی طرح

رہیں خموش تو خود ظلم کو حجاب آیا
زبان کھولی تو کوفے میں انقلاب آیا

جہادِ نفس کیا قتلِ عام کے بدلے
نبیؐ کے گھر کو سنبھالا امام کے بدلے

عجب نہ تھا جو شہ خاص و عام ہو جاتیں
نہ ہوتیں پردہ نشیں تو امام ہو جاتیں

برائے نام شہیدوں کا نام رہ جاتا
جو یہ نہ ہوتیں ادھورا پیام رہ جاتا

عدو کا دل جو نہ خطبوں سے ان کے ہل جاتا
نہادتوں کو بغاوت خطاب مل جاتا

درحقیقت اردو مرثیے کے مدح جز، جسکو نسیم امروہوی نے قرآن اور احادیث کی مدد سے نہ صرف وسعت بخشی ہے بلکہ عظمت بھی عطا کی ہے اور یہ صرف ان ہی کا حصہ ہے فاتح ٹیکسلا مولانا محمد بشیر قبلہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ۔

" اپنے ہم صنف فاضل۔ جناب نسیم امروہوی کی شاعری میں فاضلانہ اندازِ تخیل اور قرآن و حدیث کے معانی کا عالمانہ محتاط طرزِ ادا وہی خصوصیات ہیں جو لَا زلت مُوَیّدُ اًبِرُوحِ القُدُس فادمت فی مَدحِنَا۔ (جب تو ہماری مدح میں مصروف رہے گا روح القدس تیری تائید کرتے رہیں گے)۔ میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ وصف جناب نسیم امروہوی کے علاوہ متقدمین میں بھی عموماً نہیں پایا جاتا کہ جو کچھ واعظینِ کرام آیات واحادیث اور علمِ کلام کے مباحث میں پیش کرتے ہیں، وہی علمی نکات مرثیہ میں بھی نظم ہو جاتے ہیں۔ یہ موصوف کا خاص رنگ ہے بلکہ وہ اس کے موجد ہیں۔" (تسبیح فاطمہ ص۳)

مدح کے بعد نسیم امروہوی کی زبان سے تلوار کی تعریف ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ۔

چلی وہ چال کہ لاکھوں کو پائمال کیا ۔۔۔ رخوں کا رنگ اڑایا، بدن کو لال کیا
نگاہ جس پہ پڑی اس کو خستہ حال کیا ۔۔۔ ادا سے ذبح کیا، ناز سے حلال کیا
یہ دل جلا گئی، اس دل کی آس توڑ گئی
جدھر گئی کوئی تازہ شگوفہ چھوڑ گئی

ہوے اور بھی رنگت چمکتی جاتی ہے ۔۔۔ نزاکتوں سے کمر بھی لچکتی جاتی ہے
جو اونگھتے ہیں یہ ان کو تھپکتی جاتی ہے ۔۔۔ جراحتوں پہ نمک بھی چھڑکتی جاتی ہے
روش میں سیل ہے، بجلی شرر فشانی میں
وہ شوخ ہے کہ لگاتی ہے آگ پانی میں

قدیم اردو مرثیے کے وہ تمام اجزا جو اس کی پہچان رہے ہیں وہ سب نسیم امروہوی

کے ہاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کے مخصوص انداز میں ملتے ہیں ۔ مدح کے حصّے پر تو انھوں نے خاص زور دیا ہے لیکن رزم کے حصے پر توجہ کم ہے اور یہ ان کی دانستہ اور شعوری کوشش محسوس ہوتی ہے ، اس کا شاید سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نسیم امروہوی مرثیے کو اپنے عہد کی قدروں کے مطابق لے کے چلے ہیں اور وقت سے ہم آہنگی پیدا کی ہے ۔ عصرِ حاضر ، تیغ زنی کے ذوق سے ناواقف ہے اس لئے اس کا بیان بھی مختصر کردیا ہے ۔ رہا سوال تلوار کی مدح کا تو وہ قصیدے کے مزاج سے قربت رکھتی ہے اور اسمیں تغزل کی بھی خاصی گنجائش ہے اس لئے ادھر توجہ کچھ زیادہ ہے ۔ بہرحال جنگ کے ذکر میں ایک بند ملاحظہ ہو ۔

سپر گری جو دکھانے لگا وہ بد گوہر　　چمک کے تیغ جری نے بجھا دئے تیور
سرو ہی اس کی جو اٹھی بسانِ دردِ جگر　　حسام ان کی چلی اُڑ کے مثلِ مرغِ نظر
سلف کا خون دو طرفہ اثر دکھانے لگا
یہ مسکرانے لگے ، وہ نظر چرانے لگا

نسیم امروہوی نے اگر ایک جانب مدح کے حصّے کو آیاتِ قرآنی اور احادیث کی مدد سے مدلل بنا کے پیش کیا ہے وہاں دوسری جانب عقلی اور منطقی دلائل کی بھی کمی نہیں ہے ۔ امامِ آخرؑ کے غیبت میں وجود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ۔

اس طرح بحرِ جہاں میں یہ گہر مخفی ہے　　جس طرح وقت کے دامن میں سحر مخفی ہے
یا شبِ تار کی چادر میں قمر مخفی ہے　　یا نمازی کی دعاؤں میں اثر مخفی ہے
عقلِ منکر کو یہی کیوں نہیں سمجھاتی ہے
کہیں آنکھوں سے مشیت بھی نظر آتی ہے

اس طرح آپ ہیں موجود ، مگر مخفی بھی　　جیسے ظاہر بھی ہے اور عقلِ بشر مخفی بھی
بے نمایاں بھی شمیمِ گلِ تر مخفی بھی　　چلتی پھرتی بھی ہے اور بادِ سحر مخفی بھی

دل سے جانا ہے تو اُن سے انھیں مانا ہے
حق کو دیکھا تو نہیں عقل سے پہچانا ہے

کیف جو دل میں سماتا ہے نہاں ہے کہ نہیں — جوش جو خون بڑھاتا ہے نہاں ہے کہ نہیں
جذب جو کھینچ کے لاتا ہے نہاں ہے کہ نہیں — ذہن جو عرش پہ جاتا ہے نہاں ہے کہ نہیں
ولولہ زیست کا مقصود ہے اور غائب ہے
رُوح بھی، سانس بھی موجود ہے اور غائب ہے

غرض کہ نسیم امروہوی کے مراثی کی ان مختصر مثالوں سے یہ خوب واضح ہو جاتا ہے کہ نسیم امروہوی اپنے عہد سے قبل کے مرثیے سے پوری طرح واقف و آگاہ بھی ہیں اور فنی عروج کے ساتھ ہر منزل سے گذرنے کی پوری قدرت بھی رکھتے ہیں۔ وہ انیسؔ کے رنگ کو اپنانا چاہیں تو ان کو پہچاننا مشکل ہو جائے اور دبیرؔ کے رنگ میں تو ایک مرثیہ سنکر مرزا عالمگیر لکھنوی نے مزاحاً پوچھا تھا کہ نسیم صاحب یہ مرثیہ مرزا دبیر کی کونسی جلد میں ہے۔ اس مرثیے کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

اے منشیٔ گردوں قلمِ نخلِ دلادے — سو سال جو پہلے کا ہے وہ رنگ دکھا دے
ماضی کو پھر اے دورِ زماں حال بنا دے — اسلوب دبیرؔ آج کے لفظوں میں مزا دے
جب مرثیہ گوئی کا قلم ہاتھ میں آئے
دل جس سے غنی ہو وہ رقم ہاتھ میں آئے

یہ مرثیہ نسیم امروہوی نے مرزا دبیر کی صد سالہ یادگار کی تقریب میں کراچی میں پڑھا تھا۔

انیسؔ و دبیرؔ سے ہٹ کر ہمیں نسیم امروہوی کے ہاں حالی کا قومی درد اور اقبال کی فکر و فراست بھی نظر آتی ہے۔ نسیم امروہوی فرماتے ہیں۔

ہم ہیں عرفان و حقیقت کے پرستاروں میں — گم ہم نے پڑھا تیغوں کی جھنکاروں میں

سر جھکایا نہ کبھی ظلم کے درباروں میں انتہا یہ کہ چنے بھی گئے دیواروں میں

سبز یہ باغ ہوا ذوقِ نمو سے اپنے

ہم نے اسلام کو سینچا ہے لہو سے اپنے

اب اس بند کی گونج پر غور کیجئے تو فوراً اقبال کا "شکوہ اور جواب شکوہ" یاد آجائے گا۔ اس سلسلے میں حسین اعظمی لکھتے ہیں کہ۔

"مولانا حالی کے شہرۂ آفاق مسدس "مد و جزرِ اسلام" اور علامہ اقبال کے مشہور مسدس "شکوہ، اور جواب شکوہ" کا اثر قبول کرنے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے [illegible] نسیم امروہوی نے مذکورہ مسدس سے متاثر ہو کر یا ردِ عمل کے طور پر اردو مرثیے کو اسی [illegible] میں ڈھالنے کی پہلی کوشش کی تھی۔ بہر حال یہ اردو مرثیے میں پہلی آواز اور پہلا تجر[illegible] اس سے پہلے یہ انداز کسی دوسرے مرثیہ میں نہیں ملتا۔" (عرفانِ نسیم [illegible]

نسیم امروہوی نے یوں تو اردو مرثیے کو بے حد وسعت دی ہے۔ [illegible] کے خاص موضوعات، انقلاب و حریت، علم و عمل، اتحاد و اتفاق۔ اص[illegible] فلسفۂ غم و مسرت۔ قرآن و اہلِ بیت۔ عقل و عشق۔ عزم و حوصلہ۔ جرأت و ہمت [illegible] و انسانیت۔ محبت و خلوص۔ اسلام و ایمان۔ حمد و نعت اور چراغ و قلم۔

انقلاب کے موضوع پر نسیم امروہوی نے بہت کچھ لکھا ہے وہ صحت[illegible] کے دل سے قائل ہیں جس کی وضاحت انھوں نے اپنے مختلف مراثی میں اپ[illegible] میں کی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

اے انقلاب! مژدۂ عزم و عمل ہے [illegible] بجا لائی ہے

تعمیر کائنات نہ صرف اب [illegible] نظر آتی ہے

گردش بتا رہی [illegible]

تو ہے دلیل [illegible] نظر [illegible] روزگار کی

ہے عالمِ فنا کی بقا انقلاب سے — دل چسپ ہے چمن کی فضا انقلاب سے

ہیں دلربا نسیم و صبا انقلاب سے — خود معتدل ہے آب و ہوا انقلاب سے

فطرت کی حد جمود کی حد سے بلند ہے

ہر پھول اس چمن میں تغیر پسند ہے

جاری یہی ازل سے ہے قانونِ لم یزل — تمہید انقلاب ہے فطرت کا ہر عمل

ممکن نہیں کہ قوتِ نشو و نما ہو شل — ہر بیج ایک پھول ہے ہر پھول ایک پھل

اک انقلاب تو کئی تمنا لئے ہوئے

ذرے ہیں اپنی گود میں صحرا لئے ہوئے

اُردو قدیم مرثیے میں حضرت حُر کے حال میں، تو کافی مراثی ملیں گے، بلکہ شاید اپنے ... را ایسا ہو جس نے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو. لیکن حریت کو موضوع لکھنو ... میں بنایا گیا ہے، بیسویں صدی میں ربع اول کے بعد کی سیاسی صورتحال کا ... دیکھیں تو اس دور میں حریت کی گونج زیادہ سنائی دے گی جس سے مرثیہ نگار ... کا متاثر ہونا بھی فطری تھا. نسیم امروہوی کے ہاں بھی حریت کی خاص گونج ہے.

... دیکھئے:

...ح حریت، شرفِ جسم و جان ہے تو — اک زندگی دائمی ہے جہاں میں جہاں ہے تو

...ے ہر رگ و پے میں رواں ہے تو — بوڑھے کے دل میں ہو تو وہاں بھی جواں ہے تو

... کے جی گئے

... میں پڑھا تھا ... ت میں جی گئے

انیس ودیہ ... نا زندگی کا سہارا ہے حریت

... ے — فطرت کا اک لطیف اشارا ہے حریت

ختم ہو تو ... ... کے واسطے

انساں نہیں بنا ہے غلامی کے واسطے

بے حریت حیات ہے اک نخلِ بے ثمر
مضمونِ نو کا بند خموشی میں کب اثر

بخشے نہ دل کو جذبۂ پرواز تو اگر
نکلے بھی قفس سے نہ مرغِ شکستہ پر

بندش میں ہے جو نطق وہ کب دلپذیر ہے
نغمہ بھی چیختا ہے جو بلبل اسیر ہے

علم و عمل ایسا موضوع ہے جس پر شاید نسیم امروہوی سے زیادہ [illegible] نی اور شاعر نے نہیں دیا ہے اور نسیم امروہوی کی یہ کوشش غیر شعوری ہے اس کے پیچھے یقیناً ان کی اپنی ذات اور اپنی زندگی پوشیدہ ہے۔ وہ عالم باعمل ہیں اور ان کی اس خصوصیت نے ہی انھیں خود بخود اس راہ پر لگا دیا ہے انھوں نے کربلا کو اسی زاویے سے دیکھا ہے۔

فطرت بھلا سکے گی نہ احسانِ کربلا
گہوارۂ عمل ہے بیابانِ کربلا

جب وہ اپنے امام کی طرف دیکھتے ہیں تب بھی ان کا یہی زاویۂ نظر ہے۔

کون شبیرؑ، وہ خورشید ضیا بارِ عمل
گلِ بستانِ علیؑ، نزہتِ گلزارِ عمل

پیکرِ صبر و سکوں کوہِ گراں بارِ عمل
خود پُر اسرار مگر محرمِ اسرارِ عمل

جو محمدؐ بھی ہے اور حیدرِ کرار بھی ہے
صبر کی ڈھال بھی ہے علم کی تلوار بھی ہے

پیکرِ علم میں جو روحِ عمل ہے وہ حسینؑ ہے
تا ابد خلق میں جو نورِ ازل ہے وہ حسینؑ ہے

دیا تھا علم کا آدمؑ نے گو سبق پہلا
مگر کتابِ عمل کا ہے تو ورق پہلا

نبیؐ ہیں علم کے ساتھ اور نبی کے ساتھ عمل

علیؑ کا صدر ہے علم اور علیؑ کا ہاتھ عمل

جو علم سے ہے عمل، تو عمل سے عالم ہے

نہ ہو عمل تو وہ عالم نہیں ہے ظالم ہے

کربلا میں امام حسینؑ کی فتح کا ایک راز نسیم امروہوی کی نظر میں عمل بھی ہے۔

فرماتے

عمل سے جیت لیا عزم کی لڑائی کو

سر بریدہ سے سر کر لیا خدائی کو

عمل کا علم سے بھی ایک خاص تعلق ہے اور ان دونوں کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

جمال شاہد حق علم ہے، عمل ہے جلال — محاسن ابدی کا وہ نور ہے، یہ کمال

وہ نخل ہے، یہ ثمر ہے، وہ مال ہے، یہ نال — وہ فلسفہ، یہ حقیقت، وہ قیل و قال، یہ حال

جہان ذات وہ ہے، عالم صفات یہ ہے

حیات وہ ہے مگر مقصد حیات یہ ہے

ضیائے علم سے قائم ہے آب و تاب عمل

بغیر علم نہیں کوئی کامیاب عمل

نسیم امروہوی کا یہی جذبہ علم و عمل انہیں عزاداران امام حسینؑ سے اس طرح مخاطب کرتا ہے۔

بجا جو کرتے ہو تم مجلسیں عزا کے لئے — اشاعت غم مظلوم کربلا کے لئے

یہ صرف بہر بکا ہیں نہ واہ وا کے لئے — یہ مدرسہ بھی تو ہیں دین مصطفےٰ کے لئے

نہیں یہ بزم ہدایت کا اہتمام ہے گویا

حسینؑ علم و عمل کی کتاب ہے گویا
غضب ہے تم رہِ علم و عمل سے بھاگے ہو
حسینؑ کا تو سپاہی وہ ہے جو آگے ہو

نسیم امروہوی قومی ترقی کے لئے اتحاد و ملت کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک موقع پر قوم کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

قوم بھی وہ قوم جو تیغوں کے سائے میں پلی   سر کٹانا جس کا ادنیٰ کھیل ایسی من چلی
جس کا خوں تاریخِ جانبازی کا عنوانِ جلی   رزم گاہِ دہر میں نعرہ ہے جس کا یا علیؑ
زندگی جس کی شجاعت، جس کا میداں کربلا
تن مدینہ، سر نجف، دل سامرہ، جاں کربلا

جب قوم اس طرح اپنے ماضی سے واقف ہو جائے گی تو مستقبل بنانے کے لئے خود کوشاں ہو گی۔ وہ قوم کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کر کے اتحاد و اتفاق کی جانب اس طرح متوجہ کرتے ہیں کہ۔

بھلا دیا ہے درسِ اخوت سے خود کلام مجید   عمل سے کر گئے اصحابؓ و آلؑ بھی تائید
جواب دو کہ پھر آپس میں کیوں ہے جنگ شدید   ہوئی جو تم میں دوئی مجھو مٹ گئی توحید
لڑو فروغ پہ ناحق نہ مصطفیٰؐ کے لئے
حصولِ دیں کی حفاظت کرو خدا کے لئے

ملت کے اتحاد کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حالات کی بھی اصلاح ہو، معاشرے کو بھی سدھارا جائے اور قدیم غیر ضروری رسم و رواج کو بھی ختم کیا جائے قومی ترقی کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ نسیم امروہوی نے اس سلسلے میں بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور کھل کر تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

وہ ذی خرد جو دکھاتے ہیں راہ آزادی   خلافِ عقل ہوئے ہیں رسوم کے عادی

اگر عنایت حق سے کسی کی ہو شادی
تو گھر لٹاتے ہیں بر وقت خانہ آبادی

ادا رسوم جہالت تمام کرتے ہیں
خدا کے حکم میں شامل حرام کرتے ہیں

اگر پسر کی ہے شادی بہ فضل ربانی
ضیافتوں میں یہ کرتے ہیں اپنی قربانی

خوشی کے جوش میں ہوتی ہے ایسی حیرانی
کہ جس کے بعد نہ گھنے کو مل سکے پانی

تباہ ہو کے بھی برباد کن عمل نہ گئے
اگرچہ جل گئی رسّی تمام بل نہ گئے

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کے اسی پہلو سے متاثر ہو کر عبدالرؤف عروج لکھتے ہیں کہ۔

"بیسویں صدی کے اوائل میں لوگوں نے پہلی مرتبہ ادب کے ذریعہ تہذیبی اور سماجی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی محرومیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کا مداوا کرنا چاہا تو اور اصناف کے ساتھ ان کی نگاہ مرثیہ پر بھی گئی۔ ان میں پہلا نام نسیم امروہوی کا لیا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔" (عرفانِ نسیم۔ صـ۲۰۳)

غم انسان کی فطری اور نفسیاتی ضرورت ہے۔ یہ فطرت کے قانون کا تقاضہ ہے نسیم امروہوی نے غم اور مسرّت کی حقیقت کو بڑی گہری نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں کہ۔

گریۂ غم سے ہے یوں فطرتِ انساں شاداب
جس طرح قطرۂ شبنم سے شگفتہ ہو گلاب

دل بہت ہوتا ہے جب دردِ نہاں سے بیتاب
اس کے شعلے پہ تڑپتا ہے عمل کا سیماب

عیش جاگے ہوئے جذبے کو سُلا دیتا ہے
درد سویا ہوا احساس جگا دیتا ہے

اشک اور آہ سے ممکن نہیں دنیا میں مفر
گلشنِ دہر میں روتا ہوا آتا ہے بشر

دستِ دایہ میں نہ روئے کوئی مولود اگر	عیشِ شادی میں کھر بار ہو چشمِ ماد
رونے والوں کو نہیں وجہِ ندامت رونا
نوعِ انساں کے ہے جینے کی علامت رونا

جو یہ کہتے ہیں کہ گریہ ہے شجاعت کے خلاف	ان کا یہ دعوہٰ باطل ہے حقیقت کے خلاف
یہ نہ فطرت کے مخالف ہے نہ عادت کے خلاف	ہاں اگر ہے تو سیہ مستی و غربت کے خلاف
جس میں احساس کی شدت ہو تو ہے وہی
اشک کے دُر جو لٹاتا ہے بہادر ہے وہی

جہاں تک اہلبیتؑ رسولؐ کا سوال ہے نسیم امروہوی نے اپنے مختلف مراثی میں اہل بیتؑ کی مدح جگہ جگہ کی ہے اور چودہ معصومین سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا ذکر آپ کے مراثی میں نہ مل جائے۔ پنجتن کی مدح میں تو آپ کے کئی کئی پورے مل ہی جائیں گے لیکن امام زین العابدینؑ اور امام تقیؑ کے سلسلے میں بھی پورے پورے شاہکار مراثی موجود ہیں۔ ایک پورا مرثیہ قرآن کے موضوع پر بھی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

ع جامعِ آیاتِ قرآں شہادت ہیں حسینؑ

عقل اور عشق، خالص فلسفیانہ موضوعات ہیں لیکن ہمیں ان پر بھی کافی اہم اور جاندار مواد نسیم امروہوی کے ہاں مل جاتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آدمی وہ نہیں دراصل جو ہو آدم زاد	عقل اور عشق ہیں انساں کی اساسی بنیاد
عقل سے پائے بشر معرفتِ حق کی مراد	عشق سے ذوقِ عبادت، خلشِ حقِ عباد
عقل سے فرقِ حقیقی و مجازی سیکھے
عشق سے بندگی و بندہ نوازی سیکھے

عقل کے پاؤں سے طے کرکے دو عالم کے طبق	عشق کے ہاتھ سے تحریر کرے دل کا ورق
عقل کی آنکھ سے کرتا ہو نظارۂ حق	عشق کے کان سے رہ رہ کے سنے حق کا سبق

عقل سے مایک طلب، فرقہ گرے، امرد بنے
عشق کے فیض سے فیاض ہو، ہمدرد بنے

عقل کے نور سے ہر سود و زیاں پر ہو نظر
عشق اس سود و زیاں سے ہو بہت بالاتر
عقل تجدید و تجدد کی بنے راہ گذر
عشق قائم رہے ہر حال میں اک حالت پر
عقل ہو فکر لبر، فکر کی بنیاد ہو عشق
عقل حالات کی پابند ہو آزاد ہو عشق

عقل ادراک ہو احساس کی طغیانی کا
عشق احساس ہو کیفیت روحانی کا
عشق بتلائے خط عقل کی پرکار ہے کون
عقل تجویز کرے عشق کا حقدار ہے کون

ان مصرعوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم امروہوی نہ صرف ایک عظیم فنکار ہیں۔ بلکہ عظیم فلسفی بھی ہیں۔

نسیم امروہوی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جرأت و ہمت اور حوصلہ و عزم کا درس بھی مراثی کے ذریعہ کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ دیتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

دلِ حق بیں سے کیا ہم نے فنا کینوں کو
دی جلا جنگ کی تہذیب کے آئینوں کو
بڑھ گئے رن میں کبھی تان کے جب سینوں کو
رکھ دیا پسلیوں سے توڑ کے سنگینوں کو
کون حالات سے ماضی کے خبردار نہیں
وہ رجل ہم ہیں جو کرّار ہیں، فرّار نہیں

اردو شاعری میں اخلاق کی تعلیم سب سے زیادہ مراثی میں ملتی ہے۔ نسیم امروہوی کے ہاں بھی شرافت و انسانیت، خلوص و محبت اور اخلاق و مروت پر جگہ جگہ زور دیا گیا ہے وہ انسان کو حقوق العباد کی جانب اس طرح متوجہ کرتے ہیں۔

نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ و خمس و جہاد
تمہیں جو رٹ گئے دے کے چند فریضے یاد
غضب کی چاہیے کہ بھولے نبی کا یہ ارشاد
کہ ہے عبادتِ حق، قدر، پہلے حق عباد

ہر ایک طاعت خالق کی بے قضا شگون

یہ فرض، ہو جو قضا پھر ادا ہے نا شگون

دین، ایمان اور اسلام کی تشریح عصرِ حاضر کے بہت سے شعراء نے کی ہے

اسلام کو صحیح شکل میں پیش کرنا وہ بھی شاعری کی زبان میں ایک دشوار کام ہے

نسیم امروہوی کی زبان میں یہ بھی ملاحظہ ہو۔

اسلام یعنی منبرِ توحید کا خطیب — فطرت کا ساز گار ہے یہ عقل کا نقیب

باطل کی ہر حکایتِ ناپاک کا رقیب — نباضِ نفس، روح کے امراض کا طبیب

احساسِ حریت کا انوکھا پیام ہے

جب تو خدا کے غیر کو سجدہ حرام ہے

خداوندِ عالم کے بارے میں حمد کے پیرائے میں نسیم امروہوی اس طرح اسلامی

نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔

تو مجمعِ اضداد ہے اے اول و آخر — بے ہاتھ کے بے پاؤں کے ہر امر پہ قادر

سیکھا نہیں اک حرف ہر اک علم کا ماہر — بے گوش کے سامع تو بغیر آنکھ کے ناظر

بے پردہ ہے موجود حجابوں میں نہاں ہے

یاں بھی ہے وہاں بھی نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

رکھتا ہے نظر آنکھ دکھاتا بھی نہیں ہے — گویا بھی ہے آواز سناتا بھی نہیں ہے

رگ رگ میں سمایا ہے سماتا بھی نہیں ہے — آتا بھی ہے اور ذہن میں آتا بھی نہیں ہے

جتنا ہو جہاں ذوق وہ اتنا ہی قریں ہے

دیکھو تو یہیں ہے جو نہ دیکھو تو نہیں ہے

آخر میں نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری میں چند ایسے نمونے اور ملاحظہ ہوں جو بالکل

اچھوتے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً پانی کے موضوع پر مرثیے میں فرماتے ہیں۔

تمام خلق کا خدمت گذار ہے پانی   رگوں میں خون، بدن میں نکھار ہے پانی
گلوں میں حسن، چمن میں بہار ہے پانی   نموکی بزم میں پروردگار ہے پانی

نگاہِ خلق سے غائب جو ہے فضاؤں میں
امامِ غیب کا بھرتا ہے دم ہواؤں میں

اس پورے مرثیے میں نسیم امروہوی نے سائنسی مشاہدات کو شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

یہ آب و رنگ یہ سب رنگ و بو ہے پانی سے   عروسِ خاک تری آبرو ہے پانی سے
چڑھے جو بامِ فلک پر سحاب ہو جائے   جو کھینچ لیں تو عرق ہو، شراب ہو جائے
چمن میں ہے تو گل، بَن میں ہے تو خارِ بلا   زمین پہ ہے تو دریا، فضا میں ہے تو گھٹا
صدف کے بطن میں موتی، کنارِ جُو ذرا   گلے میں ہے تو حیات، اور گلے گلے تو قضا

نسیم امروہوی کا یہ مرثیہ محاورہ بندی کی بھی بہترین مثال ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کہیں یہ جیسے کہ پیاسوں نے دل میں جب ٹھانی   تو جو بھی آئیں کڑی منزلیں ہوئیں پانی
کبھی ہے حوصلہ و عزم کے معانی میں   کہ جیسے مدِ مقابل ہے کتنے پانی میں
کسی کی آنکھ کا پانی ذرا جو ڈھل جائے   نظامِ عصمت و اخلاق ہی بدل جائے
ارے فرات کے کم ظرف دیدۂ بے پانی   نہ مل سکا علی اصغرؑ کو ڈوب مر پانی

تلاشِ مضامین اور بلندیِ تخیل ملاحظہ ہو۔

نبیؐ کے سر پہ جو رہتا تھا ابر کا سایہ   نظر کو آپ کا سایہ کہاں نظر آیا
نگاہِ خلق میں یہ ابر ہے جو پانی ہے   مری نظر میں نبوت کی یہ نشانی ہے
فضا دکوہ میں حاضر ہے فرش پر موجود   نبیؐ کے ہاتھ دھلانے کو عرش پر موجود

نسیم امروہوی کے ایک مرثیہ کا موضوع چراغ بھی ہے۔ جس کا مطلع ہے
ع   چراغِ خونِ حسینی مدام روشن ہے۔

اس مرثیے میں بھی محاورات کا بہت خوبصورت استعمال ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چھلکے خود انہی کے ہی دل جو چراغ حق سے جلے
یہ پوچھ لو شب ہجرت سے، کس نے ہاتھ ملے
وہ سورما جو شجاعوں کی گود کے تھے پلے
چراغ دیں کو بجھانے چلے، چراغ جلے

علیؑ کا رعب وہ بیٹھا قلوب داغی میں
خودی بھی دے گئے بودے یہاں چلاغی میں
اگر علیؑ کہیں ایسی گھڑی میں ٹل جاتے
سواد کفر میں گھی کے چراغ جل جاتے

پانی اور چراغ کی ہی طرح قلم کے موضوع پر بھی نسیم امروہوی نے پورا مرثیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

پہچانتا ہے قدر جو ارباب فن کی تو
انگلی پکڑ کے چلتا ہے اہل سخن کی تو
کیونکر ملے نہ تجھ کو ریاضت کا اپنی پھل
چلتا ہے راہ علم و حقیقت میں سر کے بل
رفعت یہ ہے کہ عرش علیٰ تک رسائی ہے
حد ہو گئی خدا نے قسم تیری کھائی ہے
جو لکھدے تو اسے حکومت کی شان ہے
تیری رقم خزانۂ شاہی کی جان ہے

اسی طرح آنحضرتؐ سے حضرت خدیجہؑ کا عقد اور حضرت علیؑ سے جناب فاطمہؑ کے عقد کے موضوع پر بھی نسیم امروہوی نے دو مراثی شاعرانہ خوبیوں اور انوکھے انداز میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ۔

عقد اک رشتۂ سر رشتۂ انسانی ہے
عقد، اک عقدۂ سربستۂ روحانی ہے
عقد، حکم نبوی، آیۂ قرآنی ہے
عقد، اک ایسا عقیدہ ہے جو لافانی ہے
عقد، رحمان کی قربت میں بٹھا دیتا ہے
عقد، شیطان کے حملے سے بچا دیتا ہے

قدیم مراثی میں گھوڑے کی تعریف تو جگہ جگہ ملتی ہے لیکن اونٹ کی تعریف نہیں ملتی۔ نسیم امروہوی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے۔ حج آخر کے بعد رسولؐ کا قافلہ اونٹوں پر

اکبر سوار ہے۔ وہ اونٹ کیسے ہیں۔

عیاں ہے شانِ اطاعت گذار اونٹوں کی لئے ہوئے ہیں فرشتے مہار اونٹوں کی
نظر بلند جو ہے خاکسار اونٹوں کی پسندِ حق ہے روش بُردبار اونٹوں کی
بنی ہے راہِ خدا، ان کی راہ کیا کہنا
یہ اونٹ خضرِ بیاباں ہیں واہ کیا کہنا

ناقہؑ رسولؐ کا ذکر بھی ملاحظہ ہو۔

وہ ناقۂ نبوی، سرعتوں میں رشکِ سمند ہر ایک جوڑ میں رف رف کی روح کا پیوند
مثالِ رایتِ دینِ خدا جو سر ہے بلند وہ حُسن ہے کہ خدا کے حبیب کو ہے پسند
جدھر کو پاؤں بڑھایا بہار لے کے چلا
قوی ہے وہ کہ نبوت کا بار لے کے چلا

مرثیے کی روح رثائیت ہے، عصرِ حاضر میں ان سے زیادہ قادر اس حیثیت سے بھی کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ عصرِ حاضر کے نقاد اس سلسلے میں متفق ہیں کہ نسیم امروہوی مصائب نظم کرنے میں سب سے زیادہ ماہر ہیں۔ ان کے مراثی کا یہ حصہ نہایت دردناک اور درد انگیز ہے جسے سن کر بے ساختہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

مندرجہ بالا نمونۂ کلام سے نسیم امروہوی کے شری محاسن، بلندیٔ فن، قادر الکلامی عمیق مطالعہ، وسعتِ نظر، نظریۂ فن اور تازگیٔ فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تنگیٔ صفحات کے سبب تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اردو مرثیے کو بہت کچھ دیا ہے آپ کے مراثی صرف کربلا کی سرحدوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ جناب خدیجہ اور حضرت ابوطالبؑ کے دور سے امام عصر کے دور تک پھیلے ہوئے ہیں، آپ نے اہلبیتؑ کی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو بھی موضوع بنایا ہے جن پر پہلے نہیں لکھا گیا۔ آپ نے مرثیے کو منطقی طرزِ استدلال سے روشناس کرایا ہے۔

آپ نے مراثی کے ذریعے قومی خدمت کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ آپ نے مستقل موضوعات پر مراثی کہنے کی بنیاد ڈالی ہے۔ آپ نے صرف احادیث اور آیاتِ قرآنی کی مدد سے مرثیہ کہنے کی بھی ابتدا کی ہے۔ آپ نے جا بجا قرآن، احادیث اور تفاسیر سے مرثیے میں کام لیا ہے۔ آپ مرثیے میں تمثیلی انداز کے بھی موجد ہیں۔ چاند اور سورج کی زبان سے بھی آپ نے مراثی میں واقعاتِ کربلا نظم کر کے ایک افسانوی کیفیت سے مرثیے کو روشناس کرایا ہے۔ آپ مرثیے میں ترقی پسند تحریک کے اثرات کے بانی ہیں۔ آپ نے عزاداری اور رسومِ عزا پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ آپ مرثیے میں کسی شاعر کی شاعری پر تبصرہ کے بھی موجد ہیں (جیسا کہ آپ نے انیس و دبیر کی صد سالہ یادگار کے موقع پر مراثی کہے)۔ آپ بہت سے موضوعات پر مرثیہ لکھنے کے بانی ہیں۔ علمائے دین کے مرثیے لکھنے کے رجحان کے بھی آپ موجد ہیں۔ اور اس پر مسلسل قائم رہنے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ (مولانا ناصر الملت، مولانا نجم الملت، آقائے محسن الحکیم، علامہ رشید ترابی، مولانا سید الملت آلِ رضا رضا اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے حال میں مرثیے کہہ چکے ہیں)۔ اردو مرثیے کے ذریعے عزم و عمل کا سب سے زیادہ درس آپ نے ہی دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو بے عملی سے نفرت اور جہل سے دشمنی ہے۔ آپ نے صنفِ مرثیہ کو کارآمد ترین بنانے کی کوشش کی ہے اور آپ نے مرثیے کی افادیت اور عظمت میں اضافہ کیا ہے۔

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری پر اب تک سینکڑوں اہلِ قلم اظہارِ خیال فرما چکے ہیں جن میں خاص طور سے قابلِ ذکر حامد حسن قادری۔ پروفیسر ممتاز احمد نقوی۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ پروفیسر وقار عظیم۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ فاضلِ مشرقیات مولانا شبیہ الحسنین۔ پنڈت برج ناتھ شرفا ایڈوکیٹ۔ پروفیسر طاہر نقوی۔ پیر حسام الدین راشدی۔ میجر تصویر حسین نقوی۔ عبدالرؤف عروج۔ قائم علی شاہ سابق [illegible] ۔ ڈاکٹر صفدر حسین۔ ناز اکبر آبادی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری جمیل اعظمی۔ جون ایلیا۔ ڈاکٹر حفیظ۔ سید محمد رضا کاظمی۔ ڈاکٹر [illegible] نقوی۔ ساحر لکھنوی۔ اور ضمیر اختر نقوی وغیرہ وغیرہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نسیم امروہوی جدید مرثیے کے بانی اور بیسویں صدی میں اردو مرثیے کی آبرو کا نام ہے۔ وہ مرثیے کا ایک اسکول ہیں۔

نسیم امروہوی کی تصانیف کی فہرست بھی بہت طویل ہے وہ اب تک تقریباً ستّر کتابیں تصنیف و تالیف کر چکے ہیں جن میں شعری مجموعوں کے علاوہ لغت، درسی کتب۔ اسلامیات اور بچوں کے ادب پر بھی ہیں۔

نسیم امروہوی کے قصائد۔ سلام۔ قطعات، غزل، رباعیات، مثنوی اور نثر نگاری سے متعلق لکھنے کے لئے ایک الگ طویل مضمون کی ضرورت ہے۔

جدید مرثیے کی ابتدا کے سلسلے میں سید شبیہ الحسن [illegible] لکھتے ہیں۔

"اس دور کے مرثیے کے سر خیل نسیم امروہوی، ان کے بعد آلِ رضا، جوش ملیح آباد، نجم آفندی، افسر لکھنوی، جمیل مظہری اور شمیم کرہانی ہیں۔"

(اردو مرثیہ ص ۲۹)

سید سکندر حسین فہیم

فہیم کے والد سید جواد حسین شمیم اور دادا سید حیدر حسین نکہت تھے۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ایسے ماحول کی پرورش نے فہیم کے ادبی شعور کو نکھارا۔

فہیم کی ولادت صاحب "انوارِ رقم" کے بیان کے مطابق تقریباً ۱۳۲۶ھ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ وہ ذی علم، ہوشیار اور تیز طبع الشان تھے۔ مقام گلبرگہ (دکن) میں عرصہ تک مدرس رہے۔ وہاں کے قیام کے دوران علم افلاک پر ایک کتاب تحریر کی۔ امروہہ میں انتقال ہوا۔ تین پسر سید باقر شمیم، سید جواد حسن اور [illegible] عقب میں چھوڑے۔ ورثا نے باوجود تقاضوں کے کلام نہیں دیا۔

دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہرِ مدینہ یاں سے کوئی دو قدم نہیں
پھر کیا کروں کہ پاؤں میں قسمت کے [illegible]

بوذر، بلال، اویس، ابوبکر، بوتراب
کس کا میر نیاز ترے در پہ خم [illegible]

[illegible] حضرت عبد الرزاق فخرؔ [illegible]

ایک غزل کا مطلع ملاحظہ [illegible]

مرا مذاق اڑانا کو [illegible] زندگی

سید صفدر حسین۔ نازؔ اکبرآبادی



نثر نگاری کے

مجسم

تجربہ میں کر تلاش، نہ بیتِ خدا میں ڈھونڈ
عزم و عمل کو ساتھ لے، نقطۂ کربلا میں ڈھونڈ

پانا تو یہ محال ہے کہ عشق بے مثال ہے
پا اُن کا مثل وسعتِ ارض و سما میں ڈھونڈ

گر جبر و شکر کی تجھے دولت کی ہے تلاش
دولت یہ تو حسینؑ کی دولت سرا میں ڈھونڈ

پھیلی ہے آنسوؤں کے چراغوں کی روشنی
آ اپنی شاہراہِ نجات اس ضیا میں ڈھونڈ

یکتا کے سلسلے میں تابش دہلوی لکھتے ہیں کہ۔

"بعض خطوں کی سرزمین میں تہذیبی روایت اس قدر رچ جاتی ہے کہ ان کا ایک ایک ذرہ تہذیب کا خزینہ معلوم ہوتا ہے۔ امروہہ بھی انھی خطوں میں سے ہے۔ یہاں کی خاک سے ایسی ایسی نادرِ روزگار ہستیاں اٹھی ہیں جن کا دوسری جگہ [illegible] نہیں ملتا۔ ہزاروں ادیب اور شاعر اس سرزمین نے پیدا کیے ہیں جن کی خدمات نے ہمارے تہذیبی ورثے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے اور اسے خوب سے قابلِ رشک بنا دیا ہے۔ یکتا صاحب نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی ذہانت و ذکاوت کے جوہر دکھلائے ہیں۔ اور اہلِ ادب سے داد حاصل کی ہے۔ ان کا کلام پسندیدہ ہے اور فن و فکر کے تمام جوہروں سے آراستہ ہے۔ ان کا کلام نہایت دلکش اور پُر تاثیر ہے۔

سید جمیل احمد جمیل

جمیل کا تعلق اولادِ شرف الدین سے ہے۔ اسی لئے انھوں نے اپنا مجموعہ "بزمِ بہور رنگین" اپنے جدِ امجد کے نام ان الفاظ میں منسوب کیا ہے کہ

"حضرت مخدوم شرف الدین شاہ ولایت سہروردی کے نام۔ کہ میرے جسم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کی ہر اک بوند ان کے طفیل شہادت کی رجز خوانی کر رہی ہے۔"

حضرت شرف الدین گلِ نخلِ شرافت

فرزندِ نبی، جانِ علی، برجِ سیادت

جمیل کی ولادت ۱۹۱۳ء میں امروہہ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید عقیل احمد ہے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کی آغازِ جوانی سے شعر کہتے ہیں۔ قومی نظموں کے علاوہ غزلوں کا بھی ایک مجموعہ موجود ہے۔ عرصہ سے کراچی میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ادبی سرمایہ اتنا ہے کہ بقول ابوالخیر کشفی دس پندرہ جلدوں میں شائع ہو سکتا ہے۔

جمیل نے اپنے عقیدے کا اظہار مندرجہ ذیل مصرعوں میں کیا ہے۔

کربلا صبر کو تلوار بنا دیتی ہے ۔ کربلا آج بھی رہ رہ کے صدا دیتی ہے

ظلم کے سلسلے میں پرزاں چڑھو گے کب تک

نورِ اغیار کے فانوس میں ہوگے کب تک

دو بند مصائب کے بھی ملاحظہ ہوں۔

زنجیر آ گئی پہ بیمار خستہ تن ۔ حبل المتیں کی آل ہوئی بستۂ رسن
مقتل سے قید ہو کے چلی شاہ کی بہن ۔ بھائی کی لاش رہ گئی بے گور بے کفن

چادر تھی دھوپ کی جسدِ پائمال پر

روتی تھی بے کسی شہِ بے کس کے حال پر

ہائے وہ شامِ غریباں وہ مصیبت کے اسیر ۔ سر کھلی بلوۂ اشرار میں شہ کی ہمشیر
ظلم سے باز نہ آئے مگر اس پر بھی شریر ۔ ہائے عابدؑ کو پہنائی گئی بھاری زنجیر

اُن کی نصرت کو وہاں کوئی کہاں اٹھتا تھا

جلتے خیموں سے ہر اک سمت دھواں اٹھتا تھا

جمیل نے سلام بھی کافی کہے ہیں۔ ایک سلام ۳۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو بغداد اور کربلا کے درمیان سفر کے دوران کہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسینؑ ابنِ علیؑ عالی مقام اے کربلا والے

درود [illegible] والے، سلام اے کربلا والے

جلے خیمے [illegible] کی ریت پر بکھری ہوئی لاشیں

فلک کو یاد ہے اب تک وہ شام اے کربلا والے

ازل سے آج تک ایسا کوئی منظر نہیں ملتا

لبِ دریا بہتر تشنہ کام اے کربلا والے

اجازت ہو جمیلِ غم زدہ کو عرض کرنے کی
در اقدس پہ حاضر ہے غلام اے کربلا والے

جمیل نے اپنی ایک فارسی رباعی میں اپنا تعارف اور اپنے وطن کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

پرسند "کرا افضل و امجد ہستم — عالی نسب و صاحب [illegible] ہستم
گفتم کہ "ز خاکِ پاک امروہہ ہستم — اما [illegible] کہ من آلِ محمد ہستم

پاکستان کے ممتاز نقاد ابو الخیر کشفی، جمیل کی رثائی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "جمیل نقوی کی یہ رثائی شاعری آنکھ سے ٹپکے ہوئے لہو کا دوسرا نام ہے، یہ ان کا شرف ہے کہ اس لہو کو انھوں نے شاعری کا [illegible] کر دیا ہے۔ جمیل نقوی کے مرثیے، کربلا سے متعلق ان کی نظمیں اور ان کے سلام محض مجلس کو گرمانے اور رلانے کے لئے نہیں کہے گئے، انھوں نے تو اپنے لہو کی داستان رقم کی ہے، اسی لئے کربلا کی روداد لہو رنگ کے پس منظر و پیش منظر خود ان کی ذات ہے۔"

(روداد لہو رنگ صفحہ ۹-۱۰)

مرثیے میں جمیل نقوی، نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ جمیل کی تالیف و تصانیف میں "انتخاب اصغر" "انتخاب میر" "عمر خیام" انگریزی ناول کا ترجمہ، نعتوں کا مجموعہ ذکرِ جمیل، قومی نظموں کا مجموعہ، پرچم کا ہلال جگمگایا، خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

تر... قطعہ گوئی کے بادشاہ ہیں اردو ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ قطعات کہنے کا

لکھتے ہیں کہ ... ہے۔ ۱۳۲۷ھ ... قطعہ کہہ رہے ہیں ایسے اب تقریباً

... بجے دن کے ... لطاف ... نیا اس کا نام سید محمد مہدی ... کہہ چکے ہیں جس کی مثال

۱۳۲۲ھ کو فرزند مذکور کا عقیقہ کیا گیا۔ بتاریخ ۲۵ صفر المظفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹

چہارشنبہ مکتب ہوا۔ بتاریخ ۷ ربیع الاول ۵۳ ... مطابق ۳۰ جون ۱۹۳۴ء بروز شنبہ شادی

ہوئی۔"

رئیس کی پرورش خاندان کے علمی و ادبی ... میں ہوئی۔ اس وقت بھی گھر میں کم از

شاعر موجود تھے یعنی والد، تینوں تائے اور دادا ... ہے اس تربیت نے رئیس کے مجموعہ

و حکمت کے کتنے نکات اور شعر و ادب کے کتنے اسرار و رموز جذب کر دیئے ہوں گے۔ اسی

سے ہی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔

درحقیقت رئیس کا ... جس خانوادے ... کسی سند کا محتاج نہیں بڑے بڑے

سند یافتہ اس در پر زانوئے ادب تہہ کرتے ... ری شاعری میں

پر ... کی گہری نظر ہے۔ رئیس کے چار دختر ...

ہندوستان کے قیام میں ان کے شاگردوں کی ... نام اور ... وغیرہ بھی

کی ادارت کے ذریعے وہ ہندوستان میں ہی ایک ... یہ ... مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا

رئیس نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ... اچھا مطالعہ کیا ہے۔

صحافت سے پورا ... سیاسی کالم لکھے ہیں۔ بلکہ مزاحیہ خاکے بھی،

تو دوسری طرف ... عظمت کا علم لہرایا

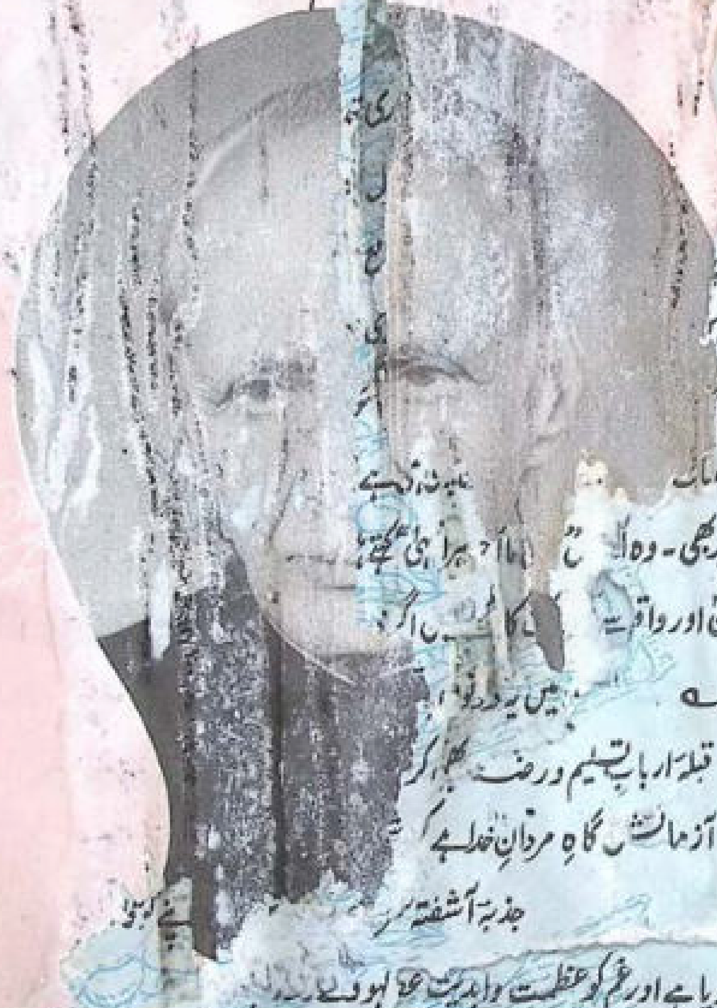
کی صحافت پر ...

پرچم غم لہرایا

رئیس ... الف۔" رئیس ... فلسفہ حیات و کائنات کو مرثیے کا چہرہ اس طرح

... یہ فلسفیانہ موضوع مرثیے کے ساتھ چلتا ہے۔ فلسفہ حیات میں وہ

جلد دوم۔ طنز … مزاح۔ خلا کے "اچھے مرزا" نفسیات پر "نفسیات، جادو، المتفرق"
… جلدیں۔ "عجائبات … ۲ جلدیں" … ۳ جلدیں۔ "…"
"جنات" ۲ جلدیں "تو جاہ …"



لی حرماں … ماہیت شدہ ہے
فلسفے پر بھی۔ وہ … آج … بڑا … بھی کچھ …
حسینؑ اور واقعہ … کا … اگر …
ہیں کہ … میں یہ …

قبلۂ اربابِ تسلیم و رضا … کر
آزمائش گاہِ مردانِ خدا ہے

جذبۂ آشفتہ سر … کو …

دیا ہے اور غم کو عظمت و ابدیت عطا ہو …
غم کو بخشی نئی صورت نئی سیرت … سرفروشی کا سبب …
ڈھال دی درد کے قالب میں … امتحانِ کفر بھی اندازہ …

… تاریخ دائم

جب عیارِ عاشقی پر بے بدل پایا تجھے
عشق نے معیارِ مرگ و زیست ٹھہرایا تجھے

اس کربلائی تخلیق و تعمیر حسین نے کی اس کے لیئے رئیس فرماتے ہیں ۔

انقلابِ فکر کا جو رہ نما ہے وہ حسینؑ — جو شعورِ امر و زِ تسلیم و رضا ہے وہ حسینؑ
جو حدودِ ابتلا سے ماوراء ہے وہ حسینؑ — جو خود اپنی ذات میں اک کربلا ہے وہ حسینؑ

دل کے ہر گوشے میں شمعِ آرزو جلتی رہی
ذہن میں جس کے ہمیشہ کربلا پلتی رہی

کربلا میں امام حسین کی تاریخ ساز قربانی ۱۳ سو سال سے نوعِ انسانی کے کس طرح کام آرہی ہے اور انسان و انسانیت کو کربلا کس طرح محفوظ رکھے ہوئے ہے رئیس کہتے ہیں کہ ۔

بھر گیا جب بھی سرِ باطل میں سودائے فساد — بڑھ گیا جب بھی شقاوت پر کسی کا اعتماد
جب بھی کود جنگ میں کوئی یزید بد نہاد — جب بھی ابھرا ظلم کی تہ سے کوئی ابن زیاد

ظلمتِ تاریخ میں تنہا سفر کرتی رہی
کربلا ہر معرکے میں رہنمائی کرتی رہی

اسی بات کو رئیس ایک دوسرے مرثیے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اندازِ بیان کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ۔

جب بھی دنیا میں ہوئی عہدِ ستم کی تجدید — حق کی تردید کے درپے ہوئے باطل کے مرید
جب بھی شدادِ زمانہ کے ہوئے ظلم شدید — جب بھی نازل ہوا امت پہ مزید ایک یزید

جب بھی انسان نے صداقت کا علم لہرایا
بڑھ کے تاریخ نے یہ پرچمِ غم لہرایا

رئیس کے مرثیے "حسینؑ اور حسینیت" میں فلسفۂ حیات و کائنات کو مرثیے کا چہرہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ مرثیے کے اختتام تک یہ مرکزی موضوع مرثیے کے ساتھ چلتا ہے ۔ فلسفۂ حیات میں وہ

بنیادی چیز غم کو ... تے ہیں اور طرح طرح سے غم کی تشریح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

اے خوشا دل کہ ازل سے ہو جراحت خوردہ — جو شکستہ ہے شکست اک قریۂ دریا بُردہ
اے خوشا دل کہ مسرت سے رہے آزردہ — دلِ افسردہ عجب شے ہے دلِ افسردہ

کیا اس دل کو جو انعام ملا ہے غم ہے
دل سے انساں کی جِلا دل کی جِلا غم ہے

وہ دنیا کے تمام غموں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں یہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں زندۂ جاوید صرف ایک ہی غم ہے ؎

غم بھی دنیا میں بہت سے غمِ جاناں غمِ جاں — کوئی غم دیر تلک نہیں ہے برائے دوراں
غم کے روپ بہت غم جنیں غمِ حیراں — درد سے رنگ کئی درد بشر دردِ جہاں

دردِ دل ایک ہی ہے درد مگر ایک ہی ہے
غم ہزاروں ہیں غمِ جاوید مگر ایک ہی ہے

دنیا کے غموں اور غمِ جاوید میں کیا فرق ہے وہ فرماتے ہیں کہ ؎

غم ہے غمِ کربلا کتنا اثر انداز رہوں ہم — محو ہو جاتا ہے کچھ دن میں ہر اک نقشِ الم
غمِ دوراں کی قسم فطرتِ انساں کی قسم — غمِ جاوید ہے اک زندۂ جاوید کا غم

غم ہے جاوید اسی سے یہ قسم کہتے ہیں
ہائے غم اس کا جسے کشتۂ غم کہتے ہیں

غم اور غمِ جاوید کا فرق بتانے کے بعد رئیس یہ بتاتے ہیں کہ غمِ حسینؑ نے غم کے مفہوم کو ہی بدل دیا ہے اور غم کو عظمت و ابدیت عطا کی ہے ؎

غم کو بخشی نئی صورت نئی سیرت جس نے — کی عطا آنکھ کو اشکوں کی بصیرت جس نے
ڈھال دی درد کے قالب میں مسرت جس نے — عظمتِ غم کو عطا کی ابدیت جس نے

دلِ مُردہ کو دیا حکم بہر طور تڑپ

روحِ انسان کو سکھایا کہ تڑپ اور تڑپ

رئیسؔ نے بتایا کہ حسینؑ کا غم عہد بہ عہد نسلِ انسانی کے کس طرح کام آرہا ہے۔ باطل کو کس طرح شکست دیتا رہا ہے اور تاریخ پر کس طرح اثر انداز ہوا ہے کہتے ہیں کہ ؎

غمِ شبیرؑ نے ہر عہد کو بخشا ہے شعور — جس کے آگے کبھی چلتا نہیں باطل کا غرور

چشمِ بینا سے نہیں ہے یہ حقیقت مستور — محورِ تاریخ کو اس غم کی اشاعت منظور

جب کبھی رنگِ ستم و جور نکھر جاتا ہے

ایسے عالم میں یہ غم اور نکھر جاتا ہے

جب کبھی میدان میں نکلا کوئی فرزندِ نبیؑ — جب کبھی ماحول سے ابھرا کوئی باغی تھاؑ

جب کبھی اک حد سے بڑھی عہدِ ستم کی میعادؑ — جب کبھی حق کوش جوانوں نے کیا عزمِ جہادؑ

جب کبھی انساں نے صداقت کا علم لہرایا

بڑھ کے تاریخ نے یہ پرچمِ غم لہرایا

رئیسؔ کے مراثی میں دراصل یہ بات سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ سیرتِ امام حسینؑ، واقعۂ کربلا و کردارِ شہدائے کربلا بھی نوعِ انسان کے لیے اک مکمل درسِ حیات فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے کرداروں سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہا ہے جس کا اظہار انہوں نے بڑے واضح انداز میں اپنے مراثی میں کیا ہے کہتے ہیں کہ ؎

ہم کو اصغرؑ نے بتایا کہ شہادت کیا ہے — ہم کو اکبرؑ نے سکھایا کہ حمیت کیا ہے

ہم نے قاسمؑ سے لیا درس کہ غیرت کیا ہے — ہم نے عباسؑ سے سیکھا کہ شجاعت کیا ہے

عشق کے درد رسیدوں سے سبق ہم نے لیے

زندہ رہنے کے شہیدوں سے سبق ہم نے لیے

ہم نے فضہؑ سے یہ سیکھا کہ ولا کیا شے ہے — ہم کو بانوؑ نے سکھایا کہ رضا کیا شے ہے

ہم کو زینبؑ نے بتایا کہ وفا کیا شے ہے　　ہم کو عابدؑ نے دکھایا کہ دعا کیا شے ہے

جتنے رستے ہیں اسی منزل مقصد سے ملے

عشق کے درس ہیں عون و محمد سے ملے

۱۹۸۲ء میں رئیس امروہوی ہندوستان تشریف لائے تھے ۲ محرم کو سید شمیم ہادی نقوی نے ایک مجلس کا امروہہ میں اہتمام کیا تھا۔ جس میں انہوں نے اپنا مرثیہ "منزل گہہ تسلیم جاں" پڑھا تھا بعد کو ذاتی ملاقات میں راقم کو بتایا کہ ان کا ایک مرثیہ زیر تصنیف ہے۔ ممکن ہے وہ اب تک مکمل ہو گیا ہو۔

رئیس کی مرثیہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ایک فلسفی کی نگاہ سے معرکۂ کربلا کو دیکھا ہے اور ایک پیغامبر کی زبان سے بیان کرتے ہیں اگر انہوں نے اس جانب مزید توجہ دی تو وہ کام جو شاد عظیم آبادی نے کیا ہے یقیناً وہ کافی آگے بڑھ سکے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ شائی پہلو کو بھی مد نظر رکھیں۔

سید محمد جعفر حیات

حیات کا تعلق حضرت شاہ ولایت شرف الدینؒ کی نسل سے ہے۔ آپ کے وا
کا نام سید محمد احسن تھا۔ بڑے بھائی یوسف امروہوی تھے جن کا پا
انتقال ہوا۔ چھوٹے بھائی نبات امروہوی، امروہہ رہتے ہیں
۱۹۱۴ء میں حیات کی ولادت امروہہ میں ہوئی۔ سید لا
تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد نعیمیہ عربی کالج میرٹھ میں داخل ہوئے۔
بعد امام المدارس اسکول میں کچھ دن ٹیچر رہے۔ اس کے بعد اخبار "سلاک
مدیر ہو گئے۔ کچھ عرصے "اتحاد" کے بھی مدیر رہے۔ ماہنامہ
کے بعد رامپور چلے گئے اور ... حمایت کیا ہے
اس کے بعد ... نذر کیا ہے ... ہم نے جس سے سیکھا کر شجاعت کیا ہے

امروہہ میں انتقال۔ ... رسیدوں سے سبق ہم نے لیے

حیات، امروہوی ... سے سبق ہم نے لیے

ہوتی تو آج غزل ... البا شرہے ... ہم کو بانو نے سکھایا کر رضا کیا شے ہے

ہم کو زیست



...ر شاہنشہِ شہدا

آپ کے وا...

...رتِ امام حسینؑ ... بیدلا...

...راہم کرتا ہے ... داخل ہوئے ...

...ے واضح

...کے بعد اخبار " سلاک...

...م حا اکبر نے سکھایا کہ حمیت کیا ہے

...نے لیا درسِ غیرت کیا ہے — ہم نے عباس سے سیکھا کہ شجاعت کیا ہے

عشق کے دردر سیدوں سے سبق ہم نے لیے

...امر دھری ا... — ...ے شہیدوں سے سبق ہم نے لیے

...سیکھا کہ ولا کیا شے ہے — ہم کو بانو نے سکھایا کہ رضا کیا شے ہے

ہ، سلام۔ نوحے۔ قطعات اور نظمیں وغیرہ۔ سی ہیں۔ ائمہ کی مدح

میں مسدس قلم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو

جو دلِ حق امامِ دوسرا ہے وہ علیؑ
جو ہمیشہ ساتھ یارِ حق کے رہا ہے وہ علیؑ

جو حبیبِ خاص، محبوبِ خدا ہے وہ علیؑ
جس کی چوکھٹ کا حیات ادنیٰ گدا ہے وہ علیؑ

زندگی جس نے عطا دی ملّتِ اسلام پر
اے مسلماں جان دیدے اس علیؑ کے نام پر

مسدس کے علاوہ اسلامی شاعری میں حیات کے یہاں کچھ نئے تجربات بھی
ے ہیں۔ مثلاً انھوں نے "حسینی ہولی" کے عنوان سے نظم کہی ہے۔ جہاں تک مرثیے کا
ہے حیات نے کوئی مکمل مرثیہ تو نہیں کہا البتہ اردو میں ایک مشہور قدیم

جس دم اسیر عترتِ مشکل کشا ہوئی

ت نے سید کاظم حسین سوز خواں اور سید محامد حسین سوز خواں کی
اضافہ کیا ہے چند بند ملاحظہ ہوں

سمجھاتی تھی پھوپی کہ نہ رو میں ترے نثار
اللہ تجھ کو صبر ہوے اے شہ کی یادگار

خاموش ہو رہو

سمجھاتی تھی پھوپی
صورت نظر پڑی

مادر کس طرح سے نجیب شہ کی دل رُبا · منگوا لیا گیا سرِ شاہنشہِ ھُدا
طشت میں باپ کا سر خود بخود اُٹھا · بچی نے پیار سے اُسے گود میں لیا

منھ رکھ کے منھ پہ باپ کے خاموش ہوگئی
آغوش میں قضا کی ہمیشہ کو سو گئی

جناب ... سلام کافی تعداد میں کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مومنو آکر لو بکا ماہِ محرم آگیا
اشک برسانے کے دن، رونے کا موسم آگیا
ہو گئیں بے نور آنکھیں مرگِ اکبرؑ دیکھ کر
لاش بھائی کی اٹھا کر پشت میں خم آگیا
ہیں بہتر داغ اپنے قلبِ مضطر پر مگر
زخمِ دل کے واسطے اشکوں کا مرہم آگیا

ساتھ ہیں قرآں کے حیدرؑ اور نبیؐ حیدرؑ کے ساتھ
معجزہ اک اور ہے اعجازِ پیغمبرؐ کے ساتھ
تفرقہ سمجھا نہ دونوں کے قدم ...
یوں علیؑ ثابت قدم ...

لے چلا ہے ... قدر ... نیزہ پر
اب جوانی چل نہیں ... کے ساتھ

اک تشنہ لب شہید کے ماتم کی رات ہے
یہ ... ماتم کی رات ہے

کھٹکتی ہے بار بار سکینہؑ کی خامشی
ننھا سا دل ہے اور بڑے غم کی رات ہے

باطل سے اختلاف میں خطروں کے باوجود
آوازِ حق پہ وعدۂ محکم کی رات ہے

حیات نے ایک سلام بہت طویل کہا ہے جس میں تقریباً ۳۰ اشعار ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ کرائے چاندنی اٹکھیلیاں اب ماہ و اختر سے
کہ تجھ کو بدر کامل مل گیا تیرے مقدر سے

بیاباں ہو گیا روشن جمالِ روئے اکبرؑ سے
چمک اٹھی زمینِ کربلا حسنِ پیمبرؐ سے

فرشتے لے گئے تسبیح کے دانے بنانے کو
غمِ شبیرؑ میں آنسو جو نکلے دیدۂ تر سے

شہادت چپ کھڑی ہے لو لگائے تیغ و خنجر سے
محبت کربلا آئی کفن باندھے ہوئے سر سے

ہو تی ہے تیرے رونے سے دل ... سے جب کربلا کا ذکر کرتا تھا
فضا برسنے لگتی تھی یوں جیسے ساون کی گھٹا برسے

حیات نے شدید بیماری کے بعد عین عالمِ جوانی میں انتقال کیا۔ اس کے باوجود بے حد شہرت و مقبولیت غم زدہ شاعری اور نظم گوئی میں حاصل کی۔ کاش ان کی عمر نے وفا کی ہوتی۔

رگھبیر سرن دواکر راہی

امروہہ کے غیر مسلم خاندانوں میں ... خاندان بہت باوقار رہے ہیں۔ ان میں
ہی ایک جین خاندان بھی ہے جس سے رگھبیر سرن دواکر راہی کا تعلق ہے۔ راہی کی ولادت
۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو امروہہ میں ہوئی۔ یہیں پرورش اور ہائی اسکول ... تعلیم حاصل کی
پہلے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول امروہہ میں فارسی
کی تعلیم بھی حاصل کی اور جین پاٹھ شالا میں ... تعلیم حاصل کی جس کے ساتھ
سنسکرت بھی پڑھی۔ ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ ... امتحان پاس
میرٹھ کالج میرٹھ سے ۱۹۳۶ء میں بی اے او...
کیں۔ ۱۹۳۶ء سے بیرسٹر کیدارنا... ت نیز ...
۱۹۳۶ء میں آپ کی ... بیرسٹر کے ساتھ
آپ کو صحافت سے دلچسپی ...
ادارت سنبھالی۔ ... ماتم کی رات ہے
اور جو اتما ... عالم کی رات ہے



ـت ... ی

بوتہت تیرے رنڈے دل ... ہے جب

صابر، پد ... یوں جیے

حیات کے رنڈا ہماری ... عیش عا...

بے حد شہرت و مقبولیت ... غم زدہ ... شاعر

کی عمر نے وفا کی ہوتی۔

"نقشِ راہ" منظرِ عام پر آیا۔ اور ایک انتخاب "رنگِ تغزل" بھی شائع ہوا۔ سب سے آخر میں "چراغِ منزل" کے نام سے آپ کا تازہ مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کے علاوہ "سنگ ریزے" اور "سپیدِ گل" کے نام سے بھی اشعار کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ ہندوستان کے مختلف رسائل و اخبارات میں راہی کا کلام شائع ہوا۔

راہی ہندوستان کے مختلف شہروں کے مشاعروں کے علاوہ کراچی کے ہند و پاک مشاعرے میں بھی ہندوستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ مشاعروں کے علاوہ آپ محافل اور مقاصدوں میں بھی اکثر شرکت کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک راہی کی مرثیہ نگاری کا سوال ہے اس کی عمر بھی زیادہ نہیں ہے، انھوں نے گذشتہ سال ہی اس طرف توجہ کی ہے لیکن وہ رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے عقیدت ہمیشہ سے رکھتے ہیں اور واقعۂ کربلا سے بھی بے حد متاثر ہیں اسی وجہ سے ان کی غزلوں تک میں ان موضوعات پر اشعار مل جاتے ہیں۔

راہی نے اپنا پہلا مرثیہ "مقصدِ شہادت" کے عنوان سے کہا ہے۔ جس میں کربلا کے المیہ کی مقصدیت کو واضح کیا ہے۔ امام حسینؑ کی قربانی کے بارے —

آپ کیوں تسلیم کرتے بیعتِ دستِ یزید آپ کی نظروں میں تھا وہ پیرِ باطل کا عنید
گفتگوئے صلح کی پا کر نہ گنجائش مزید ہو گئے با عزم مقصد شہید

آپ نے اسلام کے پرچم کو اونچا کیا
الغرض انسانیت کا بول بالا کر دیا

مسلکِ تسلیم اور حق کی رضا پر آپ نے کر کے کوفے کا سفر وعدہ وفا پر آپ نے
رکھ دیا سوکھا گلا تیغِ جفا پر آپ نے ظلم سے ٹکرا کے ارضِ کربلا پر آپ نے

بظاہر مسلکِ اسلام تابندہ کیا
تم نے ہی میں انسانیت کا نام تابندہ کیا

کربلا کی جنگ، حق و باطل کی جنگ تھی۔ یزید کے پاس بظاہر سب کچھ تھا۔ لیکن پھر ... سے ناکامی ہوئی۔ راہی کہتے ہیں۔

اک طرف تھے ظلم کے تیر اک طرف مظلوم تن
اک طرف پانی پہ قبضہ اک طرف پیاسا دہن
اک طرف عیش و عشرت اک طرف رنج و محن
تھا مقابل لشکر کے ایمان کا جو بانکپن

راہِ عرفاں میں وہی تو بانکپن کام آ گیا
زندۂ جاوید ہو جانے کا پیغام آ گیا

کربلا کے واقعے سے نسلِ انسانی نے کس طرح درس لیا اور آج بھی اس کی کتنی اہمیت ہے۔ راہی بتاتے ہیں کہ۔

آج بھی وہ سرخ ذرے ہیں نشانِ کربلا
آج بھی پیچ بولتے ہیں بے زبانِ کربلا
دے چکے جب سے بہتر امتحانِ کربلا
حق و ایماں آج بھی ہیں ترجمانِ کربلا

آج دنیا کو ضرورت ہے حسینی آن کی
ورنہ ہیں پھر خطرے میں اب زندگی ایمان کی

اور ... آج نگاہی کے لئے
منتخب کرتے ہیں جو رستے تباہی کے لئے
پُرخطر تاریک راہوں اور روآہی کے لئے
آج پھر انسانیت کی خیر خواہی کے لئے

... پیغامِ حق لے کر یہاں آئیں حسینؑ
... دنیا پیغام دے جائیں حسینؑ

راہی کے اس مرثیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں عصرِ حاضر سے بڑی ہم آہنگی ہے ساتھ ہی ساتھ امام حسینؑ سے راہی کی عقیدت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لئے برشا ملا انہوں نے کہا ہے کہ۔

میں کیا کروں کہ عقیدت کے جوش میں راہی
حسین لکھتا ہوں لیکن حسینؑ پڑھ ...

اسی عقیدت نے راہی سے اس حقیقت کو بھی بیان کرایا۔

موقوف کچھ نہیں ہے انیس و دبیر پر
راہی بھی کہہ رہا ہے ترا مرثیہ حسینؑ

ایک قطعہ میں بھی عقیدت ملاحظہ ہو۔

وہ دید کے قابل تھا جس دور کے انساں نے
باطل کے اندھیرے میں تنویر کو دیکھا تھا
اس دور کے لوگوں سے کیوں رشک نہ ہو راہی
جس دور کے لوگوں نے شبیرؑ کو دیکھا تھا

کربلا کے دردناک واقعات سے راہی کا دل کس قدر متاثر ہوا ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل شعر سے کیا جا سکتا ہے۔

اے کاش میں خلافِ حقیقت یہ مان لوں
جو کچھ بھی کربلا میں ہوا واقعہ نہ تھا

ایک سلام کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

سجدے میں سر ہے، سر پہ ہے تیغ جفا حسینؑ
اللہ رے یہ ادائے نمازِ خدا حسینؑ
جو رہبری کریں گے ہمیشہ حیات کی
چھوڑے ہیں تم نے راہ میں وہ نقشِ پا حسینؑ

حقیقت یہ ہے کہ راہی ایک حق پرست انسان ہیں اس لئے صاف الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ۔

میں حق پرست مسلم ہوں اس لئے شبیرؑ!
تمھیں ہی ذبح عظیم [illegible] دیتا ہوں

جو چاہتے ہیں اُجالا کہوں اندھیرے کو
انھیں یہ علم نہیں ہے کہ میں تمھارا ہوں

ایک موقع پر ذرا مضمون کی تلاش اور عزم کی پختگی ملاحظہ ہو۔

تشنہ کامی کا میں یہ مفہوم سمجھا ہوں حسینؑ
جو نہ آئے آپ کی محفل میں تشنہ کام ہے

تم مٹے لیکن تمہیں مٹنے نہ دیں گے ہم حسینؑ
وہ تمہارا کام تھا اور یہ ہمارا کام ہے

کربلا کے موضوع پر راہی کا وہ شعر جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گا مندرجہ ذیل ہے۔

وقارِ خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے، جنگ ہارا ہے

سیّد انعام حسین انعام

آپ کا تعلق نسل سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ہے آپ کے مورث اعلیٰ سید اسداللہ خاں بہادر تھے۔ جو اپنے دور کی ممتاز شخصیت تھے۔ آپ کے والد کا نام سید غلام حسین تھا اور دادا سید موحسن وکیل تھے۔ یہ سب بزرگ علم دوست اور ادب پرور تھے

اسی ماحول میں ۷ مئی ۱۹۱۶ء کو سید انعام حسین انعامؔ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر گورنمنٹ انٹر کالج امروہہ سے میٹرک پاس کیا۔ یہاں کے بعد تعلیم حاصل کرنے مراد آباد پہنچے لیکن والد کی بے وقت موت کے سبب تعلیم مکمل نہ کر سکے اور ملازمت شروع کی۔ امام المدارس ہائی اسکول میں ۱۹۵۰ء تک سائنس ٹیچر رہے ساتھ ہی ساتھ آل احمد گرلز اسکول امروہہ میں مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں ہندی رائج ہونے کے سبب دشواری محسوس کی اور ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے وہاں ٹاؤن پلاننگ کے محکمے میں ملازمت شروع کی اور سینئر سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ۷ مئی ۱۹۷۲ء کو سبکدوش ہوئے۔ آپ کی اولاد میں ایک دختر اور ایک پسر ہیں۔ آپ کے پسر تعلیمی شعبہ سے وابستہ ہیں۔

انعامؔ نے اپنی زندگی کے تقریباً ۳۵ سال امروہہ گزارے اس دور میں ان کی شاعری

جو گو اشکل میں تھی ... اس حیثیت سے وہ بہت مقبول تھے۔ لیکن حیدرآباد سندھ پہنچنے کے بعد پہلی مرتبہ وہ مرثیہ نگاری کی جانب متوجہ ہوئے اور ۱۹۶۵ء میں پہلا مرثیہ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر بھی ہوا۔

انعام نے اب تک مندرجہ ۴ مراثی کہے ہیں جو راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ مطلع ملاحظہ ہو

مومن وہ ہے جو اجرِ رسالت ادا کرے ۔۔۔ ڈرتا ہو کسی سے پہ خوفِ خدا کرے
سب جانتا ہو، کیا نہ کرے اور کیا کرے ۔۔۔ ہو جہل سے گریز، نبیؐ سے وفا کرے
عالم نہ ہو، پہ علم ہے کیا جانتا تو ہو
وہ بابِ شہرِ علم کو پہچانتا تو ہو

اس مرثیے میں ۵۳ بند ہیں۔ اس میں علم کی اہمیت۔ اپنی کم علمی کا اظہار۔ نعتِ رسولؐ۔ مدحِ علیؑ۔ فضائلِ امام حسینؑ و حضرتِ عباسؑ وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ چند بند اس طرح ہیں ؎

کس کی مجال تیرے فضائل کرے بیاں ۔۔۔ نانا ترا حبیبِ خدا مالکِ زماں
بابا علیؑ ہے شیرِ خدا، فاطمہؑ سی ماں ۔۔۔ بھائی حسنؑ کہ خلقِ مجسم نبیؐ کی جاں
زینبؑ سی وہ بہن کہ سراپا بتولؑ کا
بیٹا وہ جس پہ ہوتا تھا دھوکا رسولؐ کا

عباسؑ جس کو شیرِ خدا نے کہا ہے شیر ۔۔۔ جاں باز صف شکن وہ جیالا نڈر دلیر
دشمن کو زیر کرنے میں جس کو لگے نہ دیر ۔۔۔ ایسا زبر کہ لاکھ عدو کر سکیں نہ زیر
مردِ شجاعؑ ہے ابوطالب صفات ہے
بیٹا علیؑ کا فاتحِ نہرِ فرات ہے

تیار ہو کے جعفرِ طیار کی طرح ۔۔۔ نکلے نیام فوج سے تلوار کی طرح
بولے عدو جری ہیں یہ عمار کی طرح ۔۔۔ جم کر لڑیں گے حیدرِ کرار کی طرح

ہاں کیا عجب، چڑھا کے ابھی آستین کو
یہ آسماں جناب الٹ دیں زمین کو

ہاں چوم اے زمیں قدم ابنِ بوتراب
لے چرخِ پیر ان کی سلامی کو جھک شتاب
اے ماہتاب گرد پھر ان کے کہ یہ جناب
ہیں کعبۂ جلالتِ حیدرؑ رہِ فاماب

کیا ذکرِ جاہ صاحبِ صد افتخار ہیں
حیدرؑ مزاج ہیں ابوطالب شعار ہیں

اکبر بھی تھے چچا کی طرح غازیوں میں فرد
حیدرؑ صفت شجاع بہادر دلیر مرد
دیکھے نہ تھے اگرچہ زمانے کے گرم و سرد
لیکن لڑے تو ایسے کہ ہوں ماہر نبرد

ہم صورتِ نبیؐ نے وہ رن میں جدال کی
صورت بگاڑ دی سپہ بدخصال کی

انعام کے دوسرے مرثیہ کا مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

مجھ سا عاصی سرِ منبر یہ جسارت دیکھیں
میری کم علمی کے یا وصف یہ جرأت دیکھیں
دعوۂ زورِ بیاں بھی ہے یہ ہمت دیکھیں
ذکرِ حق وردِ زباں ہے یہ سعادت دیکھیں

یہ حقیقت ہے تعلی نہیں کچھ وہم نہیں
اک سخن ور تو کجا میں تو سخن فہم نہیں

اس مرثیے میں ۴۹ بند ہیں۔ اپنی گناہ گاری کا ذکر۔ اہلِ بیتؑ سے محبت ان کی غلامی پر فخر اور مصائب بیان کیے ہیں دو بند ملاحظہ ہوں ؎

لاکھ بے زر سہی لیکن ہوں ابوذر کا غلام
دربدر ہوں، مگر حسنینؑ کے ہوں گھر کا غلام
حیدری ہوں، بخدا حیدرِؑ صفدر کا غلام
ایک ہاں ایک اکیلا ہوں بہتر کا غلام

اس غلامی کے تصدق سے عطا کر مولا
جرأت مدحتِ اولادِ پیمبرؐ مولا

مہرِ تاباں جو پیمبرؐ ہیں تو مہتاب علیؑ مصطفٰےؐ شمع تو پروانۂ بے تاب علیؑ
علم کا شہر ہیں احمدؐ تو کھلا باب علیؑ وجہِ امکاں محمدؐ ہیں تو اسباب علیؑ
الغرض دونوں یہ اک جان ہیں دو قالب ہیں
کلِ ایمان علیؑ ابن ابی طالب ہیں

میں نے چلا کے کہا عابدِؑ بیمار اٹھو رک نہ جائے کہیں اب وقت کی رفتار اٹھو
ہوش میں آؤ قیامت کے ہیں آثار اٹھو لٹ گئی احمدِ مختار کی سرکار اٹھو
ہاں اٹھو بارِ امامت کو اٹھا لو بیٹا
باپ مارا گیا اب گھر کو سنبھالو بیٹا

انعام کے تیسرے مرثیے کا مطلع ہے ؎

ع یارو کہاں مجالِ سخن اس جناب میں

اس مرثیے میں ۴۲ بند ہیں۔ اس میں مدحِ خاندانِ رسولؐ۔ جناب عونؑ و محمدؑ کی جنگ۔ عباسؑ کی جنگ بیان کی ہے۔ اور حضرت عباسؑ کی شہادت کا ذکر کیا ہے چند بند ملاحظہ

لونڈی ہے در پہ جس کے شجاعت وہ ان کا گھر جس گھر کی ہے کنیز سخاوت وہ ان کا گھر
آئے جہاں قدومِ رسالت وہ ان کا گھر اتری جہاں پہ دہر کی آیت وہ ان کا گھر
جو فاطمہؑ کا گھر وہی ام البنین کا
جو گھر حسینؑ کا تھا وہی اس حزین کا

فرماتے تھے ادھر سے یہ عباسؑ نامدار تم پر فدا تمہاری شجاعت کے میں نثار
بچو دکھاؤ لڑتے ہیں یوں شہ کے دوستدار ہاں دشمنوں پہ ٹوٹ پڑو بڑھ کے ایک بار
سب کو گماں ہو جعفرِ طیار آ گئے
سمجھیں عدو کہ حیدرِ کرار آ گئے

حیراں تھی فوج بچے میں بل کس جری کا ہے

آسماں جری ندا کہ یہ پوتا علیؑ کا ہے

انعام کا چوتھا مرثیہ "قلم" کے نام پر ہے اس میں ۵۰ بند ہیں اور مطلع مندرجہ ذیل ہے ؂

قلم وہ ہے جو خدا کا نام لکھتا ہے — خدا کے بعد محمدؐ کا نام لکھتا ہے
نبیؐ کے ساتھ علیؑ کو امام لکھتا ہے — بغیر فصل کے قائم مقام لکھتا ہے

قلم، کہ حق ہے جسے حق کی ترجمانی کا
جواب ہے وہی، قل کی لن ترانی کا

اس مرثیے میں قلم کی تشریح۔ اہلِ قلم کا ذکر۔ حضرت ابو طالب کی مدح اور شہدائے کربلا کے مصائب بیان کیے ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؂

قلم کے ذکر پہ یاد آگئے انیسؔ و دبیرؔ — کہ جن کے فن سے رسائی ادب ہے باتوقیر
حروف زر سے یہ بابِ سخن پہ ہے تحریر — انیسؔ نیرِ تاباں، دبیرؔ ماہِ منیر

کلام سب کا ہے اچھا کوئی کلام نہیں
جواں کا ہے وہ کسی اور کا مقام نہیں

حضرت ابوطالب کی مدح ملاحظہ ہو ؂

وہ لطف و مہر کہ قدرت بھی مہرباں ہوئی — وفا وہ کی کہ وفا رسمِ خاندان ہوئی
نگاہ وہ جو نبوت کی نگہبان ہوئی — انہیں کی گود میں پیغمبری جواں ہوئی

وہ تربیت کہ نبیؐ اور کوئی امام بنا
جسے نواز دیا قبلۂ انام بنا

شہِ زمن کے مربی ہیں ان کو شاہ کہو — رسولِ حق کے محافظ ہیں حق پناہ کہو
علیؑ کے والدِ ماجد ہیں قبلہ گاہ کہو — ثنا میں پڑھتا ہوں اک بیت واہ واہ کہو

جو ایک پہلو میں اپنے لیے [illegible] نبوت ہیں

تو دوسرے سے سنبھالے ہوئے [illegible] امکاں

ہے جو پیش یہ معیار حق [illegible]

اسی کو حق ہے محمدؐ کی [illegible]

دو بند مصائب کے بھی ملاحظہ ہوں ۔

یہ سن کے ٹھوکریں کھاتے چلے صدا کی طرف [illegible] کہاں بس اب آ گیا [illegible]

بڑھے چلے گئے میدانِ کربلا کی طرف [illegible] امید و بیم کی حالت میں اشقیا کی طرف

صفوں کو چیر کے آئے تو ہائے کیا دیکھا

جوان بیٹے کے سینے میں دم گھٹا دیکھا

کہا کہ جانِ پدر کیا ہوا بتاؤ تو کچھ [illegible] گزرتا ہے بیٹا ہمیں سناؤ تو کچھ

ہے ہاتھ سینے پہ کیوں تیری لب ہلاؤ تو کچھ [illegible] کہاں کا قصد ہے اکبر ٹھہر کے جاؤ تو کچھ

ہوئیں تم تو ہائے یہ کیا ہوا بیٹا

یہ کیسا حال جوانی میں ہو گیا ہوا بیٹا

انعام کے مسدس [illegible] قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہیں ان کی طبیعت میں روانی،

بیان میں سادگی اور زبان میں درد و کرب ہے ۔

ہجری کلام

پوتا عثل کلام

سا پر ...

سید محمود حسن قیصر

ساداتِ امروہہ میں سب سے بڑی اکثریت تو نقوی سادات کی ہے۔ لیکن امروہہ میں نقوی سادات کے علاوہ تقوی۔ عابدی۔ زیدی اور حسنی سادات بھی ہے۔ سید محمود حسن قیصر کا تعلق ساداتِ حسنی سے ہے۔ حسنی سادات میں بھی علم وادب کا کافی چرچا۔ شعرا بھی پیدا ہوئے ہیں۔

قیصر کے والد کا نام سید مقبول حسن قابل تھا۔

اس طرح قیصر کو شاعری ورثہ میں ملی ہے آمادہ کی کہ وفا رسم خاندان ہوئی میں ہوئی۔ شاعری کا آغاز ... مطالب ... انہیں کی گود میں پیغمبری، جواں ہوئی نظمیں بھی کہیں۔

... یت کہ نجی اور کوئی امام بنا

مدرسۂ ناظمیہ ...

... سے نواز دیا قبلۂ انام بنا

مجتہد امروہوی ...

قیصر بھی اس ... ریاں ان کو شاہ ہو ... رسولِ حق کے محافظ ہیں حق پناہ ہو

ماحول نے قبلہ ... مد میں قبلہ گاہ ہو ... ثنا میں پڑھتا ہوں اک بیت واہ واہ ہو

جو ایک پہلو میں اپنے لیے

تو دوسرے سنبھالے ہے



انعام کے متعدد باوقار

بیان میں سادگی اور زبان میں درد و کرب ہے

ہونے کو ہے اب بارشِ الہام سے جل تھل ہے نظم کے جنگل میں رچانا مجھے منگل
آئے ہیں کہ دیکھیں مرے اشجار کے پھل جھیار دبیر و تحقی، منقبل و فردوسی و عبدل

افکار نے گفتگو پہ گھٹا چھائی ہوئی ہے
شعر مری تخئیل سے تقرانی ہوتی ہے

قیصر نے اپنا پہلا مرثیہ اپنے دورِ طالب علمی میں ۱۹۴۱ء میں کہا اور نجم الملت مولانا سید نجم الحسن مجتہد کے چالیسویں کی مجلس میں پڑھا چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہے سکوتِ شام پر چھایا ہوا غم کا اثر لائی ہے شب ماتمی ملبوس میں کیسی خبر
جھلملا اٹھے ہوا کے غم سے تارے چرخ پر قلبِ گیتی پر ہیں کرنیں ماہ کی تیر و تبر
شاعرِ فطرت سمجھ سکتا نہیں کیا بات ہے
چاند ہے نکلا ہوا لیکن اندھیری رات ہے

آہ اے نجم الحسن اے دینِ حق کے تاجدار موتِ جاں فرسا سے تیری زخم دل ہیں اشکبار
پیرہن علمِ حدیث و فقہ کا ہے تار تار شرعِ پیغمبر بنی ہے تیرے غم میں سوگوار
کوکبِ ملت تھا تو مذہب کا ستارا تھا تو
راہِ عرفاں جس سے مل جاتی تھی وہ تارا تھا تو

بجھ گیا وہ ملتِ بیضا کا تنظیمی چراغ چھن گیا صد حیف ہم سے آج تبلیغی دماغ
طالبانِ حق کو جس سے حق کا ملتا تھا سراغ آج ہے رحلت سے اس کی سینۂ ملت پہ داغ
واعظین و ناظمین یادگاریں آپ کی ہیں
اس خزاں خوردہ چمن میں یہ بہاریں آپ کی ہیں

قیصر کے دیگر شاہکار جدید رنگ کے اور تازگیٔ فکر کا مظہر ہیں ان کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

اے وقت جا ہے کہ پھر تازہ انقلاب حالانکہ ہے ذرے ذرے میں آشوب اضطراب
ہے تیز نبض دہر ... ناب برہم ہے جیسے آتش و خاک و ہوا و آب

کرب الم سے زرد ہے چہرہ حیات کا
دھارا ہے نہر نہر کی خونیں فرات کا

لرزہ بپا ہے ساعتِ میدانِ گیر و دار
نکلا ہے کون تیغ بکف بہرِ کارزار
رخت و زرہ خشیتِ رب، تیغ ذوالفقارؑ
عزمِ علیؑ ہے جنبشِ تصدیقِ کردگار

ڈر ہے کہیں لب دبا زمانہ سمٹ نہ جائے
ساتھ آستیں کے تختۂ گیتی الٹ نہ جائے

موجوں سے ذوالفقار کی تھا زلزلہ میں رن
تھا میمنہ، نہ میسرہ لشکر کا تھا نہ زن
تڑپی جو قلب پر تو پھڑکنے لگے بدن
کر کے اشارتی تو بہ کھینچا خطِ گہن
چمکا جو رزم گاہ کو لاشوں سے پاٹ کے
پہنچی فلک پہ عقدۂ ثریا کو کاٹ کے

وہ شب کہ پھیلی ہوئی تھی ضیائے ماہِ منیر
فروغِ نور سے تھا بختِ تیرگی دلگیر
ہر ایک ذرہ تھا صامت، سکوت کی تصویر
فضا سے گرتی تھی چہرِ حسن کے ماہ کی تنویر
محیطِ وقت پہ تجلی تھی ریگزاروں کی
ہجوم نور میں گم تھی ضیا ستاروں کی

جبرئیلؑ نے یہ تری الفت میں جھانی ... بنتِ نبیؐ ... جھمد

احمدؐ نے خود قبا ... اللہ نے رسولؐ کی دعوت میں چھپائی ہے

تجھ ... میں تو خود ... الٰہی ہے

... کی ... سکون ... لائی ہے

(ہفتہ وار "...نجی" لکھنؤ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴ء)

ایک بند جنگ کا بھی ملاحظہ ہو۔

راستہ روکنے جب فوج ستم گار بڑھی
دستِ عباسؑ میں چلنے لگی تلوارِ علیؑ
پہلواں بھاگ گئے تھے پھینک کے سر سے پگڑی
رن پڑا ایسا لب نہر بہی خوں کی ندی
جتنا دریا پہ تھا لشکر وہ سبھی تار چلا
خون میں تیر کے عباسؑ کا رہوار چلا

فاضل ... نے ایک موقع پر امام حسینؑ کی بھی جنگ نظم کی ہے جس میں ذوالفقار کے امامؑ سے مکالمے نظم کئے ہیں۔ مرثیے میں یہ موضوع اچھوتا تو ... البتہ اتنا ضرور ہے کہ بہت کم شعراء نے یہ مکالمے نظم کئے ہیں۔

فاضل کہتے ہیں کہ۔

چلائی ذوالفقار کہ آقا نہ روکیے
بولی پلٹ کے ہاتھ سے مولا نہ روکیے
ان سب کو دم کے دم میں ...
سے

بولے حسینؑ ذو تیغ شرربار صبر ...
اے دینِ مصطفےٰؐ کی مددگار صبر کر
ذوالفقار جواب دیتی ہے کہ۔

... کے ... سلام اور نوحے رسائل میں ... کار ... قومی موضوعات پر طنزیہ نظمیں سے لکھ رہے ہیں۔

... ۱ ... ...

قاسمؑ کی لاش ہو گئی ٹکڑے کیا ہے صبر

یا ہے صبر

حیدرؑ کا گھر لٹے میرے ہوتے ہیں چپ

میں چپ ہو

رو کر یہ ذوالفقار سے شبیرؑ نے کہا — اب دیتے ہیں لعین محمدؐ کا واسطہ

نانا کا نام سنکے مرا ہاتھ رک گیا — الوداع! وعدۂ طفلی کر دیا وفا

بولی یہ رو کے آج سے خود کو چھپاؤں گی

تا حشر اب کسی کو نہ صورت دکھاؤں گی

فاضل روایت پسند شاعر ہیں اس لئے ان کے مراثی بھی اسی رنگ میں ہیں

البتہ انھوں نے اپنے ایک مرثیے میں ایک تجربہ کیا ہے اور وہ یہ کہ ان کا تیسرا مرثیہ

جس کا مطلع ہے۔ مشک لے کر پسرِ حیدرِ کرارؑ چلا۔ اس کی تمام بیتیں ایک

ہی قافیہ اور ردیف کی پابند ہیں۔ راقم کی نظر سے اس سے پہلے صرف ایک مرثیہ اسی

ہے جو مقیم امروہوی کا ہے۔

کے — بھی کافی تعداد میں کہی ہیں — وہ لکھنؤ جیسے ادبی شہر

۱۹۲۷ء کو محلہ — شاعرے یا — میں شرکت نہیں کرتے۔ ان کے مزاج میں

ہی حاصل کی۔ اس کے بعد — کے اصرار پر کسی محفل میں شرکت کر لیتے ہیں۔

شرکت نہیں۔ البتہ کسی زمانے میں جب یونی

تدریس کا سلسلہ جاری ہے — نے اپنی کوٹھی پر ایک نشست کا

رکھتے ہیں۔ آپ کے اب تک — لیا تھا۔ فاضل نے شرکت

کی ایک غزل کا ذکر چھڑ گیا اور کسی شاعر

تعریف کے ساتھ مندرجہ ذیل شعر ریڈی صاحب کو سنایا۔

پڑا مجوزہ [illegible] کا ۔ یہ جھجک کے ساقی نے

سمجھ [illegible] ساغر کہ ہے شراب میں سانپ

سب [illegible] تجھ [illegible] لدوی [illegible] فضل خاموش رہے لوگوں نے [illegible] لیا کہ آخر آپ کل کچھ فرما [illegible] کہا شعر میں نقصیا؟ کمزوری ہے ایسا لگتا ہے سانپ نظر آنے کے بعد ساقی نے بڑے اطمینان سے [illegible] پر ساغر رکھ دیا اور یہ ناممکن ہے۔ لوگوں نے یہ اعتراض تو پسند کیا لیکن ایک صاحب نے فرمایا کہ زمین تو دیکھئے کتنی مشکل ہے، اچھے اچھے غزل نہیں کہہ سکتے۔ یہ سننا تھا کہ فاضل نے کہا کل پوری غزل سن لیجئے گا۔ گورنر صاحب نے اگلے دن کے لئے اپنی کوٹھی پر نشست کا اعلان کیا۔ فاضل ۱۲۔ اشعار کی غزل کہہ کر لے گئے۔ مطلع اور ایک شعر ملاحظہ ہو۔

وہ رُخ پہ زلف ہے پُرخم کہ پیچ و تاب میں سانپ
ہمارے ڈسنے کو پالا ہے یا گلاب میں سانپ،
ذرا سا زُلف و دو تا جام سے کو چھو جو گئی!
تڑپ کے خود گرا ساقی کہا شراب میں سانپ

غزل سن کے سامعین نہ صرف محظوظ ہوئے بلکہ فاضل کی ذہانت کے بھی قائل ہو گئے۔ فاضل کی تین مناجاتیں شائع ہوئی ہیں۔ چند سلام اور نوحے رسائل میں شائع ہوئے ہیں، باقی کلام غیر مطبوعہ ہے۔ آج کل قومی موضوعات پر طنزیہ نظمیں لکھنؤ کے اخبارات کے لئے اجنبی لکھنؤ والا کے قلمی نام سے لکھ رہے ہیں۔

سیّد محمد ریحان ریحان

سید محمد ریحان کا تعلق زیدی سادات امروہہ سے ہے۔ یہ امروہہ کا ایک باعزت خاندان ہے لیکن زیادہ وسیع نہیں ہے۔ سادات کے دیگر خاندانوں کی طرح اس خاندان میں بھی علم و ادب کا ذوق رہا۔ اور [illegible] امروہوی وغیرہ جیسے شعرا پیدا ہوئے۔

ریحان کے والد سید الفقہا مولانا سید ابراہیم صاحب قبلہ تھے، جو منصبیہ عربی کالج میرٹھ کے پرنسپل تھے۔ اس لئے گھر کا ماحول مذہبی اور ادبی تھا۔ اسی علمی ماحول میں ۷ جنوری ۱۹۲۷ء کو محلہ قاضی زادہ امروہہ میں ریحان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد منشی کامل، مولوی، عالم، فاضل وغیرہ کی اسناد حاصل کیں۔

ریحان منصبیہ عربی کالج میرٹھ سے وابستہ ہیں اور ایک طویل عرصے سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ یہی ان کا محبوب مشغلہ بھی ہے۔ عربی و فارسی کی اچھی قابلیت رکھتے ہیں۔ آپ کے اب تک نہ جانے کتنے شاگرد فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ مزاج میں بے حد سادگی ہے جس نے کافی حد تک کلام کو محفوظ رکھنے میں غیر ذمہ دار بھی بنا دیا ہے اور اسی وجہ سے اس کی اشاعت پر بھی کبھی توجہ نہیں کی۔ شہرت و مقبولیت کی کبھی

کلمہ پڑھتی تھی جوانی جس کی ہیئت دیکھ کر
جھومتا تھا مصحفِ ناطق بھی صورت دیکھ کر

اے مہِ غم، اے شہیدِ کربلا کے سوگوار　　لے مظفر کی طرح کاہیدہ و غمگین و زار
بامِ گردوں پر تجھے میں نے جو دیکھا جلوہ بار　　یاد آئی مجھ کو اطفالِ حسینی کی قطار
غنچۂ زخمِ دلِ بیتاب اک دم کھل گیا
کوزۂ دستِ سکینہؑ کی طرح دل ہل گیا

امام حسینؑ کی مدح ملاحظہ ہوں۔

خون جس کا بن گیا بنیادِ دیں وہ ہے حسینؑ
آسماں ہے جس کے مقتل کی زمیں وہ ہے حسینؑ

جس نے ڈالا فوجِ باطل میں خلل وہ ہے حسینؑ
کر گیا جو کفر کے تصور کو شل وہ ہے حسینؑ

تھا حسینؑ ایسے جری ابنِ بہادر کا پسر
جس کا کلمہ پڑھ رہا ہے آج تک خیبر کا در

اے مسلمانوں حسینؑ ایسے جری کا نام ہے
جس سے باقی عظمتِ پیغمبرِ اسلام ہے

امام حسینؑ نے عظیم مقصد کی وضاحت اور ان کے کردار پر یگانہ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں

مائلِ ذوقِ جہانگیری اگر ہوتے حسینؑ　　ہر جگہ پر اپنے ہی مقصد مگر ہوتے حسینؑ
پیاسے اعداء پہ مثلِ ابرِ تر ہوتے حسینؑ　　پھر یہاں ہرگز نہ ترک فوج مر ہوتے حسینؑ

راہ میں بھی حُرؑ کے لشکر کو پلاتے آبِ تیغ
سجدہ کرتا ہر سپاہی دیکھ کر محرابِ تیغ

ریحانؔ کے سلاموں کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اطوارِ مرتضیٰ کو ادا کر سکے تو کر — قاتل سے بھی سلوک عطا کر سکے تو کر
زاہد ہے فرض الفت، زائیدہ حرم — اس کے بغیر حج کو ادا کر سکے تو کر
نیزے پہ پڑھ کے شہ نے بتایا یزید کو — قرآں ہے میرے ساتھ جدا کر سکے تو کر
آئینہ ہے حسینؑ خدا کی کتاب کا — اس آئینے سے دل میں جلا کر سکے تو کر
اصغرؑ نے تیر کھا کے جتایا کہ حرملہ — ہم مسکرا رہے ہیں قضا کر سکے تو کر

بچا دوزخ سے حُرؑ خوش بخت انساں ایسے ہوتے ہیں
ملا رد مالِ زہراؑ پاک دامان ایسے ہوتے ہیں

تبسم مرتے دم اصغرؑ کا یہ اعلان کرتا تھا
کہ خالی ہاتھ ہو کے مردِ میداں ایسے ہوتے ہیں۔

زمانہ پیر کہتا ہے حبیب ابنِ مظاہر کو
میں کہتا ہوں شباب افروز انساں ایسے ہوتے ہیں

شہیدانِ وفا کا خون زمیں پر گر کے یوں چمکا
پکارا دینِ پیغمبرؐ، چراغاں ایسے ہوتے ہیں

سکینہؑ کا یہ جملہ غم بجز زینبؑ کما لوحہ سے تھا
پھوپی اماں میں اب سمجھی کہ زنداں ایسے ہوتے ہیں

سید صادقین احمد صادقین

ایک شاعر کا دل۔ ایک مصوّر کی نظر، ایک مفکّر کا ذہن اور ایک خطّاط کا ہاتھ دیکھ کر قدرت نے نسلِ شاہ ولایت میں جس ذات کو سرزمینِ امروہہ پر ۲۵ جون ۱۹۳۰ء کو اُتارا اسے ہم صادقین کہتے ہیں۔ امروہہ کی تاریخ کا واقعی یہ ایک سعد اور نیک دن تھا۔ درحقیقت آفتاب کی ہزاروں گردشوں کے بعد کسی خطۂ زمین کی قسمت میں ایسا کوئی دن آتا ہے۔ جب ہم صادقین سے ملیں تو چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور بے گناہی کے آثار ملیں گے۔ بولتی ہوئی آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی نظر آئے گی لہجے میں کلیوں جیسی چٹک اور شیر و شکر سے دُھلی ہوئی زبان میں مصری کی ڈلی جیسی مٹھاس محسوس کریں گے اس کا اعتراف وہ خود بھی ایک جگہ کرتے ہیں

؎ منہ میں لیتے مصری کی ڈلی لکھتا ہوں۔

صادقین اب تک وہ سب کچھ حاصل کر چکے ہیں جو اتنی عمر میں شاید کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوا ہوگا۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے میں وہ کبھی بھی تکبّر کے قریب سے نہیں گذرے اور غرور سے بالکل نا آشنا ہیں۔ انسان شہرت کے پیچھے بھاگتا ہے لیکن

صادقین کا دل شہرت سے سیر ہے اور اب وہ ایسی منزل پر ہیں کہ شہرت ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ وہ اب تک پوری دنیا سے اپنے فن کا اعتراف کرا کے ایسا تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ دنیا کے بے شمار ممالک میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے بلائے جا چکے ہیں اور ان کے فن کی نمائش ہو چکی ہے۔ عالمی پریس ان کے فن کو سراہ چکا ہے۔

آج سے ۲۰ سال قبل یعنی جب ان کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی ۱۰ نومبر ۱۹۶۲ء کو وہ پاکستان کا سب سے بڑا انعام "پرائڈ آف پرفارمینس" (PRIDE OF PERFORMANCE) حاصل کر چکے ہیں۔ بقول ایچ۔ اے۔ اینڈ ریوز "صادقین نے جس قدر پاکستان کو متعارف کرایا ہے وہ پاکستانی سفیروں کے بھی بس کی بات نہیں ہے"۔ ۷ نومبر ۱۹۶۳ء کو "لندن ٹائمز" نے لکھا "صادقین کا آرٹ موثر طاقت سے بھرپور ہے"۔ ۸ جولائی ۱۹۶۳ء کو واشنگٹن پوسٹ نے لکھا "آرٹ کی مخصوص علامت کیکٹس کی تخلیق میں صادقین زندگی کی کامرانیوں کی منزل پر نظر آتے ہیں"۔ ۲۵ جولائی ۱۹۶۳ء کو ایسوسیٹیڈ پریس آف امریکہ نے صادقین کے فن کو بہت پُرزور الفاظ میں سراہا۔ اس کے علاوہ فرانسیسی ناقد بارنیٹ کولان۔ برطانوی ناقد ایرک نیوٹن اور امریکن ناقد ٹامس ڈاؤسنگ نے صادقین کے فن کی بے حد تعریف کی ہے۔ امریکہ۔ انگلینڈ۔ آسٹریلیا۔ فرانس۔ رومانیہ۔ سوویت روس۔ عراق۔ ایران۔ سعودی عرب۔ بحرین اور بہت سے دیگر ممالک کی حکومتیں صادقین کو بڑے بڑے اعزازات سے نواز چکی ہیں۔ درحقیقت صادقین کے بارے میں پوری دنیا کے اخبارات۔ رسائل۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اتنا کہا اور لکھا ہے کہ اگر اس کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

صادقین کی زندگی کا سفر کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ سادات امروہہ کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں گذشتہ ایک صدی سے سید سجاد علی۔ سید یاد علی۔ سید داد علی اور سید سبطین احمد کی مصحف نگار انگلیوں میں جو فن کار محفوظ تھا وہ صادقین کی شکل

میں ایک دن نمودار ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں امام المدارس انٹر کالج امروہہ سے (جو اس وقت ہائی اسکول تھا) میٹرک اور ۱۹۴۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۶ء میں ہی امام المدارس امروہہ میں آرٹ ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک ایگریکلچرل کالج لائلپور میں آرٹسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۲ء تک ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۵۴ء سے اب تک ایک فن کار کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں جس میں زیادہ تر خدمات اعزازی طور پر انجام دیں۔

صادقین نے اب تک اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مصوری اور خطاطی کی شکل میں زیادہ ڈھالا ہے۔ لیکن جب یہ تخلیقی کرب زیادہ بڑھ جاتا ہے یا یوں کہئے کہ مصوری و خطاطی سے جب ذہن تھک جاتا ہے تو وہ تھکی ہوئی انگلیاں شعروں کے موتی پرونے لگتی ہیں اور یہ جذبہ تخلیق صادقین کو تیسری شکل دے کر شاعر بنا دیتا ہے اور صادقین کی یہ تینوں صورتیں یعنی بحیثیت مصور، بحیثیت خطاط اور بحیثیت شاعر اہلِ نظر کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ آخر کون سی حیثیت زیادہ تابناک ہے۔ کیونکہ خزانۂ قدرت کے اس انمول ہیرے کے جس رخ پر بھی نظر پڑتی ہے وہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور اس چکا چوند کے عالم میں کوئی بھی اہلِ نظر کسی فیصلے پر آسانی سے نہیں پہنچ پاتا۔ صادقین نے شاعری کی ابتدا میں اپنا تخلص صدقی رکھا اور ابتدائی شاعری میں اسی تخلص کا استعمال کیا جو "جزو بوسیدہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی تصنیفات کی تفصیل اس طرح ہے

رقعات صادقینی (مکتوبات) لاہور

رباعیاتِ صادقین (لاہور)

رباعیات صادقین نقاش کراچی ۱۹۷۰ء

رباعیات صادقین مصور کراچی ۱۹۷۱ء

بیاضِ صادقین کراچی

جزو بوسیدہ لاہور ۱۳۹۹ء

جزو بوسیدہ، نظموں۔ رباعیات، مثنوی اور شخصی مرثیے کا مجموعہ ہے۔ شعر کے موضوع پر کہتے ہیں ؎

خونِ شبیرؑ شربت کا امیں
ذاتِ شبیرؑ پر ہزار درود

ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو ؎

میں عقل کے انکار کو ٹھکراتا ہوں — اور قلب کا اقرار بجا لاتا ہوں
اے ابنِ علیؑ تیری بدولت واللہ — اللہ پہ ایمان لیے آتا ہوں

صادقین کے بارے میں ایک موقع پر خواجہ احمد عباس نے کہا تھا کہ "بظاہر اتنے کمزور انسان کا اتنا مضبوط فن دیکھ کر بے حد تعجب ہوتا ہے"۔

شاعر صادقین۔ مصور اور خطاط صادقین سے عمر میں کم ہے کیوں کہ مصور اور خطاط پہلے ہی جنم لے چکے تھے اس کے باوجود بھی شاعر کا قد چھوٹا نہیں ہے کیوں کہ یہ جس تیزی سے بلندیوں کی جانب بڑھے وہ یقیناً محیر العقول ہے اگست ۱۹۶۹ء سے جنوری ۱۹۷۰ء تک تقریباً ۱۱۱۱ رباعیات کو جنم دیا۔ اور اب تک ۵ ہزار سے بھی زیادہ رباعیاں کہہ چکے ہیں۔ یہ بسیار گوئی اور قلم کی یہ رفتار یقیناً ایسی تھی کہ جس سے ان کے ہاں تکرارِ مضامین پیدا ہو جاتے لیکن صادقین کی رباعیات کے تمام مجموعے دیکھنے کے بعد اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ صادقین کی ہر رباعی فکر و تخیل کے اعتبار سے ہر دوسری رباعی سے مختلف ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اتنے کم وقت میں شاید کسی دوسرے

شاعر نے اتنی رباعیاں نہ کہی ہوں گی جس کی وجہ یہ ہے کہ صادقین شاعر ہی رباعی کے لئے بنے تھے۔ یا قدرت کے ذریعے ہی ان کو یہ فریضہ سونپا گیا تھا۔ وہ رباعی کا مزاج لے کر پیدا ہوتے ہیں اور رباعی ان کے خمیر میں رچی بسی ہوتی ہے وہ خود اپنے ایک مجموعے میں اسی بات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ

"صنفِ رباعی سے اپنی محبت بچپن سے ہے نہ جانے کیوں اس میں ایک خاص حسن وجمال ایک خاص متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے اور پھر یہ کہ اگر یہ لکھی جاتی ہے تو خطاطی کے نقطۂ نظر سے ــــــ"

صادقین کو واقعی رباعی نے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے اور وہ اس کے جال میں پھنسے ہوتے ہیں۔ نکلنا چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے۔ اس بات کا ثبوت ان کا مرثیہ ہے۔ جو اپنی بحر کے اعتبار سے اردو مرثیہ میں ایک نیا تجربہ اور اضافے کی حیثیت رکھتا ہے یہ مرثیہ رباعی کی ہی ایک بحر میں ہے۔ راقم کی نظر سے آج تک اس بحر میں کوئی مرثیہ نہیں گذرا (جب کہ راقم کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً دس ہزار مراثی موجود ہیں)

صادقین کے لئے مرثیہ کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ ان کا تعلق جس سرزمین سے ہے وہ مرثیہ نگاری کے لئے ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے دوسری بات یہ کہ وہ جس خانوادے کے چشم و چراغ ہیں وہاں بھی اسلاف میں علم و ادب کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے ان کے والد ہی سید سبطین احمد سبطین نہ صرف اپنے وقت کے مایۂ ناز مرثیہ خوان تھے بلکہ شاعر بھی اور مرثیہ نگار بھی۔ [illegible] ین کی فکری نہج نہ صرف مرثیہ نگاران امروہہ سے مختلف ہے [illegible] ن ود [illegible] بھی مختلف ہے اور عصرِ حاضر [illegible] مرثیہ نگاروں جوش۔ جمیل۔ نسیم۔ رضا اور نجم سے بھی بہت مختلف ہے وہ تقلید پسند نہیں ہیں۔ اس نقطہ [illegible] سے بھی صادقین کا مرثیہ نہ صرف قابلِ توجہ ہے بلکہ اردو

مرثیے میں ایک فکری موڑ بھی ہے اور صحت مند تجربہ بھی ہے۔ رہا سوال مرثیے کی زبان اور اسلوب کا تو صادقین کی رباعیات کے سہارے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ صادقین کی زبان امروہہ اور دہلی کا مرکب ہے لاہور کی معطر فضاؤں کی بسی ہوتی ہے جس میں جوہی پھولوں کی طرح بھینی بھینی خوشبو ہے لیکن صادقین کے اسلوب میں نہ امروہہ اور دہلی کا امتزاج ہے نہ امروہہ اور لکھنؤ کا اور نہ امروہہ اور لاہور کا وہ اپنے اسلوب کے موجد و خالق خود ہیں۔ ان کا اسلوب فطری ہے اور ان کے جو احساسات ہیں انہیں وہ بے ساختہ۔ برجستہ اور غیر ارادی طور پر اپنی زبان پر لے آتے ہیں کسی بات کو کہنے کے لیے وہ کسی مخصوص انداز اور مخصوص رنگ کے اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنے انداز میں ادا کر دیتے ہیں اور یہی ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے مصور ہونے کے ناطے چوں کہ ان کا مشاہدہ عمیق ہے اس لیے وہ جزئیات اور تہہ در تہہ دیکھ لیتے ہیں اور یہاں ان کا فنِ مصوری ان کی پوری مدد کرتا ہے اور اس طرح خالص اپنے احساسات کو بغیر کسی سے متاثر ہوئے پیش کر دیتے ہیں۔ صادقین اپنی رباعیات کے ایک مجموعے کے دیباچے میں اپنے نظریۂ فن کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ

"فقیر روایت پرست ہونے کے ساتھ ساتھ زمانوں کے بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی انداز کے ساتھ ہی ساتھ ان کے پس منظر میں جمالیاتی اقدار بھی متغیر ہوتی ہیں لہٰذا روایت میں تخلیق و اختراع و ایجاد کا قائل ہے کہ بغیر اس کے روایت جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور روایت میں بغیر تخلیق اختراعات و ایجادات کے مستقبل کی طرف حرکت پیدا نہیں ہوتی۔"

اردو شاعری میں ایک اہم ... وطنیہ پر بھی مشتمل ہے۔ شاعر نے اپنے آبائی وطن اور جائے ولادت سے ... طرح طرح ... اظہارِ عقیدت کیا ہے وطن کی شان میں قصیدہ نگاری کی ہے۔

اس بر کوچک ہیں کچھ شہر تاریخی۔ سیاسی۔ ادبی۔ جغرافیائی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے اپنا یک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ اور حیدر آباد وغیرہ۔ ان شہروں کا ذکر اکثر شعراء نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ اور لکھنؤ سے متعلق تو بیشتر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ امروہہ سے متعلق بھی امروہہ کے شعراء نے کافی نظمیں اور قطعات کہے ہیں۔ مثلاً اختر شاہ خاں اختر۔ افق کاظمی۔ شفیق حسن ایلیا۔ یا عصرِ حاضر میں رئیس امروہوی اور تاباں نقوی کی نظمیں وغیرہ وغیرہ۔

صادق یقین نے امروہہ پر نظم کہنے کے بجائے امروہہ کو اپنے مرثیے کا چہرہ بنایا ہے۔ شاعر ۳۳ سال کے بعد اپنے آبائی وطن کی طرف واپس آتا ہے۔ اس کے دل کی سب سے بڑی تمنا بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مولد کو دیکھ سکے۔ اس کا ذہن ۳۳ سال پہلے کی البم کو پلٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے سیکڑوں تصویریں نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ لیکن وطن پہنچ کر جب وہ حقیقت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو نہ جانے کتنی تصویریں مٹی ہوئی ملتی ہیں۔ کتنی گم ہو چکی ہیں اور کتنی دھندلی دکھائی دیتی ہیں۔

مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ؎

لاریب کہ اللہ تعالےٰ تو نے
بندے کو بڑے عیش سے پالا تو نے
لغزش ہوتی جب بھی تو سنبھالا تو نے
میرا ہر اک ارمان نکالا تو نے

شاعر کے دل کا جب یہ ارمان نکل جاتا ہے تو بارگاہِ خدائے دوجہاں میں اس طرح شکر گزار ہوتا ہے کہ ؎

ہاں شکر خدائے دوجہاں ہے مجھے زیب
اس ذات سے جو ذات ہے قطعاً بے عیب

میرکا مدد ہو جاتی ہے من رب غیب
صدقے میں حسینؑ ابن علیؑ کے لاریب

اور یہ مدد حسینؑ ابن علیؑ کے صدقے میں کس شکل میں ہوئی ہے ؎

یاروں سے ملا دیا ہے مالک تونے
امروہہ دکھا دیا ہے مالک تونے

صادقینؔ سے پہلے مرثیے کا چہرہ لکھنے میں شعرا نے مختلف موضوعات پر توجہ کی ہے لیکن کسی شہر یا بستی کو موضوع نہیں بنایا۔ صادقینؔ نے مرثیے کے چہرے میں مرکزی طور پر یہ بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی ہر چیز تبدیلیٔ زماں ومکاں سے متاثر ہے اور ۳۳ سال کے دوران جب زمانہ بہت تبدیل ہو گیا صادقینؔ کے اپنے شہر کے بھی ذرّے ذرّے میں تغیر و تبدیلی آگئی وقت کے خاموش انقلاب نے در و دیوار کو بدل دیا۔ کوچہ و بازار بدل دیئے۔ زمین و آسمان میں تبدیلی ہو گئی لیکن نواسہ رسولؐ کا غم اور کربلا کے شہیدوں کی یادگار منانے کے کسی بھی انداز میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی یہ غمِ جاوداں اسی طرح برقرار ہے یہ ابدی غم اسی طرح قائم اور جاری ہے اسی بات کو صادقینؔ نے بہت سلیس اور موثر انداز میں کافی تفصیل سے کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہتے ہیں کہ ؎

ہر ساز اور ساماں میں تبدیلی ہے
پالٹ میں اور دالان میں تبدیلی ہے
کب لوگوں کے ایمان میں تبدیلی ہے
مولا کی کہاں شان میں تبدیلی ہے

مولا کی شان میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہونے کا وہ اس طرح ثبوت دیتے ہیں کہ ؎

علموں کے جلوس کا تحمل ہے وہی
مجلس کے خلوص کا تجمل ہے وہی

عزاداری امامِ حسینؑ کی یہی دو شکلیں اور دو طریقے ہوتے ہیں یعنی جلوسِ عزا اور مجلسِ شہدا۔ آگے چل کر وہ جلوس کے جزیات اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

اونٹوں کا وہی نظام اللہ اللہ
آرائش کا احتشام اللہ اللہ
دُلدُل کا وہ احترام اللہ اللہ
مولا پہ وہ پھر سلام اللہ اللہ

ان مصرعوں کی ترتیب بھی وہی ہے جو امروہہ میں جلوسِ عزا کی ہوتی ہے یعنی سب سے آگے اونٹوں کی قطار۔ پھر مختلف تابوتوں اور علی اصغرؑ کے جھولے کی شبیہہ جسے امروہہ کی مخصوص اصطلاح میں آرائش کہتے ہیں اس کے پیچھے امام حسینؑ کے اسپِ وفادار کی یاد میں ایک گھوڑا (دُلدُل) اور سب سے پیچھے عزادارانِ امامِ مظلوم صف بہ صف نوحہ پڑھتے ہوتے اور مولا پر سلام بھیجتے ہوتے۔

یہ سب ذکر کرنے کے بعد شاعر اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ ہر چند وہ ۳۳ سال سے دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں وقت گذار رہا تھا اور وہاں کی شاہ راہوں سے گذرتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی امروہہ کے گلی کوچوں کی یاد سے غافل نہیں تھا ؎

شہ راہوں پہ بے حد ہی تو تڑپاتی تھیں
امروہے کی گلیاں مجھے یاد آتی تھیں

اور جب ان گلیوں کو دیکھ لیتا ہے تو سکڑوں شکر ادا کرتا ہے ؎

صد شکر کہ امروہے کی گلیاں دیکھیں

ان گلیوں کو دیکھنے کے بعد صادقین نے جو کچھ دیکھا اس کا ذکر دل ہلا دینے والا ہے اور اس کیفیت کا صحیح اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی ایسا وقت گذرا ہو۔ پھر دل سا اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اعلیٰ ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے کا رنج و مسرت پڑھنے اور سننے والے پر بھی طاری کر دیتا ہے۔ صرف ایک بیت ہی پورا ایک مرثیہ ہے ؎

جو اپنے تھے، باہر سے وہ گھر بھی دیکھے
کچھ کاخ و قصور کے کھنڈر بھی دیکھے

۳۳ سال کی طویل مدت کے بعد اپنا گھر کوئی دیکھے اور وہ بھی صرف باہر سے تو کیا گذرے یہ صادقین کا دل ہی جانتا ہے۔ اس مجبوری نے صادقین کو کس کرب میں مبتلا کیا ہو گا اس کا اندازہ اس بیت سے کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ صادقین آفاقیت اور بین الاقوامیت کے قائل ہیں کُل کائنات کو اپنا گھر ملنتے ہیں لیکن کچھ فطرت کے بھی تقاضے ہوتے ہیں ؎

البرز نہ الوند کا باشندہ ہوں — دلی نہ سمرقند کا باشندہ ہوں
ہر خطۂ خورسند کا باشندہ ہوں — میں ارضِ خداوند کا باشندہ ہوں

رب کی ہے تو ہر طور ہے دنیا میری
دنیا کا ہوں میں اور ہے دنیا میری

صادقین اپنے آبائی وطن کی عظمت کا اظہار کرنے کے لیے پہلے اپنے مشاہدے اور خود آگہی کا اظہار کرتے ہیں اور جب اپنے آپ کو متعارف کرا دیتے ہیں تب امروہے کی سرزمین سے اپنی عقیدت اور سلوک کا ذکر کرتے ہیں ؎

دیکھا ہوا اپنا ہے ہر ... آب — صحرا کا بگولا اور بحر کا گرداب
سورج کا جلال اور جمالِ مہتاب — ہم جن کو فلک بھی کر رہا ہو آداب

امروہے کی سرزمیں کو کرتے ہیں سلام
جیسے کہ کسی حسیں کو کرتے ہیں سلام

اس کے بعد اس سرزمین کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل بھی پیش کرتے ہیں کیوں کہ یہ اولیائے کرام کا مسکن ہے اور صادقین کی طبیعت قلندرانہ ہے دوسری بات یہ کہ ان اولیائے کرام میں جو سرِ فہرست ہیں وہ صادقین کے مورثِ اعلیٰ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت ہیں جن کی درگاہ پر آج بھی ہر مذہب و ملت کے ماننے والے عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں ؎

یہ شاہِ ولایت کی زمیں ہے اے دوست — دنیا میں جواب اس کا نہیں ہے اے دوست
درگاہ بھی حضرت کی یہیں ہے اے دوست — جس جا ہے وہ آراضی حسیں ہے اے دوست
کیا ہے بتاؤں وہ زمیں کا ٹکڑا
دھرتی پہ ہے فردوسِ بریں کا ٹکڑا

رخسارۂ گیتی پہ ہے سنبل امروہہ — امروہے کے لوگوں کا ہے دل امروہہ
دلّی ہے اگر آب تو گلِ امروہہ — لکھنؤ جو بندی ہے تو تِل امروہہ
امروہہ پہ دو شہرِ دل آرا بخشوں
بس ہو تو سمرقند و بخارا بخشوں

اب ان کو اپنا ماضی اور کم سنی یاد آجاتی ہے جس کو اسی دیارِ خوباں میں گذارا ہے۔ کہتے ہیں کہ ؎

طفلی میں علم بھی میں بناتا تھا یہاں
ٹائٹل کے قلم بھی میں بناتا تھا یہاں

لیکن یہ شوق کیسے پیدا ہوا تھا اور کس طرح ان کو ورثے میں ملا اس کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں ؎

مابعد طبیعات کو لکھنے کا یہ شوق — تو انجیل کا لفظ رات کو لکھنے کا یہ شوق
سچائی کی ہر بات کو لکھنے کا یہ شوق — قرآن کی آیات کو لکھنے کا یہ شوق

اللہ کے اس ولی سے ورثے میں ملا

مجھ کو حضرت علیؑ سے ورثے میں ملا

اس کے بعد وہ مرثیے کے اصل موضوع کی طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں

اور خطاطی کا قلم بنانے کے بعد گریز کرتے ہیں کہ ؎

پھر نامِ ولی ابنِ ولی لکھتا ہوں کاغذ پہ حسین ابنِ علیؑ لکھتا ہوں

یہ نام میں پڑھ پڑھ کے جلی لکھتا ہوں منہ میں لیے مصری کی ڈلی لکھتا ہوں

اس نام کو کب خانۂ یاقوت میں آج

لکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت میں آج

صادقین جو نام لکھتے ہیں اس ذات سے انہیں جو عقیدت ہے اس کا اظہار بھی

اپنے منفرد انداز میں کرتے ہیں ؎

اس نام کو سنتے ہی چمکتے ہیں قلوب

مشرق، مغرب، شمال اور جنوب

یہ نام یہ شخصیت ہے ہم کو محبوب

لکھنے میں بھی پڑھنے میں بھی سننے میں بھی خوب

لیکن یہ نام یونہی نہیں لکھا جاتا ہے بلکہ ؎

پی کر یارو ولا کی مے کے دو جام

بنتی ہے ولی ابنِ ولی کی تصویر

یعنی کہ حسینؑ ابنِ علیؑ کی تصویر

صادقین اپنے اس خطاطی کے عمل کو اپنا نہیں بتاتے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک

طاقت ہے جو ان سے یہ لکھوا رہی ہے ؎

کس کے ہیں یہ سب طور قرینے میں

لکھتا ہے کوئی اور مرے پردے میں

اور اس خطاطی کو وہ اپنے لیئے مولا کا کرم بتاتے ہیں ؎

مولیٰ کا کرم کس پہ ہے مجھ جیسے پر
نازل یہ قلم کس پہ ہے مجھ جیسے پر

تخلیق کی اس منزل سے گذرنے میں ان پر کیا گزری اور ان کو کہاں کہاں سے گذرنا پڑا وہ کہتے ہیں کہ ؎

تخلیق کا کرب خاص سہ کر میں نے
طائع ہو ہو کے اور گہہ کر میں نے

اس کرب کے عالم میں اس قلم سے جوان پر نازل ہوا ہے صادقین جونام لکھتے ہیں آگے چل کر اس کی تشریح بھی کرتے ہیں ؎

کندہ کیا خطاط ازل نے یہ نام ؑ ہاں وقت کے دھارے میں نہیں کوئی کلام
وہ دن ہو کہ ہو رات سحر ہو کہ ہو شام اہل نظر اس نام کو کرتے ہیں سلام

جس وقت محمدؐ نے تھا رکھا یہ نام
جبریل نے آکر تھا بتایا یہ نام
یہ نام حسینؑ بھی وحی ہے گویا
یہ اسم گرامی ہے خدا نے رکھا
الہام کی یوں جان ہے نام نامی
دل والوں کا ایمان ہے نام نامی
دنیا میں ہے زندہ تا قیامت یہ نام
ہے دینِ نبیؐ کی استقامت یہ نام
یہ اس کا ہے حق بات بتائی جس نے
کردار کی معراج ہے پائی جس نے

عالم کے شہیدوں کے ہے سردار کا نام
تاریخ کے سب سے بڑے خودار کا نام

امام حسینؑ نے کربلا پہنچ کر اپنے مقصد کے لیے اپنی اور اپنے تمام ساتھیوں کی قربانیاں پیش کیں۔ حق و صداقت کے اصولوں کو بچانے کے لیے ہر طرح کی اذیت اور تکلیف برداشت کی لیکن اپنے مقصد سے قدم پیچھے نہیں ہٹاتے اور دشمنانِ دینِ خدا سے مخاطب ہو کر کیا کہا اس کو بھی صادقینؔ کے مخصوص انداز میں ملاحظہ کیجیے۔

مولا نے پھر آیات شہادت پڑھ کر
فرمایا رسولؐ ہیں پیارے ہم کو
سچ تو اصول ہیں پیارے ہم کو
بیعت میں شکست ہے شہادت میں ظفر
کافر سے ملے حق کا ولی ناممکن
بیعت اور حسینؑ ابن علیؑ ناممکن

امام حسینؑ نے اصولوں پر کس قدر زور دیا اور ان کے تحفظ کے لیے کیا تیاری کی۔ وہ کہتے ہیں کہ

حملہ وہ اصولوں پہ اگر کر دیں گے
ہم جان کو اور دل کو سپر کر دیں گے

ہے ظلم بھی اور ظلم کی شدت منظور — مقصود تباہی ہے ہلاکت منظور
مطلوب اسیری ہے شہادت منظور — منظور ہے سب پر نہیں بیعت منظور
کافر کا کبھی ساتھ نہیں دے سکتے
کٹوا تیں گے سر ہاتھ نہیں دے سکتے

پورے بند میں جو روانی اور زور ہے وہ اس بحر میں پیدا کرنا صادقینؔ کے فن کا

کمال ہے۔

کارزارِ کربلا میں دو طاقتوں کی جنگ تھی۔ نور کی ظلمت سے۔ حق کی باطل سے۔ انسانیت کی حیوانیت سے۔ صداقت کی جھوٹ سے اور شرافت کی ذلالت سے امام حسینؑ تمام انبیا کی وراثتوں کے نمائندے اور رحانی طاقتوں کے مالک تھے۔ یزید، نمرود ہامان اور فرعون کا نمائندہ اور طاغوتی طاقتوں کا مالک تھا۔ صادقینؔ نے دونوں کرداروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ امام حسینؑ کی زبانی کہتے ہیں ؎

تم لوگ رہِ گناہ چلنے والے　　لے لے کے بہت سپاہ چلنے والے

ہم صبر و رضا کی راہ چلنے والے　　ساتھ اپنے ہیں مہر و ماہ چلنے والے

تم کون ہو فرعون ہو۔ موسیٰ ہم ہیں
تم تحت الثریٰ۔ عرشِ معلےٰ ہم ہیں
اسفل سے کرے دوستی اعلیٰ کیسے
اس ہاتھ پہ رکھ دیں یدِ بیضا کیسے

امام حسین کے بیعت سے انکار میں کس قدر شدت تھی اس کا اندازہ ان مصرعوں سے ہوتا ہے ؎

فاسق کے تو میں ساتھ نہیں ملنے کا
سر کاٹ لو پر ہاتھ نہیں ملنے کا
کچھ بھی کہو ہم سے یہ خرافات نہ ہو
ہر بات ہو، بیعت کی مگر بات نہ ہو

اور اگر حکمرانِ وقت پھر بھی اپنی ضد پر قائم رہے
ہر طرح کی ایذا ہے گوارا ہم کو
بھاتا ہے یہ مقتل کا نظارا ہم کو

کربلا میں کون کس سے بیعت کا طلب گار تھا یہ صادقینؔ کی زبانی سن لیجئے پورا فلسفۂ شہادت سمجھ میں آجائے گا ؎

بو جہل ہے عرفان سے بیعت مانگے
اور کفر ہے ایمان سے بیعت مانگے
گندا ورق قرآن سے بیعت مانگے
شیطان ہے رحمٰن سے بیعت مانگے

تیسرا مصرع کہنے کے لیے واقعی صادقینؔ جیسے ہی ذہن کی ضرورت تھی یہ استعارے اور تمثیلیں اچھوتی اور نادر ہیں۔

شبِ عاشور میں امام حسینؑ کے خیموں اور فوجِ یزید کی نہ جانے کتنے شعرا نے اپنے اپنے انداز میں منظر نگاری کی ہے۔ صادقینؔ نے بھی دونوں تصویریں اپنے انداز میں پیش کی ہیں ؎

مالک کی عبادت کا دلوں میں ہے وفور
اور شوقِ شہادت میں ہر اک ہے مسرور
خیموں میں ہے پھیلا ہوا ایمان کا نور
کرتی ہے جسے سلام برقِ سرِ طور

فوجیں گھنے جنگل میں ہوں جیسے کہ درخت
کرتے ہیں خنجروں پر صیقل بدبخت
فولاد کے خود ہیں تو آہن کے ہیں رخت
... ہے فوج کا پہرا بڑا سخت

... فرات کا بھی ذکر بہت ملتا ہے کیوں کہ دریا پر پہرا لگا کر امام حسین ... بھیوں کا پانی بند کر دیا گیا تھا۔ اس دریا کو جب صادقینؔ

نے اپنی مصورانہ نگاہ سے دیکھا تو کیا نظر آیا ؂

دریا نہ تھا۔ عاشور کی شب کی ہیں بات
چہرے پہ زمیں کے اک آنسو تھا فرات

انسان جب خود غم زدہ ہوتا ہے اس کا اپنا دل غمگین ہوتا ہے تو اسے کائنات کی ہر شے غمگین نظر آتی ہے۔ فطرت بھی افسردہ ہو جاتی ہے ؂

دریا میں پچھاڑیں کھا رہا تھا سیلاب
رہ رہ کے دھاڑیں مارتا تھا سب آب
ہاں ٹوٹ گئے اور پھوٹ کے روتے تھے حباب

دامانِ خلا پہ جو وہ ہر سو تھے نجوم
افلاک کے ٹپکے ہوتے آنسو تھے نجوم
آنسو تھے نجوم اور تھے بادل رومال
اب عالمِ بالا کا کہوں کیا احوال
تھے چرخ چہارم پہ مسیحا بے حال
روتے تھے کہ مشکل میں محمدؐ کا ہے لال

اردو مرثیے میں پانی کا تڑپنا اور حباب کا پھوٹ پھوٹ کے رونا تو شعرا کے لئے ایک روایت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن فرات کو زمین کے چہرے کا آنسو بتانا۔ نجوم کو افلاک کے ٹپکے ہوتے آنسو کہنا اور بادل کو رومال بتانا یقیناً صادقین کا حصہ ہے۔

عاشور کی رات کی اہمیت شاعر کی نظر میں کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ؂

کھل گئے عالم کے طبق آج کی رات
یکجا ہوتے قرآں کے ورق آج کی رات
سمجھا گیا مضمونِ ادق آج کی رات
تھے حفظ شہادت کے سبق آج کی رات

دی عالمِ بالا سے محمدؐ نے ندا

راتوں میں عظیم ہے تو ہے آج کی رات

عاشور کی شب ہے تری معراج کی رات

آہستہ آہستہ یہاں سے صادقین عصرِ عاشور کے وقت تک پہنچتے ہیں یہاں تک کہ شہادت کی منزل آجاتی ہے ؎

جب شمرِ کریہہ نے چلایا خنجر

مولیٰ کی زباں پر تھا سبحان ربّی

یل ابھی اتک کٹ گئے نشانِ ربّی

مرثیہ کا بنیادی مقصد رثائیت ہے۔ صادقین انیس کے اس اصول سے واقف ہیں

ع مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے۔

اس لیئے وہ بھی اس کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں اور کئی بندوں میں ان کے مرثیہ میں شدت سے رثائیت پائی جاتی ہے حالاں کہ اس میں بھی انہوں نے اپنے تخئیل کی پرواز کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ اس وادی میں زیادہ اڑان کی گنجائش نہیں ہے۔ تاریخ کی سرحدوں سے قدم باہر نکالنے میں پیر جل جاتے ہیں ان کی زبانی دنیا پر حسینؑ کی شہادت کے اثرات ملاحظہ ہوں ؎

اس وقت عراق و عرب و شام ہلے   کسریٰ کے محل کے بھی در و بام ہلے

یونان میں یونان کے اصنام ہلے   اور مصر میں تھے مصر کے اہرام ہلے

تھی سدِ سکندری بھی لرزاں اس دم

دیوار بھی چین کی تھی گریاں اس دم

دنیا کے اہم ترین ممالک کا ذکر کر کے صادقین نے یہ کہنا چاہا ہے کہ پوری دنیا

حسینؑ کی شہادت سے متاثر ہوئی اور رثائی ادب میں اس انداز میں یہ بات ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کے نتائج کا ذکر بھی مختلف شعرا کے ہاں ملتا ہے لیکن صادقین نے شہادت کا نتیجہ حسینؑ کے حق میں جس مثبت انداز میں اور یزید کے لیے جس منفی انداز میں پیش کیا ہے وہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں کہ ؎

وہ خون تھا روشنائی، تختی مقتل　　مقتل کی وہ گرم ریت کیا تھی، بھوبل
اس پر وہ رواں ہوا بناتا ہوا بل　　خطاطِ ازل کا ہاتھ بالکل اجل

بنتا تھا تو بن جاتا تھا ایمان کا لفظ
انسان کا عرفان کا قرآن کا لفظ

آسیب کے ہاتھ میں بلا تھا خنجر　　جب گردنِ پاک پر چلا تھا خنجر
تو خون کی حدت سے جلا تھا خنجر　　جب خون جلا تھا تو گلا تھا خنجر

احوالِ شدید میں ہوا تھا تبدیل
اور مرگِ یزید میں ہوا تھا تبدیل

کربلا میں حسینؑ کی قربانی صرف گذرے ہوتے کل کے لئے نہیں تھی بلکہ آج کے لئے بھی اور آنے والے کل کے لیے بھی ہے۔ یہ قربانی بنی نوع انسان کی ہر ہر دور میں رہ نمائی کرتی ہے انسان کو ایک نیا عزم اور حوصلہ دیتی ہے جرأت و ہمت عطا کرتی ہے اور جذبہ حق و صداقت پیدا کرتی ہے اسی لیئے کربلا ایک علامت بن گئی اور کربلا سے آنے والی آواز پر صادقین آج بھی دنیا کو متوجہ کر رہے ہیں ؎

اک غیب سے آواز چلی آتی ہے
یہ ہے ولی ابن ولی کی آواز
یعنی کہ حسینؑ ابن علیؑ کی آواز

رخ سے پردے اٹھا رہی ہے لوگو

تم کو سب کچھ سنا رہی ہے لوگو

تاریخ [illegible] لوگو

ہر دور میں [illegible] رہی ہے لوگو

صادقین کا مقصد یہ ہے کہ کربلا کو صرف ایک تاریخ کا واقعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس سے فائدہ بھی اٹھایا جائے۔ یہ مرثیہ ۸۲ بندوں پر مشتمل ہے جس میں چہرہ۔ گریز۔ مدح۔ خطبہ۔ رجز۔ تلوار اور گھوڑے کی مختصر تعریف۔ شہادت اور بین سب کچھ موجود ہے اور اس میں فلسفہ شہادت کی کافی تشریح کی گئی ہے۔ صادقین کا یہ پہلا مرثیہ ہے اس سے پہلے انہوں نے صرف ایک شخصی مرثیہ اپنے ایک عزیز یزدانی مرحوم کی موت پر کہا تھا۔ لیکن ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ مستقبل میں اور بھی مرثیے کہیں گے۔ ان کی یہ کوشش یقیناً اردو مرثیے کی نئی زندگی کے لیئے ایک نیک فال کی حیثیت رکھتی ہے۔

صادقین کے اس مرثیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خوشہ چینی تو درکنار انہوں نے سب کچھ خود پیدا کیا ہے ان کا اپنا نقطہ نظر ہے۔ اپنا انداز بیان ہے انہوں نے اپنا چراغ کسی چراغ سے جلانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی بصیرت اور ان کا مشاہدہ ہی ان کا رہنما ہے وہ واقعی ذکاوت کے مقلد اور وجدان کے شاگرد ہیں اور ان کے مرثیے کا کینوس بھی وسیع ہے۔

مرثیے نے اردو ادب کو جو وسعت۔ تنوع اور وقار بخشا ہے اگر صادقین جیسے ہاتھوں میں رہا [illegible] رہے گا۔

جالب حسین جالب

جالب کا تعلق امروہہ کے زیری خاندان سے ہے۔ اس خاندان میں اکثر صاحبانِ علم ہوئے ہیں۔ جالب کے والد مولوی ثاقب حسین ثاقب ریٹائرڈ لکچرار اردو و فارسی امام المدارس انٹر کالج امروہہ) نہ صرف ایک مولوی اور عالمِ دین ہیں۔ بلکہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی ہیں۔ جالب کی پیدائش جنوری ۱۹۳۶ء میں امروہہ میں ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں امام المدارس انٹر کالج امروہہ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ایف اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ آگے جاری نہ رہ سکا۔ ایف۔ اے کے بعد کاروبار میں دلچسپی کے سبب تجارت شروع کی جو آج تک امروہہ میں جاری ہے۔

جالب کی ولادت چونکہ ایک ادبی گھرانے میں ہوئی تھی اس لئے کم عمری ہی سے شاعری کی جانب متوجہ ہوئے اور اپنے والد سے شاعری ورثہ میں حاصل کی۔ امروہہ میں منقبتی محفلیں اُس دور میں کافی گرم تھیں جالب نے بھی ابتدا سے ہی اُن میں شرکت شروع کر دی۔ جونؔ ایلیا اس وقت ہندوستان سے پاکستان نہیں گئے تھے امروہہ میں ہی بیٹھے بیٹھے ایک بڑے خطّے کے نوجوان شعراء کی رہبری



نورِ حسینؑ، نورِ رسالت مآب تھا

جا آب کا ایا۔ مرثیہ حضرت حُرؑ کے حال میں ہے جس میں نفسیاتی کشمکش کا

بڑا اچھا اظہار کیا ہے ایک بند ملاحظہ ہو۔

دل میں آتے رہے حُرؑ کے یہی رہ رہ کے خیال
پسرِ مصحفِ ناطق کو دیا میں نے ملال
مجرم ایسا ہوں کہ جس کی نہیں دنیا میں مثال
دیکھیے کیا مری تقصیر کا اب ہوگا مآل
بے خطا دلبرِ زہرہؑ کو ستایا میں نے
لا کے سید کو بیابان میں پھنسایا میں نے

ایک جگہ جنابِ زینبؑ کے بین ملاحظہ ہوں۔

اماں میں رو رہی ہوں برادر کے واسطے
لیلیٰ تڑپتی ہے علی اکبرؑ کے واسطے
دکھیا رباب روتی ہے اصغرؑ کے واسطے
برپا ہے حشر ثانیٔ حیدرؑ کے واسطے
ڈھارس تھی دل کو جس سے وہ جرار مر گیا
اماں مری سکینہ کا غمخوار مر گیا

سید علی رضا۔ رضا

رضا امروہہ کی نقوی سادات کے چشم و چراغ ہیں۔ اُن کی ولادت ۱۲ر جون ۱۹۳۹ء کو امروہہ میں ہوئی۔ اور یہیں پر میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ رضا کے تائے انوار احمد زخمی شاعر تھے اس لئے بچپن سے ان کا کلام پڑھتے تھے اسی ماحول نے شاعری کی جانب متوجہ کیا ۱۱۔سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں جون ایلیا سے مشورۂ سخن کیا اور ان کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد شمیم کرہانی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۶۳ء سے محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف سے وابستہ ہیں۔ سب سے پہلا شعر مندرجہ ذیل ہے۔

قصۂ غم سُنا رہا ہوں میں
اور خود مسکرا رہا ہوں میں

رضا اپنی شاعری اور مرثیہ خوانی و مرثیہ نگاری سے متعلق راقم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں سیدھا سادہ غزل گو ہوں۔ غزل گو ہونے کے ساتھ منقبت سلام، قصائد، نوحے اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ جہاں تک مرثیے کا تعلق ہے مرثیے سے ہم سب کا ایک جذباتی رشتہ ہے۔ کئی پشت سے میرا خاندان مرثیہ خوانی کر رہا ہے۔ میں

بیان میں عمیق مطالعے۔ گہرے مشاہدے اور قدرتِ بیان کا اچھا ثبوت دیا ہے۔ کاش کہ وہ آئندہ بھی مرثیہ نگاری کے لئے وقت نکال سکیں۔

یوں تو رضا کا کلام ہندوستان کے مقبول رسائل میں ایک طویل عرصے سے شائع ہو رہا ہے۔ ملک کے مختلف مقامات کے مشاعروں میں بھی وہ امروہہ کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن اُن کے چار شعری قابلِ قدر مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ "پربت کے پاسبان"۔ "ایمان و ایقان"۔ "رنگ و روشنی" اور "رقص نوا" ادبی حلقوں نے رضا کے ان شعری مجموعوں کو کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ تازہ مجموعہ "رقص نوا" کا اجرا۔ صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ جی کو بھی پر ان کے دستِ مبارک سے ہوا ہے۔

رضا کی شاعری پر جوش ملیح آبادی۔ اندر کمار گجرال۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شمیم کرہانی۔ خواجہ عبدالباقی۔ ڈاکٹر کبیر کوثر۔ ڈاکٹر ضیا ... درخشاں اور ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی وغیرہ اپنی اچھی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔

رضا بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل گوئی ان کی محبوب صنف ہے وہ اس کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے قومی نظمیں وطنی نظمیں۔ روحانی نظمیں۔ قصائد۔ نعتیں۔ منقبتیں۔ سلام۔ نوحے۔ قطعات رباعیات وغیرہ سب کچھ کہا ہے اور وہ اس میں بھی کامیاب ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مے نئی، احساس نیا، میکش نئے، ساغر نیا
دل نیا، جذبہ نیا، موسم نیا، منظر نیا
شب نئی، ہجرت نئی، اج [illegible] بستر نیا
کس قدر آرام سے سویا ہے پیغمبر نیا

رُخ وہی، لہجے وہی، مقصد وہی، حرمت وہی
کچھ نیا ہو یا نہ ہو دلدار ہیں سب در نیا

جذبۂ شوقِ شہادت کوئی بستر مانگے
اور حیدرؑ کی جوانی کوئی خیبر مانگے

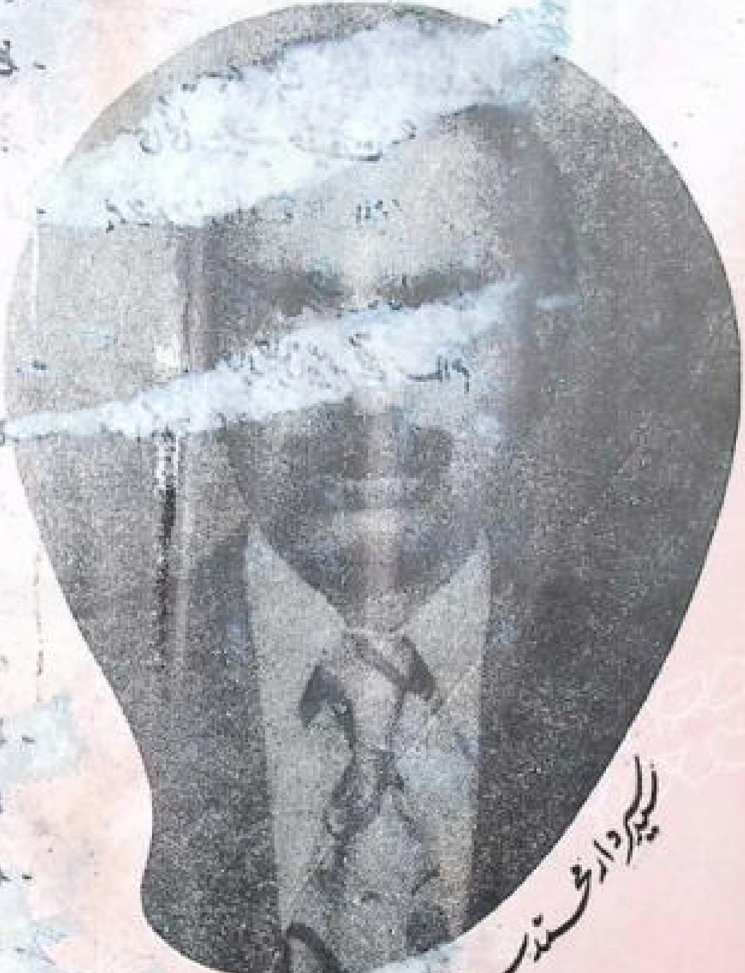
ہر اہلِ محبت کو لئے دل ایمان سے محبت ہوتی ہے
ایمان مکمل کرنے کو حیدرؑ کی ضرورت ہوتی ہے

تجسس اہلِ دانش کا تعقل کی فضا تک ہے
مگر میرے جنوں کا سلسلہ تو کربلا تک ہے
مکاں سے لامکاں تک ہے زمیں سے ماورا تک ہے
یہ کس نے کہہ دیا آوازِ اکبرؑ نینوا تک ہے
وہی ارضِ بلا حقانیت کا قبلۂ عالم
جو کل تک خاک تھی لیکن وہ اب خاکِ شفا تک ہے

کربلا ایثار و قربانی کے چہرے کا سکوں
کربلا نورِ شہادت کا نیا پیغام ہے

رضا نے حال ہی میں ایک اور شعر کہا ہے جس کا مطلع ہے

؎ برپا ہوئے ہیں زمانے میں انقلاب



پیرزادہ محمد سردار

ہے انھوں

کے ہی مطابق اپنے

جسے ڈاکٹر ہاو ... کے زیرِ اہتمام ہونے والے رضویہ سوسائٹی کے کتابچے میں پیش

... تقریباً ۲۰ مراثی کہہ چکے ہیں۔

چند مطلعے مندرجہ ذیل ہیں۔

نظمِ دعا، نظامِ عبادت ہے زندگی

لولاک کہا ...

ع۔ بخش ... حر مجھے

ع۔ ... الف ... کا شعور

ع۔ یارب شعورِ عشق کو حسنِ قبول ...

ع۔ قرآں، ...

۔ ... جس کے نبی محمدؐ ہیں

ع۔ دوشِ فلک پہ پرچمِ اوجِ بشر کھلا

ع۔ مشکِ دعلم کا ذکر وفا کی نماز ہے

ع۔ غمِ حسینؑ عبادت بھی ہے، ثقافت بھی

۔ اے شیخ فکر زینتِ بزمِ سخن ہو آج

۔ عقلِ مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے

ع۔ قرآں کے رمز صحبتِ داور سے پوچھئے

۔ لولاک کس کی منقبتِ بے مثال ...

... ہوا

علوم دینی ... ہوا

۔ بحیثیت نائب مدرس ... سے ...

... شعبہ اردو کے صدر براہ کی، طبیعت بھلے ... ہم کی نظر سے گذرے ہیں

ستودا ... مسلم کہہ لے ... احادیث، تاریخ اسلام

سائنس۔ فلسفہ۔ منطق اور مراثی پر اچھی نگاہ ہے۔ انھوں نے قدیم مراثی کا مطالعہ کیا ہے، جدید ذہن سے کر پیدا ہوئے ہیں، دن بدن ہونے والی [illegible] سے واقف ہیں، ان کے عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے کے اثرات ان کے مراثی پر بھی ہیں۔ قبل رسولؐ عرب کس معاشرے سے گذر رہا تھا اس کا ذکر وہ ایک جگہ اس طرح کرتے ہیں۔

قبل نبیؐ حیات کی وہ ظلمت سیاہ — [illegible] کی ظلمتوں میں بھٹکتی ہوئی نگاہ
منزل سے راستوں کا تعلق نہ رسم و راہ — [illegible] زشب کا زوال کہ اللہ کی پناہ

آتی تھی صبح فتنۂ تازہ [illegible] ہوئے
جاتی تھی شام دن کا جنازہ لئے ہوئے

عرب کے اس ماحول میں رسولؐ تشریف لائے اور رسولؐ کی آمد کے بعد کس طرح پورے معاشرے میں انقلاب آگیا۔ سردار کہتے ہیں کہ

حد سے فزوں جو ظلمتِ نفسِ بشر ہوئی — پہلوئے آمنہ سے سحر جلوہ گر ہوئی
اب جس کی کوئی شام نہیں وہ سحر ہوئی — خوش کیوں نہ ہوں خلیلؑ دعا بار ور ہوئی

اُبھرا جو آفتاب اندھیرے ہوا ہوئے
ابلیس سے خود [illegible] کے پجاری خفا ہوئے

بدلا مزاجِ زیست، بدلنے لگی فضا — روشن ہوئے چراغ اندھیروں کا دم گھٹا
باغِ عمل میں چلنے لگی عدل کی ہوا — [illegible] کی سمت راہ نے عزمِ سفر کیا

کانٹے ہٹائے راہ کو ہموار کر دیا
فتنوں کی آگ کو بجھا [illegible] گلزار کر دیا

سردار کے مراثی کا کینوس کافی وسیع ہے انھوں [illegible]
کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش [illegible] کے ہی مطابق اپنے مراثی [illegible]
کی [illegible]

ہے۔ خطبہ جناب [illegible] کے ذکر کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

بڑھ [illegible] تو فرعون کو یوں للکارا ؎ توڑ کر رکھ دیا پندارِ تکبر سارا

چشمِ تاریخ نے دیکھا یہ عجب نظارا ؎ ظلم کی [illegible] پکار اٹھی کہ ظالم ہارا

اب جو قرآن کے آئینے میں صورت دیکھی

ظلم نے اپنے لئے دائمی ذلت دیکھی

سردار کے مراثی میں سراپا۔ رجز اور جنگ بھی ملتی ہے۔ جناب قاسمؑ کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ۔

تیرہ برس کا ہے پسر مجتبیٰؑ ابھی ؎ تھا دعوتِ عشیرہ میں حیدرؑ کا سن یہی

اس کمسنی میں عزم وہی، حوصلہ وہی ؎ جاتے ہیں یوں جہاد کو جس طرح سے علیؑ

خیبر میں جس طرح شہِ خیبر شکن بڑھے

یوں بڑھ رہے ہیں جیسے جمل میں حسنؑ بڑھے

حیدرؑ کی طرح فوج پہ ڈالی جو اک نگاہ ؎ افواجِ روم و شام کی حالت ہوئی تباہ

تھی بند فوجِ ظلم پہ اب زندگی کی راہ ؎ کہتے تھے جبرئیلؑ، علیؑ دوست واہ واہ

بالکل علیؑ کی طرح جو اندازِ جنگ ہے

قاسمؑ کے روپ میں یہ علیؑ کی امنگ ہے

سردار نقوی کے ہاں بیان میں استدلال بھی ہے انھوں نے اُن تمام مواقع پر جہاں دلیل اور ثبوت کی ضرورت ہوئی ہے اپنے ہر دعوے کے ساتھ دلیل بھی پیش کی [illegible] ہے۔

بحیثیت نائب مدرس ابوطالبؑ کے ذکر میں کہتے ہیں کہ

تھی شعبۂ اردو کے سربراہ کی، طبیعت بہلے ؎ خلق، پھر عقل ہے کیوں یارِ جہالت پہلے

سو داسکے [illegible] ہوں [illegible] مسلم کہہ لے ؎ نعت تو لاؤ کوئی [illegible] سے پہلے

جس کی تقدیر میں غلبہ ہے وہی غالب ہے ... ہم مراثی کا

موجدِ نعت بہر حال ابوطالبؑ ہے

حقیقت یہ ہے کہ سردار نقوی نے اپنے مراثی میں تمام موضوعات کو ... کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مختلف اجزاء کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ اور عصرِ حاضر کے بہت سے مرثیہ نگاروں کی طرح رثائیت سے ان کے یہاں فرار نہیں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

وہ کربلا کی شام، وہ جلتے ہوئے خیام — جلتے ہوئے خیام وہ طفلانِ تشنہ کام

طفلانِ تشنہ کام پہ وہ ظلمِ فوجِ شام — وہ ظلمِ فوجِ شام، وہ مظلومیِ امام

مادر اسیر ہو گئی بیٹے کے سامنے

چادر چھنی پھپھی کی بھتیجے کے سامنے

سردار نقوی نے ریڈیو وغیرہ کے لئے کافی تقاریر، علمی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر بھی لکھی ہیں۔

... کینوس کافی وسیع ہے۔ انھوں ...

... حقیقت کی کوشش ... کے ہی مطابق اپنے مراثی ...

... ہ ...

ہے خطہ جناب

ڑ

سید محمد سیادت فہمی

مولانا سید محمد سیادت فہمی کا تعلق امروہہ کے ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں کئی نسلوں سے علم و ادب اور امامت نماز ورثے میں چلی آرہی ہے۔ اس خاندان میں گذشتہ تین نسلوں سے شاعری کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ مولوی سید اولاد حسن تسکیم کے پوتے اور مولوی سید محمد عبادت کلیم کے فرزند ہیں اور پشتوں سے جو نماز کی امامت کا سلسلہ خاندان میں ہے۔ وہ ذمہ داری بھی آپ کے سپرد ہے۔

فہمی کی ولادت ۶ر نومبر ۱۹۲۳ء کو امروہہ میں ہوئی۔ دار العلوم سید المدارس امروہہ سے کامل (فارسی) اور فاضل ادب الہ آباد بورڈ کے امتحانات پاس کئے اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ والد ماجد کی تربیت اور گھر کے ماحول نے علوم دینی سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۲ء سے امام المدارس انٹر کالج امروہہ بحیثیت نائب مدرس ملازمت کا آغاز کیا۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۶۳ء سے ہندو ڈگری کالج امروہہ تک شعبۂ اردو کے سربراہ کی ... طبیعت ... ۱۹۴۳ء میں ہی میرد ... سو د اسکے ... ہے ... لوں ... اور مسلم ہا کہہ لے ... نعت قولا و کرکی ... کہیں نہیں ملتا)۔

ے اردو کلام کو مرتب کرکے اُردو دنیا کو علی نقطۂ نظر سے متعارف کرایا ا ء کے بعد اُن پر ایک تحقیقی مقالہ بعنوان "علی نظریات اور شاعری" لکھ کر روہیلکھنڈ یونیورسٹی پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔

فہمی کی شاعری کا آغاز ۱۰-۱۲ سال کی عمر سے ہوا۔ ابتدا میں جوگن ا مشورۂ سخن کرتے رہے اس ۱۰ از ماجد مولانا سید محمد عبادت کلیم کے شاگرد ہوئے۔ فہمی کے ابتدائی دور کی منقبت کے چند

کیا اثر تذکرۂ عابدِ بیمار میں ہے
جوششِ طوفانِ الم دیدۂ خونبار میں ہے

کر لیا ایک زمانے کو مسخر جس نے
ایسا نغمہ تری زنجیر کی جھنکار میں ہے

کیوں نہ ہو آپ کا ممنون جہانِ کردار
روحِ سردارِ رسلؐ آپکے کردار میں ہے

(دیارِ مسیحا ص۹۔ مرتبہ عنبر احمد وہوی)

فہمی یوں تو شاعری کی مروجہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن آپ کی شاعری کا زیادہ تر موضوع اسلامیات رہا ہے۔ مسدس جس کی عہدِ حاضر میں ایک بار پھر مقبولیت بڑھ گئی ہے اس سے بھی فہمی کو لگاؤ ہے۔ فہمی نے اب تک صرف ایک ہی مرثیہ کہا ہے جس میں تقریباً ۵۰ بند ہیں۔ امید ہے کہ اُن کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔ مرثیے کا مطلع ملاحظہ ہو۔

دراصل مطلعِ انوارِ آگہی ہیں حسینؑ
خدا بشر کو ملے جس سے وہ خودی ہیں حسینؑ

جو رشکِ نوعِ بشر ہو وہ آدمی ہیں حسینؑ
نہیں ہے موت جسے ایسی زندگی ہیں حسینؑ

حسینؑ آئے زمانے میں حق نما بن کر
شعور وفکر و تعقل کی انتہا بن کر

آگے چل کر فہمی

حسینؑ ہی نے ضیا ...



مولوی سید محمد سیادت فہمی

بحیثیت نائب صدر

تل شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض ۔ ب

سودا کے ہمعصر علی نقطہ امروہوی (جن کا دیو

دونوں پہ کیا آپ کی الفت نے اثر ایک — بستی میں ہوں [illegible] نما ایک

جو مظہرِ وحدت ہیں بہر حال ہیں واحد — ظاہر میں تو جو دو ہیں حقیقہ [illegible]

واحد ہے یونہی نورِ علیؑ، نورِ پیمبرؐ — دو آنکھیں ہیں جس طرح مگر نور نظر [illegible]

غیرِ خدا کا ہو جو خوف دل سے لئے نکال — نعرۂ حیدری لگا دُ، آئی بلا کو ٹال

جاہ و جلالِ احمدی، حسن و جمالِ حیدری — عظمتِ کردگار ایک، مظہرِ بے مثال دو

جس کی ہے ذات بیمثال بعدِ رسولِ ذوالجلال — اس کی کوئی مثال لادُ، اس کی کوئی مثال دو

(پندرہ روزہ "حسینی آواز" دہلی ۔ ۲۵ جولائی و ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

فہمی کے سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

امتحانِ عشق میں ایسا بھی وقت آیا کہ جب — کربلا میں اک مدلل شبیہ پہ آئی کہ بس

باپ کی آغوش میں تیرِ ستم کھانے کے بعد — اصغرِ بے شیر کو ایسی ہنسی آئی کہ بس

حسینؑ ابنِ علیؑ وہ شہیدِ اعظم ہے — کہ جس نے موت کو بخشا ہے زندگی کا مزاج

گلے پہ تیر لیا مسکرا کے جاں دے دی — بدل دیا علی اصغرؑ نے تشنگی کا مزاج

شاعری کے علاوہ فہمی مذہبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی اکثر لکھتے ہیں جو ہندوستان کے مختلف رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ فہمی کی آل انڈیا ریڈیو اردو سروس سے بھی ادبی موضوعات پر تقاریر نشر ہوتی رہتی ہیں۔

فہمی کی ذات سے نہ صرف امیدیں وابستہ ہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ اپنی مذہبی، علمی اور ادبی خدمات کے ذریعہ اپنے خاندان کی عظیم روایات کو ہمیشہ برقرار رکھیں گے۔

سیّد شمیم حیدر شمیم

شمیم کا تعلق سید شرف الدین شاہ ولایت قدس سرہٗ کی نسل سے ہے ان کے بزرگوں میں کئی نسل پہلے، کئی شعراء گذرے ہیں۔ شمیم کے ذریعے خاندان کی ادبی روایات کی تجدید تقریباً ایک صدی بعد ہوئی ہے۔

شمیم کے والد کا نام سید علی حسن تھا۔ سید علی حسن کے گھر ۱۴ مئی ۱۹۲۱ء کو وہ فرزند پیدا ہوا جس نے اس گھر میں ادب کی بجھی ہوئی شمع کو دوبارہ روشن کیا۔ البتہ شمیم کے بزرگوں میں نانا سید خلیق حسن فہیم اس وقت موجود تھے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی اس کے بعد رامپور کے قیام کے دوران بی اے کی سند حاصل کی۔ ابتدائی عمر سے کھیل کود کا بھی شوق تھا اور اسی شوق نے کھیلوں کی سرکاری تربیت گاہ تک پہنچا دیا اور وہاں سند حاصل کی۔ اس کے بعد این۔ ڈی ایس۔ آئی کی حیثیت سے رامپور اور غازی آباد وغیرہ کی درسگاہوں میں تقرر رہا۔

آج کل ہاپوڑ میں تقرر ہے۔ شمیم کے استاد مولانا سید محمد عبادت کلیم اور ضیا رامپوری ہیں۔

شمیم کی شاعری کی ابتدا دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ اسی سال امروہہ سے سید شرافت حسین رضوی ایم ایل اے کے الیکشن میں کامیاب ہوئے تھے ان [illegible] کے دوران شمیم نے الیکشن

گھر میں ان لوگوں کے یہ کہہ کے کنیز ...

اس کنیزی ہی میں جیسے کی تمیز آتی ہے ...

درس ملتا ہے کنیزی میں بھی آزادی کا

اب تو پہچانیے رتبہ مری شہزادی کا

خود کو میں جملۂ ارباب حرم رکھا ہے

ایسے ماحول میں فضہ نے قدم رکھا ہے

ماجرا کیا ہے، ذرا جانئو یہ قصہ کیا ہے

سورۂ دہر بتائے گا کہ فضہ کیا ہے

گھر میں حسینؑ کے تو جو باندی کی طرح

آج ہے دامنِ قرآں میں وہ چاند کی طرح

شمیم نے اس مرثیے میں کردار نگاری پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

ایک جگہ کہتے ہیں کہ۔

اپنی آنکھوں سے محمدؐ کا گھرانہ دیکھا ہیبتِ حیدرِ یداللہ کا چھانا دیکھا

باقر و عابد و سبطین کا آنا دیکھا تو نے تو پانچ اماموں کا زمانہ دیکھا

پنجۂ صبر سے ہر ظلم کو موڑا تو نے

انقلاب آئے مگر ساتھ نہ چھوڑا تو نے

شمیم نے ایک موقع پر جناب فضہ کی زندگی کا وہ اہم واقعہ جو واقعۂ کربلا کے بعد پیش آیا بیان کیا ہے۔

جذبۂ قوم پرستی میں تھے سرشار بہت ایک ادنیٰ سے اشارے کے طلبگار

سر پہ موجود تھے کھینچے ہوئے تلوار بہت تھے دربار میں فضہ کے طرفدار بہت

کھلبلی پڑ گئی ایوانِ یزیدی لرزا

... انسا پلۂ میزانِ یزیدی لرزا

... کے حالات اور کردار بیان کرنے کے بعد شمیم مرثیے کو مصائب کی

... سوز دیے ہیں۔

... پہ محمدؐ کا نواسہ نہ رہا ‎ ‎ خنجرِ ظلم چلا حق کا شناسا نہ رہا

... زا لاتھا جو گھر پیمبر کو ... نہ رہا ‎ ‎ حوضِ کوثر پہ گیا ہائے وہ پیاسا نہ رہا

خیمہ ... حرمِ پاک میں لشکر آیا

نوکِ ... نیزہ پہ سرِ سبطِ پیمبر آیا

شمیم کی تصانیف میں "انتساب قطعہ" اور "انیس سو بیاسی" منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ایک مشترکہ مجموعہ "رثائی جزء ا" بھی شائع ہوا ہے جس میں راج ساما رامپوری، ہلال رضوی، تصور حسین زیدی، طاہر رامپوری اور شمیم امروہوی کا کلام ہے۔ شمیم اور راقم الحروف نے ایک بین الاقوامی محرم نمبر بھی ترتیب دیا ہے۔

شمیم کی شاعری پر اب تک متعدد اہلِ قلم اظہارِ خیال کر چکے ہیں جن میں رئیس امروہوی، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، مولانا ظفر الحسن، ڈاکٹر بدر الحسن، خواجہ حسن ثانی نظامی، تاباں نقوی اور تقی الحسن قابلِ ذکر ہیں۔

اک شمع کی لگی سرِ محشر بجھائے گا
جلتے ہیں جو علیؑ سے یہ ان کو جلائے گا

مدح اور مصائب کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

جو ذات [illegible] کا [illegible] ہے وہ حسینؑ — جو زندگی کے درد کا درماں ہے وہ حسینؑ
[illegible] جو دینِ کبریا کا نگہباں ہے وہ حسینؑ

نسیم حیدر نسیم

[illegible] ہے
[illegible] بہت مادرِ حسینؑ
[illegible] دخترِ حسینؑ

لاشہ اٹھا کے لے گئے [illegible] — پہنچا دیا جوان کو لے آئے شیرخوار
پانی طلب کیا [illegible] — [illegible] نے علی بھی دیکھ کے بچے کا حالِ زار
اک [illegible] نے [illegible]
[illegible] ننھے مجاہد [illegible] سے

خمار کے اس مرثیے میں ۹۲ بند ہیں۔ آخر میں کئی شہداء کی شہادت نظم کی ہے۔

خمار کے دوسرے مرثیے [کا م]طلع ہے۔

یارب مجھے بھی حکمت و دانائی ہو عطا — میرے بھی ذہن و فکر کو گہرائی ہو عطا
لفظوں کو حسن، حسن کو [illegible] — گونجے صدا وہ قوتِ گویائی ہو عطا
حمد و ثنا [illegible] تو جہاں جھومنے لگے
گردوں بھی جھک کے میرے قدم چومنے لگے

خمار کے تیسرے مرثیے کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

ثنا لکھوں کیا خالقِ اکبر کے اوصاف بھلا لکھوں

تاریک نگاہی ہے کہ ساری دنیا لکھوں او جھل بھی عیاں بھی ہو لکھوں بھی تو کیا لکھوں

ادراک کی منزل سے آگے ہے مکاں اس کا

ہر شے سے وہ بالاتر، ہر شے میں نشاں اس کا

... "۱۰۰" اس کا عنوان ہے

ان کا چوتھا ... اہم ہے۔ یہ مرثیہ بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

خمارؔ کے غزلوں کے مجموعے پر ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ڈاکٹر ... فرخی۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین۔ شاعر لکھنوی۔ شبنم رومانی۔ رئیس امروہوی۔ سحر انصاری۔ ... دہلوی۔ احمد ہمدانی اور محترمہ نسیم ملک وغیرہ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ... خمار سے توقعات ہیں بشرطیکہ وہ دلچسپی قائم رکھیں۔

سید قسیم حیدر قسیم

قسیم کا تعلق امروہہ کے اس خانوادے سے ہے کہ وہ بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ۔ ؎ پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

وہ نسیم امروہوی جیسے مرثیہ نگار کے نورِ نظر ہیں، بر جیس امروہوی کے چشم و چراغ ہیں، شمیم امروہوی کے گلشنِ سخن کے پھول ہیں، اور ریحانا امروہوی سے انھیں ورثے میں علم و ادب، شعر و سخن اور مرثیہ نگاری بالا ترتیب ملی ہے۔ اتنی عظیم وراثتوں کا وارث ہونا کچھ کم قابلِ فخر نہیں ہے۔

قسیم کی ولادت ۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خیر پور (سندھ) میں والد کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ناز ہائی اسکول خیر پور سے ۱۹۶۱ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۶۵ء میں کراچی پولی ٹیکنک سے انجینئرنگ کا ڈپلومہ حاصل کیا ۱۹۶۶ء سے کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں ملازم ہو گیا۔

نسیم امروہوی کی آغوشِ تربیت کا اثر تھا کہ ۱۹۶۳ء میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ خون جو بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا اس نے مداحِ اہلِ بیت اور مرثیہ نگار

راہ پر لگا دیا۔ ماحول تھا ہی سازگار، اب بھلا کس بات کی کمی تھی کہ قسیم مرثیہ نہ کہتے۔ ان کا مرثیہ نگار نہ ہونا یقیناً تعجب خیز ہوتا۔ خاندانی مراثی کے علاوہ میر انیس، تعشق اور مرزا اوج کے مرثیے بھی تحت اللفظ پڑھے۔ ۱۹۷۴ء میں قسیم نے پہلا مرثیہ کہا اس کے بعد سے اب تک مندرجہ ذیل چار مراثی کہہ چکے ہیں۔

ع۔ عزت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی

"منشور زندگی" بند ۶۸۔ ۱۹۷۴ء

ع۔ یارب مجھے شمیم کے فن سے نواز دے

"اتحادِ ملت" بند ۷۲۔ ۱۹۷۶ء

ع۔ حریت شان و شکوہ رُخِ زیبائے عمل

"منشورِ حریت" بند ۴۲۔ ۱۹۷۶ء

ع۔ فرغِ علم با تدبیر اسلامی سیاست ہے۔

"اسلامی سیاست" بند ۷۸۔ ۱۹۷۷ء

مندرجہ بالا مراثی میں سے قسیم کے دو مراثی شائع بھی ہو چکے ہیں۔ "منشورِ حریت" سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

حریت، شان و شکوہ رُخِ زیبائے عمل　　حریت، دلکشی حسنِ سراپائے عمل
حریت، جس پہ عمل کر کے بقا پائے عمل　　حریت، جس سے ہے تکمیلِ تمنائے عمل
لبِ تاریخ پہ ہمنیٰ ہوں گفتار یہ ہے
امن کا درس جو دیتی ہے وہ تلوار یہ ہے

مرثیہ "اسلامی سیاست" کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو۔

علومِ حق میں پنہاں اصل مفہوم سیاست ہے　　حدیث و وحی و قرآں، اصل مفہوم سیاست ہے
یقین و دین و ایماں، اصل مفہوم سیاست ہے　　علی کا درسِ عرفاں اصل مفہوم سیاست ہے

سیاست داں حق وہ ہے جو شب کاٹے عبادت میں

جو سوئے بھی تو بستر پر نبیؐ کے ذوقِ نصرت میں

تسنیم کا سب سے پہلا مرثیہ "منشورِ زندگی" ہے جس میں زندگی کی مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے

عزت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی
کوشش، جہاد، عزم، شجاعت ہے زندگی

شفقت، خلوص، حلم، اطاعت ہے زندگی
اخلاق، انکساری، عبادت ہے زندگی

جس زندگی میں [illegible] خدائے کریم ہے

وہ زندگی جہاں میں سب سے عظیم ہے

تسنیم کے مرثیہ میں ان کا سماجی اور سیاسی شعور کہیں کہیں اُبھرتا نظر آتا ہے وہ اپنے عصر سے آگاہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ

ظلمت میں ہے گھرا ہوا انسان اک طرف
آپس میں پنجہ کش ہیں مسلمان اک طرف

رکھا ہوا ہے طاق پہ قرآن اک طرف
بکتا ہے کھوٹے داموں پہ ایمان اک طرف

ملت میں یہ عجیب سیاست کا دور ہے

بوجہل بھی کہے [illegible] امانت کا دور ہے

تسنیم اپنے دور کے حالات کا [illegible] لینے کے بعد یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان خیوں کا علاج صرف اسوۂ حسینی اختیار کرنے سے [illegible] ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ

کیا مرتبہ ہے تو نے جو پایا ہے اے حسینؑ
[illegible] کے دینِ رب کو بچایا ہے اے حسینؑ

طرزِ جہادِ صدق سکھایا ہے اے حسینؑ
یوں حق کو روشناس کرایا ہے اے حسینؑ

باطل کی پھر نمود بشکلِ جدید ہے

پھر اے حسینؑ تیری ضرورت شدید ہے

تسنیم کے مرثیہ "اتحادِ ملت" کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

یارب مجھے شمیم کے فن سے نواز دے
فخرِ نسیم ہو سکوں وہ امتیاز دے

فکرِ رسا کو راہِ طویل و دراز دے
زورِ بیاں میں سوز تو دل میں گداز دے

یعنی خلوصِ قلب [illegible] وہ دعا کر دوں
خود آگہی سے خدمتِ [illegible] خدا کروں

قسیم نے اپنے اس مرثیے میں اپنے فن [illegible] عروج کی دعا مانگنے کے بعد اتحادِ ملت کو موضوع بنایا ہے۔ اتحاد کی اہمیت پر یوں زور دیتے ہیں:

ہر دور میں ضرورتِ انساں ہے اتحاد
بستی [illegible] میں بستیاں وہ گلستاں ہے اتحاد

تنظیمِ کار کا سر و ساماں ہے اتحاد
شیرازہ بندِ زلفِ پریشاں ہے اتحاد

جب دل نہ متحد ہوں تعاون نہ ہو سکے
دنیا میں کاروبار [illegible] نہ ہو سکے

عصرِ حاضر کی چند تصاویر بھی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

عادل پہ کیوں ہنسے نہ [illegible] عالم کی زندگی
[illegible] باطلوں سے جو عالم کی زندگی

دل میں ہے اور زباں [illegible] بالوں پہ اور ہے
[illegible] بھی سیاستِ دنیا کا دور ہے

[illegible] کوئی تحصیلِ فساد کو
[illegible] ہے صدا اتحاد کو

قسیم کی مرثیہ نگاری پر علامہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] موسوی، ڈاکٹر [illegible] ابراہیم جلیس اور ہلال نقوی [illegible] خیالات کر چکے ہیں۔ ابراہیم [illegible] لکھتے ہیں کہ

"مرثیہ کے پرانے روایتی [illegible] میں دورِ حاضر کی عوامی زندگی اور نئے انسان کے مسخر کائنات اور [illegible] گیر رجحانات [illegible] شاعر قسیم [illegible] ہی کمندِ مرثیہ یوں پھینکی کہ اب مرثیہ پر بھی شاعری کی جدید ترین [illegible] کی طرح باوجود اپنی قدامت کے سارے جہاں تاب [illegible] اردو شاعری [illegible] خوش گذشتہ [illegible] کا ہوتا ہے۔"

(اتحادِ ملت، صد ۳۲)

"حدیثِ غم" نظارہ بکڈپو (لکھنؤ) [illegible]

"تحریکِ نینوا" بک کارنر دانش [illegible] آباد

"حسینؑ اور زندگی" انجمن جاں نثارانِ [illegible] (امروہہ)

"مرثیۂ عظیم" دانیال اکیڈمی کراچی (پاکستان)

اس کے علاوہ قمر علی [illegible] [illegible] مرثیۂ غم اور [illegible] [illegible] ہیں

اور شمیم امروہوی کے ساتھ "بین الاقوامی [illegible]" [illegible] [illegible] دیباچے [illegible] کے علاوہ سے بھی لگاؤ رہا۔ اب تک تقریباً ۲۵ ادبی تنقیدی اور مذہبی [illegible] لکھے ہیں، جو شائع ہو چکے ہیں۔ ریڈیو کے لئے بھی اکثر مختصر تقاریر [illegible] [illegible] ہندوستان کے مختلف شہروں کی محافل اور مشاعروں میں شرکت کے علاوہ دو مرتبہ [illegible] سادات امروہہ پاکستان کی دعوت پر پاک ہند مشاعرہ سنہ ۱۹۸۲ء اور سنہ ۱۹۸۳ء میں بھی شرکت کا موقع ملا ہے۔

مرزا رضا حسین لکھنوی، ڈاکٹر مظفر عباس نقوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی کے مشورے پر پہلا مرثیہ سنہ ۱۹۸۳ء میں لکھنا شروع کیا اس کے بعد صاحبانِ ذوق نے اتنا نوازا کہ اب تک ۱۲ مراثی مکمل لکھ چکا ہوں، جن کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ زیرِ تصنیف ہیں۔

؏ زندگی اشک بھی گوہرِ نایاب بھی ہے۔ بند۔ ۶۴

"حسینؑ اور زندگی"

؏۔ آدم سے درسِ علم جب انسان کو ملا بند۔ ۷۲

"حسینؑ اور قرآن"

؏۔ جہاں میں علمِ محمدؐ کے ورثہ دار ہیں ہم بند۔ ۶۳

"حسینؑ اور مسلمان"

؏۔ ہوائے رحمتِ ربِ قدیر ہے آزاد بند۔ ۸۰

"حسینؑ اور حریت"

... پہ بشر میں وفا نہ تھی بند۔ ۶۰

"حسینؑ اور رسولؐ"

درحقیقت وجہ اعلائے ... بہ ہے یہ زمیں بند۔ ۵۲

"حسینؑ اور کربلا"

... سے آدم ... رسم قربانی ہوئی بند۔ ۶۱

"حسینؑ اور قربانی"

عصر حاضر کی ضرورت ... حسینؑ ابن علیؑ بند۔ ۵۰

"حسینؑ اور عصر حاضر"

۔ ... پیالے ... ہے شب ... وفا بند۔ ۶۰

"حسینؑ اور وفا"

۔ بشر کی راہ نجات کا نام ہے اسلام بند۔ ۵۰

"حسینؑ اور اسلام"

۔ راہ خدا پہ ہو تو عبادت ہے یہ زندگی بند۔ ۴۸

"حسینؑ اور نماز"

۔ ہر دور میں بشر کی ضرورت ہے اتحاد بند۔ ۵۲

"حسینؑ اور اتحاد"

مندرجہ بالا مراثی ہند و پاک کے اہل قلم ... جن میں خاص طور سے قابل ذکر جوش ملیح آبادی، مولانا ... مولانا نسیم امروہوی ... امروہوی، سید محمد تقی، فضل ... سنگھ بیدی سحر ... شمیم کرہانی، تقی الحسن، ڈاکٹر منظر عباس ... اکبر حیدری، ڈاکٹر امام مرتضیٰ

ترقی کرنے کے بعد آج اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ریاض میں مقیم ہیں لیکن کمپنی کے کاموں سے مختلف ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ نقوش کو قوم پروری اپنے دادا سید ابن حسن سے ورثہ میں ملی تھی اس لیے قوم کے بہت سے نوجوانوں کی تلاشِ معاش کے سلسلے میں نقوش نے مدد کی اور سعودی میں روزگار سے لگایا۔

نقوش کی شاعری کی ابتدا ۱۹۶۳ء میں ہوئی اور سب سے پہلا قصیدہ جناب سیدہؑ کی شان میں کہا اور حضرت احسان امروہوی مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ احسان امروہوی کی رہنمائی اور ہمت افزائی کے سبب نقوش کی شاعری پر نکھار آتا گیا اور غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ نوحہ، سلام اور منقبت تک ہی محدود نہ رہی بلکہ مرثیہ بھی کہا۔ نقوش کا ایک مرثیہ راقم کی بھی نظر سے گزرا ہے بہرحال وہ ابھی نوجوان ہیں آئندہ بھی امید ہے کہ اس جانب توجہ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔

مرثیے کا مطلع مندرجہ ذیل ہے ؎

متاعِ لوح و قلم سے نواز دے یارب — بلند حق کے علم سے نواز دے یارب
نہ جاہ سے نہ حشم سے نواز دے یارب — فقط حسینؑ کے غم سے نواز دے یارب
یہ غم ہمارے لیے جان سے بھی پیارا ہے
ہر ایک غم میں بشر نے اسے پکارا ہے

آگے چل کر نقوش غمِ حسینؑ کی کیفیت اس کی تاثیر اور اثر کا بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ؎

یہ غم وہ ہے کہ جو کون و مکاں پہ طاری ہے — یہ غم زمانے میں صدیوں سے اب بھی جاری ہے
اسی کے سائے میں عمرِ رواں گزاری ہے — یہ غم زمانے کی ہر اک خوشی پہ بھاری ہے
جہاں میں آج شہِ مشرقین کا غم ہے
ہے جاوداں جو فقط وہ حسینؑ کا غم ہے

غمِ حسینؑ نے زمانے کی کس طرح رہنمائی کی۔ دلوں کو تقویت بخشی اور ذہنوں کو

روشنی عطا کی اسے، بھی نقوشؔ نے روشنی ڈالی ہے یہاں انکا اسلوبِ بیان بھی ایک نیا انداز لیے ہوتے ہے کہتے ہیں کہ ؎

غموں میں ایک غمِ جاوداں حسینؑ کا غم
دلوں کی راہ میں اک کہکشاں حسینؑ کا غم
بشر کے ذہن پہ ہے ضوفشاں حسینؑ کا غم
یزید سمجھا تھا بس ہے دھواں حسینؑ کا غم
یہ غم حسینؑ کا دنیا میں رنگ لا کے رہا
جو کائنات کے ہر خشک و تر پہ چھا کے رہا

نقوشؔ کی قادرالکلامی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مرثیے میں مختلف صنعتوں کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے ملتا ہے مثلاً ایک بند میں صنعتِ ذوقافیتین و ذوردیفین استعمال کی ہے اپنے ممدوح کے فضائل بیان کرتے ہیں ؎

حسینؑ کون؟ جو وحدانیت کا مظہر ہے
حسینؑ کون؟ جو مظلومیت کا پیکر ہے
حسینؑ کون؟ جو حقانیت کا لشکر ہے
حسینؑ کون؟ جو انسانیت کا رہبر ہے
رخِ حیاتِ بشر کو نکھارنے والا
ہے کائنات کی زلفیں سنوارنے والا

نقوشؔ کے مرثیے میں رثائیت بھی ایک منفرد لہجہ لیے ہوئے ہے وہ کہتے ہیں کہ ؎

وہی حسینؑ محمدؐ کا جو نواسہ ہے
خدا کا دین بچانے کو آج آیا ہے
یزیدیت کی گھٹاؤں نے اس کو گھیرا ہے
عدو کی فوج ہے چاروں طرف وہ تنہا ہے
عطش میں دھوپ میں لو کی بھی اذیت ہے
کہ اس پہ تیروں کی چاروں طرف سے بارش ہے

نقوشؔ کا یہ مرثیہ پہلی کوشش ہے اگر انہوں نے مشقِ سخن جاری رکھی تو امید ہے کہ وہ مرثیے میں ایک نمایاں مقام حاصل کریں گے۔ نقوشؔ کے سلام۔ قصائد اور نوحوں کا مجموعہ "نقوشِ غم" جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ انہوں نے اسلامی شاعری کے علاوہ نہ صرف

شبیرؑ، روحِ دانش و عرفاں کا نام ہے — شبیرؑ، گو یا صحوا [illegible] کا نام ہے
شبیرؑ، دین و کفر کے فرقاں کا نام ہے — شبیرؑ عزم فخرِ رسو[illegible] کا نام ہے
شبیرؑ، کربلا کے مجاہد کا نام ہے
شبیرؑ، دینِ حق کے قوائد کا نام ہے

ندیمؔ کے اس ا[illegible] سے کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر انھوں نے آئندہ بھی [illegible]شر کی جانب اسی طرح توجہ [illegible] نمایاں مقام حاصل کر سکیں گے۔

ندیمؔ بڑی سلیس [illegible] ۔ [illegible]عر کہتے ہیں۔ محاوروں کا بھی برمحل اور مناسب استعمال ملے گا۔ حتی المقدور [illegible] الفاظ اور سخت تراکیب سے گریز کرتے ہیں۔ ندیمؔ نے سلام بھی کافی کہے ہیں۔ چند [illegible] ار ملاحظہ

زندگی اصغرؑ بے شیر کے خوں نے بخشی — ورنہ اسلام تھا مرتے ہوئے تلیلوں کی طرح
حسینؑ ابنِ علیؑ جب تک ترا پیغام زندہ ہے — ہماری صبح زندہ ہے ہماری شام زندہ ہے
بتایا شمر کے سینے سے ہٹ کے تم نے اے مولا — بہادر ایسے ہوتے ہیں، دلاور ایسے ہوتے ہیں

ندیمؔ کی نعت و منقبت کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ ہو گا تم سا زمانے میں دوسرا نہ ہوا — رسولؐ تو ہوئے دنیا میں مصطفےٰؐ نہ ہوا
کوئی ثنائے محمدؐ کرے یہ ناممکن — خدا کے بعد کسی سے یہ حق ادا نہ ہوا
جس کا میں مولا ہوں بس مولا ہے اس کا مرتضیٰؑ — جب رسولِ حق نے یہ فرما دیا اچھی طرح
تب خدا نے فخر سے ارشاد فرمایا ندیمؔ — آج دیں دنیا پہ واضح ہو گیا اچھی طرح

یوں تو ندیمؔ نے کافی غزلیں کہی ہیں لیکن ان کا مندرجہ ذیل شعر بہت مشہور ہے

زندگی کب سے مانگتے ہیں زندگی
اور اسی حسرت میں مر جاتے ہیں لوگ

پیمہ [illegible]ا[illegible]ش کا

سیّد ہلال رضا ہلال

ہلال نقوی سید شرف الدین شاہ ولایتؒ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن بطنِ مادر میں تھے کہ ۱۹۴۷ء میں والدین نے امروہہ سے پاکستان کو ہجرت کی اور وہاں ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو پیدائش ہوئی۔ ہلال کا تعلق امروہہ کے ایک معزز و مقتدر خاندان سے ہے۔ والد سید مرمل حسین نقوی نہایت شریف اور باوقار شخصیت ہیں۔

ہلال کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا تھا اور ۱۹۶۷ء میں پہلی غزل کہی۔ اس کے بعد نظم کی جانب توجہ زیادہ رہی۔ ترقی پسند ذہن ابتدا سے پایا تھا اس لئے اسی رنگ میں زیادہ تر نظمیں کہیں۔ جوش ملیح آبادی کے مراثی کا مطالعہ کرنے سے طبیعت مرثیہ کی جانب راغب ہوئی اور ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا جس پر جوش ملیح آبادی سے اصلاح لی۔ اس طرح جوش کے سب سے پہلے اور آخری شاگرد ہلال ہوئے۔ اس مرثیہ پر اصلاح کے بعد جوش ملیح آبادی نے مرثیہ پر اصلاح لینے کے لئے ہلال کو مشورہ دیا کہ وہ نسیم امروہوی سے رابطہ قائم کریں۔ اس مشورہ کے بعد سے اب تک ہلال، نسیم امروہوی سے اصلاح لیتے ہیں۔ ہلال کا یہ پہلا مرثیہ "مشعلِ وفا" کے نام سے

تھی، اور اس کا سلسلہ کہاں کہاں تاریخ کی کڑیوں سے ملتا تھا اور ا... ہلال نے اس بات کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

بیعت جو توڑنے کی حسنِ مجتبیٰ نے کی — جب مجتبیٰ ... کی توڑش
جب نائبِ رسولؐ نے کی مصطفیٰ نے کی — مطلب حسینؑ کا صاف

سمجھیں یہ لوگ حق کا یہی ورثہ دار ہے
یعنی یزید وارثِ پروردگار ہے

ہلال نقوی ایک تو خود ہی انقلابی ذہن کے مالک ہیں پھر جوش ملیح آبادی کے قریب ان کو اور بھی ... ہیں۔ اسی ... سے اُن کے مراثی میں کئی ایسے مقامات ملیں گے جہاں انھوں نے ... پڑے معاشرے کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اکابرینِ سیاست، صاحبانِ اقتدار اور عالمانِ وقت کسی سے بھی ہلال نے نیچی نظر نہیں کی۔

ع۔ پھر زندگی پہ جبرِ سیاست ہے سر بسر

رہبر بنی ہے کور نگاہی جہان میں — اہلِ ہوس ہیں ظلِ الٰہی جہان میں
علم و عمل کا شیشۂ دل چور چور ہے — اونچا جہالتوں کا سرِ پُر غرور ہے

ہلال کی مرثیہ نگاری پر مختصر اور جامع تبصرہ ان کے ہی مندرجہ ذیل دو مصرعوں میں اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ۔

ہم انقلابیوں کی نظر ہے حسینؑ پر
اور یہ نظر بہ طرزِ دگر ہے حسینؑ پر

ہلال نقوی کی تصانیف میں جواب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں "مشعل و مقتل" "جدید مرثیے کے تین معمار" "گلدستۂ اطہر پر ایک نظر" اور "چشمِ نم" وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ جلد ہی ان کے مراثی کا مجموعہ "روحِ انقلاب" اور تحقیقی مقالہ "جدید اردو مرثیہ" منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک بہترین شاعر، دوربین محقق اور روشن دماغ نقاد

زیدی ... ہندو پاک میں چند شعراء سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان میں ہی
ماس ... ہیں۔ ایسے چند ہی شاعر اردو مرثیہ کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ نئی زندگی دینے
... اد ...)۔

زیدی ... طور مرثیے کے علاوہ سلام۔ نوحہ۔ قصیدہ۔ نعت۔ منقبت۔ غزل۔ نظم۔
... مختصر رباعیات وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مختصر آزاد مرثیہ بھی کہا ہے۔
در ... تحقیقی۔ تاریخی و تنقیدی مضامین بھی کافی تعداد میں لکھے ہیں۔

ہلال نقوی کی مرثیہ نگاری پر یوں تو ہندو پاک کے بیشتر نقادوں نے رائے کا اظہار
کیا ہے لیکن ان میں خاص طور سے قابلِ ذکر جوش ملیح آبادی ... دہلوی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی
ڈاکٹر اکبر حیدری۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین۔ ڈاکٹر بشیر بدر۔ حسینی ... منظر عباس نقوی
ڈاکٹر امام مرتضیٰ۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ اور ضمیر اختر نقوی وغیرہ ہیں۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ "فکری پختگی اور بیان کی ندرت میں وہ (ہلال)
اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے ہیں۔ (اردو مرثیہ پاکستان میں) ص۳۹۱

نسیم امروہوی لکھتے ہیں کہ "ندرتِ خیال۔ جدتِ اسلوب۔ متانتِ فکر اور نئی سے
نئی معنی خیز تراکیب سے میں نے اُن کے (ہلال کے) کلام کو آراستہ و پیراستہ پایا"۔
(اردو مرثیہ پاکستان میں ص۳۹۱)

جوش ملیح آبادی کہتے ہیں کہ میں اس صنفِ سخن یعنی مرثیے کے میدان میں اُنکی (ہلال کی)
روایت شکنی کی داد دیتا ہوں۔ انھوں نے لوگوں کو رلایا نہیں بلکہ جگایا ہے جیسے اُن کے
ہاں ایک مخصوص فرقے یا گروہ کے رہبر نہیں بلکہ پوری کائنات کے رہنما ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی فرماتے ہیں کہ "اس مسدس میں مسدسِ حالی کی طرح عصرِ جدید
پر تنقید کی گئی ہے جو حالی کی سمجھ سے بہت دور ہے اور جس کی مثال اقبال کے ایسے مسدس
میں ملتی ہے جیسے "شکوہ و جوابِ شکوہ"۔

ایک موقع پر امام کی عظمت کا بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

امام، علم و یقین کی مہر کو کہتے ہیں ۔۔۔ امام، جلوۂ شمس و قمر کو کہتے ہیں
امام، منزلِ فکر و نظر کو کہتے ہیں ۔۔۔ امام، عظمت نوعِ بشر کو کہتے ہیں

فکرِ انساں کا شباب بھی ہے
...صبغۃ اللہ کی آب بھی ہے

شاعر اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

ایسا سورج ... ہوئیں اس سے منسوب ۔۔۔ ساری دنیا کی وفائیں ہوئیں اس سے منسوب
دے گیا وقت کو ... ۔۔۔ لکھ دیا موجوں کے سینے پہ وفا کا مکتوب

... بھی ہوئی ہریالی ہے
کربلا ... عالی ہے

فکر بشر کی قوت پرواز کربلا ۔۔۔ عمرِ رواں کی منزلِ آغاز کربلا
قرآن کا تسلسل اعجاز کربلا ۔۔۔ ہے آخری رسولؐ کی آواز کربلا

کرب و بلا بشر کی رگِ جاں ہے آج بھی
یہ خاکِ سجدہ گاہ میں شامل ہے آج بھی

ناشر نے اپنے دور کے حالات کا جائزہ بھی لیا ہے، عصرِ حاضر کے مسائل بھی سامنے آئے ہیں اور ان کا حل بھی وہ درِ حسینؑ ہی سے حاصل کرتے ہیں۔

مطلب پرستیوں میں ہے دنیا کے رنگ و بو ۔۔۔ دامانِ دیں کو آج ہے پھر حاجت رفو
قرآں شکستہ جسم ہے ایماں لہو لہو ۔۔۔ خطرے میں پھر ہے دینِ محمدؐ کی آبرو

اب سن بھی لے یہ درد میں ڈوبی صدا حسینؑ
پھر عصر نو پکار رہا ہے کہ "یا حسینؑ"

ناشر کے مراثی میں مصائب کا حصہ بھی کافی جاندار ہے اور یہ حصہ بھی اسلوب بیان کے اعتبار سے جدید ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

اونٹوں پہ جب سوار ہوئے نیرِ صفات — بچوں کے [illegible] گودیں ماؤں کی حادثات
ہی میرِ قافلۂ جادۂ حیات — حسرت سے دیکھتا [illegible] سلطانِ کائنات
جب قافلے کے آگے سوئے شام چل پڑے
دل پھٹ گیا، فرات کے آنسو نکل پڑے

اے مرے لعل، مرے تشنہ جگر کچھ تو کہو — کیوں یہ خاموشی [illegible] لب، بولو زباں تو کھولو
تم تو کہتے تھے کہ چھوڑو گے نہ تنہا مجھ کو — تم تو ڈھارس [illegible]، اے علی اکبر اٹھو
خشک ہونٹوں میں مرے سوکھی زباں [illegible] بیٹا
ظہر کا وقت ہے، جنگل میں اذاں [illegible] بیٹا

ناشر نقوی نے مراثی کے علاوہ سلام، نوحے، قصائد، نعت، منقبت، رباعیات اور قطعات وغیرہ بھی کہے ہیں۔ سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لہو سے لکھا گیا تھا ورق ورق جس کا
حسینؑ لائے تھے ایسی کتاب مقتل میں

سجا دو جس پہ سوئے تھے اس جلتی ریت نے
قصرِ امیرِ شام کے بستر جلا دیئے

ہر نگینے کو بدل کر قطرہ قطرہ خونِ شاہ
قیصری کے تاج کو بے قدر پتھر دے گیا

ناشر کی تصانیف میں "تشنگی" اور "وسیلہ" مراثی، سلام اور نوحوں کے

مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ سلام اور نوحوں کا ایک مجموعہ "تنظیم امامیہ مشن لکھنؤ" سے جلد شائع ہونے والا ہے۔ آج کل وہ اپنے قصائد بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ شاعری کے علاوہ ناشر کو نثر نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ اب تک کئی مضامین، ریڈیو رپورٹس، انشائیے اور ریڈیو فیچر لکھ چکے ہیں جو ملک کے مختلف رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔

ناشر کا سلسلۂ تلمذ کبھی نفیس لکھنوی سے بھی تھا۔ لیکن اب دہلی کے قیام کے سبب اُن کے شفیق استاد مہدی نظمی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"آج کی نئی شاعری اور آج کے نئے اسلوب اور نئے لب و لہجے میں بیسویں صدی پہلے کی اندوہ ناک داستان کو جس ڈھنگ سے پیش کرنے کا ان کے پاس فن ہے وہ یقین دلا رہا ہے کہ "مصحفی اور سعادت کی سرزمین" کا یہ سپوت ایک دن ضرور آسمانِ ادب پر انجم و خورشید و ماہ کی طرح چمکے گا۔" (وسیلہ صفحہ ۹)

پروفیسر ستنام سنگھ خمار لکھتے ہیں کہ۔

"جس عمر میں ناشر نقوی نے فن کی پختگی کے جوہر دکھائے ہیں وہ نہ صرف قابلِ صد تحسین ہیں بلکہ ان کی مستقبل کی انفرادیت کی ضمانت ہیں۔"

(تشنگی صفحہ ۶)

کتابیات

تاریخِ اصغری	امروہہ	سید اصغر حسین
تواریخِ واسطیہ	امروہہ	سید رحیم بخش
نخبۃ التواریخ	امروہہ	سید آلِ حسن مودودی
تاریخِ ساداتِ امروہہ	حیدر آباد	سید جمال احمد نقوی
تاریخِ اسلام جلد پنجم		ذاکر حسین
تاریخِ فرشتہ		محمد قاسم
تاریخِ مرثیہ		سفارش حسین رضوی
تاریخِ ادب اردو		رام بابو سکسینہ
تذکرۃ الکرام		محمود احمد عباسی
انوارِ قم	کراچی	سید ضمیر حسن
آئینِ اکبری		ابوالفضل
شجراتِ ساداتِ امروہہ جلد دوم۔ کراچی		مولوی سید بشیر حسین

مقدمہ شعر و شاعری — الطاف حسین حالی
موازنہ انیس و دبیر — شبلی نعمانی
کاشف الحقائق ۔ جلد دوم — امداد امام اثر
قاموس المشاہیر — نظامی بدایونی
تحقیق الانساب — امروہہ — محمود احمد عباسی
مجمع الانتخاب — شاہ محمد کمال
طبقات الشعراء — قدرت اللہ شوق
بزم سخن — حسن علی خاں
نتائج الافکار — قدرت اللہ
طور کلیم — نورالحسن خاں
شاگردانِ انیس — کراچی — ڈاکٹر قمقام حسین جعفری
گلشنِ بے خار — نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
خوش معرکۂ زیبا — سعادت خاں ناصر
نکات الشعراء — میر تقی میر
عقدِ ثریا — غلام ہمدانی مصحفی
ریاض الفصحا — غلام ہمدانی مصحفی
مقدمہ مراثی نسیم جلد دوم — رئیس امروہوی
جدید مرثیے کے تین معمار — کراچی — ہلال نقوی
گلشنِ بے خزاں — قطب الدین باطن
خم خانۂ جاوید جلد پنجم — لالہ سری رام
مخزنِ نکات — قائم چاند پوری

آبِ حیات		محمد حسین آزاد
شعر العجم		شبلی نعمانی
دبستانِ دبیر		ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
اردو مرثیہ		اطہر علی فاروقی
اردو مرثیے کا ارتقاء		ڈاکٹر مسیح الزماں
تعارفِ مرثیہ		شجاعت علی سندیلوی
درسِ بلاغت		نجم احمد
واقعاتِ انیس	لکھنؤ	مہدی حسن احسن
اردو مرثیہ پاکستان میں	کراچی	ضمیر اختر نقوی
خم خانۂ جاوید جلد دوم		لالہ سری رام
مراثی میر		ڈاکٹر مسیح الزماں
آیاتِ مصحفی	لکھنؤ	مہذب لکھنوی
مجاہد اعظم		مولوی سید شاکر حسین
شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی		ڈاکٹر فضل امام
معصوموں کا ستارہ		لیگنڈ بیڈ ر گنگل
کار جہاں دراز ہے	بمبئی	قرۃ العین حیدر
سعادت امروہوی	کراچی	نسیم امروہوی
سفر نامہ ابن بطوطہ		ابن بطوطہ
دیوانِ فرقتی	امروہہ	سید ابو الحسن فرقتی
نخل پارہ		کاظم علی خان
اردو کی دو قدیم مثنویاں	لکھنؤ	نائب حسین نقوی

مسدس جوہر		...سے حسین حالی
روداد لہورنگ	کراچی	جم...
شمع عرفان	کراچی	...ن نعمانی
قصیدہ نگارانِ اتر پردیش	لکھنؤ	...د امام اثر
		...امی بدایونی
رپورٹ مشاعرہ میونسپل بورڈ - امروہہ	۱۹۳۰ء	
		...سعود احمد عباسی
ریاض شمیم		شاہ محمد کمال
سلور جوبلی نمبر انجمن وظیفہ...		
شخصیات	کراچی	...ذ الحمز
		...امی خاں
گلدستہ ادب...		
سوزِ غم	امروہہ	مرتبہ اسلام حسین و احتشام حسین
ذکر ساداتِ امروہہ	امروہہ	تلمیذ الدین احمد
"چمن"	امروہہ	مرتبہ سید ابو الحسن
مکتوب شمیم امروہوی	بنام	داغ دہلوی
مکتوب داغ دہلوی	بنام	شمیم امروہوی
مکتوب ضمیر اختر نقوی	بنام	محمد علی خاں
مکتوب رشید احمد صدیقی	بنام	نسیم امروہوی ۱۳ دسمبر ۱۹۴۳ء
مکتوب ہلال نقوی	بنام	عظیم امروہوی ۱۱ اگست ۱۹۸۳ء
مکتوب رضا امروہوی	بنام	عظیم امروہوی
مقدمہ "معراج نفس رسول"	کراچی	رئیس امروہوی
مقدمہ "وسیلہ"	دہلی	مہدی نظمی
مقدمہ "تشنگی"	غازی آباد	پروفیسر ستنام سنگھ خمار

		خمار فاروقی
		ابراہیم جلیس
آبِ حیات	کراچی	جوش ملیح آبادی
اُردو مرثیہ	[illegible]	ہلال نقوی
اردو مرثیے کا ارتقاء	[illegible]	مولوی عبدالحق
تعارفِ مرثیہ	کراچی	ہاشم رضا عابدی الہ آبادی
درسِ بلاغت		مولوی سید محمد سیادت
[illegible] نسیم	کراچی	رؤف عروج
اردو مرثیہ [illegible]	کراچی	ڈاکٹر [illegible]قدر حسین مقدر
مقدمہ کلامِ [illegible]	دہلی	روشن علی چشتی نظامی
مقدمہ سازِ حریت	لکھنؤ	پروفیسر ممتاز احمد نقوی
مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک	کراچی	ساحر لکھنوی
مقدمہ امانتِ سخن	[illegible] آباد	پروفیسر احتشام حسین
مقدمہ دیوانِ شبیر	امروہہ	مسیح اللہ خاں عطا
مقدمہ حیاتِ حاذق	امروہہ	مظاہر حسین مومن
پیش لفظ روشنیٔ طبع	لکھنؤ	میر نفیس لکھنوی
قلمی بیاض		مولوی سید اعجاز حسین
قلمی بیاض		علامہ شفیق حسن ایلیا
قلمی بیاض		سید ممتاز حسن کمال
قلمی بیاض		جون ایلیا
مقدمہ مرثیہ عظیم	کراچی	ڈاکٹر ہلال نقوی

میوۂ شیریں			ریاض حسین حالی
مقدمہ 'کربلا شناسی'	کراچی		ترجمہ شبلی نعمانی
اوصافِ علی	آگرہ		احسان اللہ
بیمارِ مسیحا	امروہہ		علی جواد زیدی
مقدمہ حدیثِ غم	لکھنؤ	۱۹۳۰ء	
مقدمہ آہ۔ سید محسن رضا خاں	امروہہ		شمیم امروہوی
مقدمہ امانتِ سخن	حیدرآباد		سید اعجاز حسین خاں حیدری ۔۔۔
ضیاء الصنائع	امروہہ		سید حسن ضیا
مقدمہ فریادِ ضیا			سید ممتاز حسین جونپوری
گلدستۂ تمکین			علی ذہین نقوی
ماہنامہ 'مجلہ'	کراچی	ستمبر ۱۹۶۵ء	اشفاق حسین بیگس
ماہنامہ 'پاسبان'	چنڈی گڑھ	اپریل ۱۹۸۱ء	سید حسین عباس رضوی
ماہنامہ 'مجاہد'	لکھنؤ		مرتبہ مولوی سید محمد حسن آلِ نجم العلماء
ماہنامہ 'اتحادِ اسلام'	امروہہ	اگست ۱۹۱۰ء دمئی ۱۹۱۱ء	مجاہد حسین جوہر
ماہنامہ 'معیارِ سخن'	دہلی		لائق حسین قوی
ماہنامہ 'سوز و ساز'	دہلی		لائق حسین قوی
ماہنامہ 'نسیم چمن'	دہلی		مولوی احمد حسین خاں
ماہنامہ 'الجواد'	بنارس	نومبر ۱۹۶۱ء	
ماہنامہ 'معراج الکلام'	امروہہ	اکتوبر ۱۹۳۲ء	حکیم محمد فیاض علی خاں
ماہنامہ 'الحجت'۔	پشاور		یادگار حسینی نمبر
ماہنامہ 'شاعر'	امروہہ	۱۹۲۸ء	افق کاظمی

آبِ حیات	کراچی	
شعر العجم	کراچی	اپریل، مئی ۱۸۹۰ء
دبستانِ دبیر	دہلی	۲۵ جولائی تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء
دیباچہ [illegible] و مقتل	کراچی	فروری ۱۹۶۳ء
مقدمہ "ذکرِ میر"		۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء
مقدمہ "تحریکِ نینوا"	امروہہ	۱۵ ستمبر ۱۹۸۰ء
مقدمہ "دیوانِ علی نظر"	امروہہ	۷ [illegible] ۱۹۶۳ء
روزنامہ "واشنگٹن پوسٹ"	واشنگٹن	[illegible] جولائی ۱۹۶۳ء
ہفتہ وار "ندائے عوام"	مظفر پور	۲۰ دسمبر ۱۹۸۲ء
سہ ماہی "اردو"	کراچی	اپریل ۱۹۵۱ء
[illegible] آباد گزیٹئر	مراد آباد	
[illegible] ماتم	حیدر آباد	مرتبہ شیخ ابوالقاسم حسام
عرفانِ نسیم	کراچی	حسین اعظمی
مقدمہ "تسبیحِ فاطمہ"		مولانا محمد بشیر
نفسِ مطمئنہ		مولانا مرتضیٰ حسین فاضل
ماہنامہ "اظہار"	کراچی	اکتوبر ۱۹۸۳ء
دانا المراد		نسیم امروہوی
ماہنامہ "نگار"	کراچی	نیاز فتح پوری
مقدمہ قطعاتِ رئیس امروہوی جلد دوم		جوش ملیح آبادی
دستورِ [illegible]، ۱۴۰۲ھ	کراچی	نقوش نقوی
انا من الحسین	کراچی	رئیس امروہوی
چشمۂ غم		نسیم امروہوی

الاتحاد کمیٹی کی آئندہ پیش...

قصیدہ نگارانِ امروہہ

پاک و ہند کے مشہور نوجوان محقق اور شاعر جناب عظیم امروہوی کی مسلسل کئی سال کی شاندار اور گراں قدر تحقیق جس میں امروہہ کے گذشتہ ۳ سو سال کے قصیدہ نگار شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام پیش کیا ہے جلد

[illegible]

...ب نقوش نقوی کی شاہکار اسلامی
نظمو... مجموعہ ممتاز نقادوں کی رائے کے ساتھ
دنیائے اسلا... ...یب طلوع۔